جاوید احمد غامدی

البیان

النحل - القصص

۱۶ــــ۲۸

۳

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نئی اشاعت
نظر ثانی کے بعد

ناشر: المورد
طابع: ٹوپیکل پرنٹنگ پریس، لاہور
طبع اول: جولائی 2018ء
کتابت: محمد یوسف نگینہ
قیمت:
ISBN: 978-969-8799-96-0

Address: Post Box 5185, Lahore Pakistan.
Website: www.al-mawrid.org
Email : info@al-mawrid.org, almawrid@brain.net.pk

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

۱۶- النحل ۹
۱۷- بنی اسرائیل ۶۱
۱۸- الکہف ۱۱۹
۱۹- مریم ۱۶۸
۲۰- طٰہٰ ۲۱۱
۲۱- الانبیاء ۲۷۵
۲۲- الحج ۳۲۷
۲۳- المؤمنون ۳۷۸
۲۴- النور ۴۱۵

باب چہارم

۲۵- الفرقان ۴۶۳
۲۶- الشعراء ۴۹۲
۲۷- النمل ۵۴۳
۲۸- القصص ۵۸۱

النحل - بنی اسرائیل

۱۶ ـــــ ۱۷

النحل - بنی اسرائیل

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا باہمی تعلق اجمال اور تفصیل کا ہے۔ چنانچہ پہلی سورہ میں جو چیزیں اشارات کی صورت میں ہیں، دوسری میں اُن کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ یہود سے مفصل خطاب، اخلاق کے فضائل و رذائل کی وضاحت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے لیے تیاری کی ہدایت اِس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

دونوں سورتوں کا موضوع انذار و بشارت ہے جو پچھلی سورتوں سے چلا آ رہا ہے اور دونوں میں خطاب اصلاً قریش ہی سے ہے۔ دوسری سورہ —— بنی اسرائیل —— میں، البتہ یہود سے بھی مفصل خطاب کیا گیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قریش کی حمایت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے اب وہ بھی پوری طرح میدان میں آ چکے ہیں۔

اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب ہجرت کا مرحلہ قریب آ گیا ہے۔

سورة النحل

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَتٰۤى اَمۡرُ اللّٰهِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ①
يُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖۤ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اللہ کا فیصلہ صادر ہو چکا ہے، سو اُس کے لیے جلدی نہ مچاؤ[1]۔ وہ پاک اور برتر ہے اُن چیزوں سے جنھیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں[2]۔ (اِنھیں بتاؤ، اے پیغمبر کہ ہر شخص اِس کا اہل نہیں ہوتا کہ اللہ اُس پر فرشتے اتار دے)۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، اپنے حکم کی وحی[3] کے ساتھ فرشتے اتارتا ہے، اِس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو

---

[1] یہ اُس فیصلے کا اعلان ہے جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد لازماً صادر ہو جاتا ہے۔ قرآن کے مخاطبین اُسی کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے۔ یہ اُنھی کو خطاب فرمایا ہے۔

[2] اِس آیت میں پہلے براہ راست خطاب ہے، پھر غائب کا صیغہ آ گیا ہے۔ یہ التفات کیوں ہوا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس میں بلاغت یہ ہے کہ پہلے ٹکڑے میں تہدید و وعید ہے جس کے لیے خطاب ہی کا اسلوب زیادہ موزوں ہے اور اِس دوسرے ٹکڑے میں کراہت و نفرت کا اظہار ہے جس کے لیے غائب کا صیغہ زیادہ مناسب تھا۔ گویا بات اُن سے منہ پھیر کر فرمائی گئی۔“ (تدبر قرآن ۳۸۹/۴)

[3] اصل میں ’بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِهٖ‘ کے الفاظ آئے ہیں، یعنی اپنے حکم کی روح کے ساتھ۔ ’رُوۡح‘ سے مراد یہاں وحی الٰہی ہے۔ قرآن میں یہ لفظ اِس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جو پھونک یا کلمہ خدا سے صادر ہو کر فرشتہ بن جاتا ہے یا انسان کا قالب اختیار کرتا ہے یا

اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ③ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ
خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ④ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَکُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا
تَاْکُلُوْنَ ۪ ⑤ وَلَکُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ ۪ ⑥
وَتَحْمِلُ اَثْقَالَکُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَکُوْنُوْا بٰلِغِیْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ

خبردار کر دو کہ میرے سوا (تمھارا) کوئی معبود نہیں ہے، لہٰذا مجھی سے ڈرو۔ اُس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے[4]۔ (اُس کے فیصلوں پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا)، وہ برتر ہے اُن چیزوں سے جنھیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔ اُس نے انسان کو ایک ذراسی بوند سے پیدا کیا تو دیکھتے ہو کہ یکایک وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اُٹھ کھڑا ہوا ہے[5]۔ یہ چوپایے بھی اُس نے پیدا کیے ہیں۔ اِن میں تمھارے لیے جاڑے کی پوشاک ہے اور دوسرے فائدے بھی اور اِن سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ اِن کے اندر تمھارے لیے جمال بھی ہے، جب کہ شام کے وقت اِن کو واپس لاتے ہو اور جب صبح کو چرنے کے لیے چھوڑتے ہو[6]۔ یہ تمھارے بوجھ ایسے شہروں تک لے جاتے

لفظ کا جامہ پہنتا ہے، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔

[4] یعنی غایت و حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ یہ کائنات بامعنیٰ انجام کو پہنچے اور اِس میں جو کچھ ہوا ہے، خدا کی عدالت انصاف کے ساتھ اُس کا فیصلہ سنا دے۔ یہ کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ لوگ اِس میں جو چاہیں، کرتے پھریں اور اُن سے کوئی باز پرس نہ ہو۔

[5] اشارہ ہے اُنھی سرکشوں کی طرف جو اُس وقت قرآن کے مخاطب تھے۔

[6] اصل الفاظ ہیں: 'حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ'۔ اِن میں 'سَرْح' کو بظاہر 'اِرَاحَة'

إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝٧ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝٨ وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ أَجْمَعِينَ ۝٩

هُوَ الَّذِيٓ أَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۖ لَّكُم مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ۝١٠ يُنۢبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ

ہیں، جہاں تم جان توڑ کر ہی پہنچ سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار بڑا ہی شفیق، بڑا مہربان ہے۔ یہ گھوڑے اور خچر اور گدھے بھی اُس نے پیدا کیے ہیں تاکہ تم اِن پر سوار ہو اور یہ زینت بھی ہیں۔ وہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جنھیں تم نہیں جانتے۔ (اُس کو پانا چاہتے ہو تو جان لو کہ) اللہ تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے، جب کہ راہیں ٹیڑھی بھی ہیں۔ اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو اُسی ایک راہ کی ہدایت دے دیتا۔ ۱-۹

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا جس سے تم پیتے بھی ہو اور اُسی سے وہ نباتات بھی اگتی ہیں جن میں تم مویشیوں کو چراتے ہو۔ وہ تمھارے لیے اُسی سے

پر مقدم ہونا چاہیے تھا، لیکن قرآن نے اُسے موخر کر دیا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...اِس کی وجہ یہ ہے کہ موقع کلام اظہار شان کا ہے اور شان کا اظہار گلے کی شام کو واپسی میں زیادہ ہے، جب کہ وہ چراگاہ سے چر چگ کے تازگی اور فربہی کی حالت میں گھر کو واپس آتا ہے۔ یہ بات اِس درجہ میں اُس وقت نہیں ہوتی، جب وہ صبح کو چرنے کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۳۹۱)

وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ ⑪ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ
وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۙ ⑫
وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ⑬

کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ یقیناً اِس میں اُن لوگوں کے لیے بہت بڑی نشانی ہے جو غور کریں[۷]۔ رات اور دن اور سورج اور چاند کو اُسی نے تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور اُسی کے حکم سے ستارے بھی تمھارے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یقیناً اِس میں اُن لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیں۔ اور یہ جو رنگ رنگ کی چیزیں اُس نے تمھارے لیے زمین میں بکھیر دی ہیں، اُن میں بھی یقیناً بہت بڑی نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں[۸]۔ ۱۰-۱۳

---

[۷] یعنی اِس بات کی نشانی کہ یہ کائنات مخلوق ہے اور اِس کا ایک ہی خالق ہے، زمین و آسمان میں ہر جگہ اُسی کی حکومت ہے، سب اُسی کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت سے متمتع ہو رہے ہیں، اُس نے کوئی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی ہے، وہ یقیناً ایک دن ایسا لائے گا، جس میں اُن لوگوں پر انعام فرمائے گا جنھوں نے اپنی ذمہ داری پہچانی اور اُن سے بازپرس کرے گا جو اندھے اور بہرے بن کر ایک شترِ بے مہار کی زندگی گزارتے ہیں۔

[۸] انسان کی جو صلاحیتیں اُس کی صحیح رہنمائی کرتی ہیں، اُنھیں بالترتیب یہاں 'يَتَفَكَّرُوْنَ'، 'يَعْقِلُوْنَ' اور 'يَذَّكَّرُوْنَ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول ہے۔ انسان کی سب سے اعلیٰ صفت تو یہ ہے کہ وہ اِس

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا
مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ
فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٤﴾
وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ

وہی ہے جس نے سمندر کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے، اِس لیے کہ تم اُس سے (مچھلیوں کا) تازہ گوشت کھاؤ اور اُس سے زیور (کی وہ چیزیں) نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو۔ اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اِسی (سمندر) میں (اُس کا سینہ) چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہیں، اِس لیے کہ تم اُن میں سفر کرو اور اِس لیے کہ اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو اور اِس لیے کہ اُس کا شکر کرو۔ ۱۴

اُسی نے زمین میں پہاڑ ڈال دیے ہیں، اِس لیے کہ وہ تم کو لے کر جھک نہ پڑے

کائنات میں تفکر کرے، اِسی تفکر سے اُس کو اِس کثرت کے اندر وحدت کی طرف رہنمائی اور اِس کائنات کی اصل غایت کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو کم از کم یہ تو ہو کہ وہ اپنی عقل سے کام لے اور اِس کائنات کی ایک ایک چیز جس نشانِ منزل کی طرف انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کر رہی ہے، اُس کی اِس یاددہانی سے فائدہ اٹھائے اور اندھے بھینسے کی طرح نہ چلے۔ اِنھی صفات کا حوالہ آگے اِسی سورہ کی آیات ۶۵، ۶۷، ۶۹ میں بالترتیب 'یَسْمَعُوْنَ'، 'یَعْقِلُوْنَ' اور 'یَتَفَکَّرُوْنَ' کے الفاظ سے آیا ہے۔ یہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف صعود ہے۔ یعنی ایک معقول آدمی کے اندر کم از کم جو بات ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ وہ معقول بات کو سنے اور اُس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اگر یہ نہ ہو تو وہ سرے سے آدمی ہی نہیں ہے، بلکہ نرا دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اور اُس کا اعلیٰ وصف یہ ہے کہ وہ اِس کائنات میں تفکر کرے، اِس لیے کہ اِسی تفکر سے علمِ صحیح اور معرفتِ حقیقی کے دروازے کھلتے ہیں اور قرآن درحقیقت انسان کی اِسی صلاحیت

النحل
۱۶

تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾
اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ
تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ
يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ؕ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ
وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور اُس میں نہریں جاری کر دی ہیں[۹] اور راستے نکال دیے ہیں، اِس لیے کہ راہ پاؤ اور اِن کے علاوہ دوسری علامتیں بھی ٹھیرائی ہیں[۱۰] اور لوگ (آسمان کے) تاروں سے بھی راستہ پاتے ہیں۔ ۱۵-۱۶

پھر کیا جو پیدا کرتا ہے، وہ اُن کے برابر ہو جائے گا جو کچھ پیدا نہیں کرتے؟ تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو اُنھیں گن نہیں سکو گے۔ (اِس پر بھی ناشکری کرتے ہو)؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ (اُس نے تمھیں مہلت دے رکھی ہے تو اُس کی وجہ یہی ہے، مگر یاد رکھو کہ) اللہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو۔ جنھیں یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کچھ پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مردہ ہیں نہ کہ زندہ اور نہیں

کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔" (تدبر قرآن ۳۹۶/۴)

[۹] اصل میں 'اَنْهٰرًا وَّسُبُلًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کے لیے موزوں افعال عربیت کے اسلوب پر حذف کر دیے گئے ہیں، یعنی 'فَجَّرَ فِيْهَا اَنْهَارًا وَّمَهَّدَ فِيْهَا سُبُلًا'۔

[۱۰] یہاں بھی وہی اسلوب ہے جس کا ذکر اوپر ہوا، یعنی 'جَعَلَ لِلسَّبِيْلِ عَلٰمٰتٍ'۔

اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ
مُّنْکِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ (۲۲) لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ
وَمَا یُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ (۲۳)
وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّکُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۲۴) ۙ
لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ کَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ

النحل
۱۶

جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔[۱۱] ۱۷-۲۱

تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ مگر جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُن کے دل منکر ہیں اور وہ غرور میں پڑے ہوئے ہیں۔[۱۲] اللہ یقیناً جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اُن لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو اِس طرح غرورِ نفس میں مبتلا ہیں۔ ۲۲-۲۳

جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے پروردگار نے یہ کیا چیز اتاری ہے[۱۳] تو کہتے ہیں کہ اگلوں کی کہانیاں ہیں۔[۱۴] یہ اِس لیے کہ قیامت کے دن وہ اپنے بوجھ بھی پورے

---

[۱۱] آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ خاص اُن کے بزرگوں اور آباواجداد کا ذکر ہے جنھیں معلوم نہیں کیا کیا قرار دے کر وہ اپنی حاجتوں کے لیے پکارتے اور اُن کی پرستش کرتے تھے۔

[۱۲] مطلب یہ ہے کہ اُن کے دلوں میں انکار بس گیا ہے جس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ داعیِ حق کی بات مان کر اپنے مزعومہ عقائد کو چھوڑ دینا اُنھیں اپنی ہتک محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ محض غرورِ نفس ہے جس کی بنا پر ایک واضح حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں۔

[۱۳] قرآن کی دعوت سے متاثر ہو کر یہ سوال، ظاہر ہے کہ پیرو اپنے لیڈروں سے کرتے ہوں گے تاکہ اُن کی راے معلوم کریں اور اُس کی روشنی میں اپنے لیے کوئی لائحۂ عمل طے کر سکیں۔

[۱۴] مطلب یہ ہے کہ ماضی کے بے اصل قصے ہیں جو اپنے رنگ میں دہرائے جا رہے ہیں۔

يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ (۲۵)
قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ
فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ
لَا يَشْعُرُوْنَ (۲۶) ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ

اٹھائیں اور اُن لوگوں کے کچھ بوجھ بھی جنھیں وہ بغیر کسی علم کے گم راہ کر رہے ہیں[۱۵]۔ یاد رکھو، نہایت برا ہے وہ بوجھ جو یہ لوگ اٹھائیں گے۔ ۲۴-۲۵

اِن سے پہلے لوگوں نے بھی اِسی طرح چالیں چلی تھیں[۱۶]۔ پھر اُن کی عمارت خدا نے بنیاد سے اکھاڑ دی تو اُس کی چھت اُن کے اوپر سے اُن پر آ رہی[۱۷] اور اُس کا عذاب اُن پر وہاں سے آیا، جہاں سے اُن کو گمان تک نہ تھا۔ پھر یہی نہیں، قیامت کے دن اللہ

اِن سے مرعوب یا ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہی ٹھیک ہے۔ خدا کے نام سے یہ من گھڑت باتیں محض تمھیں گم راہ کرنے کے لیے پیش کی جا رہی ہیں۔

[۱۵] اصل الفاظ ہیں: 'مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ'۔ اِن میں 'مِنْ' 'تبعیض' کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گم راہ ہونے والے اپنی گم راہی کا بوجھ تو لازماً اٹھائیں گے، اِس لیے کہ خدا نے اُنھیں بھی عقل و فہم سے بہرہ مند فرمایا تھا، مگر اُن کے بوجھ میں سے کچھ حصہ اُن کے لیڈروں کو بھی بٹانا ہوگا جو اُنھیں گم راہ کرتے رہے۔ اِس پر 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' کی قید بتا رہی ہے کہ رسولوں کی دعوت علم حقیقی پر مبنی ہوتی ہے اور اُس کے مقابلے میں جو کچھ بھی کہا جائے، وہ 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' ہوتا ہے۔ علم و عقل کے مسلمات میں سے کوئی چیز اُس کی تائید میں پیش نہیں کی جا سکتی۔

[۱۶] یہ جو کچھ کر رہے تھے، چونکہ اپنی لیڈری کو بچانے کے لیے کر رہے تھے، اِس لیے قرآن نے اِسے چالوں سے تعبیر کیا ہے۔

[۱۷] یہ اُس تباہی اور بربادی کی تصویر ہے جس سے یہ قومیں دوچار ہوئیں اور اُن کے تمدن

الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ
الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ
عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ
اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ

اُنھیں اور بھی رسوا کرے گا اور اُن سے پوچھے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کے لیے تم لڑتے رہے تھے؟ جن کو علم دیا گیا تھا، وہ (اُس وقت) پکار اُٹھیں گے کہ آج اِن منکروں پر رسوائی اور بدبختی ہے —— اُن[۱۸] پر، جن کی روح فرشتے اِس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہوں گے تو فوراً سپر ڈال دیں گے کہ ہم تو کوئی برا کام نہیں کر رہے تھے۔ (فرشتے جواب دیں گے): کیوں نہیں، بے شک اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اِس طرح کہ اُسی میں ہمیشہ رہو گے۔ سو کیا ہی برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کے لیے! ۲۶-۲۹

دوسری طرف جو خدا سے ڈرنے والے ہیں، جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ

اور اقتدار کی عمارت گویا اِس طرح ڈھے گئی کہ اُس کی دیواریں اور چھتیں، سب اُن کے اوپر آ پڑیں۔

[۱۸] یہاں سے آگے تضمین ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اہل علم کی بات کو مخاطبین پر منطبق کر دیا

دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ ﴿٣٠﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ ﴿٣١﴾ الَّذِيْنَ
تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا
الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٣٢﴾
هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ

تمھارے پروردگار نے یہ کیا چیز اتاری ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بہترین چیز اتاری ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) جنھوں نے بھلائی اختیار کی، اُن کے لیے اِس دنیا میں بھی بھلائی ہے[١٩] اور آخرت کا گھر تو اِس سے کہیں بہتر ہے اور کیا ہی خوب ہے خدا سے ڈرنے والوں کا گھر! ہمیشہ رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے، اُن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، اُن کے لیے وہاں سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ اللہ ڈرنے والوں کو اِسی طرح صلہ دے گا۔ اُن[٢٠] کو، جن کی روح فرشتے اِس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ پاک ہیں[٢١]۔ فرشتے کہیں گے: تم پر سلامتی ہو، جنت میں جا کر رہیے اپنے اعمال کے صلے میں۔ ٣٠-٣٢

کیا یہ اِسی کے منتظر ہیں کہ اِن کے پاس فرشتے آ پہنچیں یا تیرے پروردگار کا فیصلہ

ہے کہ جو آج اپنے غرور میں مست ہیں، وہ بھی اِسی حال کو پہنچیں گے۔

[١٩] یہ خاص طور پر اِس لیے فرمایا ہے کہ اُس وقت اِس کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی تھے جن کے لیے دنیا میں بھی غلبہ اور اقتدار لازمی تھا۔

[٢٠] یہ اللہ تعالیٰ نے کلام کو اُسی طرح مطابق حال کر دیا ہے، جس طرح آیت ٢٨ میں ہوا ہے۔

[٢١] اصل میں لفظ 'طَيِّبِيْنَ' آیا ہے۔ یہ 'ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ' کے مقابل میں ہے۔

كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا
اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ
بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ
مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ
كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ
فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ
فَسِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾

صادر ہو جائے؟ اِن سے پہلے والوں نے بھی یہی کیا تھا۔ (پھر جو کچھ ہوا، وہ) اللہ نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ وہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ سو اُن کے کرتوتوں کی سزائیں اُن کو ملیں اور جس چیز کا مذاق اڑا رہے تھے، اُسی نے اُن کو گھیر لیا۔ ۳۳-۳۴

یہ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اُس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے، نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ اُس کی ہدایت کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔ اِن سے پہلے والوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا تھا۔ سو رسولوں پر تو صاف صاف پہنچا دینے ہی کی ذمہ داری ہے۔ (چنانچہ دیکھ سکتے ہو کہ) ہم نے ہر قوم میں ایک رسول اِس دعوت کے ساتھ بھیجا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو اور شیطان سے بچو، پھر اُن میں سے کچھ کو اللہ نے ہدایت بخشی اور اُن میں کچھ ایسے بھی ہوئے جن پر

إِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ
يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾
وَأَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ۚ
بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ ۙ لِيُبَيِّنَ
لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾
إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنٰهُ أَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾

گم راہی مسلط ہوگئی۔ سو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ہے؟ ۳۵-۳۶

تم اگر اِن کی ہدایت کے حریص ہو تو اِس سے کیا حاصل کر لو گے، (اے پیغمبر)؟ اِس لیے کہ اللہ اُن کو ہدایت نہیں دیا کرتا جنھیں وہ (اپنے قانون کے مطابق) گم راہ کر دیتا ہے اور اُن کا کوئی مددگار بھی نہیں بن سکتا۔ ۳۷

یہ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے، اللہ اُس کو نہیں اٹھائے گا۔ کیوں نہیں، یہ اُس پر ایک وعدہ ہے جسے وہ لازماً پورا کرے گا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ یہ اِس لیے ہو گا کہ اللہ اِن کے سامنے اُس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور منکرین جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔ (یہ ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے)۔ ہم جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اُس کے بارے میں ہمارا اتنا ہی کہنا ہوتا ہے کہ ہم اُس کو کہتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے[۲۲]۔ ۳۸-۴۰

---

[۲۲] یعنی اُس طریقے کے مطابق ہو جاتی ہے جو اُس کے لیے طے کر دیا جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

(ہم کیوں نہیں اٹھائیں گے)؟ بلکہ جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہے، اِس کے بعد کہ اُن پر ظلم ڈھائے گئے، ہم اُن کو دنیا میں بھی لازماً اچھا ٹھکانا دیں گے[۲۳] اور آخرت کا اجر تو کہیں بڑھ کر ہے[۲۴]۔ اے کاش، یہ منکرین جانتے! اُنھی (ہجرت کرنے والوں) کو دیں گے جو ثابت قدم رہے اور جو اپنے پروردگار ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔ ۴۱-۴۲

---

[۲۳] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے دنیا میں بھی غلبہ و اقتدار لازمی تھا۔

[۲۴] آخرت کے بارے میں جو بات اوپر فرمائی ہے، یہ اُسی کو مطابق حال کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت نہیں ہو گی تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ اللہ اُن لوگوں کو جو اُس کی راہ میں ستائے گئے ہیں، اُن کی جان بازیوں کا صلہ نہیں دے گا اور تمھاری جفا کاریوں پر تم سے کوئی باز پرس نہ کرے گا؟ یہ کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ اِس سے ہجرت کی حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ہر نقل مکان ہجرت نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...ہجرت یہ ہے کہ آدمی اپنے دین کے معاملے میں ستایا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنا محبوب وطن اور اپنا عزیز آشیانہ چھوڑ کر وہاں سے نکلنے اور دوسری سرزمین کو اپنی پناہ گاہ بنانے پر مجبور ہو جائے۔ اِس راہ میں صبر کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ اُس کے سر پر آرے ہی کیوں نہ چل جائیں، لیکن دین حق کی جو نعمت اُس کو مل چکی ہے، وہ اُس سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ ہو اور ’توکل‘ کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں، لیکن وہ یہ اعتماد رکھے کہ اللہ اُس کو تنہا نہیں چھوڑے گا، بلکہ اُس کی دست گیری فرمائے گا۔ یہی صبر و توکل ہجرت کی راہ میں زاد راہ کی

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا
اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۙ ﴿۴۳﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَآ
اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

(اِنھیں اصرار ہے کہ اِن کے لیے فرشتے بھیجے جائیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے بھی ہم نے آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا، جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے۔ سو اگر تم لوگ نہیں جانتے تو اُن سے پوچھ لو جو (اِس سے پہلے) یاددہانی والے ہیں[۲۵]۔ ہم نے اُن کو دلائل کے ساتھ اور کتابیں دے کر بھیجا تھا اور اب یہ یاددہانی ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، اِس لیے کہ تم اِن لوگوں کے لیے اُس چیز کو بیان کر دو جو اِن کی طرف نازل کی گئی ہے اور اِس لیے کہ یہ غور کریں[۲۶]۔ ۴۳-۴۴

حیثیت رکھتے ہیں۔" (تدبر قرآن ۴/ ۴۱۲)

[۲۵] یعنی اہل کتاب سے، جو نبوت و رسالت کے باب میں خدا کے قانون کو خوب جانتے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہے کہ انسانوں کے اندر نبوت و رسالت کا منصب ہمیشہ انسانوں ہی کو دیا گیا ہے، اِس کے لیے فرشتے کبھی منتخب نہیں کیے گئے۔

[۲۶] یعنی اِس لیے اتاری ہے کہ بے کم و کاست اِن تک پہنچا دو اور یہ تدبر کے ساتھ اُس کا مطالعہ کریں تاکہ اُس کی روشنی میں اُن حقائق کو سمجھ سکیں جن کو سمجھانا خدا کے پیش نظر ہے۔ آیت میں 'لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فعل 'تُبَیِّنَ' بالکل اُسی طرح آیا ہے، جس طرح سورۂ رحمٰن (۵۵) کی آیت 'اَلرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ' میں لفظ 'عَلَّمَ' ہے۔ اِس سے شرح و وضاحت مراد نہیں ہے، جس طرح کہ 'عَلَّمَ' سے وہاں شرح و وضاحت کے ساتھ سکھانا، پڑھانا مراد نہیں ہے۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيۡنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنۡ يَّخۡسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ
الۡاَرۡضَ اَوۡ يَاۡتِيَهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ۙ﴿٤٥﴾ اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ
فِىۡ تَقَلُّبِهِمۡ فَمَا هُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ۙ﴿٤٦﴾ اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ
فَاِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿٤٧﴾
اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ
الۡيَمِيۡنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴿٤٨﴾ وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ

پھر کیا یہ لوگ جو بری تدبیریں کر رہے ہیں، اِس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ اِن کو زمین میں دھنسا دے یا اِن پر وہاں سے عذاب آجائے، جہاں سے اِنھیں گمان بھی نہ ہو یا اِن کو چلتے پھرتے پکڑ لے ـــــ (وہ ایسا کرنے پر آجائے) تو یہ اُس کو عاجز نہیں کر سکتے ـــــ یا اِن کو ایسی حالت میں پکڑ لے کہ یہ (خود بھی اُس کا) اندیشہ محسوس کر رہے ہوں؟ وہ اِنھیں مہلت دے رہا ہے، اِس لیے کہ تمھارا پروردگار بڑا ہی نرم خو ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۴۵-۴۷

اللہ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے، کیا یہ اُس کو نہیں دیکھتے کہ اُس کے سایے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے[۲۷] دائیں اور بائیں سے پلٹتے ہیں اور (جن کے یہ سایے ہیں)، اُن پر

---

[۲۷] ہر چیز کا سایہ زمین پر بچھا رہتا ہے۔ اِسی کو یہاں سجدے سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ اِس بات کا علامتی اظہار ہے کہ ہر چیز طوعاً و کرہاً خدا ہی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ آگے اِسی کی وضاحت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ سایے کا یہ سجدہ سورج کی بالکل مخالف سمت میں ہوتا ہے۔ سورج اگر پورب کی طرف ہے تو سایہ پچھّم کی طرف پھیلے گا اور اگر سورج پچھّم کی طرف ہے تو

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ
لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۴۹) يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۵۰) السجدة
وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ
فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۵۱) وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ
وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ (۵۲)

فروتنی طاری ہوتی ہے[۲۸]؟ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں جتنے جان دار ہیں، وہ سب خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور خدا کے فرشتے بھی، وہ کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا اُنھیں حکم دیا جاتا ہے۔ ۴۸-۵۰

اللہ نے فرمایا ہے کہ دو معبود نہ ٹھیراؤ، وہ ایک ہی معبود ہے، اِس لیے مجھی سے ڈرو۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے اور اُسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے۔ پھر کیا اللہ کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو[۲۹]؟ ۵۱-۵۲

سایے کا پھیلاو پورب کی طرف ہوگا۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے اِس حقیقت کی طرف کہ سایے کی فطرت ابراہیمی ہے۔ آفتاب پرستی سے اُس کو عار ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/۴۱۶)

[۲۸] یعنی عاجز و درماندہ، یہاں تک کہ اُن میں سے کوئی اگر خدا سے اکڑتا بھی ہے تو جس وقت اکڑتا ہے، حقیقت کی نگاہ سے دیکھیے تو عین اُسی وقت اپنے پورے وجود سے خدا کے سامنے جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اِس لیے کہ جس دائرے میں اُسے اختیار نہیں دیا گیا، اُس میں وہ ادنیٰ درجے میں بھی خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔

[۲۹] اوپر توحید کی تکوینی دلیل بیان ہوئی ہے۔ اُس کے بعد اب یہ اُسی کے حق میں خود خدا کی

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ
تَجْـَٔرُونَ ج (۵۳) ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ
يُشْرِكُونَ لا (۵۴) لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنٰهُمْ ط فَتَمَتَّعُوا قف فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ (۵۵)
وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ط تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ
عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ (۵۶)

تمھیں جو نعمت بھی ملی ہوئی ہے، اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب کوئی تکلیف تم کو پہنچتی ہے تو فریاد بھی اُسی سے کرتے ہو[۳۰]۔ پھر جب اللہ وہ تکلیف تم سے دور کر دیتا ہے تو اُسی وقت تم میں سے کچھ لوگ اپنے پروردگار کے شریک ٹھیرانے لگتے ہیں تاکہ جو نعمتیں ہم نے اِن لوگوں کو دی ہیں، اُن کی ناشکری کریں۔ سو چند دن عیش کر لو، پھر عنقریب تم جان لو گے۔ اور جن کے بارے میں اِنھیں کچھ علم نہیں ہے[۳۱]، یہ اُن کا حصہ بھی اُن چیزوں میں لگاتے ہیں جو ہم نے اِنھیں عطا کی ہیں[۳۲]۔ خدا کی قسم، جو افترا تم کر رہے ہو، اُس کی تم سے ضرور باز پرس ہونی ہے۔ ۵۳-۵۶

شہادت کا حوالہ دیا ہے جو اُس کے پیغمبروں اور اُس کی کتابوں کے ذریعے سے لوگوں کو پہنچی ہے۔

[۳۰] یہ توحید کی اَنفسی دلیل ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ دلیل ہے اِس بات کی کہ اصل فطرت کے اندر صرف ایک ہی خدا کا شعور ہے۔ یہ دوسرے دیوی دیوتا جو تم نے بنا رکھے ہیں، اصل فطرت کے اندر اِن کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ چنانچہ جب کسی حقیقی پریشانی کا وقت آتا ہے تو یہ سارے بناوٹی دیوی دیوتا غائب ہو جاتے ہیں، صرف ایک ہی خدا باقی رہ جاتا ہے جس کا اعتقاد اصل فطرت کے اندر ودیعت ہے۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۴۱۷)

[۳۱] یعنی دیوی دیوتا جن کے بارے میں یہ جو کچھ کہتے ہیں، بغیر کسی علم کے کہتے ہیں۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا
بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۚ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى
مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ
فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾

یہ اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھیراتے ہیں۔ سبحان اللہ، خدا کے لیے بیٹیاں اور اِن کے لیے جو یہ چاہیں۔ جب اِن میں سے کسی کو بیٹی کی خوش خبری دی جائے تو اُس کا چہرہ سیاہ پڑ جائے، وہ جی میں گھٹتا رہے، اُس کی عار کے مارے جس کی خوش خبری دی گئی، لوگوں سے چھپتا پھرے، سوچے کہ اُس کو ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اُس کو مٹی میں دبا دے ـــــ سنو، کیا ہی بُرا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں[۳۳]! (حقیقت یہ ہے کہ) بری تمثیل کے لائق تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کو نہیں مانتے۔ اللہ کے لیے تو سب سے برتر تمثیلیں ہیں[۳۴]۔ وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ ۵۷-۶۰

---

[۳۲] یہ اُس مقرر حصے کا ذکر ہے جو یہ لوگ اپنے دیوی دیوتاؤں کی نذر، نیاز اور بھینٹ کے لیے الگ نکال رکھتے تھے۔

[۳۳] مطلب یہ ہے کہ خدا کے لیے اولاد تجویز کرنا بجاے خود شدید جہالت ہے، مگر اِن کی بلادت کا یہ حال ہے کہ اُس چیز کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، جسے اپنے لیے اِس قدر ناپسندیدہ سمجھتے ہیں۔

[۳۴] خدا کے صفات و افعال کو سمجھانے کے لیے کوئی تمثیل بیان کی جائے تو اُسے اعلیٰ سے اعلیٰ ہونا چاہیے، اِس لیے کہ یہی اُس کے شایان شان ہے۔ یہ علم و نظر کی موت ہے کہ خدا اور بندوں

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ
وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾
وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ
لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿٦٢﴾

اگر اللہ لوگوں کے ظلم[۳۵] پر فوراً اُنھیں پکڑ لیتا تو زمین پر کسی جان دار کو نہ چھوڑتا، لیکن (اُس کا قاعدہ ہے کہ) وہ ایک مقرر وقت تک اُنھیں مہلت دیتا ہے۔ پھر جب اُن کا وہ مقرر وقت آ جائے گا تو وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۶۱

یہ اللہ کے لیے وہ چیزیں تجویز کر رہے ہیں جو خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے اور اِن کی زبانیں جھوٹ کہتی ہیں کہ اِن کے لیے (آگے بھی) بھلائی ہے[۳۶]۔ اِن کے لیے لازماً دوزخ ہے اور یہ اُسی میں پڑے چھوڑ دیے جائیں گے۔ ۶۲

کے تعلق کو بیٹوں اور بیٹیوں کے ذریعے سے سمجھا اور سمجھایا جائے۔ قرآن نے یہ اِسی نوعیت کی حماقتوں پر تبصرہ کیا ہے۔

[۳۵] اِس سے مراد وہی کفر و شرک ہے جس کا ذکر پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’ظُلم‘ کے اصل معنی حق تلفی کے ہیں۔ چونکہ شرک و کفر سب سے بڑی حق تلفی ہے، جس کا ارتکاب کر کے بندہ اپنے رب کے سب سے بڑے حق کو بھی تلف کرتا ہے اور خود اپنی جان پر بھی سب سے بڑا ظلم ڈھاتا ہے، اِس وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ کفر و شرک کو ظلم سے تعبیر کیا ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/ ۴۲۰)

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾
وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا
فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦٤﴾
وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ
اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ

خدا کی قسم، (اے پیغمبر)، ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں کی طرف رسول بھیجے تھے تو شیطان نے اُن کے اعمال بھی (اِسی طرح) اُنھیں اچھے کر کے دکھا دیے۔ سو اب وہی اُن کا ساتھی ہے اور اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ٦٣

(یہ نہیں مانتے تو اِس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے)۔ ہم نے یہ کتاب صرف اِس لیے تم پر اتاری ہے کہ اِس کے ذریعے سے تم وہ چیز اِن پر اچھی طرح واضح کر دو جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور اِس لیے کہ یہ اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہو[۳۷] جو اِس کو مان لیں۔ ٦٤

حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیا۔ اِس میں یقیناً اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانی

---

[۳٦] یہ بات، ظاہر ہے کہ وہ اُنھی دیویوں کے اعتماد پر کہتے تھے جنھیں وہ خدا کی بیٹیاں قرار دے کر پوجتے تھے۔

[۳۷] یعنی ہدایت آغاز کے لحاظ سے اور رحمت انجام کے لحاظ سے۔

نُسْقِيكُمْ مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا
لِّلشّٰرِبِينَ ﴿٦٦﴾ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ
سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ ﴿٦٧﴾

ہے جو سنتے ہیں۔ اور تمھارے لیے چوپایوں میں بھی یقیناً بڑا سبق ہے[۳۸]۔ ہم اُن کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے[۳۹] تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار ہے۔ اِسی طرح کھجور اور انگور کے پھلوں سے بھی۔ تم اُن سے نشے کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی[۴۰]۔ اِس میں یقیناً اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں[۴۱]۔ ۶۵-۶۷

---

[۳۸] اصل میں لفظ 'عِبْرَة' آیا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک پہنچ جانا۔ انسان، اگر غور کرے تو یہی عبرت اُس کے تمام علم کی کلید ہے۔

[۳۹] یعنی ایک طرف خون بنتا ہے، دوسری طرف گوبر، مگر اِنھی جانوروں کی مادینوں کے پیٹ سے ایک تیسری چیز بھی پیدا ہو جاتی ہے جس میں گوبر یا خون کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ ہر آلودگی سے بالکل پاک اور پینے والوں کے لیے نہایت لذیذ اور خوش گوار ہوتی ہے۔

[۴۰] اِس سے ضمناً یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ نشے کی چیزیں اچھی نہیں ہیں۔ یہ کھجور اور انگور اور اِس طرح کی دوسری چیزوں کا سوء استعمال ہے کہ انسان اُن سے عقل و دل کو ماؤف کر دینے والی چیزیں تیار کرے۔

[۴۱] یعنی توحید اور قیامت کی بڑی نشانی ہے۔ اِس لیے کہ اِن میں سے ایک ایک چیز زبان حال سے بتا رہی ہے کہ زمین و آسمان، دونوں میں ایک ہی حکیم و قدیر کا ارادہ کارفرما ہے۔ وہ جس طرح مردہ زمینوں کو پانی کے ایک چھینٹے سے حیات تازہ بخش دیتا ہے، اُسی طرح تمھارے مردوں

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا
وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ (۶۸) ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ
فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ

(تم دیکھتے نہیں ہو کہ)، تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی پر وحی کی[۴۲] کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور لوگ جو اونچی اونچی ٹٹیاں بنا لیتے ہیں، اُن میں چھتے بنا، پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس اور اپنے پروردگار کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ[۴۳]۔ اُس کے پیٹ سے ایک

کو بھی اٹھا کھڑا کرے گا۔ یہ اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اللہ نے اپنی نعمتوں میں یہ گونا گونی و بوقلمونی اِس لیے رکھی ہے کہ سوچنے والے سوچیں اور سمجھنے والے سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دنیا اپنی بقا کے لیے اِن تنوعات کی محتاج نہیں تھی، یہ بالکل سادہ اور یک رنگ، بلکہ بالکل بے رنگ بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اِس کے خالق نے یہ چاہا کہ یہ اُس کی صفات کا ایک پرتو اور مظہر ہو تا کہ غور کرنے والے غور کریں اور اِس کی ایک ایک چیز سے اِس کے خالق کی اعلیٰ صفات، اُس کی بے نہایت قدرت و حکمت، اُس کی غیر محدود رافت و رحمت، اُس کی بے مثال ربوبیت و پروردگاری اور اُس کی کامل وحدت و یکتائی کا کچھ تصور اور اُس کی روشنی میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کریں۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۴۲۸)

[۴۲] یہ لفظ یہاں اُس الہام فطرت کے لیے استعمال ہوا ہے جو ہر مخلوق کی پیدایش کے ساتھ ہی اُس میں کر دیا جاتا ہے۔ اِس سے وہ وحی مراد نہیں ہے جو انبیا علیہم السلام پر کی جاتی ہے۔

[۴۳] یہ اُس پورے نظام اور طریق کار کی طرف اشارہ ہے جس کے مطابق شہد کی مکھیاں لاکھوں برس سے کام کر رہی ہیں۔ یہ ایک حیرت انگیز نظام ہے۔ شہد کی مکھیاں ریاضیاتی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے انتہائی اعلیٰ معیار کا چھتا بناتی ہیں۔ پھر ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت پھولوں سے رس چوس کر لاتی ہیں، اُس کو چھتوں میں ذخیرہ کرتی ہیں، پھر شہد جیسی مفید اور نفیس اور لذیذ چیز

مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٦٩﴾

مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، اُس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ اِس کے اندر بھی یقیناً اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو غور کرتے ہیں[۴۴]۔ ۶۸-۶۹

پیدا کر دیتی ہیں۔ قرآن نے اِسی کو یہاں اپنے پروردگار کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتے رہنے سے تعبیر کیا ہے۔

[۴۴] اصل میں 'یَتَفَکَّرُوْنَ' کا لفظ آیا ہے۔ اِس سے پہلے اِسی مقصد سے 'یَسْمَعُوْنَ' اور 'یَعْقِلُوْنَ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی سنتے ہیں، عقل سے کام لیتے ہیں اور تدبر و تفکر کرتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”یہی صفتیں انسانیت کا اصلی جوہر ہیں اور اِن میں ایک حکیمانہ تدریج و ترتیب ہے۔
>
> اِس کائنات کے حقائق میں سے بے شمار حقائق ایسے ہیں جو بدیہیات فطرت کے حکم میں داخل ہیں۔ اُن کو سمجھنے کے لیے کسی بڑی کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک معقول انسان اول تو اُن کو خود سمجھتا ہے اور اگر خود نہیں سمجھتا ہے تو چونکہ معقول باتوں کے لیے اُس کے کان کھلے ہوئے ہوتے ہیں، اِس وجہ سے دوسرے کسی معقول آدمی کی زبان سے اُن کو سنتے ہی 'از دل خیزد بر دل ریزد' کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔
>
> دوسرا مرحلہ 'یَعْقِلُوْنَ' کا ہے جہاں سوچنے سمجھنے اور عقل سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے، جہاں مقدمات کی ایک ترتیب ہوتی ہے اور پھر اُن سے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ یہ مرحلہ پہلے مرحلہ سے اونچا ہے اور علم کی راہ میں اِس کے ثمرات بھی زیادہ وقیع ہیں، لیکن ہے یہ عام عقل کی دسترس کی چیز۔ جو لوگ اپنی عقل کی قدر کرتے اور اِس نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ اِس کی برکات سے محروم نہیں رہتے۔
>
> تیسرا مرحلہ 'یَتَفَکَّرُوْنَ' کا ہے۔ یہ سب سے اونچا مرحلہ ہے۔ یہ اُن لوگوں کا مقام ہے

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۣۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى
اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۷۰
وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ

اِسی طرح اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر وہی تم کو موت دیتا ہے۔ (تم میں سے کچھ پہلے رخصت ہو جاتے ہیں) اور تم میں سے کچھ ارذل عمر کو پہنچا دیے جاتے ہیں، اِس لیے کہ بہت کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانیں۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی جاننے والا ہے، وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۴۵]۔ ۷۰

(پھر یہ بھی دیکھو کہ) اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں برتری دے رکھی

جو اسرار کائنات میں برابر غور کرتے اور علم کے مدارج برابر طے کرتے رہتے ہیں۔ یہ حکما کا درجہ ہے۔ جس طرح شہد کی مکھی اپنی بے مثال کاوش سے طرح طرح کے پھولوں سے رس چوس کر شہد بناتی ہے جس میں لوگوں کے لیے غذا اور شفا ہے، اُسی طرح یہ لوگ اپنے تدبر و تفکر کی کاوشوں سے حکمت کا شہد جمع کرتے ہیں جس میں عقل و دل کے امراض کا مداوا ہوتا ہے۔ وہ خود بھی اُس سے آسودہ رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اُس سے فیض پہنچتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۴۲۹)

[۴۵] مطلب یہ ہے کہ مرتے تو سب ہیں، مگر سب کا وقت ایک نہیں ہے۔ کچھ بچپن میں مر جاتے ہیں، کچھ جوانی میں اور کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں قدرت ارذل عمر کو پہنچا کر یہ حقیقت ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ یہاں سارا علم اور ساری قدرت صرف خدا کے لیے ہے۔ انسان کو جو کچھ ملتا ہے، وہ اُسی کا عطیہ ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہو کہ جو اپنے آپ کو علم و عقل کا دیوتا سمجھتے ہیں، وہ بھی بالآخر علم، عقل اور طاقت ہر چیز سے عاری اور دوسروں کے محتاج ہو کر رہ جاتے ہیں اور اُن کے تمام کمالات اُسی پروردگار کی طرف لوٹ جاتے ہیں جو اُن کا دینے والا ہے۔ چنانچہ حق یہ ہے کہ وہی علیم و قدیر ہے۔

فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰی مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ؕ
اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ (۷۱)
وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ
اَزْوَاجِكُمْ بَنِیْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ
یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ یَكْفُرُوْنَ (۷۲) وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَیْـًٔا وَّلَا
یَسْتَطِیْعُوْنَ (۷۳)ۚ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ

ہے۔ پھر جن کو برتری دی گئی ہے، وہ اپنی روزی اپنے غلاموں کو نہیں دے دیتے کہ وہ اُس میں برابر ہو جائیں۔ (لیکن خدا کے بارے میں یہی سمجھتے ہیں کہ اُس نے اپنی خدائی دوسروں میں بانٹ دی ہے اور یہ اُنھی سے پاتے ہیں)۔ تو کیا یہ اللہ کی نعمت کا انکار کر رہے ہیں[۴۶]؟ ۷۱

(پھر یہ بھی دیکھو کہ) اللہ نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں اور تمھاری بیویوں سے تمھارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تمھیں کھانے کی پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں۔ پھر کیا یہ (سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کے منکر ہو گئے ہیں اور اللہ کے سوا اُن چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ آسمانوں سے اِن کے لیے کسی روزی پر کوئی اختیار رکھتی ہیں، نہ زمین سے اور نہ (اِس طرح کے کسی اختیار پر) دسترس پا سکتی ہیں[۴۷]؟ سو (اپنے اوپر قیاس کر کے تم) اللہ کے

---

[۴۶] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کی طرف منسوب کیا جائے اور اُن کا شکریہ اُن کو ادا کیا جائے تو یہ اُن نعمتوں کا صریح انکار ہے۔ قرآن میں یہ مضمون کئی مقامات

لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ
رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ
يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ
مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى

لیے مثالیں نہ بیان کرو۔[۴۸] حقیقت یہ ہے کہ (اپنی ذات و صفات کو) اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے ہو۔ ۷۲-۷۴

(تم مثالیں ہی سننی چاہتے ہو تو سنو)، اللہ ایک غلام کی مثال بیان کرتا ہے جو دوسرے کی ملکیت میں ہے، وہ کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا۔ اُس کے مقابل میں دوسرا ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنی طرف سے اچھی روزی عطا کر رکھی ہے، پھر وہ اُس میں سے کھلے اور چھپے، (جس طرح چاہتا ہے)، خرچ کرتا ہے۔ (بتاؤ)، کیا دونوں برابر ہوں گے؟ (پھر خدا اور اُس کے بے اختیار بندوں کو کس طرح برابر کر دیتے ہو؟ حق یہ ہے کہ) شکر کا سزاوار اللہ ہے، لیکن اِن کے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اللہ (اِسی حقیقت کی وضاحت کے لیے) ایک اور مثال بیان کرتا ہے۔ دو آدمی ہیں، اُن میں

پر آیا ہے۔

[۴۷] پیچھے فرمایا تھا کہ باطل کو مانتے ہیں۔ یہ اُسی کی تفصیل ہے۔

[۴۸] یعنی اللہ کو دنیا کے بادشاہوں اور راجوں اور مہاراجوں پر قیاس کر کے اُس کی اولاد اور مصاحبین اور مقربین نہ بناؤ کہ جن کی وساطت کے بغیر اُس کی بارگاہ میں کوئی شخص نہ رسائی حاصل کر سکتا ہے اور نہ اپنی عرض معروض کر سکتا ہے۔

مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ
يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾
وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ
الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾
وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ
وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

سے ایک گونگا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا اور اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ وہ اُس کو جہاں بھیجتا ہے، وہ کوئی چیز درست کر کے نہیں لاتا۔ کیا یہ گونگا اور وہ صاحب اختیار برابر ہوں گے جو انصاف کی تعلیم دیتا ہے اور خود بھی سیدھی راہ پر قائم ہے[۴۹]؟ ۷۵-۷۶

(اِنھیں اصرار ہے کہ قیامت آنی ہے تو اُس کا وقت بتایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ) زمین اور آسمانوں کا سارا غیب اللہ ہی کے اختیار میں ہے اور قیامت کا معاملہ تو اتنا ہی ہے، جیسے آنکھ جھپک جائے یا اُس سے بھی پہلے۔ (یہ اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے)، اِس لیے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۷۷

اور (دیکھو)، تم کو اللہ ہی نے تمھاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا، اُس وقت تم کچھ

---

[۴۹] یعنی ایک طرف خدا ہے، حکیم ناطق۔ دنیا کی ہدایت کے لیے اپنی کتابیں نازل کرتا ہے اور لوگوں کو عدل و انصاف کی تعلیم دیتا ہے۔ پھر یہی نہیں، خود بھی قائم بالقسط ہے اور جو کچھ کرتا ہے، کمال راستی اور صحت کے ساتھ کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ تمھارے ٹھیرائے ہوئے معبود ہیں، گونگے بہرے۔ نہ تمھاری پکار سن سکتے ہیں، نہ اُس کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ تمھارا کوئی کام بنا سکتے ہیں۔ بتاؤ، یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ دونوں کو یکساں سمجھ رہے ہو؟

اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمۡسِکُہُنَّ
اِلَّا اللّٰہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۹﴾ وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ
مِّنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَہَا

نہیں جانتے تھے۔ اُس نے تمھیں کان اور آنکھیں اور (سوچنے والے) دل دیے، اِس لیے کہ تم شکر کرو[۵۰]۔ ۷۸

کیا اِنھوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی فضا میں حکم کے پابند بنے ہوئے ہیں؟[۵۱] اُن کو صرف اللہ تھامے ہوئے ہے۔ یقیناً اِس میں اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو ایمان لانا چاہیں[۵۲]۔ (فضا میں اڑتے ہوئے اِن پرندوں کی طرح) تمھارے لیے تمھارے گھروں کا سکون بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ اُسی نے تمھارے لیے چوپایوں کی کھال

---

[۵۰] یعنی پیدا ہوئے تو صرف ایک مضغۂ گوشت تھے، ایسے بے خبر کہ کسی جانور کا بچہ بھی اتنا بے خبر نہیں ہوتا۔ مگر اللہ نے اِس کے بعد تم کو وہ تمام صلاحیتیں عطا کر دیں جن پر ناز کرتے ہو۔ یہ بے بہا نعمتیں اِس لیے دی گئی تھیں کہ خدا کے شکر گزار بندے بنو، لیکن تعجب ہے کہ تمھارے یہ کان، یہ آنکھیں اور یہ دل ہر چیز کے لیے کھلے ہیں، صرف خدا کی بات سننے اور اُس کی آیات کو دیکھنے اور صرف اُسی کے بیان کردہ حقائق پر غور کرنے کے لیے بند ہو گئے ہیں۔

[۵۱] یہ پرواز کے لیے پرندوں کی نہایت موزوں ساخت اور زمین کے اوپر ہوا کے اُس نظام کی طرف اشارہ ہے جس کے بغیر پرندوں کا اڑنا ممکن نہیں تھا۔

[۵۲] یعنی خدا کے علم و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی نشانیاں ہیں۔ اصل میں 'لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فعل ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

کے گھر بنائے ہیں[۵۳] جنھیں تم اپنے کوچ اور قیام کے وقت نہایت ہلکا پاتے ہو[۵۴]۔ اور اُن کی اون اور اُن کے رووٗں اور اُن کے بالوں سے (تمھارے لیے) گھروں کا سامان اور برتنے کی بہت سی چیزیں بنائی ہیں جن سے ایک وقت تک فائدہ اٹھاتے ہو۔ ۷۹-۸۰

اور اللہ ہی نے تمھارے لیے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سایے بنائے ہیں اور پہاڑوں میں تمھارے لیے پناہ گاہیں بنائی ہیں[۵۵] اور تمھارے لیے ایسے لباس بنائے ہیں جو تم کو (تمھارے ملک کی) گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بنائے ہیں جو تمھاری ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی میں تمھاری حفاظت کرتے ہیں۔ اِسی طرح اللہ تم پر اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تاکہ اُس کے فرماں بردار بنو[۵۶]۔ ۸۱

---

[۵۳] یہ چمڑے کے اُن خیموں کا ذکر ہے جن کا رواج عرب میں بہت رہا ہے۔

[۵۴] یعنی کوچ کرنا ہو تو نہایت آسانی کے ساتھ تہ کر کے اٹھا لے جاتے ہو اور قیام پیش نظر ہو تو اِسی طرح آسانی کے ساتھ، جہاں چاہتے ہو، ڈیرا ڈال دیتے ہو۔

[۵۵] یعنی غار جو زمین پر انسان کی اولین پناہ گاہ بنے ہیں۔

[۵۶] مطلب یہ ہے کہ ہر ہر پہلو سے تمھاری ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ اِس پورے سلسلۂ بیان میں جو چیزیں بھی مذکور ہوئی ہیں، اُن میں اہل عرب اور اُن کی بدویانہ زندگی کی

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ
ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾
وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ

اِس کے باوجود یہ لوگ اگر منہ موڑتے ہیں تو، (اے پیغمبر)، تم پر صاف صاف پہنچا دینے ہی کی ذمہ داری ہے۔ (اِس کا نتیجہ یہ خود بھگتیں گے، اِس لیے کہ) یہ (وہ لوگ ہیں جو) اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں، پھر اُن سے انجان بن جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن میں اکثر ناشکرے ہیں۔ ۸۲-۸۳

یہ اُس دن کو یاد رکھیں، جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ اٹھائیں گے۔[۵۷] پھر جن لوگوں نے انکار کیا ہوگا،[۵۸] اُنھیں نہ کوئی عذر پیش کرنے کی[۵۹] اجازت دی جائے گی اور نہ اُن سے یہ فرمایش ہوگی کہ وہ خدا کو راضی کرلیں۔[۶۰] اور جو اِس ظلم کے مرتکب ہوئے، وہ

رعایت ملحوظ ہے۔ اِس کلام کے اولین مخاطب وہی تھے۔ قرآن میں یہ چیز ایسے تمام مقامات پر پیش نظر رہنی چاہیے، اِس لیے کہ کلام کے حسن اور اُس کے اثر کا صحیح اندازہ اِسی سے ہوتا ہے۔

[۵۷] اِس سے وہ امتیں مراد ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجے تھے۔ یہی رسول قیامت کے دن اُن پر گواہی کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

[۵۸] یعنی رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جانتے بوجھتے انکار کیا ہوگا۔

[۵۹] جملے کا یہ حصہ آیت میں بربنائے قرینہ حذف کر دیا گیا ہے۔

[۶۰] اِس لیے کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اِس طرح کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمۡ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا
شُرَكَآءَهُمۡ قَالُوۡا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيۡنَ كُنَّا نَدۡعُوۡا مِنۡ
دُوۡنِكَ ۚ فَاَلۡقَوۡا اِلَيۡهِمُ الۡقَوۡلَ اِنَّكُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ﴿۸۶﴾ ۚ وَاَلۡقَوۡا اِلَى اللّٰهِ
يَوۡمَئِذِ ِۨ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۸۷﴾ اَلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا
وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ زِدۡنٰهُمۡ عَذَابًا فَوۡقَ الۡعَذَابِ بِمَا
كَانُوۡا يُفۡسِدُوۡنَ ﴿۸۸﴾

جب (ایک مرتبہ) عذاب کو دیکھ لیں گے تو وہ نہ اُن سے ہلکا ہو گا اور نہ اُنھیں مہلت دی جائے گی۔ اور یہ شرک کرنے والے (اُس دن)، جب اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو دیکھیں گے تو (اپنے جرم کا الزام اُنھی کو دیتے ہوئے) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار، یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنھیں ہم تجھ کو چھوڑ کر پکارتے رہے[۶۱]۔ اِس پر اُن کے وہ معبود اُن کی بات اُنھی پر پھینک ماریں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔ اُس دن وہ خدا کے آگے سپر ڈال دیں گے اور جو افترا وہ کرتے رہے تھے[۶۲]، وہ سب اُن سے ہوا ہو جائے گا۔ (پھر یہی نہیں)، جن لوگوں نے (خود بھی) انکار کیا اور (دوسروں کو بھی) خدا کی راہ سے روکتے رہے، اُن کے اِس فساد کی پاداش میں ہم اُن کے عذاب پر عذاب بڑھا دیں گے[۶۳]۔ ۸۴-۸۸

---

[۶۱] مشرکین یہ بات اپنے آپ کو بری ٹھیرانے کے لیے کہیں گے تاکہ اصلی مجرم اُنھی کو سمجھا جائے جن کے سبب سے وہ گم راہ ہوئے۔ آگے شرکا کے جواب میں جو تلخی ہے، اُس کا اصل رخ اِسی سے واضح ہوتا ہے۔

[۶۲] یہاں شرک کو افترا سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز کے لیے خدا کی کوئی سند نہ ہو، اُسے خدا سے منسوب کرنا صریح افتراء علی اللہ ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ
شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ
وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿٨٩﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ
وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ
وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٩٠﴾

یہ اُس دن کو یاد رکھیں، جس دن ہم ہر امت میں ایک گواہ خود اُنھی کے اندر سے اُن پر اٹھائیں گے اور تمھیں، (اے پیغمبر، تمھاری قوم کے) اِن لوگوں پر گواہی کے لیے لا کھڑا کریں گے۔ (اِس سے پہلے) یہ کتاب ہم نے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے تم پر نازل کر دی ہے، ہدایت و رحمت کے طور پر[۶۴] اور فرماں برداروں کی بشارت کے لیے۔ بے شک، اللہ (اِس میں) عدل اور احسان اور قرابت مندوں کو دیتے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور بے حیائی، برائی اور سرکشی سے روکتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو[۶۵]۔ ۸۹-۹۰

---

[۶۳] یعنی اُن کی گم راہی کی سزا بھی دیں گے اور جن کو گم راہ کرتے رہے، اُن کی گم راہی کا عذاب بھی اُنھیں پہنچائیں گے۔ چنانچہ گم راہوں کو جو عذاب ہو گا، اُس کا دگنا عذاب اُن لوگوں کو ملے گا جو گم راہی کی قیادت کرتے رہے۔

[۶۴] یعنی آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت کے طور پر۔

[۶۵] یہ عظیم آیت قرآن کے تمام اوامر و نواہی کا خلاصہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...قرآن جن باتوں کا حکم دیتا ہے، اُن کی بنیادیں بھی اِس میں واضح کر دی گئی ہیں اور جن چیزوں سے روکتا ہے، اُن کی اساسات کی طرف بھی اِس میں اشارہ ہے۔ تمام قرآنی اوامر کی

> بنیاد عدل، احسان اور ذوی القربیٰ کے لیے انفاق پر ہے اور اُس کی منہیات میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کے اندر فحشا، منکر اور بغی کی روح فساد پائی جاتی ہے۔ یہاں اِس کا حوالہ دینے سے مقصود اُن لوگوں کو متنبہ کرنا ہے جو قرآن کی مخالفت میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے تاکہ وہ سوچیں کہ جس چیز کی وہ مخالفت کر رہے ہیں، اُس کی تعلیم کیا ہے اور اُس کی مخالفت سے کس عدل و خیر کی مخالفت اور کس شر و فساد کی حمایت لازم آتی ہے؟'' (تدبر قرآن ۴/ ۴۳۸)

خیر و شر کی جو اساسات اِس آیت میں بیان ہوئی ہیں، وہ بالکل فطری ہیں۔ لہٰذا خدا کے دین میں بھی ہمیشہ مسلم رہی ہیں۔ تورات کے احکام عشرہ اِنھی پر مبنی ہیں اور قرآن نے بھی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اپنے تمام اخلاقی احکام میں اِنھی کی تفصیل کی ہے۔

پہلی چیز جس کا آیت میں حکم دیا گیا ہے، وہ عدل ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا جو حق واجب کسی پر عائد ہوتا ہے، اُسے بے کم و کاست اور بے لاگ طریقے سے ادا کر دیا جائے، خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقت ور اور خواہ ہم اُسے پسند کریں یا ناپسند۔

دوسری چیز احسان ہے۔ یہ عدل سے زائد ایک چیز اور تمام اخلاقیات کا جمال و کمال ہے۔ اِس سے مراد صرف یہ نہیں کہ حق ادا کر دیا جائے، بلکہ مزید براں یہ بھی ہے کہ ہم دوسروں سے باہمی مراعات اور فیاضی کا رویہ اختیار کریں۔ اُن کے حق سے اُنھیں کچھ زیادہ دیں اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس سے معاشرے میں محبت و مودت، ایثار و اخلاص، شکرگزاری، عالی ظرفی اور خیر خواہی کی قدریں نشوونما پاتی اور زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرتی ہیں۔

تیسری چیز قرابت مندوں کے لیے انفاق ہے۔ یہ احسان ہی کی ایک نہایت اہم فرع ہے اور اُس کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرابت مند صرف اِسی کے حق دار نہیں ہیں کہ اُن کے ساتھ عدل و انصاف کا رویہ اختیار کیا جائے، بلکہ اِس کے بھی حق دار ہیں کہ لوگ اپنے مال پر اُن کا حق تسلیم کریں، اُنھیں کسی حال میں بھوکا ننگا نہ چھوڑیں اور اپنے بال بچوں کے ساتھ اُن کی ضرورتیں بھی، جس حد تک ممکن ہو، فیاضی کے ساتھ پوری کرنے کی کوشش کریں۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ

تم بھی[66]، (اے اہل کتاب)، اللہ کے ساتھ (اپنے) عہد کو پورا کرو[67]، جب کہ تم اُسے

اِن کے مقابلے میں بھی تین ہی چیزیں ہیں جن سے اِس آیت میں روکا گیا ہے۔

پہلی چیز 'فَحْشَآء' ہے۔ اِس سے مراد زنا، اغلام اور اِن کے متعلقات ہیں۔

دوسری چیز 'مُنْکَر' ہے۔ یہ معروف کا ضد ہے۔ یعنی وہ برائیاں جنھیں انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور جن کی برائی ایسی کھلی ہوئی ہے کہ اِس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مذہب و ملت اور تہذیب و تمدن کی ہر اچھی روایت میں اُنھیں برا ہی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن نے ایک دوسرے مقام پر اِس کی جگہ 'اِثْم' کا لفظ استعمال کر کے واضح کر دیا ہے کہ اِس سے مراد یہاں وہ کام ہیں جن سے دوسروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں۔

تیسری چیز 'بَغْی' ہے۔ اِس کے معنی سرکشی اور تعدی کے ہیں۔ یعنی آدمی اپنی قوت، طاقت اور زور و اثر سے ناجائز فائدہ اٹھائے، حدود سے تجاوز کرے اور دوسروں کے حقوق پر، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے، دست درازی کرنے کی کوشش کرے۔

[66] یہاں سے خطاب میں التفات ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''اوپر آیت ۸۸ میں قریش کے اُن اشرار کا ذکر گزر چکا ہے جو اللہ کے دین سے لوگوں کو روکنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ اب اِس ضمن میں نام لیے بغیر یہود کو مخاطب کر لیا ہے، اِس لیے کہ اِس مرحلے میں اُنھوں نے بھی اپنے تمام مکر و فریب کے ساتھ اللہ کی راہ سے روکنے کی اِس مہم کی پشت پناہی شروع کر دی تھی۔'' (تدبر قرآن ۴/۴۴۱)

[67] یعنی اُس عہد کو جو موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی شریعت کی پابندی اور بنی اسمٰعیل میں پیدا ہونے والے نبی امی کی تائید و نصرت کا تم سے لیا تھا۔ تورات درحقیقت اِسی عہد کا بیان ہے۔ چنانچہ اِسی بنا پر اُس کو ''عہد نامہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

تَوۡكِيۡدِهَا وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ
مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۹۱﴾ وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّتِيۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ
اَنۡكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوۡنَ اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًاۢ بَيۡنَكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ اُمَّةٌ هِيَ
اَرۡبٰى مِنۡ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبۡلُوۡكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ

باندھ چکے ہو اور اپنی قسمیں اُن کے پختہ کر لینے کے بعد مت توڑو، جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ ٹھیرا چکے ہو۔ بے شک، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔[٦٨] تم اُس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت خوب مضبوط کاتا، پھر خود ہی اُسے تار تار ادھیڑ کے رکھ دیا۔[٦٩] تم اپنی قسموں کو اِس اندیشے سے آپس میں فریب کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک امت کہیں دوسری امت سے بڑھ نہ جائے۔[٧٠] خدا تو (اپنے) اِس (فیصلے) کے ذریعے

---

[٦٨] چنانچہ کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا کے ساتھ باندھے ہوئے کسی عہد کی جواب دہی سے اپنے آپ کو بچا لے جائے۔

[٦٩] مطلب یہ ہے کہ پہلے تم نے خدا سے عہد باندھا، پھر اُس کو اپنی قسموں سے خوب پختہ کیا، لیکن جب اُس کو پورا کرنے کا وقت آیا تو اُس کے ساتھ وہی کیا جو اگر کوئی عورت اپنا کاتا ہوا سوت خود ہی تار تار کر کے رکھ دے تو اپنے شب و روز کی محنت کے ساتھ کرے گی۔

اِس تمثیل میں لفظ 'الّتی' آیا ہے۔ یہ اگرچہ معرفہ کے لیے آتا ہے، لیکن تمثیلات میں معرفہ بعض اوقات صرف اِس لیے لایا جاتا ہے کہ صورت حال کو نگاہوں کے سامنے مصور کر دیا جائے۔ اِس سے کسی متعین بڑھیا کو مراد لینے کی ضرورت نہیں۔

[٧٠] آیت میں 'اَنْ' سے پہلے 'مخافة' یا اِس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ یہود جو کچھ کر رہے تھے، اُس کا اصل محرک یہی تھا کہ بنی اسمٰعیل جنھیں وہ امی کہتے تھے، کہیں امامت و سیادت اور

مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٩٢﴾
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ
وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔـلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾

سے تمھاری آزمایش کر رہا ہے۔ قیامت کے دن وہ ضرور اُس چیز کو تم پر اچھی طرح واضح کر دے گا جس میں اختلاف کر رہے ہو۔ ۹۱-۹۲

اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر (اُس نے تمھیں اختیار دیا ہے، اِس لیے اب) وہ جس کو چاہتا ہے، (اُس کے برے استعمال کی وجہ سے) گم راہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق)[۲۱] ہدایت بخشتا ہے۔ اور (اُس نے اپنی حجت تم پر پوری کر دی ہے تو) جو کچھ تم کر رہے ہو، اُس کے بارے میں ضرور تم سے پوچھا بھی جائے گا۔ ۹۳

دولت و اقتدار میں اُن سے بڑھ نہ جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اُنھوں نے اِسی بنا پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ 'دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ' کے الفاظ اُن کی اِنھی سرگرمیوں کے لیے آئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ یہود کی اُن مفسدانہ کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ اسلام کی طرف مائل لوگوں کو اسلام سے روکنے یا اسلام قبول کر لینے والوں کو متزلزل کرنے کے لیے صرف کر رہے تھے۔ یہ قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ یہ نیا دین سر تا سر خدائی دین کے خلاف ہے۔ ہمارے صحیفوں میں نہ اِس کی کوئی سند موجود ہے اور نہ ہمارے نبیوں نے اِس کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے۔ یہود کو چونکہ فی الجملہ مذہبی تقدس کی سند حاصل تھی، اِس وجہ سے اُن کی یہ قسمیں اُن لوگوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کرتی تھیں جو اُن کی چالوں اور اُن کے مخفی محرکات سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۴۴۲)

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا
وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ
هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

تم اپنی قسموں کو آپس میں فریب کا ذریعہ نہ بناؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے[2] اور تمھیں اِس جرم کی پاداش میں کہ تم نے (لوگوں کو) خدا کی راہ سے روکا ہے، عذاب کا مزہ چکھنا پڑے[3] اور (آخرت میں) تم ایک بڑے عذاب سے دوچار ہو جاؤ۔ تم اللہ کے عہد کو تھوڑی قیمت کے عوض نہ بیچو[4]۔ (خدا کے بندو)، اگر تم جانو تو جو کچھ خدا کے پاس ہے، وہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ ۹۴-۹۵

---

[1] یعنی اِس قانون کے مطابق کہ جو ہدایت کے سچے طالب ہوں گے، اُنھیں ہدایت ضرور ملے گی۔

[2] یعنی کسی شخص کے حق پر جمے ہوئے قدم اکھڑ جائیں اور وہ اسلام لانے کے بعد اُس سے برگشتہ ہو جائے۔

[3] اصل میں 'تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'سُوْٓءَ' سے مراد نتیجۂ سوء ہے۔ یہ فعل سے نتیجۂ فعل کو ظاہر کرنے کا اسلوب ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[4] اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر زیادہ قیمت مل جائے تو بیچ سکتے ہو۔ اِس میں نہی کا تعلق اصل فعل سے ہے۔ جملے میں اِس طرح کے قیود سے کسی چیز کی شناعت کو واضح کرنے کا یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی عام ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ کی آیتوں کے مقابلے میں اگر دنیا کے سارے خزانے بھی مل جائیں تو وہ ایک متاعِ حقیر ہی ہیں۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ

(یاد رکھو)، جو کچھ تمھارے پاس ہے، وہ (ایک دن) ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ باقی رہنے والا ہے۔ (یہ اعمال کا صلہ ہے) اور ہم اُن لوگوں کو جو (ہماری راہ میں) ثابت قدم رہے ہیں، اُن کے اعمال کے بدلے میں ضرور اُن کا بہترین صلہ دیں گے۔[۵] جو شخص بھی کوئی اچھا عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت[۶]، وہ اگر ایمان

---

[۵] یہ اُن اہل ایمان کی طرف اشارہ ہے جو اُس وقت معاندین کے نرغے میں طرح طرح کے روحانی اور جسمانی مصائب کے ہدف بنے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بشارت دی اور اُن کے مخالفین کو تنبیہ فرمائی ہے۔

[۶] اِس تصریح کی کیا ضرورت تھی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...اِس کا ایک خاص محل ہے۔ وہ یہ کہ اُس دور میں جس طرح مسلمان مرد اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنے کے لیے نہایت کڑے امتحانات سے گزر رہے تھے، اُسی طرح بہت سی خواتین بھی اپنا ایمان بچائے رکھنے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھیں اور اُن کا امتحان کمزور عنصر ہونے کے سبب سے مردوں کے امتحان سے بھی زیادہ سخت تھا۔ یہاں قرآن نے مردوں کے ساتھ خاص طور پر عورتوں کی تصریح کر کے اُن کی دل داری اور حوصلہ افزائی کر دی کہ اگر اُنھوں نے ایمان اور عمل صالح کی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لیا ہے تو اللہ تعالیٰ اُن کو ضرور پاکیزہ زندگی بسر کرائے گا۔ شیاطین اِس نعمت سے اُن کو محروم نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ اِس کا موقع اُن کو نہیں دے گا۔“ (تدبر قرآن ۴/۴۴۸)

اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٩٧)
فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (٩٨)
اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (٩٩)
اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ (١٠٠)

پر ہے تو ہم اُس کو (دنیا اور آخرت، دونوں میں) ایک پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے[٧٧] اور ایسے لوگوں کو اُن کے اعمال کے بدلے میں ضرور اُن کا بہترین صلہ دیں گے۔ ٩٦-٩٧

سو جب (اِن کے سامنے، اِنھیں خبردار کرنے کے لیے) تم قرآن پڑھو تو (پہلے) شیطان مردود سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو[٧٨]۔ (وہ لازماً وسوسہ اندازی کرے گا، مگر یاد رکھو)، اُس کا اُن لوگوں پر کچھ زور نہیں چلتا جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے پروردگار ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔ اُس کا زور تو اُنھی پر چلتا ہے جو اُس سے دوستی رکھتے اور اپنے پروردگار کے شریک ٹھیراتے ہیں۔ ٩٨-١٠٠

---

[٧٧] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ دنیا میں بھی قلب و ضمیر کی جو طمانیت و سکینت ایمان اور عمل صالح سے حاصل ہوتی ہے، وہ کسی فاسق و فاجر کو بڑی سے بڑی سلطنت کی بادشاہی سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

[٧٨] یہ قرآن کی دعوت پیش کرتے وقت تعوذ کی ہدایت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”اِس کی تاثیر آدمی کے دل کی حالت پر منحصر ہے۔ اگر آدمی محض زبان سے تعوذ کے الفاظ دہراتا ہے تو اِس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، لیکن جن کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے، وہ اِس سے ایک ایسی قوت و طاقت حاصل کرتے ہیں جو شیطان اور اُس کے اولیا سے نبرد آزمائی میں بڑا سہارا بنتی ہے۔ یہ نبرد آزمائی اُس امتحان کے مقتضیات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے اِس دنیا میں انسانوں کے لیے مقرر کر رکھا ہے، اِس وجہ سے اِس سے کسی حالت میں مفر نہیں

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ
اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ
مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٠٢﴾

(تم دیکھتے ہو کہ) جب ہم ایک آیت کو بدل کر اُس کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں[۷۹] ـــــ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ نازل کرتا ہے ـــــ تو یہ کہتے ہیں کہ (یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ) تم تو خود گھڑ لاتے ہو[۸۰] نہیں، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اِن میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں کہ اِس میں کیا حکمت پیش نظر ہوتی ہے۔ اِن سے کہہ دو، اِس کو تو روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ اتارا ہے[۸۱] تاکہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے[۸۲] اور اُن کے لیے یہ ہدایت اور بشارت ہو جو (خدا کے) فرماں بردار ہیں[۸۳]۔ ۱۰۱-۱۰۲

ہے۔ اِسی سے آدمی کی اپنی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ تعوذ کی یہ برکت ہے کہ اگر آدمی کو اِس کا سہارا حاصل ہو تو وہ شیطان اور اُس کے ایجنٹوں سے شکست نہیں کھاتا۔'' (تدبر قرآن ۴/۴۴۸)

[۷۹] یعنی تورات کے کسی حکم کو قرآن مجید میں کسی دوسرے حکم سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ اُن احکام کا حوالہ ہے جو آگے تحریم و تحلیل اور یوم السبت کے باب میں بیان ہوئے ہیں۔

[۸۰] اِس لیے کہ اگر تورات بھی خدا کی کتاب ہے اور تم اُس کو مانتے ہو تو اِس کے کیا معنی کہ خدا ایک مرتبہ قانون دے اور پھر اِس قانون کو خود ہی دوسرے قانون سے تبدیل کر دے؟

[۸۱] روح القدس سے جبریل امین مراد ہیں اور حق کے ساتھ اتارنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ خدا کی شریعت کو ٹھیک اُس صورت میں لے کر آیا ہے جو یہود و نصاریٰ اور مشرکین بنی اسمٰعیل کی تمام ملاوٹوں سے پاک اُس کی اصل صورت ہے۔

[۸۲] یعنی وہ دین کو اُس کی خالص اور بے آمیز صورت میں دیکھ کر مطمئن ہو جائیں کہ اُن کی

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ
يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

ہم اچھی طرح جانتے ہیں[۸۴] کہ یہ تمھارے متعلق کہتے ہیں کہ اِسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے۔ یہ جس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُس کی زبان عجمی ہے اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔[۸۵] حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے، اُنھیں اللہ کبھی صحیح بات تک پہنچنے کی توفیق نہیں دیتا اور (آگے بھی) اُن کے لیے دردناک سزا ہے۔

طرف حق نازل ہوا ہے اور اُن کے پاے استقلال میں کوئی لغزش نہ آنے پائے۔

۸۳؎ یعنی آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے بشارت ہو۔

۸۴؎ اصل میں 'وَلَقَدْ نَعْلَمُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ایک فعل ناقص عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے، یعنی 'وَلَقَدْ كُنَّا نَعْلَمُ'۔

۸۵؎ روایتوں میں مذکور ہے کہ مکہ میں کچھ عجمی غلام تھے۔ اُن میں سے زیادہ تر چونکہ یہودی یا نصرانی تھے، اِس لیے قریش نے محض یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ تورات و انجیل پڑھتے ہیں، اِن میں سے کسی ایک کے بارے میں بے تکلف یہ الزام گھڑ دیا کہ اِس قرآن کو در حقیقت وہی تصنیف کر رہا ہے۔ یہ قرآن نے اِس الزام کا جواب دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’...جواب کی تمہید ہی اِس طرح اٹھائی گئی ہے جس سے اِس اعتراض کی لغویت واضح ہو رہی ہے، اِس لیے کہ 'وَلَقَدْ نَعْلَمُ' کے اسلوب ہی میں یہ بات مضمر ہے کہ ہم برابر معترضین کی یہ بکواس سنتے رہے ہیں، لیکن اِس کی لغویت کے سبب سے ہم نے اِس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اِس کے بعد فرمایا کہ اگر اِن بوالفضولوں کو قرآن کے معانی و حقائق کی پرکھ نہیں ہے تو کم از کم اِس کے بیان کی سطوت و جلالت اور اِس کی زبان کی بے مثال فصاحت پر ہی غور کرتے تو اِن پر اپنے

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٠٥﴾
مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ
بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ
اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٦﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠٧﴾ اُولٰٓئِكَ

(ہمارے پیغمبر نے کوئی جھوٹ نہیں گھڑا، بلکہ) جھوٹ تو وہی لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیتوں کو مانتے نہیں ہیں اور وہی درحقیقت جھوٹے ہیں۔ ۱۰۳-۱۰۵

(ایمان والو، تم میں سے) جو اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ سے کفر کریں گے، اُنھیں اگر مجبور کیا گیا ہو اور اُن کا دل ایمان پر مطمئن ہو، تب تو کچھ مواخذہ نہیں، مگر جو کفر کے لیے سینہ کھول دیں گے، اُن پر اللہ کا غضب ہے اور اُنھیں بڑی سخت سزا ہوگی۔ یہ اِس لیے کہ اُنھوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو عزیز رکھا

اِس اعتراض کی لغویت واضح ہو جاتی کہ کہاں ایک کج مج بیان عجمی اور کہاں یہ حوض کوثر کی دھلی ہوئی عربی مبین۔ آخر ایسا کودن کون ہو سکتا ہے جو منہ کے اڑائے چھینٹوں اور آسمان کی بارش میں امتیاز نہ کر سکے؟

یہ بات علیٰ سبیل التنزل فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے معانی و حقائق تک تو اِن لوگوں سے پہنچنے کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی جن کو گہر اور پشیز میں امتیاز نہیں ہے، لیکن اِن کو اپنی طلاقت لسانی پر بڑا ناز ہے تو کم از کم اِس کی زبان ہی پر غور کرتے کہ ایک عجمی تو در کنار، خود اِن کے کسی شاعر یا خطیب کے بس میں بھی یہ نہیں ہے کہ اِس طرح کا کلام پیش کر سکے۔ یہاں تک

الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝١٠٨ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝١٠٩ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١١٠ يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ

اور اِس لیے کہ اِس طرح کے منکر لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔[۸۶] یہی لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے[۸۷] اور یہی ہیں جو (آخرت سے) غافل ہیں۔ لازم ہے[۸۸] کہ آخرت میں یہی خسارے میں ہوں گے۔ ۱۰۶-۱۰۹

پھر یہ بات بھی ہے کہ جنھوں نے ہجرت کی، اِس کے بعد کہ وہ آزمایشوں میں ڈالے گئے، پھر (اللہ کی راہ میں) جدوجہد کی اور ثابت قدمی دکھائی،[۸۹] تیرا پروردگار، اِس میں

کہ خود پیغمبر کے اپنے کلام اور اِس کلام میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔" (تدبر قرآن ۴/۴۵۱)

[۸۶] یعنی اُن کو ہدایت نہیں دیا کرتا جو ایمان و اسلام کی صداقت کو سمجھتے ہیں، مگر مشکلات سے گھبرا کر کفر ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔ اللہ اپنی ہدایت کی راہ اُنھی لوگوں کے لیے کھولتا ہے جو اِس طرح کے حالات میں اگر کبھی بے بس بھی ہو جائیں تو اِس سے آگے نہیں بڑھتے کہ زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکال دیں جو وقتی طور پر اُنھیں کسی مصیبت سے بچا لے۔

[۸۷] یعنی اُن کے اِس جرم کی پاداش میں مہر لگا دی ہے کہ اُنھوں نے اِس کے باوجود انکار کر دیا کہ اسلام کی صحت و صداقت اُن پر واضح تھی۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اُس سنت الٰہی کا اطلاق ہے جس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۷ کے تحت کر چکے ہیں۔

[۸۸] اصل میں 'لَا جَرَمَ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ 'لا بد' اور 'لا محالة' کے معنی میں کسی بات کی تاکید کے لیے آتا ہے، لیکن موقع کا تقاضا ہو تو اِس کے اندر قسم کا زور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ
لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا
رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ
الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ

کوئی شبہ نہیں کہ تیرا پروردگار (اُن کی) اِن سب باتوں کے بعد بڑا ہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۹۰] اُس دن، جب ہر شخص اپنی مدافعت میں بولتا ہوا آئے گا اور ہر شخص کو پورا پورا وہی بدلہ ملے گا جو اُس نے کیا ہوگا اور لوگوں کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہوگا۔ ۱۱۰-۱۱۱

(قریش کے لوگو)، اللہ (تمھارے لیے) اُس بستی کی مثال پیش کرتا ہے[۹۱] جو امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اُس کا رزق اُس کو ہر طرف سے فراغت کے ساتھ پہنچ رہا تھا۔ پھر اُس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی، تب اللہ نے اُس کے باشندوں کے کرتوتوں کی پاداش میں اُس کو بھوک کا مزہ چکھایا اور خوف کا لباس پہنا دیا۔[۹۲] اُن کے

---

[۸۹] یہ مہاجرین حبشہ کی طرف اشارہ ہے اور اللہ کی راہ میں جدوجہد سے اُن کی وہ جاں بازیاں مراد ہیں جو اُنھوں نے دین پر استقامت کے معاملے میں دکھائیں۔

[۹۰] یعنی اُن سے اگر کوئی لغزش یا فروگذاشت ہوئی بھی ہے تو اِن اعمال کے صلے میں اللہ اُسے معاف کر دے گا اور اُنھیں اپنی رحمت سے نوازے گا۔

[۹۱] یہ ہر اُس بستی کی مثال ہے جس کی طرف کسی رسول کی بعثت ہوئی۔ قریش کے لیے اِس کا سب سے نمایاں مصداق وہ بستیاں تھیں جن کی تباہی کی داستانیں اُن کے ہاں ضرب المثل بن چکی تھیں۔

[۹۲] اصل الفاظ ہیں: ’فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ‘۔ اِس میں عربیت کے

مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ
اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ
وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ

پاس اُنھی میں سے ایک رسول آیا تھا تو اُنھوں نے اُسے جھٹلا دیا۔ پھر اُنھیں عذاب نے پکڑ لیا اور وہ اپنی جانوں پر خود ظلم ڈھانے والے تھے[۹۳]۔ ۱۱۲-۱۱۳

سو (اُن کے اِس انجام سے سبق لو اور) اللہ نے جو حلال اور پاکیزہ چیزیں تمھیں دے رکھی ہیں، اُنھیں کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو[۹۴]، اگر تم اُسی کی پرستش کرتے ہو[۹۵]۔ اُس نے تو تم پر صرف مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ

اسلوب پر جملے کے کچھ حصے حذف ہو گئے ہیں، اُنھیں کھول دیجیے تو پوری بات اِس طرح ہو گی: 'فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ طُعْمَ الْجُوْعِ وَاَلْبَسَهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ'۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۹۳] مطلب یہ ہے کہ ہم نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اُن کے ساتھ یہ جو کچھ ہوا، خود اُنھی کا ظلم تھا جو اُنھوں نے اپنے اوپر کیا تھا۔

[۹۴] یعنی کسی حلال اور پاکیزہ چیز کو اپنے مشرکانہ اوہام کے تحت حرام نہ ٹھیراؤ۔ یہ کفران نعمت ہے اور اہل سبا اِسی کے مرتکب ہو کر اُس انجام کو پہنچے تھے جس کا ذکر پیچھے ہوا ہے۔

[۹۵] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ تمام مشرکانہ خرافات میں مبتلا ہونے کے باوجود قریش مکہ کا دعویٰ یہی تھا کہ وہ خدا ہی کی پرستش کرتے ہیں اور بتوں کو صرف اِس لیے پوجتے ہیں کہ وہ اُنھیں خدا کے قریب کر دیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اُن کا زعم یہ تھا کہ یہ خدا کے مقرب اور چہیتے ہیں۔ اگر یہ راضی رہیں تو خدا سے سفارش

وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (١١٥) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ
اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ

حرام ٹھیرایا ہے۔[٩٦] اِس پر بھی جو مجبور ہو جائے، اِس طرح کہ نہ چاہنے والا ہو، نہ حد سے بڑھنے والا[٩٧] تو اُس پر کچھ گناہ نہیں، اِس لیے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ تم اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے

کر کے اپنے پرستاروں کو جو چاہیں، دلوا سکتے ہیں۔ اِسی زعم کے تحت وہ اُن کو نذرانے اور چڑھاوے پیش کرتے اور اُن کے نام پر جانور چھوڑتے جن کو تقدس کا یہ درجہ حاصل ہو جاتا کہ نہ اُن کا دودھ اور گوشت کھانا جائز ہوتا اور نہ اُن پر سواری کی جا سکتی۔ قرآن نے اُن کے اِسی مغالطے کو یہاں رفع کیا ہے کہ اگر خدا ہی کی پرستش کا دعویٰ ہے تو اُس کی نعمتوں پر اُسی کا شکر ادا کرو۔ اُس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو نہ دوسروں کی طرف منسوب کرو، نہ اُن کے لیے اُن کی قربانی پیش کرو، نہ اُن کے نام پر اُن کو حرام و حلال ٹھیراؤ۔'' (تدبر قرآن ۴/۴۵۹)

٩٦ یعنی اُن چیزوں میں سے جنھیں کھانے والے من جملہ طیبات سمجھ کر کھا سکتے تھے، یہی چار چیزیں حرام ٹھیرائی ہیں۔ خون کو اِس لیے کہ درندگی کی طرف مائل کرتا ہے، مردار کو اِس لیے کہ طبعی موت مرنے سے خون رگوں ہی میں رہ جاتا ہے، سؤر کو اِس لیے کہ اگرچہ انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، مگر درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے اور ذبیحہ لغیر اللہ کو اِس لیے کہ یہ صریح شرک ہے جس کا ارتکاب وہی کر سکتے ہیں جو خدا سے سرکش ہو گئے ہوں۔ رہے خبائث تو اُن کے لیے کسی تعیین و تصریح کی ضرورت نہیں ہے، اِس لیے کہ وہ ممنوعات فطرت ہیں اور انسان ہمیشہ سے جانتا ہے کہ اُن سے اُس کو اجتناب کرنا ہے۔

٩٧ اصل الفاظ ہیں: 'غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ'۔ اِن میں 'بَاغٍ' 'بغی یبغی' سے اسم فاعل ہے۔ اِس پر 'عَادٍ' کے عطف سے واضح ہے کہ اِس کے معنی یہاں چاہنے اور طلب کرنے ہی کے ہیں۔ یہ اُس حالت اضطرار کے لیے رخصت ہے جو کھانے کی کوئی چیز میسر نہ ہونے سے پیدا ہوتی

الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ؕ
مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾
وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ
وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾
ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ

اور یہ حرام ہے کہ اِس طرح اللہ پر جھوٹ باندھنے لگو۔ یاد رکھو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں گے، وہ ہرگز فلاح نہ پائیں گے۔ یہ چند روزہ عیش ہے اور (اِس کے بعد) ایک دردناک عذاب اُن کا منتظر ہے۔ ۱۱۶-۱۱۷

اور جو یہودی ہیں، اُن پر بھی ہم نے وہی چیزیں حرام کی تھیں جو (اوپر) اِس سے پہلے ہم تمھیں بتا چکے ہیں۔ (اِس کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ) ہم نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے ہیں[۹۸]۔ ۱۱۸

پھر اُن کے لیے جو جذبات سے مغلوب ہو کر برائی کر بیٹھیں[۹۹]، پھر اُس کے بعد توبہ

ہے۔

[۹۸] اشارہ ہے اُن چیزوں کی طرف جو یہود کو اُن کی سرکشی کی سزا دینے کے لیے اُن پر حرام کی گئیں، اِس لیے کہ اُنھوں نے خدا اور اُس کے احکام سے بے پروا ہو کر یہ چیزیں اپنے جی سے اپنے اوپر حرام کر لی تھیں۔ چنانچہ خدا نے بھی اُن کے اوپر اِنھیں حرام ٹھیرا دیا۔

[۹۹] اصل میں لفظ 'جَهَالَة' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی اگرچہ نہ جاننے کے بھی آتے ہیں، لیکن اِس کا غالب استعمال جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی شرارت یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں یہ لفظ عام طور پر علم کے بجائے حلم کے ضد کے طور پر آتا ہے۔

ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٩﴾
اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ۙ ﴿١٢٠﴾ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٢١﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو اِس کے بعد، (اے پیغمبر)، تیرا پروردگار، اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ تیرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۱۰۰]۔ ۱۱۹

(اپنے اوہام کو یہ ابراہیم کی طرف منسوب نہ کریں)، حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم (اپنی جگہ) ایک الگ امت تھا[۱۰۱]، اللہ کا فرماں بردار اور یک سو اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ وہ اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا[۱۰۲]۔ اللہ نے اُس کو برگزیدہ کیا اور اُس کی رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی تھی۔ ہم نے اُس کو دنیا میں بھی بھلائی عطا

یہاں بھی قرینہ دلیل ہے کہ یہ اِسی معنی میں آیا ہے۔

[۱۰۰] اوپر کی تنبیہات کے بعد توبہ و اصلاح کی یہ دعوت جس اسلوب میں دی گئی ہے، اُس کی بلاغت کو ہر صاحب ذوق محسوس کر سکتا ہے۔

[۱۰۱] مطلب یہ ہے کہ نہ وہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ اِن سے الگ اپنی ایک خاص حیثیت رکھتا تھا اور محض ایک فرد نہیں، بلکہ ایک ایسی شخصیت تھا جس سے خدا کے دین کی عالمی شہادت کے لیے ایک عظیم امت وجود میں آئی۔

[۱۰۲] چنانچہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کفران نعمت کا مرتکب ہو اور خدا کے پیدا کیے ہوئے جانوروں کو اصنام و انصاب کی طرف منسوب کر کے اُن کی تحلیل و تحریم کے فیصلے کرے، جس طرح کہ تم کر رہے ہو۔

لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

کی[۱۰۳] اور آخرت میں بھی وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔ پھر (یہی وجہ ہے کہ) ہم نے تمھاری طرف وحی کی کہ اِسی ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو،[۱۰۴] جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ ۱۲۰-۱۲۳

---

[۱۰۳] یہ اُس مال و جاہ اور شوکت و حشمت کی طرف اشارہ ہے جو اُنھیں بابل سے ہجرت کے بعد اِسی دنیا میں حاصل ہوئی اور اُن کی اولاد کے لیے ممکن ہوگیا کہ وہ بتدریج اُس علاقے کی مالک بن جائے جس میں اُنھوں نے اُسے آباد کیا تھا۔

[۱۰۴] یعنی دین کو ٹھیک اُس طریقے پر قائم کر دو، جہاں ابراہیم علیہ السلام نے اُسے چھوڑا تھا۔ چنانچہ تمھارے عقائد و اعمال میں نہ شرک کا کوئی شائبہ ہونا چاہیے اور نہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کی بدعتوں کا۔ تم نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے تمام دینی اعمال اور رسوم و آداب کو ہر آمیزش سے پاک کر کے بالکل اُسی صورت میں جاری کرو، جس طرح وہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں انجام دیے جاتے تھے۔ حلال و حرام کے معاملے میں بھی ہر چیز ٹھیک اپنی اصل پر آجانی چاہیے اور ہر شخص پر واضح ہو جانا چاہیے کہ ملت ابراہیم کے پیرو درحقیقت تمھی ہو، تمھارے مخالفین کا ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی ملت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ دین کا جو حصہ اِس وقت سنت کہلاتا ہے، وہ اِسی حکم کے تحت جاری کیا گیا ہے، لہٰذا اُسی طرح واجب الاطاعت ہے، جس طرح قرآن کی دوسری ہدایات واجب الاطاعت ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اِس کی تجدید و اصلاح اور اِس میں بعض اضافوں کے ساتھ اِس کے جو احکام مسلمانوں کے اجماع اور تواتر سے منتقل ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ نماز۔ ۲۔ زکوٰۃ اور صدقۂ فطر۔ ۳۔ روزہ و اعتکاف۔ ۴۔ حج و عمرہ۔ ۵۔ قربانی اور ایام تشریق کی تکبیریں۔ ۶۔ نکاح و طلاق اور اُن کے متعلقات۔ ۷۔ حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ
لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾
اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ

(سبت کی سختی کا بھی ابراہیم سے کوئی تعلق نہیں ہے)۔ یہ سبت تو درحقیقت اُنھی لوگوں پر عائد کیا گیا تھا[۱۰۵] جنھوں نے (اپنی موشگافیوں سے) اِس میں اختلافات پیدا کر لیے۔ تیرا پروردگار یقیناً قیامت کے دن اُن کے درمیان اُن سب چیزوں کے بارے میں فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ ۱۲۴

تم، (اے پیغمبر)، اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیتے رہو حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے ساتھ، اور اِن کے ساتھ اُس طریقے سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے۔ یقیناً تیرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور

اجتناب۔ ۸۔ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت۔ ۹۔ اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔ ۱۰۔ اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ ۱۱۔ ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اُس کا جواب۔ ۱۲۔ چھینک آنے پر 'الحمد للہ' اور اُس کے جواب میں 'یرحمک اللہ'۔ ۱۳۔ مونچھیں پست رکھنا۔ ۱۴۔ زیر ناف کے بال کاٹنا۔ ۱۵۔ بغل کے بال صاف کرنا۔ ۱۶۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ ۱۷۔ لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ ۱۸۔ ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ ۱۹۔ استنجا۔ ۲۰۔ حیض و نفاس کے بعد غسل۔ ۲۱۔ غسل جنابت۔ ۲۲۔ میت کا غسل۔ ۲۳۔ تجہیز و تکفین۔ ۲۴۔ تدفین۔ ۲۵۔ عید الفطر۔ ۲۶۔ عید الاضحیٰ۔

[۱۰۵] یعنی یہود پر جنھوں نے اپنے اختلافات سے اِس دن کی حرمت برباد کی اور اللہ تعالیٰ نے اِس کے نتیجے میں سبت کے احکام اُن کے لیے سخت سے سخت تر کر دیے۔ اِس کی تفصیلات، اگر

اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾ وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ
بِهٖ ؕ وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ
اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِىۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

وہ اُن کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پانے والے ہیں۔ اگر تم لوگ (کسی وقت) بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمھارے ساتھ کیا گیا ہے، لیکن اگر صبر کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہت ہی بہتر ہے[۱۰۶]۔ (اے پیغمبر)، صبر کرو[۱۰۷] ــــــ اور تمھیں یہ صبر خدا کے تعلق ہی

کوئی شخص چاہے تو بائیبل میں خروج، گنتی، یرمیاہ اور حزقی ایل کی کتابوں میں دیکھ سکتا ہے۔

[۱۰۶] دعوت دین کے لیے یہی چیزیں لائحۂ عمل کی اساس ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا جو حکم اِن آیتوں میں بیان ہوا ہے، وہ درج ذیل نکات پر مبنی ہے:

ایک یہ کہ دعوت ہمیشہ حکمت و موعظت اور مجادلۂ احسن کے اسلوب میں پیش کرنی چاہیے۔ حکمت سے مراد اِن آیات میں دلائل و براہین ہیں اور موعظت حسنہ سے دردمندانہ تذکیر و نصیحت۔ مدعا یہ ہے کہ داعی جو بات کہے، وہ دلیل و برہان اور علم و عقل کی روشنی میں کہے اور اُس کا انداز چڑھ دوڑنے اور دھونس جمانے کا نہیں، بلکہ خیر خواہی اور شفقت و محبت کے ساتھ توجہ دلانے کا ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ بحث و مباحثہ کی نوبت بھی اگر آ جائے تو اُس کے لیے پسندیدہ طریقے اختیار کیے جائیں اور اِس کے جواب میں حریف اشتعال انگیزی پر اتر آئے تو اُس کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بجائے داعی حق ہمیشہ مہذب اور شایستہ ہی رہے۔

دوسرے یہ کہ داعی کی ذمہ داری صرف دعوت تک محدود ہے، یعنی بات پہنچا دی جائے، حق کو ہر پہلو سے واضح کر دیا جائے اور ترغیب و تلقین میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ اُس نے اگر اپنا یہ فرض صحیح طریقے سے ادا کر دیا تو وہ اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہوا۔ لوگوں کی ہدایت و ضلالت کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ وہ اُن کو بھی جانتا ہے جو اُس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اُن کو بھی جو ہدایت پانے والے ہیں۔ لہٰذا ہر ایک کے ساتھ وہی

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

سے حاصل ہو سکتا ہے[۱۰۸] —— اور تم اِن پر غم نہ کرو اور جو چالیں یہ چل رہے ہیں، اُن سے دل تنگ نہ ہو۔ بے شک، اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں[۱۰۹]۔ ۱۲۵-۱۲۸

معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ داعی کو نہ داروغہ بننا چاہیے، نہ اپنے مخاطبین کے لیے جنت اور جہنم کے فیصلے صادر کرنے چاہییں۔ یہ سب معاملات اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں۔ داعی حق کی ذمہ داری صرف ابلاغ ہے۔ اُسے چاہیے کہ اپنی اِس ذمہ داری سے وہ ہرگز کوئی تجاوز نہ کرے۔

تیسرے یہ کہ دعوت کے مخاطبین اگر ظلم و زیادتی اور ایذا رسانی پر اتر آئیں تو داعی کو اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے اتنا بدلہ لینے کا حق ہے جتنی تکلیف اُسے پہنچائی گئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ صبر سے کام لیا جائے۔ اِس صبر کے معنی یہ ہیں کہ حق کے داعی ہر اذیت برداشت کر لیں، لیکن نہ انتقام کے لیے کوئی اقدام کریں، نہ مصیبتوں اور تکلیفوں سے گھبرا کر اپنے موقف میں کوئی ترمیم و تغیر کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اِس موقع پر صبر کرنے والوں کے لیے بڑی نعمت کا وعدہ ہے۔ اِس کا نتیجہ دنیا میں بھی اُن کے لیے بہترین صورت میں ظاہر ہوگا اور قیامت میں بھی خدا نے چاہا تو وہ اِس کے بہترین نتائج دیکھیں گے۔

[۱۰۷] یہ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن سیاق سے واضح ہے کہ آپ کے واسطے سے یہ تمام مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے۔

[۱۰۸] یہ صبر کی ہدایت کے ساتھ صبر حاصل کرنے کی تدبیر بھی بتا دی ہے کہ اِس کے لیے اپنا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہیے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے کہ اِس کا ذریعہ خدا کا ذکر ہے اور ذکر کا سب سے اعلیٰ طریقہ نماز ہے۔ قرآن میں نماز تہجد کے اہتمام کی تاکید اِسی مقصد سے فرمائی گئی ہے۔

[۱۰۹] یعنی ہر کام اِس طرح کرتے ہیں کہ اُس کے دوران میں اپنے آپ کو خدا کے حضور میں

سورة بنی اسرائیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ
اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ہر عیب سے پاک ہے[۱۱۰] وہ ذات جو اپنے بندے کو[۱۱۱] ایک رات مسجد حرام سے اُس دور کی مسجد[۱۱۲] تک لے گئی جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے[۱۱۳] تاکہ اُس کو ہم اپنی کچھ

سمجھتے ہیں۔

[۱۱۰] اصل میں لفظ 'سُبۡحٰن' ہے۔ یہ تنزیہہ کا کلمہ ہے جو خدا کے باب میں کسی سوءِ ظن یا غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے آتا ہے۔

[۱۱۱] آیت میں لفظ 'عَبۡدِہٖ' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِس موقع پر حضور کے لیے اِس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور کے غایت درجہ اختصاص، آپ کے ساتھ اللہ کی غایت درجہ محبت اور آپ کی کمال درجہ عبدیت کی دلیل ہے۔ گویا آپ کی ذات کسی اور تعریف و تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ لفظ 'عَبۡد' نے خود انگلی اٹھا کر ساری خدائی میں سے اُس کو ممیّز کر دیا جو اِس لفظ کا حقیقی محمل و مصداق ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۴۷۴)

[۱۱۲] اِس سے یروشلم کی مسجد مراد ہے جسے بیت المقدس کہا جاتا ہے۔ یہ حرم مکہ سے کم و بیش ۴۰ دن کی مسافت پر تھی۔ اِس کا تعارف اِسی بنا پر 'الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا'، یعنی دور کی مسجد کے الفاظ سے کرایا ہے تاکہ مخاطبین کا ذہن آسانی سے اِس کی طرف منتقل ہو سکے۔

اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①

نشانیاں دکھائیں[۱۱۴]۔ بے شک، وہی سمیع و بصیر ہے[۱۱۵]۔ ۱

---

۱۱۳ اصل الفاظ ہیں: 'اَلَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ'۔ ابراہیم علیہ السلام کی بابل سے ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو مقامات کا انتخاب کیا، جہاں خود اُس کے حکم سے دو مسجدیں تعمیر کی گئیں اور اُنھیں پورے عالم کے لیے توحید کی دعوت کا مرکز بنا دیا گیا۔ ایک سرزمین عرب اور دوسرے فلسطین۔ اِن میں سے پہلا مقام وادی غیر ذی زرع اور دوسرا انتہائی زرخیز ہے۔ قدیم صحیفوں میں اِسی بنا پر اُسے دودھ اور شہد کی سرزمین کہا گیا ہے۔ 'اَلَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ' کے الفاظ سے قرآن نے اِسی طرف اشارہ کیا ہے اور اِس طرح بالکل متعین کر دیا ہے کہ دور کی جس مسجد کا ذکر ہو رہا ہے، وہ یروشلم کی مسجد ہے۔ فرمایا کہ خدا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے اُس دور کی مسجد تک لے گیا۔ یہ لے جانا کس طرح ہوا؟ قرآن نے آگے اِسی سورہ کی آیت ۶۰ میں بتا دیا ہے کہ یہ ایک رؤیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ جس مقصد سے اختیار کیا، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...رؤیا کا مشاہدہ چشم سر کے مشاہدے سے زیادہ قطعی، زیادہ وسیع اور اُس سے ہزارہا درجہ عمیق اور دوررس ہوتا ہے۔ آنکھ کو مغالطہ پیش آ سکتا ہے، لیکن رویاے صادقہ مغالطے سے پاک ہوتی ہے؛ آنکھ ایک محدود دائرے ہی میں دیکھ سکتی ہے، لیکن رؤیا بہ یک وقت نہایت وسیع دائرے پر محیط ہو جاتی ہے؛ آنکھ حقائق و معانی کے مشاہدے سے قاصر ہے، اُس کی رسائی مرئیات ہی تک محدود ہے، لیکن رؤیا معانی و حقائق اور انوار و تجلیات کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۴۷۶)

۱۱۴ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ حرم مکہ کے ساتھ اب فلسطین کی سرزمین اور اُس کی امانت بھی بنی اسمٰعیل کے سپرد کر دی جائے گی۔ تاہم اِن نشانیوں کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی، اِس لیے کہ نہ الفاظ اِس تفصیل کے متحمل ہو سکتے ہیں اور نہ وہ ہمارے علم و عقل اور تصورات کی گرفت میں آ سکتی ہیں۔

آیت میں یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ اوپر کی بات غائب کے صیغے سے بیان ہوئی ہے اور

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ② ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ

(سو اُن کا عہد تمام ہوا جو اِس دور کی مسجد کے نگہبان بنائے گئے تھے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ) ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی[۱۱۶] اور اُس کو (اُنھی) بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا، اِس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بناؤ،[۱۱۷] اے اُن لوگوں کی اولاد جنھیں

یہاں متکلم کا صیغہ آ گیا ہے۔ اِس میں اسلوب بیان کی یہ بلاغت ہے کہ متکلم کا صیغہ التفات خاص کو ظاہر کر رہا ہے، جب کہ اوپر تفخیم شان مقصود تھی جسے غائب کے صیغے سے ظاہر فرمایا ہے۔

۱۱۵ آیت کے شروع میں لفظ 'سُبْحٰن' جس پہلو سے آیا ہے، یہ صفات اُس کی وضاحت کر رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی سمیع و بصیر ہے تو یہ اُسی کا کام تھا کہ اُن بدعہدوں کا محاسبہ کرے جنھوں نے، سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں، اُس کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا ڈالا ہے۔ بنی اسرائیل اِس گھر میں جو کچھ کہتے اور کرتے رہے ہیں، اُس کو سننے اور دیکھنے کے بعد یہی ہونا تھا۔ چنانچہ خدا نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اِس گھر کی امانت اب نبی امی کے حوالے کر دی جائے گی۔ آپ کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے یہاں تک اِسی مقصد سے لایا گیا ہے۔ خدا ہر عیب سے پاک ہے، لہٰذا وہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک قوم کو لوگوں پر اتمام حجت کے لیے منتخب کرے اور اُس کی طرف سے اِس درجے کی سرکشی کے باوجود اُسے یوں ہی چھوڑے رکھے۔ ناگزیر تھا کہ پیش نظر مقصد کے لیے وہ کوئی دوسرا اہتمام کرے۔ اُس نے یہی کیا ہے اور عالمی سطح پر دعوت و شہادت کی ذمہ داری بنی اسمٰعیل کے سپرد کر دی ہے۔

۱۱۶ یعنی تورات عطا فرمائی تھی۔

۱۱۷ یہ ایک جملے میں اُس دعوت کا خلاصہ ہے جس کے بنی اسرائیل امین بنائے گئے تھے۔ توحید پر ایمان کا اولین تقاضا یہی ہے کہ خدا کے سوا کسی کو کارساز نہ بنایا جائے اور صرف ایک خدا پر بھروسا کر کے اپنے تمام معاملات اُس کے حوالے کر دیے جائیں۔ تورات میں بھی یہ تعلیم جگہ جگہ اور نہایت واضح الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ دین کی تعلیمات میں اِس کی حیثیت ایک مرکز ثقل کی

اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا

ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا۔[۱۱۸] اِس میں شک نہیں کہ وہ (ہمارا) ایک شکر گزار بندہ تھا۔ ۲-۳

بنی اسرائیل کو ہم نے اِسی کتاب میں اپنے اِس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا[۱۱۹] کہ تم ضرور دو مرتبہ زمین میں فساد برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔[۱۲۰] (لہٰذا دونوں مرتبہ سخت سزا پاؤ

ہے اور تمام شریعت کی بنیاد بھی یہی ہے۔

[۱۱۸] مطلب یہ ہے کہ تم اُنھی باقیات الصالحات کی اولاد ہو جو توحید پر سچے ایمان کی وجہ سے کشتی پر سوار کرائے گئے اور خدا کے عذاب سے بچا لیے گئے تھے۔ اپنی یہ تاریخ ہمیشہ یاد رکھو اور اپنے ابوالآبا نوح علیہ السلام کی طرح تم بھی خدا کے شکر گزار بندے بن کر اُس کی توحید پر قائم رہو۔

[۱۱۹] اصل الفاظ ہیں: 'وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ'۔ اِن میں 'قَضَيْنَا' کے بعد 'اِلٰى' کا تقاضا ہے کہ اُسے کسی ایسے فعل پر متضمن مانا جائے جو اِس صلہ سے مناسبت رکھنے والا ہو۔ یہ 'أبلغنا' یا اِس کے ہم معنی کوئی فعل ہو سکتا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۱۲۰] یعنی خدا کے مقابلے میں سرکشی دکھاؤ گے اور اُس کی شریعت سے بغاوت کر دو گے۔ قرآن میں لفظ 'فَسَاد' اِس مفہوم کے لیے بھی آیا ہے۔ اِس کے بعد 'فنعذبکم مرتین' یا اِس کے ہم معنی الفاظ آیت میں حذف ہو گئے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات بالکل واضح بھی تھی اور آگے جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ بھی اِسی پر دلالت کر رہا تھا۔ تورات میں یہ تنبیہ اور اِس کے نتیجے میں ملنے والی سزا کی تفصیلات استثنا کے باب ۲۸ میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> "...اور چونکہ تو باوجود سب چیزوں کی فراوانی کے فرحت اور خوش دلی سے اپنے خدا کی عبادت نہیں کرے گا، اِس لیے بھوکا اور پیاسا اور ننگا اور سب چیزوں کا محتاج ہو کر تو اپنے دشمنوں

عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ

گے)۔ پھر (تم نے دیکھا کہ) جب اُن میں سے پہلی بار کے وعدے کا وقت آجاتا ہے[۱۲۱] تو ہم تم پر اپنے ایسے بندے اٹھا کر مسلط کر دیتے ہیں[۱۲۲] جو نہایت زور آور تھے۔ سو وہ

کی خدمت کرے گا، جن کو خداوند تیرے برخلاف بھیجے گا اور غنیم تیری گردن پر لوہے کا جوا رکھے رہے گا، جب تک وہ تیرا ناس نہ کر دے۔ خداوند دور سے، بلکہ زمین کے کنارے سے ایک قوم کو تجھ پر چڑھا لائے گا جیسے عقاب ٹوٹ کر آتا ہے۔ اُس قوم کی زبان کو تو نہیں سمجھے گا۔ اُس قوم کے لوگ ترش رو ہوں گے جو نہ بڈھوں کا لحاظ کریں گے نہ جوانوں پر ترس کھائیں گے۔ اور وہ تیرے چوپایوں کے بچوں اور تیری زمین کی پیداوار کو کھاتے رہیں گے، جب تک تیرا ناس نہ ہو جائے۔ اور وہ تیرے لیے اناج یا مے یا تیل یا گائے بیل کی بڑھتی یا تیری بھیڑ بکریوں کے بچے کچھ نہیں چھوڑیں گے، جب تک وہ تجھ کو فنا نہ کر دیں۔ اور وہ تیرے تمام ملک میں تیرا محاصرہ تیری ہی بستیوں میں کیے رہیں گے، جب تک تیری اونچی اونچی فصیلیں جن پر تیرا بھروسا ہو گا، گر نہ جائیں۔ تیرا محاصرہ وہ تیرے ہی اُس ملک کی سب بستیوں میں کریں گے جسے خداوند تیرا خدا تجھ کو دیتا ہے۔‘‘ (۴۷-۵۲)

’’...اور چونکہ تو خداوند اپنے خدا کی بات نہیں سنے گا، اِس لیے کہاں تو تم کثرت میں آسمان کے تاروں کی مانند ہو اور کہاں شمار میں تھوڑے ہی سے رہ جاؤ گے۔ تب یہ ہو گا کہ جیسے تمھارے ساتھ بھلائی کرنے اور تم کو بڑھانے سے خداوند خوشنود ہوا، ایسے ہی تم کو فنا کرانے اور ہلاک کر ڈالنے سے خداوند خوشنود ہو گا اور تم اُس ملک سے اکھاڑ دیے جاؤ گے، جہاں تو اُس پر قبضہ کرنے جا رہا ہے۔ اور خداوند تجھ کو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کرے گا۔‘‘ (۶۲-۶۴)

اِس کے بعد بنی اسرائیل کے انبیا اُنھیں متنبہ کرتے رہے۔ چنانچہ پہلے فساد پر اُن کی تنبیہات زبور، یسعیاہ، یرمیا اور حزقی ایل میں اور دوسرے فساد پر سیدنا مسیح علیہ السلام کی زبان سے متی اور لوقا کی انجیلوں میں موجود ہیں۔

[۱۲۱] جملے کی ابتدا ’اِذَا‘ سے ہوئی ہے۔ یہ یہاں تصویر حال کے لیے آیا ہے۔ ’اِذَا‘ کے بارے میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ جس طرح حال اور مستقبل کے لیے آتا ہے، اُسی طرح

وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدۡنَا لَکُمُ الۡکَرَّۃَ عَلَیۡہِمۡ وَاَمۡدَدۡنٰکُمۡ
بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِیۡنَ وَجَعَلۡنٰکُمۡ اَکۡثَرَ نَفِیۡرًا ۝۶ اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ

تمھارے گھروں کے اندر گھس پڑے اور وعدہ پورا ہو کے رہا۔[۱۲۳] پھر ہم نے تمھاری باری اُن پر لوٹا دی اور تمھیں مال اور بیٹے عطا فرمائے اور تمھیں ایک بڑی جماعت بنا دیا۔[۱۲۴] (یہ

بیان سنت و عادت اور ماضی میں کسی صورت حال کی تصویر کے لیے بھی آتا ہے۔

۱۲۲ آیت میں 'بَعَثۡنَا عَلَیۡکُمۡ ' کے الفاظ ہیں۔ 'بَعَثَ ' کے بعد 'عَلٰی ' دلیل ہے کہ یہ ابھارنے اور اٹھا کھڑا کرنے کے ساتھ ساتھ مسلط کر دینے کے مفہوم پر بھی متضمن ہو گیا ہے۔

۱۲۳ یہ اشارہ بابل و نینوا کے بادشاہ بخت نصر کے حملے کی طرف ہے جس نے ۵۸۶ قبل مسیح میں یہودیہ کے تمام بڑے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو، جو یہود کی عظمت کا آخری نشان تھا، بالکل پیوند خاک کر دیا۔ آیت میں اِس کے لیے 'فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّیَارِ ' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ یہود کی انتہائی توہین و تذلیل کی تصویر ہے، اِس لیے کہ جب دشمن اتنا زور آور ہو کہ وہ گھروں کے اندر گھس پڑے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اُس نے عزت و ناموس، ہر چیز کو تاراج کر کے رکھ دیا۔ اِسی طرح بخت نصر کی فوجوں کے لیے 'عِبَادًا لَّنَآ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ ' (اپنے زور آور بندے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... یہ اُن کے دین اور تقویٰ کے اعتبار سے نہیں استعمال ہوئے ہیں، بلکہ صرف اِس حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں کہ اُنھوں نے خدا کے ارادہ کے اجرا و نفاذ کے لیے آلہ و جارحہ کا کام دیا۔ یہ اگرچہ خود گندے تھے، لیکن گندگی کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کرنے میں اُنھوں نے مشیت الٰہی کی تنفیذ کی، اِس وجہ سے اُنھیں بھی فی الجملہ خدا سے نسبت حاصل ہو گئی۔ بنی اسرائیل کو غرہ تھا کہ 'نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ' ہم خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ خدا نے اُن پر واضح کر دیا کہ جن جوتوں سے تم پٹے ہو، وہ تو خدا کی نظروں میں کچھ وقعت رکھتے ہیں، لیکن تم کوئی وقعت نہیں رکھتے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۴۸۲)

لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ﴿٧﴾ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا

تمھارے لیے سبق تھا کہ) اگر تم اچھے کام کرو گے تو اپنے لیے اچھا کرو گے اور اگر برے کام کرو گے تو وہ بھی اپنے لیے کرو گے۔ (یہ پہلا وعدہ تھا)۔ اِس کے بعد جب دوسری بار کے وعدے کا وقت آ جاتا ہے تو ہم اپنے کچھ دوسرے زور آور بندے اٹھا کھڑے کرتے ہیں،[۱۲۵] اِس لیے کہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور تمھاری مسجد میں اُسی طرح گھس پڑیں، جس طرح وہ پہلی بار اُس میں گھس پڑے تھے اور جس چیز پر قابو پائیں، اُس کو تہس نہس کر ڈالیں۔[۱۲۶] (اب بھی) عجب نہیں، (اے بنی اسرائیل) کہ تمھارا پروردگار

---

[۱۲۴] ایک عرصے کی غلامی کے بعد یہود میں رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہوئی تو خدا نے دوبارہ اُن کی مدد کی۔ چنانچہ بابل کی سلطنت کو زوال ہوا اور ۵۳۹ قبل مسیح میں شاہ ایران سائرس نے کلدانیوں کو شکست دے کر اُن کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اِس کے بعد اُس نے یہود پر یہ عنایت کی کہ اُنھیں اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ یہود نے واپس آ کر ہیکل مقدس کو نئے سرے سے تعمیر کیا اور عزیر علیہ السلام کی رہنمائی میں اپنے آپ کو بڑی حد تک بحال کر لیا، جس کے بعد بنی اسرائیل کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ قرآن نے یہ اِسی فضل و عنایت کا ذکر کیا ہے۔

[۱۲۵] یہ الفاظ اصل میں محذوف ہیں۔ آیت میں 'لِيَسُوْٓءٗا' کا لام انگلی اٹھا کر اِن کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

[۱۲۶] یہ اُس تباہی کا ذکر ہے جو مسیح علیہ السلام کی طرف سے اتمام حجت کے بعد ۷۰ء میں رومی بادشاہ تیتس (Titus) کے ہاتھوں یہود پر آئی۔ اِس موقع پر ہزاروں مارے گئے، ہزاروں غلام بنائے گئے، ہزاروں کو پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا اور ہزاروں ایمفی تھیٹروں اور

وَجَعَلۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ حَصِيۡرًا ⑧
اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ يَهۡدِىۡ لِلَّتِىۡ هِىَ اَقۡوَمُ وَيُبَشِّرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ

(ایک مرتبہ پھر) تم پر رحم فرمائے۔ لیکن (یاد رکھو)، اگر تم وہی کرو گے تو ہم بھی وہی کریں گے اور جہنم کو تو ہم نے اِسی طرح کے منکروں کے لیے باڑا بنا رکھا ہے۔[۱۲۷] ۴-۸

(لوگو)،[۱۲۸] حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔ یہ ماننے

کلوسیموں میں لوگوں کی تفریحِ طبع کے لیے جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے مختلف شہروں میں بھیج دیے گئے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین نے اپنے لیے چن لیں اور یروشلم کا شہر اور اُس کی مسجد، سب زمیں بوس کر دیے گئے۔

[۱۲۷] یعنی جو حقائق کو اِس طرح بہ چشم سر دیکھ لینے کے بعد بھی انکار کر دیں۔ یہ اُن یہود کو براہ راست خطاب فرمایا ہے جو قرآن کی مخالفت میں منکرین قریش کے ہم نوا ہو کر اُن کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’اِس آیت کے تیور لحاظ رکھنے کے قابل ہیں۔ پہلے تو بات غائب کے صیغے سے فرمائی۔ پھر ’اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا‘ میں متکلم کا صیغہ آ گیا۔ پہلے ٹکڑے میں بے پروائی کا انداز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ صحیح راہ اختیار کر لو گے تو اپنے ہی کو نفع پہنچاؤ گے، اور اگر نہ اختیار کرو گے تو اپنی ہی شامت کو دعوت دو گے، خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ دوسرے ٹکڑے میں نہایت ہی سخت وعید ہے۔ اِس وجہ سے اول تو متکلم کا صیغہ آیا جو تہدید و وعید کے لیے زیادہ موزوں ہے، پھر اُس میں ابہام و اجمال بھی ہے۔ یہ تو بتایا کہ ہم لوٹیں گے، یہ نہیں بتایا کہ ہم کس شکل میں لوٹیں گے۔ یہ بات سمجھنے والوں کی سمجھ پر چھوڑ دی ہے اور اِس جملے کی ساری شدت اِس ابہام کے اندر مضمر ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/ ۴۸۳)

[۱۲۸] یہ خطاب یہود اور مشرکین قریش، دونوں سے ہے۔ اوپر کی تمہید کے بعد اب اُنھیں قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔

الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا كَبِيۡرًا ۙ ﴿۹﴾ وَّاَنَّ الَّذِيۡنَ
لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۰﴾
وَيَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالۡخَيۡرِ ؕ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ
عَجُوۡلًا ﴿۱۱﴾ وَجَعَلۡنَا الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيۡنِ فَمَحَوۡنَاۤ اٰيَةَ الَّيۡلِ
وَجَعَلۡنَاۤ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبۡصِرَةً لِّتَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلِتَعۡلَمُوۡا
عَدَدَ السِّنِيۡنَ وَالۡحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَىۡءٍ فَصَّلۡنٰهُ تَفۡصِيۡلًا ﴿۱۲﴾

والوں کو جو اچھے عمل کرتے ہیں، اِس بات کی بشارت دیتا ہے کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور یہ بھی کہ جو آخرت کو نہیں مانتے، اُن کے لیے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۹-۱۰

(یہ اُس کی نشانی مانگتے ہیں)۔ انسان (پر افسوس، وہ اپنے لیے) جس طرح بھلائی مانگتا ہے، اُسی طرح برائی مانگنے لگتا ہے۔[۱۲۹] انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔ یہ اگر دیکھیں[۱۳۰] تو ہم نے رات اور دن کو (اِنھی کے لیے) دو نشانیاں بنایا ہے۔ پھر ہم نے رات کی نشانی دھندلا دی کہ اُس میں راحت پاؤ اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن کر دیا، اِس لیے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو، اور اِس لیے کہ تم برسوں کی گنتی اور اُن

---

[۱۲۹] اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی وعید سن کر اُس کی نشانی کا مطالبہ چونکہ نہایت احمقانہ اور خود مطالبہ کرنے والوں کے حق میں انتہائی مہلک تھا، اِس لیے، استاذ امام کے الفاظ میں، یہ بات باندازِ تاسف اور اُن سے منہ پھیر کر عام الفاظ میں فرما دی ہے۔

[۱۳۰] یعنی عذاب کی نشانی مانگنے کے بجائے آفاق کی اُن نشانیوں کو دیکھیں جو ہر وقت اِن کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ⑬ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ
الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ⑭ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ
وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا
كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ⑮

کا حساب جان لو۔ اِس پر مزید یہ کہ ہم نے (اِس کتاب میں) ہر چیز کی پوری تفصیل بھی کر دی ہے[۱۳۱]۔ ۱۱-۱۲

(اپنے شریکوں کے سہارے پر یہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچائیں)۔ ہر انسان کی قسمت ہم نے اُس کے گلے کے ساتھ باندھ دی ہے[۱۳۲]، اور قیامت کے دن ہم اُس کے لیے ایک نوشتہ نکالیں گے جس کو وہ اپنے روبرو بالکل کھلا ہوا پائے گا۔ لو، پڑھو اپنا اعمال نامہ، آج اپنا حساب کر لینے کے لیے تم خود ہی کافی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو ہدایت کی راہ چلتا ہے، وہ اپنے ہی لیے چلتا ہے اور جو گم راہی اختیار کرتا ہے، وہ بھی اپنی اِس گم راہی کا وبال اپنے ہی اوپر لاتا ہے۔ (خدا کا قانون یہ ہے کہ) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ (سو کیا جلدی مچاتے ہو)؟ ہم (کسی قوم کو) کبھی سزا نہیں دیتے، جب تک

---

[۱۳۱] یعنی اُن چیزوں کی پوری تفصیل کر دی ہے جن پر یہ نشانیاں دلالت کرتی ہیں۔

[۱۳۲] یہ اِس بات کی تعبیر ہے کہ انسان کو جو کچھ آگے پیش آنے والا ہے، وہ اُس کے اعمال کا صلہ ہے، اِس لیے یہیں سے اُس کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اپنی جنت اور جہنم وہ اِسی دنیا سے لے کر خدا کے حضور پہنچتا ہے۔ قیامت میں اُس کو کوئی ایسی چیز پیش آنے والی نہیں ہے جو یہاں اُس کا مقدر نہیں بن سکی۔ لہٰذا عذاب کے لیے جلدی مچانے کے بجائے یہ اِس پر غور کریں کہ اُس سے

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ
عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ
مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

ایک رسول نہ بھیج دیں (کہ سزا سے پہلے وہ اُس پر حجت پوری کر دے)۔[۱۳۳] ۱۴-۱۵

جب ہم کسی بستی کو (اُس کے کرتوتوں کی پاداش میں) ہلاک کر دینا چاہتے ہیں تو اُس کے خوش حالوں کو حکم دیتے ہیں کہ جاؤ، جو جی چاہے، کرو۔[۱۳۴] پھر وہ اُس میں نافرمانیاں کرتے چلے جاتے ہیں، تب اُس بستی پر بات پوری ہو جاتی ہے اور ہم اُس کو بالکل برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ (دیکھ لو)، نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں اِسی طرح ہلاک کر دیں۔ (اے پیغمبر)، اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے اور اُن کو دیکھنے کے لیے تیرا پروردگار کافی ہے۔[۱۳۵] ۱۶-۱۷

بچنے کے لیے اِنھوں نے کیا اہتمام کر رکھا ہے؟

[۱۳۳] مطلب یہ ہے کہ رسول تو آ چکا۔ اب اِسی کا انتظار ہے کہ کب حجت پوری ہو جاتی ہے۔ اِس کے بعد عذاب ہی کا مرحلہ ہے۔ سو یہ مرحلہ بھی آیا ہی چاہتا ہے۔

[۱۳۴] اصل میں لفظ 'اَمَرْنَا' آیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اَمَر' صرف حکم دینے ہی کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ بسا اوقات کسی کو ڈھیلا چھوڑ دینے اور مہلت دے دینے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ آپ کسی شخص یا گروہ سے افہام و تفہیم کی کوشش کرنے کے بعد جب تنگ آ جاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ 'اِفعلوا ما بدا لکم' جاؤ، جو تمھارے جی میں آئے، کرو۔ بظاہر یہ امر ہی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے، لیکن اِس کا مفہوم امہال ہوتا ہے۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ بھی سرکش لوگوں پر اپنی حجت تمام کر چکنے کے بعد اُن کو

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ
ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ
الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ
مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ

(ہمارا طریقہ یہ ہے کہ) جو اِس جلد ملنے والی دنیا ہی کو چاہتا ہے، اُس کو ہم جس کے لیے چاہتے اور جتنا چاہتے ہیں، سر دست یہیں دے دیتے ہیں[۱۳۶]۔ پھر ہم نے اُس کے لیے جہنم رکھ چھوڑی ہے، جس میں وہ خوار اور راندہ ہو کر داخل ہو جائے گا۔ اور جو آخرت کو چاہتا ہے اور اُس کے لیے کوشش بھی کرتا ہے، جیسی کوشش اُس کے لیے کرنی چاہیے، اور مومن بھی ہے تو یہی لوگ ہیں جن کی سعی مقبول ہو گی[۱۳۷]۔ تیرے پروردگار کی بخشش سے

ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح سے بھر لیں۔" (تدبر قرآن ۴/ ۴۸۹)

یہ ڈھیل خوش حال لوگوں کو اِس لیے دی جاتی ہے کہ قوم کی زمام کار اُنھی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ کے رسول بھی سب سے پہلے اُنھی کو مخاطب کرتے ہیں۔ پھر اتمام حجت کے بعد یہ اُنھی کا رویہ ہے جس سے بالآخر قوم عذاب الٰہی کی گرفت میں آ جاتی ہے۔

۱۳۵؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھارے منکرین جو کچھ کر رہے ہیں، اُس کو جاننے کے لیے تمھارے پروردگار کو کسی دوسرے کی مدد یا اطلاع کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور ہر چیز سے واقف ہے۔ لہٰذا مطمئن رہو، جب وقت آ جائے گا تو اِن کا فیصلہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہ کرے گا۔

۱۳۶؎ اوپر خوش عیش لوگوں کے لیے جس ڈھیل کا ذکر ہوا ہے، یہ اُس کے بارے میں سنت الٰہی کا بیان ہے۔ تاہم اتنی بات اُس میں بھی واضح کر دی ہے کہ اِس کے نتیجے میں جو کچھ ملتا ہے، وہ بھی

عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ⑳ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ
وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ㉑

ہم (یہاں) ہر ایک کو دیتے رہتے ہیں، اِن کو بھی اور اُن کو بھی[۱۳۸]۔ اور تیرے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں ہے[۱۳۹]۔ دیکھ لو، اِن کے ایک کو دوسرے پر ہم نے کس طرح فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت کے درجے اور اُس کی فضیلت، البتہ کہیں بڑھ کر ہے[۱۴۰]۔ ۱۸-۲۱

اُن لوگوں کے اپنے اختیار میں نہیں ہے جو دنیا اور اُس کے نفع عاجل کے طلب گار ہیں، بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے۔

[۱۳۷] یہ الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ آخرت صرف تمنا کرنے سے نہیں مل جائے گی، بلکہ اِس کے لیے اُس کے شایان شان کوشش بھی مطلوب ہے اور ساتھ ہی شرک کی ہر آمیزش سے پاک ایمان بھی۔ جب تک یہ دونوں چیزیں طلب آخرت کے ساتھ نہیں ہوں گی، اُس وقت تک یہ تمنا لا حاصل ہی رہے گی۔“ (تدبر قرآن ۴/۴۹۰)

[۱۳۸] یعنی اِن کو بھی جو آخرت کے طلب گار ہیں اور اُن کو بھی جو اُس سے بالکل بے پروا ہو کر رات دن دنیا ہی کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ آیت میں لفظ ’کُلّ‘ اِنھی دو گروہوں کے لیے آیا ہے۔ زبان کے اداشناس جانتے ہیں کہ اِس طرح کے موقعوں پر یہ معرفہ کے حکم میں ہو جاتا ہے۔

[۱۳۹] اِس لیے کہ دنیا والوں کو اُس سے دنیا مل جاتی ہے اور جو آخرت کے طالب ہیں، وہ بھی محروم نہیں رہتے۔ اُن کے لیے جتنی دنیا مقدر ہے، وہ بھی اُنھیں ملتی ہے اور آخرت تو بہر حال اُنھی کے لیے ہے۔ وہ اپنی کوششوں کا بھرپور صلہ اُس میں بھی پا لیں گے۔

[۱۴۰] مطلب یہ ہے کہ اِس عارضی دنیا میں مراتب کی بلندی لوگوں کو کہاں پہنچا دیتی ہے، یہ تم

لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ﴿۲۲﴾
وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ؕ اِمَّا يَبۡلُغَنَّ

(سنو)[۱۴۱]، تم اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بناؤ کہ (روز قیامت) ملامت زدہ اور بے یار و مددگار بیٹھے رہ جاؤ۔[۱۴۲] تمھارے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ تنہا اُسی کی

دیکھتے ہو۔ اِسی سے اندازہ کر لو کہ جو لوگ آخرت میں اونچے درجوں کے لیے منتخب کیے جائیں گے، اُن کی عالی مقامی اور شوکت و حشمت کیسی ہو گی۔ پھر کیا لوگوں کو اِسی طرح اُس سے بے پروا رہنا چاہیے؟ یہ صورت حال تو تقاضا کرتی ہے کہ انسان کی تمام سعی و جہد کا مقصد آخرت کے اِنھی درجات و مراتب کا حصول ہونا چاہیے۔

۱۴۱۔ پیچھے فرمایا تھا کہ قرآن اُس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔ اُس سے متعلق چند توضیحات کے بعد یہ اب اُسی راستے کی وضاحت ہو رہی ہے۔ اِس میں خطاب جگہ جگہ واحد کے صیغے سے بھی ہوا ہے، لیکن بیچ بیچ میں جمع کا صیغہ لا کر بتا دیا ہے کہ اِس سے مقصود واحد نہیں ہے، بلکہ عربیت کے اسلوب پر ایک ایک شخص کو فرداً فرداً مخاطب کرنا ہے۔ اِسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اگر اِس بیچ میں کہیں مخاطب کیا گیا ہے تو آپ کی شخصی حیثیت میں نہیں کیا گیا، بلکہ مسلمانوں کے امام کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

۱۴۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا'۔ اِن میں 'فَتَقۡعُدَ' افعال ناقصہ کے طریقے پر آیا ہے۔ چنانچہ بیٹھنے کے مفہوم سے مجرد ہو گیا ہے۔ اِس کا ظرف 'یوم القیٰمة' ہے جسے اصل میں حذف کر دیا ہے۔ یہاں سے آیت ۳۹ تک اِس پورے سلسلۂ احکام کو دیکھیے تو اِس کی ابتدا بھی شرک کی ممانعت سے ہوئی ہے اور اِس کا خاتمہ بھی اِسی کی تاکید پر کیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب کسی چیز کی اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں اِس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ درمیان میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، اُن کے لیے یہ عقیدہ گویا شہر پناہ ہے جس

عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا

عبادت کرو[۱۴۳] اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو[۱۴۴]۔ اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں اگر تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ اُن کو اف کہو اور نہ

کے وجود سے شہر قائم رہتا اور جس میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے تو پورا شہر خطرے کی زد میں آ جاتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت اِن آیتوں میں بیان ہوئی ہے، اُس کے لیے توحید کی حیثیت یہی ہے۔ یہ اُس عدل کا سب سے بڑا اور بنیادی تقاضا ہے جس کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ چنانچہ شرک کو اِسی بنا پر ظلم عظیم کہا گیا ہے اور اِس کا یہ نتیجہ بھی قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے جس کی پاداش میں لوگ راندہ اور ملامت زدہ ہو کر جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔

یہ شرک کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو الٰہ بنایا جائے تو قرآن اپنی اصطلاح میں اُسے شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو خدا کی ذات سے یا خدا کو اُس کی ذات سے سمجھا جائے یا خلق میں یا مخلوقات کی تدبیر امور میں کسی کا کوئی حصہ مانا جائے اور اِس طرح کسی نہ کسی درجے میں اُسے اللہ تعالیٰ کا ہم سر بنا دیا جائے۔

پہلی صورت کی مثال سیدنا مسیح، سیدہ مریم اور فرشتوں کے بارے میں عیسائیوں اور مشرکین عرب کے عقائد ہیں۔ صوفیانہ مذاہب کا عقیدۂ وحدت الوجود بھی اِسی کے قبیل سے ہے۔

دوسری صورت کی مثال ہندوؤں میں برہما، وشنو، شیو اور مسلمانوں میں غوث، قطب، ابدال، داتا اور غریب نواز جیسی ہستیوں کا عقیدہ ہے۔ ارواح خبیثہ، نجوم و کواکب اور شیاطین کے تصرفات پر ایمان کو بھی اِسی کے ذیل میں سمجھنا چاہیے۔

[۱۴۳] توحید پر ایمان کے بعد یہ پہلا حکم ہے جس کا انسانوں کو مکلّف ٹھیرایا گیا ہے۔ فرمایا کہ جب اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو پھر عبادت بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔ اِس کی حقیقت خضوع اور تذلل ہے جس کا اولین ظہور پرستش کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر انسان کے عملی وجود کی رعایت سے یہی

وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿٢٣﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ

اُن کو جھڑک کر جواب دو، تم اُن سے ادب کے ساتھ بات کرو[۱۴۵] اور اُن کے لیے نرمی[۱۴۶] سے

پرستش اطاعت کو شامل ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت کے مظاہر تسبیح و تحمید، دعا و مناجات، رکوع و سجود، نذر، نیاز، قربانی اور اعتکاف ہیں۔ دوسری صورت میں آدمی کسی کے لیے خدائی اختیارات مانتا اور مستقل بالذات شارع و حاکم کی حیثیت سے اُس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اللہ، پروردگار عالم کا فیصلہ ہے کہ اِن میں سے کوئی چیز بھی اُس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتی۔ 'قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ' کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی فیصلہ بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر کسی کی تسبیح و تحمید کرتا ہے یا اُس سے دعا و مناجات کرتا ہے یا اُس کے لیے رکوع و سجود کرتا ہے یا اُس کے حضور میں نذر، نیاز یا قربانی پیش کرتا ہے یا اُس کے لیے اعتکاف کرتا ہے یا خدائی اختیارات مان کر اُس کی اطاعت کرتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے اِس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

۱۴۴ خدا کے بعد سب سے بڑا حق ماں باپ کا ہے، لیکن وہ بھی خدا کے شریک نہیں ہو سکتے۔ اُن کا حق صرف یہ ہے کہ اُن کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ یہ دوسرا حکم ہے اور اِس کی تعلیم تمام الہامی صحائف میں دی گئی ہے۔ قرآن مجید نے یہاں اور اِس کے علاوہ عنکبوت (۲۹) کی آیت ۸، لقمان (۳۱) کی آیات ۱۴-۱۵ اور احقاف (۴۶) کی آیت ۱۵ میں یہی تلقین فرمائی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ چنانچہ اللہ کی عبادت کے بعد سب سے پہلے اِسی کو ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے والدین ہی اُس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ اپنے پروردگار کے بعد انسان کو سب سے بڑھ کر اُنھی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

۱۴۵ مطلب یہ ہے کہ والدین کے ساتھ آدمی کو اِس طرح پیش آنا چاہیے کہ وہ ظاہر و باطن میں اُن کی عزت کرے، اُن کے خلاف اپنے دل میں کوئی بے زاری نہ پیدا ہونے دے، اُن کے سامنے

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ

عاجزی کے بازو جھکائے رکھو[۱۴۷] اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار، اُن پر رحم فرما، جس طرح اُنھوں نے (رحمت و شفقت کے ساتھ) مجھے بچپن میں پالا تھا[۱۴۸]۔ (لوگو)، تمھارے دلوں میں جو

سوء ادب کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالے، بلکہ نرمی، محبت، شرافت اور سعادت مندی کا اسلوب اختیار کرے۔ اُن کی بات مانے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں میں اُن کی دل داری اور تسلی کرتا رہے۔

اِس بڑھاپے کا حوالہ، خاص طور پر جس مقصد سے دیا گیا ہے، اُس کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح کی ہے:

> ”...یہی زمانہ ہوتا ہے جس میں اُن لوگوں کو ماں باپ بوجھ محسوس ہوتے ہیں جو اُن کی قربانیوں اور جاں فشانیوں کو بھول جاتے ہیں جو اُنھوں نے اُن کے لیے بچپن میں کی ہوتی ہیں۔ سعادت مند اولاد تو اِس بات کو یاد رکھتی ہے کہ جس طرح کبھی ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں مجھ کو اپنے والدین کی گود میں ڈالا گیا تھا، اُسی طرح اب میرے والدین ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کی صورت میں میرے حوالے کیے گئے ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں اُن کے احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں دوں۔ لیکن ہر شخص اِس بات کو یاد نہیں رکھتا۔ یہ اِسی بات کی یاد دہانی ہے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ والدین ہر دور میں محبت، تعظیم اور احسان کے حق دار ہیں۔“ (تدبر قرآن ۴/۴۹۶)

۱۴۶؎ اصل میں ’مِنَ الرَّحْمَةِ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ آیت میں جس اطاعت و فرماں برداری کی ہدایت کی گئی ہے، یہ اُس کا منبع بتا دیا ہے کہ یہ اطاعت و فرماں برداری تمام تر رحمت و شفقت اور مہر و محبت کے جذبے سے ہونی چاہیے۔

۱۴۷؎ اِس میں یہ تلمیح ہے کہ والدین جس طرح بچے کو پرندوں کی طرح اپنے بازوؤں میں چھپا کر رکھتے ہیں، بچوں کو بھی چاہیے کہ اُن کے بڑھاپے میں اِسی طرح اُن کو اپنی محبت و اطاعت کے بازوؤں میں چھپا کر رکھیں۔ اِس لیے کہ والدین کی شفقت کا حق اگر کچھ ادا ہو سکتا ہے تو اِسی

اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ
تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ

کچھ ہے، اُسے تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے۔ اگر تم سعادت مند رہو گے تو پلٹ کر آنے والوں کے لیے وہ بڑا درگذر فرمانے والا ہے۔[۱۴۹] ۲۲-۲۵

تم قرابت دار کو اُس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی[۱۵۰]، اور مال کو بے جا نہ اڑاؤ۔ اِس لیے کہ مال کو بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے

جذبے سے ہو سکتا ہے۔ اِس کے بغیر یہ حق ادا کرنا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔

[۱۴۸] یہ دعا والدین کا حق ہے اور اُس حق کی یاددہانی بھی جو والدین سے متعلق اولاد پر عائد ہوتا ہے۔ پھر یہ اُس جذبۂ محبت کی محرک بھی ہے جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ نے والدین سے حسن سلوک کے معاملے میں کیا ہے۔

[۱۴۹] والدین کے ساتھ حسن سلوک کی جو ہدایت کی گئی ہے، یہ اُس سے متعلق ایک نہایت اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”بڑھاپے میں والدین کی خدمت و محبت اِس طرح کرنا، جس طرح قرآن نے ہدایت فرمائی ہے، کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ اِس میں صرف ظاہری اطاعت ہی مطلوب نہیں ہے، بلکہ پاکیزہ قلبی جذبۂ محبت اور دلی لگاؤ بھی مطلوب ہے۔ اِس کی اِس مشکل کی وجہ سے قرآن نے یہ وضاحت بھی فرما دی کہ اصل مطلوب دلی محبت اور کامل سعادت مندی ہے۔ اگر یہ چیز موجود ہے تو خدا دلوں کے حال سے خوب واقف ہے۔ اِس کے ہوتے اگر کوئی چھوٹی موٹی اتفاقیہ کوتاہی صادر ہو گئی تو اُس کی تلافی توبہ اور رجوع الی اللہ سے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اپنی اِس طرح کی کوتاہیوں پر برابر اللہ سے معافی مانگتے رہیں گے تو اللہ اُن کو معاف کر دے گا۔“

(تدبر قرآن ۴/ ۴۹۷)

لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿٢٧﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ

رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔[۱۵۱] اور اگر اِن (ضرورت مندوں) سے اعراض کرنا پڑے، اِس لیے کہ ابھی تم اپنے پروردگار کی رحمت کے انتظار میں ہو، جس کی تمھیں امید ہے، تو

۱۵۰ یہ تیسرا حکم ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسان کو بخشی ہیں، وہ جس طرح اُنھیں اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے، اُسی طرح اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد اُنھیں اپنے اعزہ و اقربا اور دوسرے ابناے نوع پر بھی خرچ کرے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں اللہ کا بندہ بن کر رہنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک یہ کہ خالق کے ساتھ انسان کا تعلق ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے۔ دوسری یہ کہ مخلوق کے ساتھ وہ صحیح طریقے پر جڑ جائے۔ پہلی چیز نماز سے حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا اولین مظہر ہے، اور دوسری انفاق سے جو اُس کی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر ہے۔ پھر اِس کا صلہ بھی خدا کی محبت ہی ہے۔ اِس لیے کہ انسان جو کچھ خرچ کرتا ہے، اُسے درحقیقت آسمان پر جمع کرتا ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں، اُس کا دل بھی اِس کے نتیجے میں وہیں لگا رہتا ہے۔* آیت میں اِسے اعزہ و اقربا اور مسکین اور مسافر کا حق قرار دیا گیا ہے۔ اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اِس میں کوتاہی آدمی کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک غصب حقوق کا مجرم بنا سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہ بات دوسری جگہ واضح کر دی ہے کہ اِن حقوق سے بے پروا ہو کر اگر کوئی شخص مال و دولت جمع کرتا ہے تو یہ کنز ہے اور اِس کی سزا جہنم کی آگ ہے جس سے ہر بندۂ مومن کو اپنے پروردگار کی پناہ مانگنی چاہیے۔**

۱۵۱ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کی توفیق اُنھی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے اخراجات میں اعتدال کا رویہ اختیار کرتے اور اللہ تعالیٰ جو رزق اُنھیں عطا فرماتا ہے، اُس کو اپنی

---

* متی ۶: ۱۹-۲۱۔

** التوبہ ۹: ۳۴-۳۵۔

قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا
كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ

اِن سے نرمی کی بات کہو۔[۱۵۲] اپنا ہاتھ نہ گردن سے باندھے رکھو اور نہ اُس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہو۔[۱۵۳] بے شک، تمھارا پروردگار ہی جس کے لیے چاہتا ہے، رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے یقیناً باخبر ہے، وہ اُنھیں دیکھ رہا ہے۔ ۲۶-۳۰

تم لوگ اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم اُنھیں بھی روزی دیتے ہیں اور

کسی تدبیر و حکمت کا نہیں، بلکہ اللہ کی عنایت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی ضرورتوں کے معاملے میں اعتدال اور توازن کا رویہ اختیار نہیں کرتا، اُسے اپنے ہی شوق پورے کرنے سے فرصت نہیں ملتی کہ دوسروں کے حقوق ادا کر پائے۔

[۱۵۲] مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں پر یہ حق عائد ہوتا ہے، اُن کے حالات اگر کسی وقت ایسے ہوں کہ کسی حق دار کی مدد سے مجبوراً اعراض کرنا پڑے اور توقع ہو کہ مستقبل میں حالات بہتر ہو جائیں گے تو اُس کی دل داری کی جائے اور آیندہ کے لیے اچھے وعدے کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

[۱۵۳] اوپر اسراف و تبذیر کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے، یہ اُس کے بارے میں صحیح نقطۂ اعتدال کی وضاحت کر دی ہے کہ آدمی نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ لے اور نہ بالکل کھلے ہی چھوڑ دے کہ ضرورت کے وقت درماندہ اور ملامت زدہ ہو کر بیٹھا رہے، بلکہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرے اور ہمیشہ کچھ بچا کر رکھے تاکہ اپنے اور دوسروں کے حقوق بروقت ادا کر سکے۔

اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ
وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ

تمھیں بھی۔ اُن کا قتل یقیناً بہت بڑا جرم ہے۔[۱۵۴] اور زنا کے قریب نہ جاؤ، اِس لیے کہ وہ کھلی بے حیائی اور بہت بری راہ ہے۔[۱۵۵] خدا نے جس جان کی حرمت قائم کر دی ہے،

۱۵۴؎ یہ اوپر والی بات ہی پر متفرع ایک ہدایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب رزق کی تنگی اور کشادگی، سب خدا کے ہاتھ میں ہے تو انسان کی ذمہ داری اِس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ پوری محنت کے ساتھ اُس کے اسباب پیدا کرے۔ تم اِس حقیقت کو نہیں سمجھتے، اِسی لیے بعض اوقات ایسے سنگ دل ہو جاتے ہو کہ مفلسی کے اندیشے سے اپنی اولاد تک کو قتل کر دیتے ہو۔ خدا سے ڈرو اور کبھی اِس گناہ کا ارتکاب نہ کرو۔ یقیناً یہ بہت بڑا جرم ہے۔ اِس میں خاص طور پر عرب جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ در گور کر دینے کی اُس سنگ دلانہ رسم کی طرف اشارہ ہے جس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورت چونکہ کوئی کماؤ فرد نہیں ہے، اِس لیے اُس کی پرورش کا بوجھ کیوں اٹھایا جائے؟

۱۵۵؎ یہاں تک قرآنی اوامر ـــــ عدل، احسان، ایتاے ذی القربیٰ ـــــ کا بیان تھا۔ اب آگے وہ چیزیں بیان ہو رہی ہیں جو قرآنی منہیات ـــــ فحشا، منکر اور بغی ـــــ کے تحت آتی ہیں۔ اِن میں سب سے پہلے زنا کو لیا ہے۔ یہ چوتھا حکم ہے۔ فرمایا کہ اِس کے قریب نہ جاؤ، اِس لیے کہ یہ کھلی بے حیائی اور بہت بری راہ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اِس کے برائی اور بے حیائی ہونے پر کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کی فطرت اِسے ہمیشہ سے ایک بڑا گناہ اور سنگین جرم سمجھتی رہی ہے اور جب تک وہ بالکل مسخ نہ ہو جائے، اِسی طرح سمجھتی رہے گی۔ انسان سے متعلق یہ حقیقت بالکل ناقابل تردید ہے کہ خاندان کا ادارہ اُس کے لیے ہوا اور پانی کی طرح ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ ادارہ صحیح فطری جذبات کے ساتھ صرف اُسی صورت میں قائم ہوتا اور قائم رہ سکتا ہے، جب زوجین کا باہمی تعلق مستقل رفاقت کا ہو۔ یہ چیز اگر مفقود ہو جائے تو اِس سے فطری اور روحانی جذبات سے محروم جانوروں کا ایک گلہ تو وجود میں آسکتا ہے، کوئی صالح معاشرہ

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي
الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (۳۳) وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ
هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ

اُسے ناحق قتل نہ کرو[۱۵۶] اور (یاد رکھو کہ) جو مظلومانہ قتل کیا جائے، اُس کے ولی کو ہم نے اختیار دے دیا ہے۔ سو وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے، اِس لیے کہ اُس کی مدد کی گئی ہے۔[۱۵۷] تم یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو۔ ہاں، مگر اچھے طریقے سے، یہاں تک کہ وہ

اور صالح تمدن وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔

اِس فعل کی یہی شناعت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے صرف اتنی بات نہیں کہی کہ زنا نہ کرو، بلکہ فرمایا ہے کہ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی تمام باتوں سے دور رہو جو زنا کی محرک، اُس کی ترغیب دینے والی اور اُس کے قریب لے جانے والی ہوں۔

۱۵۶ یہ پانچواں حکم ہے اور مذہب و اخلاق کی رو سے جو حرمت انسانی جان کو ہمیشہ سے حاصل رہی ہے، اُسی کا بیان ہے۔ دوسری جگہ قرآن نے بتایا ہے کہ اِس کے بارے میں یہی تاکید بنی اسرائیل کو کی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ بات اُن پر لکھ دی تھی کہ ایک انسان کا قتل درحقیقت پوری انسانیت کا قتل ہے۔ اِسی طرح یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ کسی انسان کی جان دو ہی صورتوں میں لی جا سکتی ہے: ایک یہ کہ وہ کسی کو قتل کر دے، دوسری یہ کہ نظم اجتماعی سے سرکشی کر کے وہ دوسروں کی جان و مال اور آبرو کے درپے ہو جائے۔ اِس کے سوا ہر قتل ایک ناحق قتل ہے جس کی سزا قرآن کی رو سے ابدی جہنم ہے۔*

۱۵۷ اِس سے معلوم ہوا کہ اِس جرم کے مرتکبین کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ یا معاشرے اور حکومت کے ساتھ نہیں ہے، مقتول کے اولیا کے ساتھ بھی ہے اور اُن کو اللہ نے پورا اختیار دے

---

* المائدہ ۵: ۳۲۔ الفرقان ۲۵: ۶۸-۶۹۔

مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ
ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ

اپنی پختگی کو پہنچ جائے[۱۵۸]۔ اور عہد کو پورا کرو، اِس لیے کہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا[۱۵۹]۔ تم پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہی بہتر ہے اور

دیا ہے، لہٰذا دنیا کی کوئی عدالت اُن کی مرضی کے بغیر قاتل کو کوئی رعایت نہیں دے سکتی۔ اُس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اگر قصاص پر اصرار کریں تو اُن کی مدد کرے اور جو کچھ وہ چاہیں، اُسے پوری قوت کے ساتھ اور ٹھیک ٹھیک نافذ کر دے۔

تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی کوئی باقاعدہ حکومت اگر کسی جگہ قائم نہ ہو اور قصاص کا معاملہ مقتول کے اولیا ہی سے متعلق ہو جائے تو وہ اپنی اِس حیثیت میں حدود سے تجاوز کریں اور مثال کے طور پر جوش انتقام میں قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرنے کی کوشش کریں یا اپنی شرافت و نجابت اور برتری کے زعم میں اپنے غلام کے بدلے میں آزاد اور عورت کے بدلے میں مرد کے قتل کا مطالبہ کریں یا مجرم کو عذاب دے دے کر ماریں یا مار دینے کے بعد اُس کی لاش پر غصہ نکالیں یا قتل کے ایسے طریقے اختیار کریں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ آیت میں 'فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ' (سو وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے) کے الفاظ اِسی تنبیہ کے لیے آئے ہیں۔

۱۵۸۔ یہ چھٹا حکم ہے اور اِس کے الفاظ، اگر غور کیجیے تو وہی ہیں جو اوپر زنا سے روکنے کے لیے آئے ہیں۔ یعنی یتیم کی بہبود اور بہتری کے ارادے کے سوا اُس کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ یتیم کے مال میں صرف وہی تصرف جائز ہے جو اُس کی حفاظت اور نشوونما کی غرض سے کیا جائے اور اُسی وقت تک کیا جائے، جب تک یتیم سن رشد کو پہنچ کر اپنے مال کی ذمہ داری خود سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتا۔

۱۵۹۔ یہ ساتواں حکم ہے۔ اِس میں 'عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا' کے الفاظ یہ بتانے

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿٣٦﴾ وَلَا

انجام کے لحاظ سے بھی یہی اچھا طریقہ ہے[۱۶۰]۔ تم اُس چیز کے پیچھے نہ پڑو جسے تم جانتے نہیں ہو، اِس لیے کہ کان، آنکھ اور دل، اِن سب کی پرسش ہونی ہے[۱۶۱]۔ اور

کے لیے آئے ہیں کہ عہد صرف دو فریقوں کا باہمی معاملہ نہیں ہوتا، بلکہ اِس میں ایک تیسرا فریق کائنات کا پروردگار بھی ہوتا ہے، جس کے حضور کل ہر ایک کو جواب دہ ہونا ہے اور جس کی پکڑ سے بچنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ ہر قسم کے عہد شامل ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...ایفاے عہد کے اندر تمام چھوٹے بڑے حقوق و فرائض آ جاتے ہیں، خواہ وہ خلق سے متعلق ہوں یا خالق سے، خواہ وہ کسی تحریری معاہدے سے وجود میں آتے ہوں یا کسی نسبت، تعلق، رشتہ داری اور قرابت سے، خواہ اُن کا اظہار و اعلان ہوتا ہو یا وہ ہر اچھی سوسائٹی میں بغیر کہے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ اللہ اور رسول، ماں اور باپ، بیوی اور بچے، خویش و اقارب، کنبہ اور خاندان، پڑوسی اور اہل محلّہ، استاد اور شاگرد، نوکر اور آقا، ملک اور قوم، ہر ایک کے ساتھ ہم کسی نہ کسی ظاہری یا مخفی معاہدے کے تحت بندھے ہوئے ہیں، اور یہ بر و تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے کہ اِن تمام معاہدوں کے حقوق ادا کرنے والے بنیں۔ گویا ایفاے عہد کی اصل روح ایفاے حقوق ہے اور ایفاے حقوق انسان کے تمام چھوٹے بڑے فرائض کو محیط ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۴۲۹/۱)

۱۶۰؎ یہ آٹھواں حکم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ زمین و آسمان کو اللہ تعالیٰ نے ایک میزان پر قائم فرمایا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ انسان بھی اپنے دائرۂ اختیار میں انصاف پر قائم رہے اور ہمیشہ صحیح پیمانے سے ناپے اور ٹھیک ترازو سے تولے*۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک عظیم حکم ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے اُسی میزان انصاف کی فرع ہے جس پر یہ دنیا قائم ہے۔ چنانچہ اِس سے

---

*الرحمٰن ۵۵: ۷-۹۔

بنی اسرائیل
۱۷

تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

زمین میں اکڑ کر نہ چلو، اِس لیے کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔[۱۶۲] اِن سب باتوں کی برائی تمھارے پروردگار کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے۔ ۳۱-۳۸

انحراف اگر کوئی شخص کرتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ عدل و قسط کے تصور میں اختلال واقع ہو چکا اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کا عقیدہ باقی نہیں رہا۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ معیشت اور معاشرت کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تمدن کی کوئی اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہتی۔

[۱۶۱] یہ نواں حکم ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ کسی مسلمان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ بدگمانی کرے یا کسی پر الزام لگائے یا تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے یا محض شبہات پر افواہیں اڑائے یا اپنے پروردگار کی ذات و صفات اور احکام و ہدایات کے بارے میں ظنون و اوہام اور لاطائل قیاسات پر مبنی کوئی نقطۂ نظر اختیار کرے۔ قرآن نے متنبہ فرمایا ہے کہ اِسے کوئی معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیے، اِس لیے کہ انسان کی سماعت و بصارت اور دل و دماغ، ہر چیز کو ایک دن خدا کے حضور میں جواب دہ ہونا ہے۔

[۱۶۲] یہ دسواں حکم ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ کہ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں دیکھتے ہو کہ اُس نے تمھارے پاؤں کے نیچے یہ طویل و عریض زمین بچھا دی جس کے اوپر تمھاری حیثیت ایک بھنگے اور چیونٹی کی بھی نہیں اور جس نے یہ فلک بوس پہاڑ تمھارے آگے کھڑے کر دیے جن کے سامنے تم ایک گلہری کی بھی حیثیت نہیں رکھتے، اُس کی زمین پر اکڑنے اور اترانے کے کیا معنی؟ اپنی حیثیت پہچانو اور خدا کی عظمت اور اُس کے جلال کے آگے ہمیشہ سرفگندہ رہو۔“

(تدبر قرآن ۴/۵۰۲)

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ
اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

یہ اُنھی حکمت کی باتوں میں سے ہیں جو تمھارے پروردگار نے تمھاری طرف وحی کی ہیں[۱۶۳]۔ (اِنھیں مضبوطی سے پکڑو) اور (ایک مرتبہ پھر سن لو کہ) اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ کہ راندہ اور ملامت زدہ ہو کر جہنم میں ڈال دیے جاؤ۔ ۳۹

اِس میں خاص طور پر چلنے کا ذکر کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کی چال آدمی کے باطن کی ترجمان ہوتی ہے۔ دولت، اقتدار، حسن، علم، طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں آدمی کے اندر غرور پیدا کرتی ہیں، اُن میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اُس کی چال کے ایک مخصوص ٹائپ میں نمایاں ہوتا اور اِس بات پر دلیل بن جاتا ہے کہ اُس کا دل بندگی کے شعور سے خالی ہے اور اُس میں خدا کی عظمت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جس دل میں بندگی کا شعور اور خدا کی عظمت کا تصور ہو، وہ اُنھی لوگوں کے سینے میں دھڑکتا ہے جن پر تواضع اور فروتنی کی حالت طاری رہتی ہے۔ وہ اکڑنے اور اترانے کے بجائے سر جھکا کر چلتے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک بدترین خصلت ہے اور اِس کی سزا بھی نہایت سخت ہے۔

تورات کے احکام کی طرح یہ قرآن کے احکام عشرہ ہیں۔ تمام اخلاقیات اِنھی دس احکام کی فرع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں کو 'كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ'* یعنی بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے تعبیر کیا ہے، وہ اِنھی احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتے ہیں۔

۱۶۳ یہ قرآن نے آخر میں واضح کر دیا ہے کہ اخلاق ایمان کی فرع ہے اور قرآن کی تقسیم کے مطابق تمام اخلاقی احکام 'اُلْحِكْمَة' ہی کے تحت آتے ہیں۔ اِنھیں 'اُلْكِتٰب' کے زیرعنوان اُس وقت لایا جائے گا، جب اِن سے متعلق کوئی قانون بیان ہوگا۔

---

* الشوریٰ ۴۲: ۳۷۔ النجم ۵۳: ۳۲۔

أَفَأَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ إِنَاثًا ط إِنَّكُمْ
لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا (۴۰) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ط
وَمَا يَزِيْدُهُمْ إِلَّا نُفُوْرًا (۴۱) قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ
إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا (۴۲) سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۴۳) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ

(تم لوگوں پر تعجب ہے)، پھر کیا تمھارے پروردگار نے تمھیں تو بیٹوں کے لیے خاص کیا اور اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں لے لیں؟[۱۶۴] حقیقت یہ ہے کہ تم بڑی ہی سنگین بات کہتے ہو۔ ہم نے اِس قرآن میں طرح طرح سے سمجھا دیا ہے[۱۶۵] تاکہ یہ یاددہانی حاصل کریں، لیکن (اِن پر افسوس)، اِس سے اِن کی بے زاری ہی بڑھ رہی ہے۔ اِن سے کہو، (اے پیغمبر) کہ اگر اللہ کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہوتے، جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی کر دینے کی کوشش کرتے۔[۱۶۶] اللہ پاک اور بہت ہی برتر

---

[۱۶۴] اوپر کی ہدایات شرک کی تردید پر ختم ہوئی ہیں۔ اُسی سے بات کو آگے بڑھایا اور اُن کی دہری حماقت پر توجہ دلائی ہے کہ اول تو خدا کے شریک ٹھیرا کر حماقت کے مرتکب ہوئے، پھر اُس پر مزید ستم یہ کیا کہ خدا کے لیے اُس چیز کا انتخاب کیا جسے اپنے لیے گوارا کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔

[۱۶۵] یعنی توحید کی حقیقت بھی گوناگوں پہلوؤں سے کھول کر بتا دی ہے اور شرک کی شناعت بھی اِس طرح واضح کر دی ہے کہ غبی سے غبی آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ قرآن کا یہی اسلوب ہے جس سے وہ اپنے اجمال کی تفصیل اور اپنے معجزانہ کلام کی ایسی شرح و تفسیر بن گیا ہے کہ دنیا کی دوسری کتابوں میں اِس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔

وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا
تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾
وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ ۙ وَّجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ
يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ

ہے اُس سے جو یہ کہتے ہیں۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو اُن میں ہیں، سب اُسی کی تسبیح کرتے ہیں[۱۶۷]۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اُس کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم اُن کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔ (تمھاری یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ اِن پر آسمان ٹوٹ پڑتا، مگر) اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ بڑا ہی بردبار اور بڑا ہی درگذر فرمانے والا ہے۔ ۴۰-۴۴

(اے پیغمبر)، جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم تمھارے اور اُن لوگوں کے درمیان ایک مخفی پردہ حائل کر دیتے ہیں جو آخرت کو نہیں مانتے، اور اُن کے دلوں پر غلاف ڈال دیتے ہیں اور کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ اُس کو سمجھیں، نہ سن سکیں[۱۶۸]۔ اور جب

---

[۱۶۶] اِس لیے کہ شراکت اور وہ بھی خدائی میں شراکت اُنھیں کبھی چپکے ہو کر بیٹھنے نہ دیتی۔ وہ لازماً صاحب عرش سے نزاع اور مخاصمت کی راہ ڈھونڈتے تاکہ خود صاحب عرش بن جائیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا نظام اِس کے نتیجے میں درہم برہم ہو جاتا۔

[۱۶۷] یعنی تم جو تہمتیں چاہو، خدا پر جوڑو، لیکن زمین و آسمان تو اپنے وجود سے گواہی دے رہے ہیں کہ اللہ تمھاری اِن تہمتوں سے پاک اور بالاتر ہے۔

[۱۶۸] یہ اُس سنت الٰہی کا بیان ہے جس کے تحت جب کوئی شخص یا گروہ حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کر لیتا ہے تو کچھ عرصے کی مہلت کے بعد اُس کی وہ صلاحیت ہی سلب کر لی جاتی ہے جو

وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (۴۶) نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ
یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓی اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ
اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۴۷) اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا
فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا (۴۸)

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا (۴۹)
قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِیْدًا (۵۰) لا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ ج

تم قرآن میں تنہا اپنے پروردگار ہی کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں[۱۶۹]۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ جب وہ تمھاری طرف کان لگاتے ہیں تو جس غرض سے کان لگاتے ہیں[۱۷۰] اور خوب جانتے ہیں، جب آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں، جب وہ ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے چل رہے ہو۔ دیکھو، یہ تم پر کیسی کیسی مثالیں چست کر رہے ہیں۔ سو کھوئے گئے ہیں، اب کوئی راستہ نہیں پا رہے ہیں[۱۷۱]۔ ۴۵-۴۸

یہ کہتے ہیں کہ جب ہم (گل سڑ کر) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کہہ دو کہ تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ یا کوئی اور چیز جو

حق کو پانے اور اُس تک پہنچنے کے لیے خدا نے ہر انسان کو دے رکھی ہے۔ اُس کے بعد صرف عذاب ہی کا انتظار ہوتا ہے جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد لازماً آ جاتا ہے۔

[۱۶۹] اِس لیے کہ اپنے مزعومہ معبودوں کے بغیر وہ کسی خدا کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

[۱۷۰] یعنی اِس لیے کان نہیں لگاتے کہ اُس سے کوئی نفع حاصل کریں، بلکہ اِس لیے کان لگاتے ہیں کہ نکتہ چینی اور اعتراض کا کوئی پہلو ہاتھ آ جائے۔

[۱۷۱] یعنی حقیقت اتنی واضح ہے کہ اُس کی تردید کے لیے کوئی راستہ نہیں پا رہے ہیں۔ چنانچہ

فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ
فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰي هُوَ ؕ قُلْ عَسٰٓي اَنْ
يَّكُوْنَ قَرِيْبًا (۵۱) يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ
اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۵۲)
وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ

تمھارے خیال میں اُن سے بھی زیادہ مشکل ہو (کہ زندگی کو قبول کر سکے، پھر بھی)۔ اِس پر وہ کہیں گے: ہمیں کون لوٹائے گا؟ کہہ دو کہ وہی جس نے پہلی بار تمھیں پیدا کیا تھا۔ پھر وہ (مذاق اڑانے کے انداز میں) تمھارے آگے اپنے سر ہلائیں گے اور پوچھیں گے کہ اچھا، یہ کب ہو گا؟ کہہ دو کہ عجب نہیں کہ اِس کا وقت قریب ہی آ پہنچا ہو۔ یاد رکھو، جس دن خدا تمھیں پکارے گا تو اُس کی حمد کرتے ہوئے تم اُس کے حکم کی تعمیل کرو گے اور تمھارا گمان اُس وقت یہی ہو گا کہ تم تھوڑی ہی مدت اِس حالت میں رہے ہو[۱۷۲]۔ ۴۹-۵۲

تم میرے بندوں کو سمجھا دو، (اے پیغمبر) کہ (اِن کے جواب میں) وہی بات کہیں جو بہتر ہو[۱۷۳]۔ اِس لیے کہ یہ شیطان ہے جو (بحث کی گرما گرمی میں) اُن کے

کبھی کاہن، کبھی ساحر اور کبھی مجنون و مسحور کہہ کر گریز و فرار کے راستے تلاش کرتے ہیں۔

[۱۷۲] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ مرنے سے لے کر قیامت میں اٹھنے کے وقت تک کی مدت لوگوں کو ایسے ہی محسوس ہو گی کہ ابھی سوئے تھے اور ابھی جاگ پڑے ہیں۔

[۱۷۳] مطلب یہ ہے کہ یہ جو مثالیں چاہیں، چست کریں اور طنز و تعریض کے جو تیر چاہیں، چلائیں، تمھیں اِن کے جواب میں کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جو خلاف حق ہو یا جس میں حدود

بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

درمیان فساد کی اکساہٹ پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ (میرے بندو، لوگوں کے لیے جنت اور جہنم کے فیصلے نہ سناؤ)۔ تمھارا پروردگار تمھیں بھی خوب جانتا ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو (رحم کا مستحق سمجھ کر) تم پر رحم فرمائے گا یا چاہے گا تو (عذاب کا مستحق سمجھ کر) تمھیں عذاب دے گا۔[۱۷۴] (تمھارا کام بھی یہی ہے، اے پیغمبر کہ اِنھیں دعوت پہنچا دو)، ہم نے تم کو اِن کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ (اِسی طرح فضیلت کی بحث میں بھی الجھنے کی ضرورت نہیں ہے)۔ زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، تمھارا پروردگار اُنھیں خوب جانتا ہے (کہ کس کا درجہ کیا ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض پیغمبروں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ داؤد کو ہم نے زبور عطا فرمائی تھی۔[۱۷۵] ۵۳-۵۵

سے تجاوز ہو جائے۔ تمھیں ہر حال میں وہی بات کہنی چاہیے جو برحق ہو اور تمھاری دعوت کے وقار کے مطابق ہو۔

[۱۷۴] یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ تم بھی خدا کے رحم و کرم پر ہو، لہٰذا دعوت دو۔ تمھارا دائرۂ عمل یہی ہے۔ تم اپنے اِس دائرے سے گزر کر خدا کے دائرے میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرو۔

[۱۷۵] یعنی اگر تمھیں قرآن جیسا شہ پارۂ علم و ادب عطا فرمایا ہے تو اِس سے پہلے اپنے پیغمبر داؤد کو بھی ہم نے ایک بے مثال مزمور عطا فرمایا تھا جس کے الفاظ دلوں پر شبنم بن کر برستے تھے

قُلِ ادۡعُوا الَّذِيۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَلَا يَمۡلِكُوۡنَ
كَشۡفَ الضُّرِّ عَنۡكُمۡ وَلَا تَحۡوِيۡلًا ﴿٥٦﴾ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ يَبۡتَغُوۡنَ
اِلٰى رَبِّهِمُ الۡوَسِيۡلَةَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ وَيَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَهٗ وَيَخَافُوۡنَ
عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحۡذُوۡرًا ﴿٥٧﴾
وَاِنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا نَحۡنُ مُهۡلِكُوۡهَا قَبۡلَ يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ اَوۡ
مُعَذِّبُوۡهَا عَذَابًا شَدِيۡدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الۡكِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا ﴿٥٨﴾

اِن[۷۶] (منکروں) سے کہو کہ اُنھیں پکار دیکھو جنھیں تم خدا کے سوا اپنا معبود سمجھتے ہو۔ پھر وہ نہ تمھاری مصیبت کو تم سے ہٹا سکیں گے، نہ اُس کو بدل سکیں گے۔ جن کو یہ پکارتے ہیں، وہ خود اپنے پروردگار کی قربت کے ذریعے ڈھونڈتے ہیں کہ اُن میں سے کون سب سے زیادہ قریب ہو جائے۔ وہ اُس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں[۷۷]۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کا عذاب ڈرنے ہی کی چیز ہے۔ ۵۶-۵۷

(یہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ) کوئی بستی[۷۸] ایسی نہیں ہے جسے ہم قیامت کے دن سے پہلے ہلاک نہ کریں یا اُس کو سخت عذاب نہ دیں۔ یہ خدا

اور داؤد جب اُسے پڑھتے تھے تو اُس کی تاثیر سے زمین کے پہاڑ اور فضا کے پرندے، سب اُن سے ہم آہنگ ہو کر خدا کی حمد و ثنا کے لیے نغمہ سرا ہو جاتے تھے۔

[۷۶] اوپر کا پیرا اثنائے کلام میں برسر موقع تنبیہ و ہدایت کے لیے ایک جملۂ معترضہ کے طور پر آ گیا تھا۔ یہاں سے کلام پھر اپنے اصل مضمون سے مربوط ہو گیا ہے۔

[۷۷] یعنی فرشتے جنھیں مشرکین خدا کے شریک ٹھیرا کر پوجتے اور اُن سے طالب مدد ہوتے تھے۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾

کے نوشتے میں لکھا ہوا ہے[۱۷۹]۔ ہم کو عذاب کی نشانیاں بھیجنے سے اِسی بات نے روک رکھا ہے کہ اگلوں نے اُنھیں جھٹلا دیا تھا۔ ثمود کو ہم نے اونٹنی (اِسی طرح کی) ایک آنکھیں کھول دینے والی نشانی کے طور پر دی تھی، لیکن اُنھوں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور اُس کی تکذیب کر دی[۱۸۰]۔ (پھر نشانیاں بھیجنے سے کیا حاصل)؟ ہم نشانیاں اِسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ (عذاب سے پہلے لوگوں کو اُن کے انجام سے) ڈرا دیں[۱۸۱]۔ ۵۸-۵۹

---

[۱۷۸] اِس سے مراد وہ بستیاں ہیں جو کسی قوم کی دولت اور اقتدار کی علامت بن جاتی ہیں، جیسے بابل، نینوا، روم، قرطبہ، بغداد، دہلی اور دور حاضر میں لندن اور واشنگٹن وغیرہ۔

[۱۷۹] مطلب یہ ہے کہ بقاے دوام کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ فنا کا قانون جس طرح افراد کے لیے ہے، اُسی طرح قوموں اور بستیوں کے لیے بھی ہے۔ چنانچہ دولت اور اقتدار کی سرمستی ہر بستی کو لازماً اِس انجام تک پہنچا دیتی ہے کہ یا تو وہ دوسری قوموں سے مغلوب ہو کر اپنی حیثیت کھو بیٹھتی اور بالآخر صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا اُس کی طرف رسول کی بعثت ہوتی ہے اور اتمام حجت کے بعد وہ خدا کے عذاب سے ہلاک ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ باری باری ہر قوم کے ساتھ یہی معاملہ کر رہا ہے اور قیامت کے دن تک کرتا رہے گا۔ یہ خدا کی غیر متبدل سنت ہے اور نوشتۂ الٰہی میں لکھ دی گئی ہے۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے حام اور سام کی اولاد اِس کے لیے منتخب کی گئی اور پچھلے پانچ سو سال سے اب یافث کی اولاد منتخب کی گئی ہے۔ یہ آخری اقوام ہیں جن پر تاریخ کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد قیامت برپا ہو جائے گی۔

[۱۸۰] اصل الفاظ ہیں: 'فَظَلَمُوْا بِهَا'۔ اِن میں 'ب' کا صلہ دلیل ہے کہ 'ظَلَمُوْا' یہاں 'كذبوا' کے مفہوم پر متضمن ہو گیا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ
اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ

تم یاد کرو، جب ہم نے (اِسی تنبیہ و تخویف کے لیے) تم سے کہا تھا کہ تمھارے پروردگار نے اِن لوگوں کو گھیرے میں لے لیا ہے[۱۸۲] (اور یہ اُس کا مذاق اڑا رہے تھے)۔ اور ہم نے جو رُویا تمھیں دکھایا، اُس کو بھی ہم نے (اِن کے اِسی رویے کی وجہ سے) اِن لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ بنا کر رکھ دیا[۱۸۳] اور اُس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے[۱۸۴]۔

۱۸۱؎ یعنی جب لوگ نہیں ڈرتے، بلکہ اور زیادہ سرکش ہو جاتے اور اُنھیں جھٹلا دیتے ہیں تو اُن کو بھیجنے سے کیا حاصل؟ اِس تجربے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تنبیہ و تخویف اِس طرح کے سرکشوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ یہ اگر قائل ہو سکتے ہیں تو اصل عذاب ہی سے قائل ہو سکتے ہیں۔

۱۸۲؎ یہ اُن آیات کی طرف اشارہ ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ سرزمین مکہ کو اب ہم اُس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے اُس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ اُس انجام کی صریح پیشین گوئی اور اُس کے حوالے سے قریش کو تنبیہ تھی جس سے وہ فتح مکہ کے موقع پر دوچار ہوئے۔*

۱۸۳؎ یہ اشارہ واقعۂ اسرا کی طرف ہے جس کا ذکر سورہ کی ابتدا میں ہوا ہے۔ اِس میں چونکہ قریش اور بنی اسرائیل، دونوں کے لیے یہ تنبیہ مضمر تھی کہ مسجد حرام کے ساتھ اب بیت المقدس کی امانت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کی جا رہی ہے، اِس لیے اِس کا بھی مذاق اڑایا گیا کہ لیجیے، اب یہ بیت المقدس پر بھی قبضہ کرنے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ استاذ امام کے الفاظ میں، جو چیز اُن کی تنبیہ و تخویف اور اُن کو اُن کے مستقبل سے آگاہ کرنے کے لیے تھی، وہ اُن کی شامت اعمال سے اُن کے لیے فتنہ بن کے رہ گئی۔

۱۸۴؎ اِس سے شجرۂ زقوم مراد ہے جس میں نہ سایہ ہو گا نہ پھل، بلکہ کانٹوں کا ایک ڈھیر ہو گا

---

* ملاحظہ ہو: الرعد ۱۳: ۴۱۔ الانبیاء ۲۱: ۴۴۔

وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿٦٠﴾
وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ
قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾ ۚ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ

ہم تو اِن کے انجام سے اِنھیں ڈرا رہے ہیں، لیکن یہ چیز اِن کی غایت سرکشی ہی میں اضافہ کیے جاتی ہے۔[۱۸۵] ۶۰

(اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اِنھوں نے ابلیس کی راہ اختیار کر لی ہے)۔

اِنھیں یاد دلاؤ، جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ سب سجدہ ریز ہو گئے، مگر ابلیس نہیں ہوا۔ اُس نے کہا: کیا میں اُس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا

جس کو دوزخی بھوک سے بے تاب ہو کر کھائیں گے تو اُن کے پیٹ میں وہ ایسی آگ لگا دے گا، جیسے اُن کے پیٹ میں پانی کھول رہا ہو۔ اِس درخت کی یہی صفت ہے جس کے لیے آیت میں 'مَلْعُوْنَۃ' کا لفظ آیا ہے۔ یعنی اُس کو خدا نے پھول، پھل اور سایے کی برکتوں والا نہیں بنایا، بلکہ اِن سب چیزوں سے محروم کر کے اپنی لعنت کا ایک نشان بنا دیا ہے۔ قرآن نے لوگوں کی تنبیہ و تخویف کے لیے جب اِس کا ذکر کیا تو قریش کے لال بجھکڑوں نے اِس کو بھی استہزا کا موضوع بنا لیا اور کہا کہ ذرا اِس شخص کو دیکھو، ایک طرف کہتا ہے کہ دوزخ میں ایسی آگ ہو گی جو پتھروں کو جلا دے گی اور دوسری طرف اُسی زبان سے خبر دے رہا ہے کہ وہاں درخت بھی اگتے ہیں۔

[۱۸۵] مطلب یہ ہے کہ اِن کا مسئلہ نشانی نہیں ہے کہ دکھا دی گئی تو ایمان لے آئیں گے۔ یہ جس مرض میں مبتلا ہیں، وہ ضد اور ہٹ دھرمی کا مرض ہے۔ اِن کی تنبیہ و تخویف کے لیے یہ سب باتیں ہم نے کی ہیں، مگر اِس سے کیا فائدہ ہوا؟ یہ تینوں مثالیں بتا رہی ہیں کہ اِس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ اِن کی سرکشی میں اضافہ ہو گیا اور ہماری اِن نشانیوں کے ساتھ اِنھوں نے بھی وہی کیا جو ثمود نے اونٹنی کے ساتھ کیا تھا۔

كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ
اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ
جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ
وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ
وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ

کیا ہے؟ اُس نے مزید کہا: دیکھ تو سہی،[۱۸۶] یہی ہے جس کو تو نے مجھ پر عزت دی ہے؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑے لوگوں کے سوا اُس کی تمام اولاد کو چٹ کر جاؤں گا۔[۱۸۷] فرمایا: اچھا تو جا، پھر اِن میں سے جو تیری پیروی کریں گے، وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں، اِس لیے کہ جہنم ہی تم سب لوگوں کے لیے پورا پورا بدلہ ہے۔ اِن میں سے جس پر تیرا بس چلے تو اپنے غوغا سے اُنھیں گھبرا لے،[۱۸۸] اُن پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا،[۱۸۹] اُن کے مال اور اولاد میں اُن کا ساجھی بن جا[۱۹۰] اور اُن سے وعدے کر

---

[۱۸۶] اصل میں 'اَرَءَ یْتَکَ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ طنز و تحقیر کے موقع پر بھی آتا ہے۔ یہاں اِسی مفہوم میں ہے۔

[۱۸۷] یعنی اپنے مقاصد کے لیے شکار کر لوں گا اور وہ صرف میرے ہو کر رہ جائیں گے۔

[۱۸۸] یہ اُس شور و غوغا کی طرف اشارہ ہے جو شیطان کے اٹھائے ہوئے لیڈر، رہنما، دانش ور اور مذہبی پیشوا حق اور اہل حق کے خلاف ہمیشہ برپا کیے رہتے ہیں۔

[۱۸۹] یعنی اپنے لشکروں کے ساتھ اُن پر حملہ آور ہو جا۔ یہ محض استعارہ نہیں ہے، بلکہ امر واقعی بھی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ شیطان کے پیرو لوگوں کو دین حق سے پھیرنے کے لیے اپنی فوجیں بھی چڑھا لائے ہیں۔

عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا ﴿۶۵﴾
رَبُّکُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ
فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا ﴿۶۶﴾ وَاِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ

لے۔[۱۹۱] حقیقت یہی ہے کہ شیطان جو وعدے اُن سے کرتا ہے، دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ میرے بندوں پر ہرگز تیرا کوئی زور نہ چلے گا اور کارسازی کے لیے، (اے پیغمبر)، تیرا پروردگار ہی کافی ہے[۱۹۲]۔ ۶۱-۶۵

(لوگو)، تمھارا پروردگار وہی ہے جو تمھارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اُس کا فضل تلاش کرو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ تمھارے حال پر بڑا مہربان

---

[۱۹۰] یہ اُس وقت ہوتا ہے، جب شیطان لوگوں کو مشرکانہ اوہام میں مبتلا کر کے توہمات کے بت تراشتا اور لوگوں کو اُن کی پرستش کے آداب سکھاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مال میں سے اُن کا حصہ نکالتے، اُن کے آستانوں پر جا کر نذریں پیش کرتے، اپنی اولاد کے نام اُن کے نام پر رکھتے اور اُن کی رضاجوئی کے لیے بعض اوقات اپنی اولاد کو قربان تک کر دیتے ہیں۔

[۱۹۱] یعنی جو وعدے کرنے ہیں، کر لے۔ یہ اُن غلط توقعات، جھوٹی امیدوں اور بے بنیاد وعدوں کی طرف اشارہ ہے جن کے سبز باغ شیطان دکھاتا ہے اور لوگوں کو اپنے جال میں پھانس لیتا ہے۔

[۱۹۲] یہ اُن لوگوں کے لیے تسلی ہے جو شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں اپنے ایمان پر قائم رہنا چاہیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یعنی اللہ کے جو بندے شیطان کے فتنوں کے علی الرغم اپنے ایمان پر قائم رہنا چاہیں گے اور اپنے آپ کو پورے اعتماد کے ساتھ اپنے رب کے حوالے کر دیں گے، خدا اُن کا کارساز ہے اور وہ کارسازی کے لیے کافی ہے۔ وہ سخت سے سخت حالات کے اندر بھی اپنے بندے کی حفاظت فرمائے گا اور اُس کے ایمان کو بچا لے گا۔“ (تدبر قرآن ۴/۵۲۱)

ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ
اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۶۷)
اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ
حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا (۶۸) اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ
تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ
ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا (۶۹)

ہے۔ تمھیں جب سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو جن کو پکارتے ہو، وہ سب بھولے بسرے ہو جاتے ہیں، صرف وہی ایک یاد رہ جاتا ہے۔ پھر وہ جب تمھیں خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو منہ موڑ جاتے ہو[۱۹۳]۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۶-۶۷

سو کیا اِس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ اُسی خشکی کی طرف لے جا کر تمھیں زمین میں دھنسا دے یا تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دے، پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ؟ یا اِس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ تمھیں دوبارہ سمندر میں لے جائے، پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے اور تمھاری ناشکری کے بدلے تم کو غرق کر دے، پھر تم اپنے لیے کوئی ایسا حمایتی نہ پاؤ جو اُس پر ہمارا پیچھا کرنے والا ہو؟ ۶۸-۶۹

---

[۱۹۳] یہ انسان کے عام رویے کی مثال دی ہے کہ ہزاروں ٹن کے وزنی جہاز جو سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے رواں دواں ہیں، سب خدا ہی کے حکم سے چل رہے ہیں۔ خدا نے یہ اہتمام اِس لیے کیا ہے کہ انسان اُس کا فضل تلاش کرے اور اُس پر خدا کا شکر گزار ہو، لیکن انسان کا المیہ یہ ہے کہ یہی جہاز کسی طوفان میں گھر جائیں تو اُسے خدا یاد آ جاتا ہے اور جوں ہی طوفان سے نکل جائیں، پھر نہ وہ طوفان اور اُس کی مصیبت یاد رہتی ہے اور نہ خدا، جس کے سامنے اُس وقت

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ
مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝۷۰
يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ
فَاُولٰۗىِٕكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۷۱ وَمَنْ كَانَ

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے اور خشکی اور تری میں اُن کو سواری عطا فرمائی ہے اور اُن کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ہے اور اپنی بہت سی مخلوقات پر اُنھیں نمایاں فضیلت دی ہے۔[۱۹۴] (اِس پر بھی وہ ناشکری کرتے ہیں)۔ اُنھیں یاد رکھنا چاہیے، جس دن ہم سب لوگوں کو اُن کے رہنماؤں سمیت بلائیں گے،[۱۹۵] پھر جن لوگوں کو اُن کا اعمال نامہ اُن کے دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا، وہی اپنا اعمال نامہ (خوشی سے) پڑھیں گے[۱۹۶]

گڑگڑا رہے تھے۔

[۱۹۴] انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت یقیناً حاصل ہے، مگر یہ فضیلت کلی نہیں ہے۔ آیت سے واضح ہے کہ بعض مخلوقات انسان پر بھی فضیلت رکھتی ہیں۔

[۱۹۵] یعنی اچھے لوگ اپنے رہنماؤں کے ساتھ اور برے لوگ اپنے رہنماؤں کے ساتھ۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”ہر گروہ کو اُن کے لیڈروں اور مقتداؤں کے ساتھ جمع کرنے میں اعزاز و تکریم کا پہلو بھی ہے اور اتمام حجت کا پہلو بھی۔ اتقیا کے لیڈر تو یہ دیکھیں گے کہ الحمدللہ جس اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے اُنھوں نے بازیاں کھیلیں، اُس کا انجام اِس شان دار صورت میں سامنے آیا اور اشرار کے لیڈر اپنی کارستانیوں کے انجام دیکھیں گے اور اُن کی پیروی کرنے والے اُن پر لعنت بھیجیں گے اور اُن کے لیے، جیسا کہ دوسرے مقام میں تصریح ہے، دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۵۲۵)

فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿٧٢﴾
وَاِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ
عَلَیْنَا غَیْرَهٗ ۖق وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ

اور اُن کے ساتھ ذرہ برابر نا انصافی نہ ہوگی۔ اِس کے برخلاف جو اِس دنیا میں اندھے بنے رہے، وہ آخرت میں بھی اندھے اور راستے سے بہت دور پڑے ہوئے ہوں گے۔[١٩٧] ۰
۷۰-۷۲

(اے پیغمبر)، قریب تھا کہ یہ اُس چیز سے ہٹا کر تم کو فتنے میں ڈال دیں جو ہم نے تمھاری طرف وحی کی ہے تاکہ اِس قرآن کے سوا تم کوئی دوسری بات ہم پر افترا کر کے پیش کرو۔[١٩٨] اگر تم ایسا کرتے تو یہ ضرور تمھیں اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر یہ بات

---

[١٩٦] اصل الفاظ ہیں: 'فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ'۔ اِن میں فعل اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ جن کا اعمال نامہ اُن کے بائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا، وہ اُس کو پڑھنا تو ایک طرف، اُس کو لیتے ہی پیٹھ پیچھے چھپانے کی کوشش کریں گے اور اپنی بدبختی پر اپنا سر اور منہ پیٹیں گے۔

[١٩٧] یعنی اُس راستے سے جو اُن کو اُن کی منزل مقصود تک لے جا سکتا تھا۔ اِس کے مقابل میں جن لوگوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور خدا کی نشانیوں سے فائدہ اٹھایا، وہ اپنی منزل کو پورے دن کی روشنی میں دیکھیں گے اور بغیر کسی رکاوٹ کے شاداں و فرحاں اُس تک پہنچ جائیں گے۔

[١٩٨] اصل الفاظ ہیں: 'وَاِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ'۔ اِن میں 'عَنْ' اشارہ کر رہا ہے کہ 'لَیَفْتِنُوْنَكَ' یہاں 'یصرفونك' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم چونکہ اِن کے ایمان کے حریص ہو، اِس لیے تمھاری اِس خواہش سے فائدہ اٹھا

كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا (۷۴) اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ
وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا (۷۵)

نہ ہوتی کہ ہم نے تمھیں مضبوط بنائے رکھا تو بعید نہیں تھا کہ تم بھی اِن کی طرف کچھ جھک پڑو۔[۱۹۹] اگر ایسا ہوتا تو ہم تمھیں زندگی اور موت، دونوں کا دہرا عذاب چکھاتے،[۲۰۰] پھر تم ہمارے مقابلے میں اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔[۲۰۱] ۷۳-۷۵

کر یہ تمھیں اِس فتنے میں ڈالنا چاہتے تھے کہ ایمان و اسلام کی طرف کچھ بڑھنے کا تاثر دے کر تمھیں آمادہ کریں کہ اپنی دعوت میں تم کچھ ترمیم کر لو اور اِس طرح یہ تم کو تمھارے موقف سے ہٹا دیں۔

۱۹۹ مطلب یہ ہے کہ اِن کی پیش کش کو سن کر تم بھی کچھ تذبذب میں پڑ گئے تھے، مگر راہ حق پر تمھاری استقامت کے صلے میں خدا کی توفیق شامل حال ہوئی اور اُس نے تمھیں اِس صورت حال سے نکال دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی کے معصوم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اُس کو کوئی تذبذب کی حالت پیش نہیں آتی یا کوئی غلط میلان اُس کے دل میں خطور نہیں کرتا، بلکہ اِس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اول تو اُس کا میلان کبھی جانب نفس میں نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ جانب خیر میں ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ جانب خیر میں بھی اگر وہ کوئی ایسا قدم اٹھاتا نظر آتا ہے جو صحیح نہیں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس سے اُس کو بچا لیتا ہے اور صحیح سمت میں اُس کی رہنمائی فرما دیتا ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۴/ ۵۲۸)

۲۰۰ یعنی دنیا میں بھی دہرا عذاب چکھاتے اور موت کے بعد آخرت میں بھی۔ یہ اُسی قاعدے پر ہے کہ جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے۔

۲۰۱ اِس میں خطاب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن عتاب کا رخ، اگر غور کیجیے تو اُنھی منکرین کی طرف ہے جو سمجھوتے کی تجویزیں لے کر آ رہے تھے۔ اُنھیں تنبیہ فرمائی ہے

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (۷۶) سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (۷۷) اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (۷۸)

یہ اِس سرزمین[۲۰۲] سے تمھارے قدم اکھاڑ دینے کے درپے ہیں تاکہ تم کو یہاں سے نکال دیں۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو تمھارے بعد یہ بھی کچھ زیادہ دیر ٹھیرنے نہ پائیں گے[۲۰۳]۔ تم سے پہلے اپنے جو رسول بھی ہم نے بھیجے ہیں، اُن کے بارے میں اِس سنت کو یاد رکھو[۲۰۴] اور ہماری اِس سنت میں تم کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ (یہ مرحلہ یقیناً مشکل ہے، سو اِس میں صبر و استقامت کے لیے) سورج ڈھلنے کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے تک نماز کا اہتمام رکھو[۲۰۵] اور خاص کر فجر کی قراءت کا[۲۰۶]، اِس لیے کہ فجر کی قراءت روبرو

کہ جس پروردگار کی دعوت کے جواب میں وہ اِس طرح کی تجویزیں پیش کر رہے ہیں، وہ اُنھیں کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔

[۲۰۲] یعنی سرزمین مکہ سے۔

[۲۰۳] اللہ کے رسول کو ہجرت پر مجبور کر دیا جائے تو اُس کے قوم کو چھوڑ کر نکلتے ہی قوم کی امان اٹھ جاتی ہے اور عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ آگے فرمایا ہے کہ یہ ایک سنت الٰہی ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ پیشین گوئی اِسی سنت کے مطابق کی گئی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے نکل جانے کے بعد حرف بہ حرف پوری ہوگئی۔

[۲۰۴] اصل میں یہ فعل محذوف ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اِس اسلوب میں فی الجملہ تخصیص ذکر کا پہلو مضمر ہوتا ہے اور براہ راست اصل چیز کو نگاہ کے سامنے کر دیتا ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ

ہوتی ہے[۲۰۷] اور رات کے ایک حصے میں بھی اِسی طرح اٹھو (اور نماز پڑھو)۔ یہ تمھارے لیے مزید برآں ہے[۲۰۸]۔ تم امید رکھو[۲۰۹] کہ تمھارا پروردگار (قیامت کے دن) تم کو اِس طرح

۲۰۵ یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشا کے اوقات میں پورے اہتمام کے ساتھ پڑھتے رہو۔ نماز کے یہ اوقات چونکہ ہر شخص کو معلوم تھے، اِس لیے بالاجمال فرمایا ہے کہ 'لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ' نماز کا اہتمام رکھو۔ اِس میں 'دُلُوْك' کا 'ل' وقت کے مفہوم میں ہے اور عربی زبان میں یہ اِس مفہوم کے لیے معروف ہے۔

۲۰۶ اصل الفاظ ہیں: 'وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ'۔ اِن سے مراد نماز فجر میں قرآن کی قراءت ہے۔ یہ بات چونکہ معطوف اور معطوف علیہ کے تعلق سے واضح تھی، اِس لیے لفظوں میں بیان نہیں ہوئی۔ لفظ 'قُرْاٰنَ' کا نصب ہمارے نزدیک تخصیص ذکر کے لیے ہے، یعنی 'أخص بالذکر قرآن الفجر'۔ اِس سے فی الجملہ طول قراءت کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے اور جہر قراءت کی طرف بھی۔ اِسی طرح یہ اسلوب نماز فجر، خاص طور پر اُس میں قرآن مجید کی قراءت کی اہمیت کو بھی واضح کرتا ہے۔

۲۰۷ یعنی اِس میں ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔ روایتوں میں اِس کی تصریح ہے*۔ یہ اِسی کی برکت ہے کہ اِس نماز میں امام اور مقتدی، دونوں کو دل و دماغ کا حضور حاصل ہوتا ہے۔

۲۰۸ اِس سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نماز تہجد کا اہتمام اُسی طرح ضروری تھا، جس طرح عام مسلمانوں کے لیے پانچ وقت کی نمازوں کا اہتمام ضروری ہے۔ اُن کے لیے یہ ایک نفل نماز ہے جس کا اہتمام اگر امت کے علما کریں گے تو دعوت کی جدوجہد میں اُن کے لیے بھی، اگر اللہ نے چاہا تو یہ نصرت الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہوگی، اِس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں اِسی پہلو سے اِس کی تاکید فرمائی ہے۔

---

* بخاری، رقم ۴۴۴۰۔ مسلم، رقم ۶۴۹۔

مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۷۹) وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (۸۰) وَقُلْ

اٹھائے کہ یہ اٹھانا محمود خلائق ہو[۲۱۰] اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار، مجھ کو جہاں داخل کرنا ہے، اِس طرح داخل کر کہ وہ عزت کا داخل کرنا ہو اور جہاں سے نکالنا ہے، اِس طرح نکال کہ وہ عزت کا نکالنا ہو اور خاص اپنے پاس سے قوت و اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔[۲۱۱]

---

[۲۰۹] اصل میں لفظ 'عَسٰی' آیا ہے۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے آتا ہے تو امید و رجا کے جس مفہوم پر یہ دلالت کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے بجائے مخاطبین سے متعلق ہو جاتی ہے۔

[۲۱۰] اصل میں 'مَقَامًا مَّحْمُوْدًا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں 'مَقَامًا' ہمارے نزدیک ظرف کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ مصدر کے معنی میں ہے اور یہاں مفعول مطلق کے طور پر آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...چونکہ لفظ 'بَعْث' اور 'مَقَام' میں معنی کا اشتراک موجود ہے، اِس لیے کہ 'بَعْث' کے معنی اٹھانے اور 'مَقَام' کے معنی کھڑے ہونے اور اٹھنے کے ہیں، اِس وجہ سے اِس کے مفعول مطلق واقع ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تمھاری مخالفت و مذمت میں یہ شور و غوغا برپا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے، لیکن تم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو، نمازوں، بالخصوص تہجد کا خاص اہتمام کرو اور یہ توقع رکھو کہ تمھارا رب تمھیں اِس حال میں اٹھائے گا کہ ایک عظیم امت کی زبانوں پر تمھارے لیے ترانۂ حمد ہو گا اور عند اللہ بھی تمھاری مساعی محمود و مشکور ہوں گی۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۵۳۱)

[۲۱۱] یہ ہجرت کی دعا ہے۔ اوپر بیان ہوا ہے کہ قریش اب آپ کو مکہ سے نکالنے کے درپے تھے۔ یہ دعا اِسی تعلق سے تلقین فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس کی تلقین بتا رہی ہے کہ بظاہر یہ ایک دعا ہے، مگر حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ایک عظیم بشارت ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اِس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے نکلنے سے پہلے ہی آپ کے داخل

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿٨١﴾
وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ لا
وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿٨٢﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ
اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ج وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَؤُسًا ﴿٨٣﴾ قُلْ كُلٌّ

اور، (اے پیغمبر)، اعلان کر دو کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، اِس لیے کہ یہ باطل مٹنے ہی والا تھا۔[٢١٢] ٧٦-٨١

ہم اِس قرآن میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، مگر اِن ظالموں کے لیے یہ (اُن کے) خسارے ہی میں اضافہ کر رہا ہے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب ہم اُس کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور پہلو بدل لیتا ہے[٢١٣] اور جب اُس کو مصیبت پہنچتی ہے تو بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔ (اِن کا حال

ہونے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ آپ کا نکلنا اور داخل ہونا، دونوں عزت و وقار اور رسوخ و استحکام کے ساتھ ہو گا اور اِس سفر میں غلبہ، اقتدار اور نصرت الٰہی کا خاص بدرقہ آپ کے ہم رکاب ہو گا۔ مزید یہ کہ آپ کا پروردگار یہ سارا انتظام اپنے پاس سے فرمائے گا۔ آیت میں 'مِنْ لَّدُنْكَ' کے الفاظ اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

[٢١٢] یعنی اِس کے لیے یہی مقدر تھا کہ ایک دن مٹ جائے۔ یہ ایک سنت الٰہی کا بیان ہے۔ ہجرت اِس کے ظہور کا دیباچہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اِس کی دعا تلقین کی گئی تو ساتھ ہی حکم ہوا کہ اب یہ اعلان بھی کر دیا جائے کہ اِس سرزمین میں باطل کو شکست ہو گی اور خدا کا رسول جو حق لے کر آیا ہے، اُس کا بول لازماً بالا ہو کر رہے گا۔ قرآن کی یہ پیشین گوئی فتح مکہ کے دن اِس شان کے ساتھ پوری ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیزے کی انی سے بیت اللہ کے اندر رکھے ہوئے بت توڑتے جاتے تھے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے۔

يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝۸۴
وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ
اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْۤ
اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝۸۶ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ

بھی یہی ہے، اِس لیے) کہہ دو کہ ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے۔ سو تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے اُنھیں جو ٹھیک سیدھے راستے پر ہیں۔[۲۱۴] ۸۲-۸۴

وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں (جو تم پر وحی کی جاتی ہے)۔[۲۱۵] اِن سے کہو، یہ روح میرے پروردگار کا ایک حکم ہے اور اِس طرح کے حقائق کا تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ (اِس میں، اے پیغمبر، تمھارے کسی ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے)۔ اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تمھاری طرف وحی کیا ہے، وہ (چھین کر) لے جائیں، پھر

---

[۲۱۳] پہلو بدل لینا اعراض کی تصویر ہے جس کے لیے آیت میں 'نَاٰبِجَانِبِهٖ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے اعراض میں نفرت، بے زاری اور غرور و تکبر کا انداز نمایاں ہوتا ہے۔

[۲۱۴] یہ تفویض کی آیت ہے، گویا ہدایت فرمائی ہے کہ موقف حق پر جمے رہو اور اِن کا معاملہ اللہ کے حوالے کر دو۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم میں سے کون سیدھے راستے پر ہے۔

[۲۱۵] آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے کہ 'رُوْح' کا لفظ یہاں وحی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں صادر ہوتی ہیں، اُن کی حقیقت قرآن میں اِسی لفظ سے بیان کی گئی ہے۔ یہ گویا امر الٰہی ہے جو کبھی لفظ اور کبھی نفس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جبریل امین بھی اِسی کا ظہور ہیں۔ چنانچہ اُن کو بھی اِسی اعتبار سے 'رُوْحُ الْقُدُس' یا 'الرُّوْح' کہا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جب قرآن نے یہ کہا کہ آپ پر ہم نے ایک روح وحی کی ہے، جس طرح کہ سورۂ شوریٰ (۴۲) کی آیت ۵۲ اور بعض دوسرے مقامات میں فرمایا ہے تو

رَبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿٨٧﴾ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿٨٨﴾

اِس کے لیے تم ہمارے مقابلے میں اپنا کوئی مددگار نہ پاؤ، مگر یہ صرف تمھارے پروردگار کی رحمت ہے (کہ تم اِس سے سرفراز ہوئے ہو)۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا فضل تمھارے اوپر بہت بڑا ہے۔[۲۱۶] کہہ دو کہ اگر سارے انسان اور سارے جن اکٹھے ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تو اِس جیسا قرآن نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔[۲۱۷] ۸۵-۸۸

منکرین نے اِسے استہزا کا موضوع بنا لیا اور پوچھا کہ یہ روح کیا چیز ہے جو تم پر نازل کی جاتی ہے؟ قرآن نے یہ اِسی سوال کا حوالہ دیا ہے۔

[۲۱۶] اِن آیتوں میں خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن جو بات فرمائی ہے، وہ اُنھی لوگوں کو سنانا مقصود ہے جن کا سوال اوپر نقل ہوا ہے۔ اُن سے کہا گیا ہے کہ یہ کلام نہ پیغمبر نے گھڑا ہے، نہ اِس کے نزول میں اُس کی کسی کوشش کو کوئی دخل ہے۔ یہ سراسر ہمارا تصرف اور ہماری عنایت ہے اور اگر ہم اِس کو چھین لیں تو پیغمبر کی طاقت نہیں ہے کہ وہ اِس طرح کا کلام تصنیف کر کے پیش کر سکے۔

[۲۱۷] یہ چیلنج اِس لحاظ سے ہے کہ اپنی ہدایت، مضامین و مباحث اور اپنے اسلوب بیان اور طرز استدلال کے لحاظ سے قرآن جس شان کا کلام ہے، اُس شان کی کوئی چیز تمام جن و انس مل کر بھی زور لگائیں تو کبھی پیش نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے چودہ سو سال میں کوئی شخص کبھی اِس کی جسارت نہیں کر سکا۔ اِس طرح کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں، وہ سب قرآن کو سامنے رکھ کر اُس کے اسلوب کی نقالی کی کوششیں ہیں جو بجائے خود اعتراف عجز ہے۔ تاہم یہ کوششیں بھی سراسر ناکام ہوئیں اور اُن کے کرنے والے مضحکہ بن کر رہ گئے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؗ فَاَبٰۤى
اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ
لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ
فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ
عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ
بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى
تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کے لیے طرح طرح سے ہر قسم کی حکمت کی باتیں[۲۱۸] بیان کی ہیں، پھر بھی اکثر لوگ انکار کیے بغیر نہیں رہ رہے ہیں۔ اُنھوں نے کہہ دیا ہے کہ ہم تمھاری بات نہ مانیں گے، جب تک تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ نہ جاری کر دو یا تمھارے لیے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ پیدا نہ ہو جائے، پھر اُس کے بیچ میں تم بہت سی نہریں نہ دوڑا دو۔ یا جیسا کہ تم کہتے ہو، ہمارے اوپر ٹکڑے ٹکڑے آسمان نہ گرا دو یا اللہ اور اُس کے فرشتوں کو لا کر ہمارے سامنے کھڑا نہ کر دو۔ یا تمھارے پاس سونے کا کوئی گھر نہ ہو جائے یا (ہماری آنکھوں کے سامنے) تم آسمان میں نہ چڑھ جاؤ۔ اور ہم تمھارے چڑھنے کو بھی ماننے کے نہیں ہیں، جب تک تم (وہاں سے) ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جسے ہم پڑھیں ـــــ اِن سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار،[۲۱۹] کیا

---

[۲۱۸] لفظ 'مثل' اور 'أمثال' عربی محاورے میں علم و حکمت کی باتوں کے لیے بھی آتا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یہ اِسی مفہوم میں ہے۔

[۲۱۹] یعنی اِس سے پاک ہے کہ کسی انسان کو اِس طرح کے اختیارات دے کر اپنی خدائی میں

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا
اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ
مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ قُلْ كَفٰى
بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

میں ایک انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا[۲۲۰] ہے؟ ۸۹-۹۳

جب اِن کے پاس ہدایت[۲۲۱] آ گئی تو اِن لوگوں کے ایمان لانے میں یہی چیز رکاوٹ بن گئی ہے کہ اِنھوں نے کہہ دیا کہ کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اِن سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے کہ اطمینان کے ساتھ چل پھر رہے ہوتے[۲۲۲] تو ہم آسمان سے اُن پر کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر اتار دیتے[۲۲۳]۔ کہہ دو کہ اللہ میرے اور

شریک کر لے۔

[۲۲۰] یہ ایک مختصر سا جملہ ہے، مگر اِس قدر بلیغ ہے کہ اِس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے خدا ہونے کا دعویٰ کب کیا ہے؟ میں نے کب تم سے کہا ہے کہ میں ہر چیز پر قدرت رکھتا ہوں؟ میں نے کب کہا ہے کہ زمین و آسمان میری مٹھی میں ہیں اور میں اُن میں جو تصرف چاہوں، کر سکتا ہوں؟ میں نے پہلے دن سے صرف اتنی بات کہی ہے کہ میں ایک انسان ہوں اور خدا نے مجھے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ میری اِس بات کا تمھارے اِن مطالبات سے کیا تعلق ہے؟ یہ سب تو خدا کے کام ہیں اور میں نے ایسا کوئی دعویٰ کبھی نہیں کیا ہے۔

[۲۲۱] یعنی اللہ کی ہدایت اپنے تمام دلائل و براہین کے ساتھ۔

[۲۲۲] یعنی اُسی طرح اطمینان کے ساتھ چل پھر رہے ہوتے، جس طرح انسان چل پھر رہے ہیں۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لیے تو اُن کا زمین پر آنا جانا رہتا ہی ہے، لیکن وہ اُس کے مستقل باشندے نہیں ہیں۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا
وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿٩٧﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ
بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ

تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔[۲۲۴] اِس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے بندوں کو جاننے والا ہے، وہ اُن کو دیکھ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کو اللہ (اپنے قانون کے مطابق) ہدایت سے بہرہ یاب کرے گا، وہی ہدایت پانے والا ہو گا اور جس کو وہ گم راہی میں ڈال دے گا تو ایسے گم راہوں کے لیے تم اُس کے سوا دوسرے کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔[۲۲۵] قیامت کے دن ہم اُن کو اُن کے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے اکٹھا کریں گے،[۲۲۶] اندھے، گونگے اور بہرے۔ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اُس کی آگ جب کبھی دھیمی ہونے لگے گی، ہم اُس کو اُن پر مزید بھڑکا دیں گے۔ یہ اُن کا بدلہ ہے، اِس لیے کہ اُنھوں نے ہماری آیتوں کا

---

۲۲۳ تاکہ وہ حجاب باقی رہے جو امتحان کے لیے ضروری ہے، ورنہ اگر فرشتوں کے لیے انسان اور انسانوں کے لیے فرشتے آسمان سے اترتے اور اُنھیں خدا کا پیغام پہنچاتے تو امتحان کے لیے کیا باقی رہ جاتا؟ پھر مزید یہ کہ اپنے ابنائے نوع کے لیے اسوہ اور نمونہ بھی وہی بن سکتے تھے۔

۲۲۴ یعنی اِس بات کی گواہی کے لیے کہ جانتے بوجھتے محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کر رہے ہو یا تم پر فی الواقع بات ہی واضح نہیں ہوئی ہے۔

۲۲۵ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی کا بیان ہے۔ آیت میں آگے ’عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا‘ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ اِسی لیے گم راہی میں پڑیں گے اور بالآخر جہنم کا ایندھن بن جائیں گے کہ دنیا میں اندھے، گونگے اور بہرے بنے رہے۔

۲۲۶ اصل میں ’نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن

خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ
فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾
قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَاۗىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ
خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾

انکار کیا اور کہا کہ جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو کر رہ جائیں گے تو کیا نئے سرے سے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا اُنھوں نے سوچا نہیں کہ جس خدا نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے، وہ اِس پر قدرت رکھتا ہے کہ اُن جیسے پھر پیدا کر دے؟ اور یہ حقیقت ہے کہ اُس نے اُن کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ اِس پر بھی ظالم انکار کیے بغیر نہیں رہے۔[۲۲۷] ۹۴-۹۹

(اِنھیں تعجب ہے کہ خدا نے یہ عنایت تم پر کیوں فرمائی ہے)؟ اِن سے کہو، اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمھارے ہاتھ میں ہوتے تو خرچ ہو جانے کے ڈر سے تم ضرور اُن کو روک رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی تنگ دل واقع ہوا ہے۔[۲۲۸] ۱۰۰

میں 'عَلٰی'، جس مفہوم پر دلالت کر رہا ہے، ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

[۲۲۷] یعنی اُس کے لیے تیاری کرنے کے بجائے وہ اِس طرح کی باتیں کرتے رہے کہ اُس کا وقت بتاؤ کہ کب آئے گی اور آنی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی؟ آخر کہاں رہ گئی ہے؟

[۲۲۸] مطلب یہ ہے کہ اگر تم تنگ دل ہو تو تم نے خدا کو اپنے جیسا کیوں گمان کر رکھا ہے؟ استاذ امام کے الفاظ میں، اُس نے جن خزف ریزوں کا اہل تم کو پایا، وہ تمھارے حوالے کیے اور

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾
قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ

(تم نشانیاں مانگتے ہو)۔ ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دی تھیں۔[۲۲۹] سو بنی اسرائیل سے پوچھ لو[۲۳۰] کہ جب موسیٰ اُن کے پاس آیا تو فرعون نے اُس سے یہی کہا تھا کہ اے موسیٰ، میں تو سمجھتا ہوں کہ تم پر جادو کیا گیا ہے۔[۲۳۱] موسیٰ نے جواب دیا: تم خوب جانتے ہو کہ (تمھاری) آنکھیں کھول دینے کے لیے یہ نشانیاں زمین اور آسمانوں کے پروردگار ہی نے اتاری ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اے فرعون، تم (اب) ایک ہلاکت زدہ آدمی ہو۔ اِس کے بعد فرعون نے ارادہ کر لیا کہ بنی اسرائیل کو زمین

جس فضل عظیم کے لیے میرا انتخاب فرمایا، تمھارے اور بنی اسرائیل کے علی الرغم، اُس سے مجھ کو نواز دیا ہے۔ یہ اُس کی عنایت ہے اور وہ اپنی عنایتوں کے لیے تمھارے تعصبات کی پابندی کیوں کرے گا؟ ہاں، اگر یہ سب تمھارے ہاتھ میں ہوتا تو تم یقیناً یہی کرتے کہ اِسے اپنے ہی گروہوں کے لیے جمع کر لیتے اور اِس میں سے کچھ بھی دوسروں کے پاس جانے نہ دیتے۔

[۲۲۹] اِس سے پہلے سورۂ اعراف (۷) میں اِن نشانیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ یعنی عصا جو اژدھا بن جاتا تھا، ید بیضا جو بغل سے نکلتے ہی سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا، جادوگروں کی برسرعام شکست، پورے ملک میں قحط، پھر طوفان، ٹڈی دل، سرسریوں، مینڈکوں اور خون کی آفات جو یکے بعد دیگرے نازل ہوئیں۔

[۲۳۰] اِس میں یہ لطیف تلمیح ہے کہ قرآن نے اُنھی لوگوں کو گواہی کے لیے پیش کر دیا ہے جن کی شہ پر قریش یہ معجزات کے مطالبے کر رہے تھے۔

مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ
لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾
وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا
وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ
تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ

ہی سے اکھاڑ پھینکے۔ سو ہم نے اُس کو اور جو اُس کے ساتھ تھے، سب کو غرق کر دیا اور اُس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین پر (اطمینان کے ساتھ) رہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آ جائے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کر کے لا حاضر کریں گے۔[۲۳۲] ۱۰۱-۱۰۴

ہم نے اِس قرآن کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے[۲۳۳] اور ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو صرف اِس لیے بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) خوش خبری دو اور (نہ ماننے والوں کو) متنبہ کر دو۔ اور اِس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اِس لیے نازل کیا ہے کہ تم ٹھیر ٹھیر کر اِسے لوگوں کو سناؤ اور اِسی مقصد سے ہم نے اِس کو نہایت

۲۳۱؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی قریش یہی کہتے تھے۔ چنانچہ مدعا یہ ہے کہ اگر تمھاری طلب کے مطابق معجزے دکھا بھی دیے گئے تو کیا مان لو گے؟ نہیں، اُس کے بعد بھی انکار ہی کرو گے، جس طرح کہ تم سے پہلی قوموں کے لوگ اِس طرح کی باتیں بنا کر کرتے رہے ہیں۔

۲۳۲؎ یہ قرآن نے اپنے اسلوب کے مطابق ساتھ ہی آخرت کی یاد دہانی کر دی ہے کہ اِس وقت جو کامیابی تمھیں حاصل ہوئی ہے، اُس کی خوشی میں اُسے بھول نہ جانا، اِس لیے کہ اصلی کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہے۔

۲۳۳؎ یعنی اِس طرح اترا ہے کہ اِس میں کسی باطل کی آمیزش نہ آگے سے ہوئی ہے، نہ پیچھے

قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدة

اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔[۲۳۴] اِن سے کہہ دو کہ تم اِس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، جن لوگوں کو اِس سے پہلے (اُن کے پروردگار کی طرف سے) یہی علم دیا گیا تھا، اُنھیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار پاک ہے، (یہ اُس کا وعدہ تھا اور) ہمارے پروردگار کا وعدہ تو ہر حال میں پورا ہونا ہی تھا۔ (اِس کو سن کر) وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں اور یہ اُن کے خشوع کو اور زیادہ کر دیتا ہے۔[۲۳۵] ۱۰۵-۱۰۹

سے۔ اِس کی ہر بات قطعی ہے اور یہ علم حقیقی لے کر آیا ہے۔

[۲۳۴] یہ منکرین کے اِس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ خدا کو تو کسی تیاری کی ضرورت نہیں تھی، پھر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا جاتا ہے؟ کیا اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ حالات کے مطابق سوچتے ہیں اور جتنا تیار کر پاتے ہیں، اتنا سنا دیتے ہیں؟ فرمایا کہ یہ تمھارے حالات اور تمھاری قوت فہم کی رعایت سے ہے اور اِس لیے ہے کہ ہم اِسے بتدریج تمھارے فکر و عمل کا جزو بنانا چاہتے ہیں۔ پھر یہ بھی ملحوظ ہے کہ یہ تنبیہ و انذار اور تزکیہ و تطہیر کے جس مقصد کو سامنے رکھ کر نازل کیا گیا ہے، وہ اِسی طرح ٹھیر ٹھیر کر اور تدریج و اہتمام کے ساتھ لوگوں کو سنانے ہی سے حاصل ہو سکتا تھا، اُسے بہ یک وقت پورا قرآن تمھارے ہاتھوں میں پکڑا دینے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

[۲۳۵] یہ صالحین اہل کتاب کا ذکر ہے جو اپنے نبیوں اور صحیفوں کی پیشین گوئیوں سے واقف تھے اور اُن کی روشنی میں ایک رسول اور ایک کتاب موعود کا انتظار کر رہے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ

(انھیں اِس پر اعتراض ہے کہ تم اللہ کو رحمٰن کیوں کہتے ہو)؟[۲۳۶] اِن سے کہہ دو کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو، سب اچھے نام اُسی کے ہیں۔[۲۳۷] اور (اوپر جو نماز، اے پیغمبر، خاص تم کو پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے)، تم اپنی اُس نماز کو نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو، نہ بہت پست آواز سے، بلکہ اِن دونوں کے درمیان

> ”... یہ اِسی مبارک گروہ کی طرف اشارہ ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی کہ تم قریش اور بنی اسرائیل کے مکذبین کو سنا دو کہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، میرے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے کہ اہل علم کا ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو اِس قرآن کو سن کر بے تحاشا سجدے میں گر پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اِس ایفاے وعدہ کو دیکھ کر اُس پر گریۂ مسرت و شکر اور گریۂ خشوع کی دوگونہ کیفیت و حالت طاری ہو جاتی ہے۔ گریۂ شکر و مسرت کا پہلو تو اِس میں ظاہر ہی ہے، زیادت خشوع کا اِس میں یہ پہلو ہے کہ اِس سے آخرت کے وعدے کی از سرنو یاد دہانی ہوئی ہے کہ جس رب نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا، لازماً وہ اپنا آخرت کا وعدہ بھی پورا کر کے رہے گا۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۵۴۶)

[۲۳۶] یہ اعتراض کیوں پیدا ہوا؟ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اہل عرب بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کے لیے اللہ اور رحمٰن، دونوں نام استعمال کرتے تھے، لیکن اسم رحمٰن اہل کتاب کے ہاں زیادہ معروف تھا۔ اِس سے یہ نکتہ پیدا کر لیا گیا کہ یہ ہمارے مذہب اور ہماری روایات پر اہل کتاب کے مذہب اور روایات کو مسلط کرنے کی سازش ہے جس میں کچھ اہل کتاب در پردہ اِن کی مدد کر رہے ہیں۔

[۲۳۷] یعنی ایک رحمٰن ہی نہیں، اُس کے نام اور بھی ہیں۔ یہ محض حماقت ہے کہ کسی نام کو قبول حق کے راستے کی رکاوٹ بنا لیا جائے۔ اہل حق مجرد کسی نام کے لیے متعصب نہیں ہو سکتے، اِس لیے اللہ کہو یا رحمٰن، تم خدا کو اُس کے شایان شان ہر نام سے پکار سکتے ہو۔

سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ
شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

کا طریقہ اختیار کرو۔[۲۳۸] (تم اِسی خوب صورت طریقے سے اِس نماز کا اہتمام رکھو) اور اعلان کر دو کہ شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو نہ اولاد رکھتا ہے، نہ اُس کی بادشاہی میں اُس کا کوئی شریک ہے، نہ اُس کو ذلت کے وقت کسی مددگار کی ضرورت ہے[۲۳۹] اور تم اُس کی بڑائی بیان کرو، جس طرح کہ اُس کی بڑائی بیان کرنے کا حق ہے۔ ۱۱۰-۱۱۱

[۲۳۸] یعنی نمازِ تہجد میں، جس کا حکم خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ آیت میں ’صَلَاتِكَ‘ کا لفظ اِسی لحاظ سے آیا ہے۔ عام نمازوں سے اِس حکم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کے لیے سر و جہر کا طریقہ معلوم و معروف ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں سے جو لوگ اِس نماز کا اہتمام کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے بعد اُن کو بھی اِسی طریقے کا پابند کیا*۔ تہجد کی نماز کے لیے، اگر غور کیجیے تو یہی طریقہ ہر لحاظ سے موزوں بھی ہے۔

[۲۳۹] یہ وہی اسلوب ہے جو امرؤالقیس نے ’لا یھتدی بمنارہ‘ میں اختیار کیا ہے۔ یعنی اُس کو کوئی ذلت یا مقہوریت کبھی لاحق ہی نہیں ہوتی کہ اُس سے بچانے کے لیے اُس کو کسی حمایتی کی ضرورت پیش آئے۔

کوالالمپور

۲۰ رنومبر ۲۰۱۲ء

---

* ابوداؤد، رقم ۱۳۲۹۔ ترمذی، رقم ۴۴۷۔

الكهف - مريم

١٨ ـــ ١٩

الکہف - مریم

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع انذار و بشارت ہے جو پچھلی سورتوں سے چلا آ رہا ہے۔

پہلی سورہ —— الکہف —— میں اِس کے حقائق اُن واقعات سے مبرہن کیے گئے ہیں جن کے بارے میں قریش مکہ نے اہل کتاب، خاص طور پر نصاریٰ کے القا کیے ہوئے سوالات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتحان کی غرض سے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔

دوسری سورہ —— مریم —— میں اِن القا کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے خود اِن کے دین کی حقیقت پوری طرح واضح کر دی ہے تا کہ قریش کو متنبہ کیا جائے کہ جن کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہے، اگر اُن کی شہ پر خدا کے پیغمبر کی ناقدری کرو گے تو اندازہ کر لو کہ کتنی بڑی نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لو گے۔

دونوں سورتوں میں خطاب قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب ہجرت کا مرحلہ قریب آ گیا ہے۔

سورة الکہف

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰى عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ وَلَمۡ يَجۡعَلۡ
لَّهٗ عِوَجًا ؕ ۜ ① قَيِّمًا لِّيُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِيۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡهُ وَيُبَشِّرَ
الۡمُؤۡمِنِيۡنَ الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ ② مَّاكِثِيۡنَ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

شکر اللہ ہی کے لیے ہے[1] جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب اتاری اور اِس میں کوئی کج پیچ نہیں رکھا ہے[2]۔ ہر لحاظ سے ٹھیک اور سیدھی تاکہ جھٹلانے والوں کو[3] وہ اُس کی طرف سے ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے اور ایمان لانے والوں کو، جو نیک عمل کر رہے ہیں، خوش خبری سنا دے کہ اُن کے لیے بہت اچھا اجر ہے، جس میں[4] وہ

---

[1] یعنی اُسی کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ کسی کے حق واجب کو اقرار و اعتراف کی زبان میں بیان کرنے کا اسلوب ہے اور قرآن میں جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ لفظ و معنی کے اعتبار سے اِس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے اور نہ اِس کی رہنمائی میں صراط مستقیم سے کوئی ادنیٰ انحراف ہے کہ کوئی سلیم الفطرت انسان اُس کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔

[3] یہ الفاظ اصل میں محذوف ہیں، اِس لیے کہ آگے 'مُؤۡمِنِیۡن' کا لفظ موجود ہے جو اِن پر دلالت کر رہا ہے۔

[4] آیت میں 'فِیۡهِ' کی ضمیر نتیجۂ اجر کے لیے ہے، یعنی بہشت بریں جو اچھے اجر کا ثمرہ اور نتیجہ

فِيْهِ اَبَدًا ۙ③ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۗ④ مَا لَهُمْ بِهٖ
مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ
اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ⑤
فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ
اَسَفًا ⑥ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ

ہمیشہ رہیں گے۔ اُن لوگوں کو آگاہ کر دے جو کہتے ہیں کہ خدا نے اولاد بنا رکھی ہے[5]۔ اُنھیں اِس بات کا کوئی علم نہیں ہے، اُن کے باپ دادا کو بھی نہیں تھا۔ بڑی ہی سنگین بات ہے جو اُن کے مونھوں سے نکل رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ محض جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ ۱-۵

پھر اگر وہ اِس بات پر ایمان نہ لائے تو شاید تم اُن کے پیچھے اپنے آپ کو غم سے ہلاک کر ڈالو گے[6]۔ زمین پر جو کچھ ہے، اُس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے، اِس

ہو گا۔

[5] یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اِس میں مشرکین عرب اور نصاریٰ، دونوں شامل ہیں، اِس لیے کہ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنائے ہوئے تھے۔

[6] یہ نہایت دل نواز انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ یہ اگر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اِس کا سبب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ سے فرض دعوت کے ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ آپ تو اِس کے لیے اپنے آپ کو رنج و غم میں گھلائے دے رہے ہیں، جب کہ آپ کا کام صرف انذار و بشارت ہے اور اُس کا حق آپ نے ادا کر دیا ہے۔ اُس سے آگے آپ کی کوئی ذمہ داری

اَحۡسَنُ عَمَلًا ۝۷ وَاِنَّا لَجٰعِلُوۡنَ مَا عَلَیۡهَا صَعِیۡدًا جُرُزًا ۝۸

لیے کہ ہم لوگوں کا امتحان کریں کہ اُن میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے۔ (وہ اِسی زینت پر ریجھے ہوئے ہیں[۷]، دراں حالیکہ) ہم اُن سب چیزوں کو جو زمین پر ہیں، (ایک دن بالکل نابود کر کے اُس کو) ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں۔ ۶-۸

نہیں ہے۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فرض دعوت کے ادا کرنے کا احساس کس قدر شدید تھا۔

[۷] ایمان نہ لانے کا اصل سبب کیا ہے؟ یہ اُس سے پردہ اٹھایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...فرمایا کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اِس میں ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کون اپنی عقل و تمیز سے کام لے کر آخرت کا طالب بنتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ کر اِسی دنیا کا پرستار بن کر رہ جاتا ہے۔ اِس امتحان کے تقاضے سے ہم نے اِس دنیا کے چہرے پر حسن و زیبائی کا ایک پرفریب غازہ مل دیا ہے۔ اِس کے مال و اولاد، اِس کے کھیتوں کھلیانوں، اِس کے باغوں اور چمنوں، اِس کی کاروں اور کوٹھیوں، اِس کے محلوں اور ایوانوں، اِس کی صدارتوں اور وزارتوں میں بڑی کشش اور دل فریبی ہے۔ اِس کی لذتیں نقد اور عاجل اور اِس کی تلخیاں پس پردہ ہیں۔ اِس کے مقابل میں آخرت کی تمام کامرانیاں نسیہ ہیں اور اِس کے طالبوں کو اِس کی خاطر بے شمار جان کاہ مصیبتیں نقد نقد اِسی دنیا میں جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہ امتحان ایک سخت امتحان ہے۔ اِس میں پورا اترنا ہر بوالہوس کا کام نہیں ہے۔ اِس میں پورے وہی اتریں گے جن کی بصیرت اتنی گہری ہو کہ خواہ یہ دنیا اُن کے سامنے کتنی ہی عشوہ گری کرے، لیکن وہ اِس عجوزۂ ہزار داماد کو اِس کے ہر بھیس میں تاڑ جائیں اور کبھی اِس کے عشق میں پھنس کر آخرت کے ابدی انعام کو قربان کرنے پر تیار نہ ہوں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنی عقل و دل کی آنکھیں اندھی کر لی ہیں اور اپنی خواہشوں کے پرستار بن کے رہ گئے ہیں، وہ اِس نقد کو آخرت کے نسیہ کے لیے قربان کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے، اگرچہ اِس کے حق ہونے پر اِس کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے۔“ (تدبر قرآن ۴/۵۵۸)

اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ ۙ كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ﴿۹﴾ اِذۡ اَوَى الۡفِتۡيَةُ اِلَى الۡكَهۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ

کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور رقیم والے[۸] ہماری نشانیوں میں سے بہت عجیب نشانی تھے[۹]؟ اُس وقت، جب اُن نوجوانوں نے غار میں پناہ لی، پھر (اپنے پروردگار سے) دعا

۸۔ یہ لوگ اگر وہی ہیں جو مسیحی تاریخ میں سات سونے والے (The Seven Sleepers) کہے جاتے ہیں تو یہ شہر افیسس (Ephesus) کا قصہ ہے جو ترکی کے مغربی ساحل پر واقع زمانۂ قدیم کا ایک مشہور شہر تھا۔ اِس کے عظیم کھنڈر آج بھی وہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ شہر بت پرستی کا ایک بڑا مرکز تھا اور یہاں چاند دیوی کی پرستش ہوتی تھی جسے ڈائنا (Diana) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ اُسی کا عظیم الشان مندر تھا جو زمانۂ قدیم کے عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ اِس علاقے میں اُس وقت قیصر ڈیسیس (Desius) کی حکومت تھی جو ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنت روما کا فرماں روا رہا ہے۔ مسیح علیہ السلام کے پیرو اِسی کے لگ بھگ زمانے میں اپنی دعوت لے کر یہاں پہنچے۔ رومی حکمران خود بھی بت پرست تھا۔ وہ مذہب توحید کی اشاعت کو برداشت نہیں کر سکا۔ چنانچہ جو لوگ ایمان لائے، وہ بالعموم ظلم و ستم کا نشانہ بن گئے۔ جن نوجوانوں کا یہ قصہ ہے، وہ شہر کے اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور غالباً ۲۵۰ء میں کسی وقت ایمان لا کر اِس دعوت کے مبلغ بنے۔ اُنھوں نے یہ دعوت اِس زور کے ساتھ اور علانیہ پیش کی کہ پورا ماحول اُن کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ اُنھیں سنگ سار کر دیا جائے گا۔ اِس پر وہ لوگ شہر سے باہر نکل کر ایک غار میں پناہ گیر ہو گئے۔ عربی زبان میں کہف وسیع غار کو کہتے ہیں، اُنھیں اِسی بنا پر اصحاب الکہف کہا گیا ہے۔

عرب کے اہل کتاب اُنھیں اصحاب الرقیم بھی کہتے تھے۔ رقیم کو مرقوم، یعنی لکھی ہوئی چیز کے معنی میں لے کر بعض اہل علم نے اِس سے اصحاب کہف کے غار کا کتبہ اور بعض نے سیسے کی وہ لوح

رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ⑩ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى
الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ⑪ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ

کی کہ اے ہمارے رب، ہم کو تو خاص اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے اِس معاملے میں تو ہمارے لیے رہنمائی کا سامان کر دے[۱۰]۔ اِس پر کئی برس کے لیے ہم نے اُس غار میں اُن کے کانوں پر تھپک دیا[۱۱]۔ پھر ہم نے اُن کو اٹھایا تاکہ دیکھیں[۱۲] کہ دونوں

مراد لی ہے جس پر اُن کے نام اور حالات بادشاہ کے حکم سے لکھ کر شاہی خزانے میں رکھے گئے تھے۔ لیکن لوح یا کتبے کے لیے اِس لفظ کا استعمال عربی زبان میں معروف نہیں ہے، اِس وجہ سے ہمارے نزدیک راجح قول اُنھی لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ رقیم اُس عمارت کا نام تھا جو اصحاب کہف کی یادگار میں اُن کے غار پر بنائی گئی تھی اور جس کا ذکر قرآن میں آگے ہوا ہے۔

[۹] یہ خطاب عام ہے۔ واحد کے صیغے سے خطاب کا یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطبین کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً خطاب کرنا پیش نظر ہوتا ہے۔ آیت سے واضح ہے کہ قریش کو یہ قصہ اہل کتاب سے سن کر سخت تعجب ہوا اور غالباً اُنھی کے ایما سے اُنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتحان کی غرض سے اِسے آپ کے سامنے پیش کر دیا کہ دیکھیں آپ اِس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ آگے آیات ۲۲-۲۴ میں اشارہ ہے کہ یہ قصہ اُن کے سوال کے جواب میں سنایا گیا ہے۔ تاہم قرآن نے اِسے افسانوں کے حجاب سے نکال کر اِس کی اصل صورت میں اِس طرح سنایا ہے کہ سورہ کے مضمون سے پوری طرح ہم آہنگ ہو کر یہ اُس کے انذار و بشارت کا نہایت موثر ذریعہ بن گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ تم اِن غار والوں کی سرگذشت کو بہت عجیب سمجھتے ہو۔ خدا نے جو نشانیاں اپنے دین کے علم برداروں کی حفاظت کے لیے ظاہر کی ہیں، یہ بھی اُنھی میں سے ایک نشانی ہے۔ اِس طرح کی نشانیاں پہلے بھی ظاہر ہوتی رہی ہیں اور اِس وقت بھی، اگر خدا نے چاہا تو اُن اہل حق کے لیے ظاہر ہو جائیں گی جنھیں تم تعذیب کا نشانہ بنا رہے ہو۔

اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ⑫

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ
وَزِدْنٰهُمْ هُدًی ⑬ۖۗ وَّرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا

گروہوں میں سے کس نے اُن کے قیام کی مدت ٹھیک شمار کی ہے[۱۳]؟ ۹-۱۲

ہم اُن کی سرگذشت تمھیں ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں[۱۴]۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے[۱۵] اور اُن کی ہدایت میں ہم نے افزونی عطا فرمائی[۱۶] اور اُن کے

یہ خدا کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

۱۰؎ یعنی غار میں آتے ہی اللہ تعالیٰ سے رہنمائی اور استقامت کے لیے دست بدعا ہو گئے، اِس لیے کہ جوشِ حمیت کے ساتھ وہ نورِ حکمت سے بھی بہرہ یاب تھے اور خوب جانتے تھے کہ اِس طرح کے مراحل میں اہل ایمان کو کیا کرنا چاہیے۔

۱۱؎ اصل میں ’فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ عربی زبان کا محاورہ ہے جو پیار اور شفقت کے ساتھ کسی کو سلانے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس کے وجود میں آنے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ بچوں کو سلانے کے لیے بالعموم اُن کے کانوں پر تھپکتے ہیں۔

۱۲؎ اصل میں ’لِنَعْلَمَ‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس میں ’ل‘ غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے، یعنی تاکہ یہ بات اُس نتیجے تک منتہی ہو جو آگے بیان ہوا ہے اور لوگوں کے لیے یہ واقعہ بعث بعد الموت کی نشانی بن جائے۔

۱۳؎ یعنی خود اُنھوں نے یا اُس شہر کے لوگوں نے جس سے نکل کر وہ غار میں پناہ گیر ہوئے تھے۔

۱۴؎ اِس سے پہلے قرآن نے اِس سرگذشت کا خلاصہ بیان کر دیا ہے تاکہ اصل مدعا ابتدا ہی میں نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ اِس کے بعد اب یہ اُسی اجمال کی تفصیل کی جا رہی ہے۔ فرمایا کہ یہ ’بِالْحَقِّ‘ یعنی پوری صحت کے ساتھ اور اِس کے مقصد کی پوری رعایت کے ساتھ سنائی جائے گی۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا
شَطَطًا ⑭ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا يَاْتُوْنَ
عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ⑮ؕ

دل اُس وقت مضبوط کر دیے، جب وہ (توحید کی دعوت لے کر) اٹھے اور اعلان کیا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اُس کے سوا کسی دوسرے معبود کو ہرگز نہ پکاریں گے اور اگر ایسا کریں گے تو حق سے نہایت ہٹی ہوئی بات کریں گے۔ یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں کہ اِنھوں نے اُس کے سوا کچھ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ یہ اُن کے حق میں کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے؟ پھر اُن سے بڑا ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ باندھیں[۱۷]؟ ۱۳-۱۵

۱۵؎ یعنی خدا کی توحید پر ایمان لائے، اِس لیے کہ شرک کے ساتھ خدا پر ایمان درحقیقت کفر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’... یہاں ’فتیة‘ کے لفظ پر نظر رہے۔ قرآن نے اِن لوگوں کا جوانوں کے طبقے سے ہونا ظاہر کر کے وقت کے نوجوانوں، بالخصوص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے نوجوانوں کو توجہ دلا دی کہ وہ اِس سرگذشت سے سبق حاصل کریں اور اُنھی کی طرح دعوت حق کی راہ میں اپنی قوم کی عداوت سے بے پروا ہو کر چل کھڑے ہوں۔ خدا ہر مرحلے میں اُن کا ناصر و مددگار رہوگا۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/۵۶۹)

۱۶؎ یہ افزونی کس صورت میں ہوئی؟ آگے ’رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ‘ کے الفاظ اِسی کو واضح کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے ایمان کی نگہداشت کی جس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں کو قوت و عزیمت بخشی اور اِس طرح جو ہدایت اُن کو حاصل تھی، اُس میں اضافہ کر دیا۔

الکہف
۱۸

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ
يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾
وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ

(وہ یہی دعوت دیتے رہے، یہاں تک کہ لوگ اُن کی جان کے درپے ہو گئے تو بشارت ہوئی کہ) جب تم اُن سے اور اُن کے معبودوں سے، جنھیں وہ خدا کے سوا پوجتے ہیں، الگ ہو گئے ہو تو جاؤ اور فلاں غار میں جا کر پناہ لو۔ تمھارا پروردگار اپنی رحمت کا دامن تمھارے لیے پھیلا دے گا اور تمھارے اِس معاملے میں جو کچھ تمھاری ضرورت ہے، تم کو مہیا فرمائے گا۔[۱۸] ۱۶

تم سورج کو دیکھتے کہ جب نکلتا ہے تو اُن کے غار سے دائیں جانب کو بچا رہتا ہے

۱۷؎ آیت میں 'ھٰٓـؤُلَآءِ' کا لفظ جس انداز سے استعمال ہوا ہے، پھر حاضر کے بجائے غائب کے صیغے اختیار کیے گئے ہیں، یہ اُن نوجوانوں کی طرف سے اپنی قوم کے عقائد کے لیے ایک قسم کی حقارت کا اظہار ہے۔ یہ حقارت مذہب توحید پر اُن کے غیر معمولی شرح صدر اور اُس سے اُن کی غیر معمولی وابستگی کو ظاہر کرتی ہے۔

۱۸؎ یہ اُس رہنمائی کا بیان ہے جو اُنھیں اِس مرحلے میں اُن کے پروردگار کی طرف سے حاصل ہوئی اور اُن کے باطن سے ایما ہوا کہ اب قوم کو چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اِس طرح کے نازک مرحلوں میں یہ رہنمائی اہل حق کو بالعموم حاصل ہوتی رہی ہے۔ سیدہ مریم اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا واقعہ اِس کی مثالیں ہیں۔ یہ ختم نبوت سے پہلے کسی حد تک محسوس صورت میں بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ اِس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دعوت کے مخالفین جب داعی کی جان لینے کے درپے ہو جائیں تو اہل حق کے لیے یہی ہجرت کا وقت ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اِس کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو آگے کے لیے زاد و راحلہ اُن کا پروردگار خود فراہم کر

وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ

اور جب ڈوبتا ہے تو اُن سے بائیں جانب کو کترا جاتا ہے اور وہ اُس کے صحن میں پڑے ہیں۔[۱۹] یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ جس کو اللہ ہدایت دے، وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو اللہ (اپنے قانون کے مطابق)[۲۰] گم راہی میں ڈال دے تو اُس کے لیے تم کوئی مددگار راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔ ۱۷

تم اُن کو (دیکھتے تو) سمجھتے کہ جاگ رہے ہیں، حالاں کہ وہ سو رہے تھے۔ ہم اُن کو

دیتا ہے۔

[۱۹] یعنی خدا نے ایسا غار اُنھیں فراہم کر دیا جس کے اندر ہوا اور روشنی اور حرارت تو برابر پہنچتی تھی، لیکن آفتاب کی تمازت کسی طرح راہ نہیں پاتی تھی۔ آگے فرمایا کہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...اُس نے اپنی تدبیر و کارسازی سے اپنے بندوں کے لیے ایک ایسا غار مہیا فرما دیا جہاں بغیر کسی کاوش کے اُن کے لیے ساری ضروریات زندگی فراہم تھیں اور معلوم ہوتا کہ سورج بھی اُن کے پاس سے گزرتا ہے تو ادب و احترام سے گزرتا ہے کہ اُن کی خدمت کی انجام دہی کا شرف تو حاصل ہو، لیکن اُن کے آرام و سکون میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔" (تدبر قرآن ۴/ ۵۷۱)

[۲۰] یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ گم راہ وہی کیے جاتے ہیں جو اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں گم راہی کے سزاوار ہو جاتے ہیں۔

وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ
عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ⑱
وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ

دائیں اور بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے اور اُن کا کتا دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تمھاری نظر کہیں اُن پر پڑ جاتی تو اُن سے تم الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تمھارے اندر اُن کی دہشت بیٹھ جاتی۔[۲۱] ۱۸

(ہم نے جس طرح اپنی قدرت سے اُنھیں سلایا تھا)، اُسی طرح ہم نے اُن کو جگایا کہ اِس کے نتیجے میں وہ آپس میں پوچھ گچھ کریں۔[۲۲] اُن میں سے ایک پوچھنے

---

[۲۱] یہ اُس انتظام کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت کے لیے فرمایا۔ وہ سلا دیے گئے، اُن کے جسم کی حفاظت کے لیے فرشتے اُنھیں پہلو بدلواتے رہے اور اُن کے گرد و پیش ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا کہ دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ پراسرار سے لوگ ہیں؛ شاید چور، ڈاکو، راہب، سنیاسی یا جنات۔ سوئے ہوئے نہیں ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ذرا دم لینے کو لیٹ گئے ہیں اور اُن کا کتا غار کے دہانے پر اِس طرح بیٹھا ہے، گویا پہرا دے رہا ہے۔

[۲۲] سیدنا مسیح کے جن پیرووں کا ذکر پیچھے ہوا ہے، وہ ۲۵۰ء میں کسی وقت اپنے شہر افیسس سے نکل کر غار میں گئے تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اُس وقت اِس علاقے میں بت پرست بادشاہ ڈیسیس کی حکومت تھی۔ یہ لوگ کم و بیش ۱۹۶ سال سوتے رہے اور قیصر تھیوڈوسیس ثانی (Theodosius II) کی سلطنت کے اڑتیسویں سال ۴۴۶ء یا ۴۴۷ء میں بیدار ہوئے۔ اِس عرصے میں مسیحی مبلغین کی کوششوں سے رومی شہنشاہ قسطنطین (۲۷۲ء-۳۳۷ء) مسیحی ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں ساری رومی سلطنت میں مسیح علیہ السلام کا مذہب پھیل گیا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ بیدار ہوئے تو ہر طرف مسیحیت کا غلبہ تھا۔

لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا
لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ
اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ
بِكُمْ اَحَدًا ⑲ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ
فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ⑳

والے نے پوچھا: تم یہاں کتنی دیر ٹھیرے ہو گے؟ وہ بولے: ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ٹھیرے ہوں گے۔ بولے: تمھارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی دیر ٹھیرے ہو۔[۲۳] خیر، اپنے میں سے کسی کو اپنی یہ رقم[۲۴] دے کر شہر بھیجو، پھر وہ اچھی طرح دیکھے کہ پاکیزہ کھانا شہر کے کس حصے میں ملتا ہے[۲۵] اور اُس سے تمھارے لیے کچھ کھانا لے آئے۔ اُسے چاہیے کہ وہ چپکے سے جائے اور کسی کو تمھاری خبر نہ ہونے دے۔ اِس لیے کہ اگر وہ تمھاری خبر پا جائیں گے تو تمھیں سنگ سار کر دیں گے یا اپنے دین میں لوٹا لیں گے اور ایسا ہوا تو تم کبھی فلاح نہ پاؤ گے۔[۲۶] ۱۹-۲۰

---

[۲۳] یعنی بالکل وہی صورت پیدا ہو گئی جو برزخ کی زندگی سے اٹھنے کے بعد ہو گی۔

[۲۴] اصل میں لفظ 'وَرِق' آیا ہے۔ اِس کے معنی چاندی کے ہیں۔ یہ چونکہ اُس زمانے میں مسکوک اور غیر مسکوک، دونوں صورتوں میں خرید و فروخت کے لیے استعمال ہوتی تھی، اِس لیے ہم نے اِس کے لیے 'رقم' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

[۲۵] اصل میں لفظ 'اَیُّھَا' آیا ہے، یعنی 'أی أطراف المدینة' یا 'أی نواحی المدینة' اور پاکیزہ کھانے سے حلال و طیب کھانا مراد ہے۔ اُنھوں نے یہ بات اِس لیے کہی کہ جس ماحول سے نکل کر وہ گئے تھے، اُس میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ تھی، لہٰذا اِس طرح کا کھانا کسی ایسے

وَكَذٰلِكَ اَعۡثَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ
السَّاعَةَ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا ۚ اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ فَقَالُوا

ہم نے اِسی طرح (اپنی قدرت سے) لوگوں کو اُن پر مطلع کر دیا[27] تاکہ وہ جان لیں
کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے[28]۔ ذرا خیال کرو، جب

علاقے ہی سے مل سکتا تھا جہاں اِس طرح کی تمیز کرنے والے بستے ہوں۔

۲۶۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نوجوان اپنا شہر چھوڑ کر غار میں پناہ لینے کے لیے کیوں مجبور ہوئے اور جس ظلم و تشدد کے اندیشے سے یہ گھر سے نکلے، وہ کس انتہا کو پہنچ چکا تھا؟ آیت ۱۶ کے ترجمے میں اِسی بنا پر ہم نے واضح کر دیا ہے کہ ہجرت کا اشارہ اُس وقت ہوا، جب لوگ اِن کی جان کے درپے ہو گئے۔

۲۷۔ یعنی ایسے حالات پیدا کر دیے کہ لوگ اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور تحقیق و تفتیش کے نتیجے میں کسی کو شبہ نہیں رہا کہ یہ اِس زمانے کے لوگ نہیں ہیں۔ اوپر جس مسیحی روایت کا ذکر ہوا ہے، اُس میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے کہ جس شخص کو کھانا خریدنے کے لیے شہر بھیجا گیا تھا، اُس نے جب قیصر ڈیسیس کے وقت کا سکہ کھانا خریدنے کے لیے پیش کیا تو دوکان دار کو شبہ ہوا کہ شاید یہ کسی پرانے زمانے کا دفینہ نکال لایا ہے۔ اِس پر دونوں میں تکرار ہونے لگی تو لوگ جمع ہو گئے، حتیٰ کہ معاملہ حکام تک پہنچ گیا۔ وہاں جب سوالات ہوئے اور اُس شخص نے یہ سنا کہ قیصر ڈیسیس کو مرے زمانہ گزر چکا ہے تو وہ دنگ رہ گیا۔ چنانچہ کچھ دیر تک بالکل دم بخود رہا اور پھر اپنی داستان سنا دی۔ اُسے سن کر حکام بھی حیران ہوئے اور اُس کو لے کر اُس غار کی طرف چلے جہاں وہ اور اُس کے ساتھی چھپے رہے تھے۔ لوگوں کا ایک انبوہ کثیر بھی اُن کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ بات پوری طرح تحقیق ہو گئی کہ وہ فی الواقع قیصر ڈیسیس کے زمانے کے لوگ ہیں۔ نئے رومی حکمران قیصر تھیوڈوسیس کو اِس کی اطلاع دی گئی۔ وہ پیدل چل کر آیا اور آ کر اُن سے برکت لی۔ بیان کیا جاتا

ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى
اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

اُن کے معاملے میں لوگ آپس میں بحث کر رہے تھے[۲۹] تو کچھ لوگوں نے کہا: اِن کے غار پر ایک عمارت بنا دو (اور زیادہ تفتیش نہ کرو)، اِن کا پروردگار اِن کے حالات کو بہتر جانتا ہے[۳۰]۔ اِس کے برخلاف جن لوگوں کی راے اُن کے معاملے میں غالب رہی،

ہے کہ اِس کے بعد یہ ساتوں نوجوان غار میں جا کر لیٹے اور یکایک وفات پا گئے۔

۲۸ یہ واقعہ اگر اُسی دور کا ہے جس کا ذکر روایتوں میں ہوا ہے، تو اِس حسی دلیل کی ضرورت غالباً اِس لیے پیش آئی کہ اُس زمانے میں مسیحی دعوت یونان کے فلسفے اور رومی شرک و بت پرستی کی روایت سے نبرد آزما تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نشانی دکھائی تاکہ زندگی بعد موت کے معاملے میں عقلی دلائل کے ساتھ یہ حسی دلیل بھی پیش کر دی جائے۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ نئے نئے جو لوگ ہزاروں کی تعداد میں مسیحی ہوئے ہیں، اُن کے لیے دین کا یہ بنیادی عقیدہ فلسفیانہ موشگافیوں کا موضوع بن کر نہ رہ جائے۔ بائیبل اور قرآن، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں اِس طرح کے حسی دلائل اِس سے پہلے بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں۔

۲۹ یعنی اِس معاملے میں جھگڑ رہے تھے کہ کون سا گروہ یا فرقہ اُن سے نسبت کا زیادہ حق دار ہے اور اُن کے ساتھ کیا کیا جائے، اِس کے لیے کس کی راے مانی جانی چاہیے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اہل حق کے ساتھ اِس ظالم دنیا نے ہمیشہ یہی معاملہ کیا ہے۔ زندگی میں تو اُن کو لوگوں کے پتھر کھانے پڑے، لیکن مرنے کے بعد اُن کے بت پوجے گئے۔ اِن لوگوں کے ساتھ بھی مرنے کے بعد یہی ہوا کہ مختلف گروہ اور فرقے اُن کے ساتھ قرب کے مدعی بن کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۵۷۵)

۳۰ یہ بات اُنھوں نے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے کہی کہ غار والوں کے عقائد و نظریات

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ
سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ
كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۵ قف فَلَا
تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

اُنھوں نے کہا: ہم تو اِن کے غار پر ایک مسجد بنائیں گے۔[۳۱] ۲۱

اب یہ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا اور (اِن میں سے) کچھ کہیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا اُن کا کتا تھا، بالکل اٹکل پچو! اور کچھ کہیں گے کہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا۔ کہہ دو، میرا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ اُن کو تھوڑے ہی لوگ جانتے ہیں۔ چنانچہ، (اے پیغمبر)، تم اُن کے بارے میں بحث نہ کرو، الاّ یہ کہ ٹالنے کے لیے کچھ کہنا پڑے اور نہ اُن کے متعلق اُن میں سے کسی سے پوچھو[۳۲]—

اور مقام و مرتبے کو بحث و نزاع کا موضوع نہ بنایا جائے، بلکہ معاملہ خدا کے سپرد کر دیا جائے اور اُن کے غار پر ایک عام عمارت بنا دی جائے جس سے یہ جگہ محفوظ ہو جائے۔ آیت میں 'رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن میں ایک مضاف عربیت کی رو سے محذوف ہے، یعنی 'أعلم بأحوالهم'۔

[۳۱] یعنی خدا کی عبادت گاہ بنائیں گے، اِس لیے کہ یہ لوگ تنہا اُسی کے ماننے والے تھے، اُسی کی خاطر غار میں آکر چھپے تھے اور اُسی نے یہ عظیم الشان نشانی اِن کے ذریعے سے دکھائی ہے۔ اِس کے لیے اصل میں 'عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں بھی ایک مضاف ہمارے نزدیک محذوف ہے، یعنی 'علٰی کهفهم'۔ یہی صورت 'ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا' میں بھی ہے۔ صالحین کا عام طریقہ یہی رہا ہے کہ اگر کسی کی یادگار بنائی جائے تو مسجد ہی کی صورت میں بنائی جائے تاکہ جو لوگ وہاں آئیں، وہ خدا کو یاد کریں اور اُسی کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰٓی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

اور (دیکھو)، کسی معاملے کے لیے یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کردوں گا۔ (تم کچھ نہیں کر سکتے)، ہاں، اِس صورت میں کہ اللہ چاہے[۳۳]۔ اور جب تم بھول جاؤ تو فوراً اپنے پروردگار کو یاد کرو اور کہو، امید ہے کہ میرا پروردگار اِس سے بھی کم مدت میں صحیح بات کی طرف میری رہنمائی فرما دے گا[۳۴]۔ ۲۲-۲۴

۳۲؎ مطلب یہ ہے کہ اصحاب کہف کا قصہ جس پہلو سے سنا دیا گیا ہے، یہ اُس سے آخرت کا یقین حاصل کرنے کے بجائے اِس طرح کی بحثوں میں الجھیں گے کہ وہ کتنے تھے اور کتنے برس غار میں سوئے رہے؟ تم کو بھی یہ انھی بحثوں میں الجھانے کی کوشش کریں گے، لیکن تم ہرگز نہ الجھنا، بلکہ اجمالی جواب دے کر گزر جانا۔ تمھارے پروردگار نے بھی اِس طرح کی چیزوں سے اِسی لیے گریز کیا ہے کہ اِن کے شوق فضول کو اِس سے کوئی غذا نہ ملے اور وہی بات سامنے رہے جو اِس قصے کا اصلی سبق ہے۔

۳۳؎ یعنی جب تمھارے امتحان کی غرض سے اِس طرح کی باتیں پوچھی جائیں کہ اصحاب کہف کون تھے اور اُن کا کیا قصہ ہے، تو اپنی طرف سے کوئی وعدہ نہ کیا کرو۔ یہ ممکن ہے کہ کسی سوال کے متعلق خدا کی حکمت کا تقاضا یہ ہو کہ اُس کا جواب نہ دیا جائے یا جواب تو دیا جائے، مگر فوراً نہ دیا جائے۔ اِس لیے وحی کے بھروسے پر کوئی غیر مشروط وعدہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہر وعدہ خدا کی مشیت کی شرط کے ساتھ کرنا چاہیے۔

۳۴؎ یعنی بے خیالی میں ایسی کوئی بات زبان سے نکل جائے تو فوراً متنبہ ہو کر خدا کو یاد کرو اور جن سے وعدہ ہوا ہے، اُن کو بھی بتا دو کہ فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اِس معاملے کو موخر بھی کر

وَلَبِثُوْا فِیْ کَہْفِہِمْ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾
قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَہٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِہٖ
وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَہُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّلِیٍّ ۫ وَّلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

(اِسی طرح کہیں گے کہ) وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور نو سال اُس پر مزید بھی۔[۳۵] کہہ دو، اُن کے رہنے کی مدت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ زمین اور آسمانوں کا غیب اُسی کے علم میں ہے۔[۳۶] کیا ہی خوب ہے وہ دیکھنے اور سننے والا! اُس کے سوا اُن کا کوئی کارساز نہیں ہے اور اپنے اختیار میں وہ کسی کو شریک بھی نہیں کرتا۔[۳۷] ۲۵-۲۶

سکتا ہے اور چاہے تو جس کا وعدہ میں نے کیا ہے، اُس سے بھی کم مدت میں صحیح بات کی طرف میری رہنمائی کر سکتا ہے۔ یہ سب اُسی کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق جو چاہے گا، کرے گا۔ میں نہ غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ ایسا خود مختار ہوں کہ اپنی دعوت کی مصلحت کے لیے جو چاہوں، کر سکوں۔

[۳۵] اِس جملے کی ابتدا میں حرف عطف اور اِس کے بعد 'قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا' کا فقرہ اِس کا واضح قرینہ ہے کہ یہ بھی اُنھی لوگوں کے اقوال میں سے ایک قول ہے جن کا ذکر پیچھے ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اُن کی تعداد کے بارے میں یہ لوگ قیاس آرائیاں کریں گے، اُسی طرح غار میں اُن کی مدت قیام کے بارے میں بھی دعویٰ کریں گے کہ وہ تین سو نو سال اُس میں سوئے رہے۔

[۳۶] اِس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دعوے کی تصدیق نہیں کی، بلکہ اُسے بے بنیاد قرار دیا ہے۔ دور حاضر میں علم تاریخ کے محققین بھی اِسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسیحی روایتوں میں جن اصحاب کہف کا ذکر ہے، اُن کے غار میں رہنے کی مدت تین سو نو سال نہیں، بلکہ تقریباً ۱۹۶ سال تھی۔ قرآن خدا کا کلام ہے۔ وہ اگر کسی انسان کا کلام ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک ایسی بات کو

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۷) وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ
یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ
عَیْنٰکَ عَنْهُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا
قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَکَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۲۸) وَقُلِ

(تم اِن کی پروا نہ کرو، اے پیغمبر)، اور تمھارے پروردگار کی جو کتاب تمھاری طرف وحی کی جا رہی ہے، اُسے لوگوں کو سنا دو۔ خدا کے قوانین کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔ تم (اُن سے ہٹ کر کچھ چاہو گے تو) اُس کے سوا ہرگز کوئی پناہ کی جگہ نہ پاؤ گے۔[۳۸] تم اپنے آپ کو اُن لوگوں کے ساتھ جمائے رکھو جو اپنے پروردگار کی رضا جوئی میں صبح و شام اُس کو پکارتے ہیں۔ تمھاری آنکھیں دنیوی زندگی کی رونق کی خاطر اُن سے ہٹنے نہ پائیں اور تم اُن لوگوں کی بات پر دھیان نہ کرو جن کے دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیے ہیں اور جو اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہیں اور جن کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔[۳۹] اِن

قبول کرنے سے انکار کر دیتا جو لوگوں میں شہرت پا چکی تھی۔

[۳۷] پچھلے جملے میں بات اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم تک پہنچ گئی تھی۔ یہ قرآن نے اُسی کو آگے بڑھا کر تمام مشرکانہ تصورات کی نفی کر دی ہے۔

[۳۸] یعنی ہدایت و ضلالت کے لیے جو قوانین خدا نے بنا دیے ہیں، لوگ اُنھی کے مطابق ہدایت پائیں گے اور اُنھی کے مطابق گم راہی کے حوالے کیے جائیں گے۔ اُن سے ہٹ کر کوئی شخص کسی کو ہدایت نہیں دے سکتا اور کسی کو اِس کی تمنا بھی نہیں کرنی چاہیے۔

[۳۹] یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے قریش کے اغنیا اور متکبرین کو متنبہ کیا ہے کہ ہمارے

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ
اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا
يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ
اَحْسَنَ عَمَلًا ۚ ﴿٣٠﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ
الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا

سے کہو، تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے[۴۰]۔ سو جس کا جی چاہے، ایمان لائے اور جس کا جی چاہے، انکار کر دے۔ (البتہ یاد رکھو کہ) ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کے سراپردے اُن کو اپنے گھیرے میں لے لیں گے۔ اگر وہ پانی کے لیے فریاد کریں گے تو اُن کی فریاد رسی اُس پانی سے کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا۔ وہ چہروں کو بھون ڈالے گا۔ کیا ہی برا پانی ہوگا اور کیا ہی برا ٹھکانا! ۲۷-۲۹

رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے تو یقیناً ہم اُن لوگوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے جو اچھے طریقے سے عمل کریں۔ اُن کے لیے ہمیشہ رہنے والے باغ ہوں گے، اِس طرح کہ اُن کے پاؤں تلے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ اُنھیں

پیغمبر کو تمھاری ناز برداری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُن کی متاع عزیز وہی لوگ ہیں اور اُنھی کو ہونا چاہیے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ چنانچہ آپ کو بھی توجہ دلائی ہے کہ داعی حق کا کام یہی ہے کہ وہ خدا کا پیغام بے کم و کاست پہنچا دے اور اِس کے لیے اپنے مخاطبین کی دولت، اقتدار اور معاشرے میں اُن کے اثر و رسوخ کو ہرگز خاطر میں نہ لائے۔

[۴۰] اِس جملے میں مبتدا محذوف ہے، یعنی 'ھذا ھو الحق'۔

خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ
نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾
وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ
اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ؕ ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ
اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ

وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ وہ سندس اور استبرق کی سبز پوشاک پہنیں گے، تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے اُس میں بیٹھے ہوں گے۔ کیا ہی اچھا بدلہ ہے اور کیا ہی اچھا ٹھکانا[۴۱]! ۳۰-۳۱

تم اِن کے سامنے ایک مثال بیان کرو[۴۲]۔ دو شخص تھے[۴۳]۔ اُن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ[۴۴] دے رکھے تھے اور اُن کے گرداگرد کھجوروں کے درخت لگا دیے تھے اور اُن کے درمیان کھیتی کے قطعے رکھ دیے تھے۔ دونوں باغ خوب پھل لاتے، اُس میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ اور اُن کے بیچ بیچ میں ہم نے ایک نہر دوڑا دی تھی۔

---

[۴۱] اوپر دوزخ کے احوال بیان ہوئے ہیں۔ یہ اب جنت کے احوال ہیں۔ قرآن نے یہ سب چیزیں تشبیہ و تمثیل کے طریقے پر اور مخاطبین کے ذوق اور معلومات کی رعایت سے بیان کی ہیں۔ چنانچہ اہل ایمان کے صلے میں اُنھی چیزوں کو نمایاں کیا ہے جنھیں وقت کے امرا و اغنیا اپنا سرمایۂ فخر و مباہات سمجھتے تھے۔

[۴۲] یعنی قریش کے متمردین کے سامنے تاکہ وہ اِس کے آئینے میں اپنا ظاہر و باطن بھی دیکھ لیں اور اُس کشمکش کا انجام بھی جو اِس وقت برپا ہے۔

[۴۳] ایک جسے خدا نے دو باغ دیے تھے اور دوسرا اُس کا ساتھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

[۴۴] یعنی ایک نہیں، بلکہ دو۔ یہ تکمیل نعمت کے اظہار کے لیے ہے۔

لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا
وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ
اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ
اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ
مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ

اُس کے پھلوں کا موسم ہوا تو اُس نے اپنے ساتھی سے بحث کرتے ہوئے کہا: میں تم سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور میرا جتھا بھی زبردست ہے[۴۵]۔ وہ (یہ باتیں کرتے ہوئے) اپنے باغ میں داخل ہوا تو اپنی جان پر آفت ڈھا رہا تھا۔ اُس نے کہا: میں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی برباد ہو جائے گا اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی۔ تاہم میں اگر اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا بھی گیا تو جہاں لوٹ کر جاؤں گا، اِس سے بہتر جگہ ہی پاؤں گا۔ ۳۲-۳۶

اُس کے ساتھی نے اُس سے گفتگو کرتے ہوئے جواب دیا: کیا اُس ہستی کا انکار کر رہے ہو جس نے تمھیں مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر تم کو ایک پورا آدمی

---

[۴۵] یہ فقرہ بتا رہا ہے کہ اُس کے ساتھی نے اُسے نصیحت کی کہ تمھیں خدا نے یہ سب کچھ عطا فرمایا ہے تو اُس کے شکر گزار بندے بنو، ورنہ اندیشہ ہے کہ اُس کے قہر و غضب کا نشانہ بن جاؤ گے۔ لیکن اُس نے جواب میں بحث شروع کر دی کہ میرے مقابلے میں ذرا اپنا حال دیکھو۔ تمھارے پاس کچھ بھی نہیں اور اِس کے باوجود مجھے ڈرا رہے ہو۔ یہ جو کچھ مجھے میسر ہے، یہ خود اِس بات کی شہادت ہے کہ میرا طرزِ عمل تم سے زیادہ صحیح ہے۔

رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ
مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ ۚ
فَعَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا

بنا کھڑا کیا؟[۴۶] (تم جو چاہے کہو)، لیکن (میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ) میرا رب وہی اللہ ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیراتا۔[۴۷] تم جب اپنے باغ میں داخل ہو رہے تھے تو تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ جو اللہ نے چاہا،[۴۸] اللہ کے بغیر کسی میں کوئی طاقت نہیں ہے؟ اگر تم مجھ کو دیکھتے ہو کہ میں مال و اولاد میں تم سے کم ہوں[۴۹] تو عجب نہیں کہ میرا

---

[۴۶] یہ انکار آخرت پر اُس کے ساتھی، بندۂ مومن کا معارضہ ہے۔ وہ خدا کی سچی معرفت اور اُس پر سچے ایمان سے بہرہ یاب تھا۔ چنانچہ اُس نے توجہ دلائی کہ جس خدا کی قدرت کے یہ مظاہر دیکھتے ہو، اُس کے بارے میں کس طرح خیال کرتے ہو کہ مرنے کے بعد وہ تمھیں اٹھا نہ سکے گا؟ اِس کے معنی تو یہ ہیں کہ تم درحقیقت خدا ہی کا انکار کر رہے ہو۔

[۴۷] استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”یہ بندۂ مومن نے اپنا عقیدہ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایمان کے لیے صرف خدا کو مان لینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ خدا ہی کو اپنا رب، پروردگار اور آقا و مالک بھی مانے۔ اگر کوئی شخص اللہ کا اقرار کرتا ہے، لیکن رب دوسروں کو بھی مانتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ اور یہ شرک بھی کفر ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے مال و جاہ پر مغرور ہے، اُس کو اپنی قابلیت کا ثمرہ و نتیجہ اور اپنے استحقاق ذاتی کا کرشمہ خیال کرتا ہے اور یہ خنّاس اُس کے دماغ میں سمایا ہوا ہے کہ اُس کو اُس سے کوئی چھین نہیں سکتا تو یہ بھی شرک ہے، اِس لیے کہ ایسا شخص اپنے آپ کو خدا کی خدائی میں ساجھی سمجھتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۵۸۶)

[۴۸] یعنی جو کچھ ہے، سب اللہ کی عنایت ہے اور اُس کی مشیت سے ملا ہے۔

مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۙ ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا
فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾
وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ
خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

پروردگار مجھے تمھارے باغ سے بہتر باغ عطا فرمائے اور تمھارے باغ پر آسمان سے کوئی ایسی گردش بھیج دے کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا اُس کا پانی زمین میں اتر جائے، پھر تم اُس کو کسی طرح پا نہ سکو۔ ۳۷-۴۱

(چنانچہ یہی ہوا) اور اُس کا سارا پھل (عذاب کے) پھیر میں آ گیا۔ سو جو کچھ اُس نے باغ پر خرچ کیا تھا، وہ اُس پر اپنے ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اُس کا باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا پڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا: اے کاش، میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراتا۔[۵۰]

۴۹ـ اصل الفاظ ہیں: 'اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا'۔ اِن میں 'اَنَا' عربیت کے اسلوب پر دو مفعولوں کے درمیان ایک فاصل کے طور پر آ گیا ہے۔ اِس کی مثالیں کلام عرب میں بھی موجود ہیں اور ہماری اپنی زبان میں بھی۔

۵۰ـ یعنی اُس وقت ہوش آیا، جب ہر چیز غارت ہو گئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...تباہ شدہ باغ ایک میت کی طرح سامنے تھا اور وہ اُس کی لاش پر کھڑا اپنے دونوں ہاتھ مل رہا تھا کہ اُس سے کچھ یافت ہونی تو الگ رہی، جو کچھ اُس کے رکھ رکھاؤ پر خرچ کیا، وہ بھی برباد ہوا۔ اُس وقت اُسے اپنے ناصح کی بات یاد آئی اور نہایت حسرت کے ساتھ بولا کہ کاش، میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا۔" (تدبر قرآن ۴/۵۸۸)

اِس آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ اے کاش، میں اپنی دولت و ثروت، جمعیت و عصبیت اور خدم و حشم کو معبود بنا کر اُن کی پرستش نہ کرتا، بلکہ اِن سب چیزوں کو اپنے پروردگار کی عنایت سمجھتا اور

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ؕ﴿۴۳﴾
هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾
وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ
فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ

اُس کے پاس کوئی جتھا نہ تھا جو خدا کے مقابلے میں اُس کی مدد کرتا[۵۱] اور نہ وہ خود (اُس کا) بدلہ لے سکتا تھا۔ اُس وقت[۵۲] سارا اختیار صرف خداے برحق کا تھا۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اُسی کا اجر بہتر ہے اور جس انجام تک وہ پہنچائے، وہی سب سے اچھا انجام ہے۔ ۴۲-۴۴

(یہ جس پر ریجھے ہوئے ہیں)، اِنھیں اُس دنیوی زندگی کی مثال سناؤ۔ یہ ایسی ہے جیسے پانی ہو جسے ہم نے آسمان سے (بارش برسا کر) اتارا، پھر اُس سے زمین کی نباتات خوب گھنی ہوئیں، پھر چورا ہو کر رہ گئیں جسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے[۵۳]۔ یہ مال اور بیٹے[۵۴] اِسی دنیوی زندگی کی رونق ہیں۔ حقیقت

اُس کا شکر گزار ہوتا۔

[۵۱] یہ اُس جتھے کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر پیچھے 'اَعَزُّ نَفَرًا' کے الفاظ میں ہوا ہے۔

[۵۲] یعنی جب عذاب کی گھڑی آ گئی۔

[۵۳] چنانچہ ایک دن اُس کا حکم ہو گا اور یہ دنیا کی بہار بھی اِسی طرح خزاں رسیدہ ہو کر رہ جائے گی۔ تم اِسے لازوال سمجھ کر اِس کے دیوانے ہو رہے ہو، دراں حالیکہ اِس کی کوئی چیز بھی باقی رہنے والی نہیں ہے۔

الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾
وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ
نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۚ ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا
خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾
وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ
يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ

یہ ہے کہ تمھارے پروردگار کے ہاں اجر کے لحاظ سے بہتر وہ اعمال ہیں جو اچھے اور باقی رہنے والے ہیں اور اِس لحاظ سے بھی کہ اُن سے امیدیں وابستہ کی جائیں۔ اُس دن کا خیال کرو، جب ہم پہاڑوں کو چلا دیں گے اور تم زمین کو دیکھو گے کہ بالکل عریاں ہو گئی ہے اور ہم اِن کو لا جمع کریں گے، پھر اِن میں سے کسی کو چھوڑیں گے نہیں، اور سب صفیں باندھے ہوئے تیرے پروردگار کے حضور پیش کر دیے جائیں گے —— تم ہمارے پاس آ گئے نا، جس طرح ہم نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم تمھارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کریں گے —— اُس وقت اعمال کا دفتر سامنے رکھ دیا جائے گا۔ پھر تم مجرموں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اُس میں (لکھا) ہے، وہ اُس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسا دفتر ہے کہ نہ کوئی چھوٹی بات اِس نے لکھنے سے چھوڑی ہے نہ بڑی۔ اُنھوں نے

۵۴؎ قبائلی زندگی میں مال کے ساتھ بیٹوں کی اہمیت بھی غیر معمولی تھی۔ پیچھے جس جتھے کا ذکر ہوا ہے، وہ اصلاً بیٹوں ہی سے بنتا تھا اور لوگ اِسی بنا پر کثرت اولاد کی تمنا کرتے تھے۔

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا یَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾
وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ
کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗٓ
اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَهُمْ لَکُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَآ
اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا

جو کچھ (دنیا میں) کیا تھا، سب اپنے سامنے حاضر پایا اور تیرا پروردگار (اُس دن) کسی پر کوئی ظلم نہ کرے گا۔ ۴۵-۴۹

یاد کرو، جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ سجدہ ریز ہو گئے، مگر ابلیس نہیں مانا، وہ جنوں میں سے تھا[۵۵]، سو اپنے پروردگار کے حکم سے نکل بھاگا۔ اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اُس کو اور اُس کی اولاد کو اپنا کارساز بنا رہے ہو، دراں حالیکہ وہ تمھارے دشمن ہیں[۵۶]؟ بڑا ہی برا بدل ہے جسے یہ ظالم اختیار کر رہے ہیں[۵۷]! (یہ اُن کو میرا شریک ٹھیرا رہے ہیں[۵۸]، جب کہ) میں نے اِن (شیطانوں) کو نہ زمین اور آسمانوں کو پیدا کرتے

---

[۵۵] یعنی فرشتہ نہیں، بلکہ جن تھا۔ یہ استثنا دلیل ہے کہ جب سجدے کا حکم دیا گیا تو اُس میں فرشتوں کے ساتھ جنات بھی شامل تھے۔ وہ اُس وقت چونکہ فرشتوں کے توابع کی حیثیت رکھتے تھے، اِس لیے حکم میں مذکور نہیں ہوئے۔

[۵۶] یعنی پہلے دن سے تمھارے دشمن ہیں اور اُن کی دشمنی کو دیکھ کر بھی اُنھیں یہ حیثیت دے رہے ہو۔

[۵۷] یہ اظہار افسوس اور اظہار تعجب کا جملہ ہے اور اُن سے منہ پھیر کر ارشاد ہوا ہے۔

[۵۸] مشرکین عرب جس طرح فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر اُن کو پوجتے تھے، اُسی طرح

الکہف
۱۸

كُنتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾
وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَآءِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُم مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوٓا اَنَّهُم مُّوَاقِعُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

وقت بلایا تھا اور نہ خود اِن کو پیدا کرتے وقت بلایا تھا۔ میں ایسا نہیں ہوں کہ گم راہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنا لوں[۵۹]۔ ۵۰-۵۱

(یہ اُس دن کیا کریں گے)، جس دن خدا کہے گا کہ اب اُن کو پکارو جنھیں تم میرا شریک سمجھتے تھے؟ سو اُن کو پکاریں گے، مگر وہ اِنھیں کوئی جواب نہ دیں گے۔ ہم اُن کے درمیان ایک ہلاکت کا گڑھا حائل کر دیں گے اور یہ مجرم اُس کی آگ کو دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اُسی میں گرنے والے ہیں اور اُس سے بچنے کے لیے وہ کوئی راہ نہ پا سکیں گے۔ ۵۲-۵۳

جنوں کا رشتہ بھی خدا سے قائم کیے ہوئے تھے اور مختلف صورتوں میں اُن کی پرستش کرتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...وہ ہر وادی اور ہر پہاڑ کے الگ الگ جن اور بھوت مانتے اور اُن کی آفتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے اُن کی جے پکارتے اور اُن کو نذرانے اور چڑھاوے پیش کرتے۔ بعض جن تو اتنے خطرناک سمجھے جاتے کہ اُن کو راضی رکھنے کے لیے بدقسمت لوگ اپنی اولاد تک کی قربانی پیش کرتے۔ اُن کا وہم یہ تھا کہ اگر اِس جن کو اپنی کسی اولاد کی قربانی دے کر راضی نہ رکھا گیا تو وہ ساری اولاد کو چٹ کر جائے گا۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۵۹۶)

[۵۹] اِس جملے کا اسلوب بیان طنزیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تو اپنے کسی کام میں اُن سے کبھی کوئی مدد نہیں لی، لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ نہایت فیاضی کے ساتھ تم میری خدائی میں اُنھیں شریک

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ
الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا
اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰی وَیَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ
اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے ہر قسم کی تنبیہات[۶۰] طرح طرح سے بیان کر دی ہیں، مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے[۶۱]۔ جب اِن کے پاس ہدایت آ چکی تو اِن لوگوں کو ایمان لانے اور اپنے پروردگار سے مغفرت مانگنے سے یہی چیز روک رہی ہے کہ اگلوں کا معاملہ اِن کے لیے بھی ظاہر ہو جائے یا عذاب اِن کے سامنے آ کھڑا ہو[۶۲]۔ (اِنھیں بتاؤ کہ) رسولوں کو تو ہم صرف اِس لیے بھیجتے ہیں کہ

بنا رہے ہو کہ گویا یہ زمین و آسمان اور اِن کی مخلوقات، سب اُنھی کے تعاون سے وجود میں آئی ہیں۔

[۶۰] اصل میں لفظ 'مَثَل' آیا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو تمثیل کے اسلوب میں بیان ہوئی ہیں اور اُن کے ذریعے سے لوگوں کو عالم غیب کے حقائق پر متنبہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ تنبیہ اِس لفظ کا لازم ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۶۱] یہ بات عام صیغے سے فرمائی ہے، مگر اشارہ اُنھی مخاطبین کی طرف ہے جن سے بحث ہو رہی ہے۔

[۶۲] یعنی جہاں تک دلیل و برہان کا تعلق ہے، اُس میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی۔ قرآن نے ہر قسم کی تنبیہات سنا دی ہیں اور ہر بات گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دی گئی ہے۔ لیکن یہ ماننا نہیں چاہتے، اِس لیے مصر ہیں کہ اب عذاب ہی کو دیکھ کر مانیں گے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، قرآن اِن کے آگے مائدۂ آسمانی بچھا رہا ہے، لیکن یہ قہر آسمانی کے طلب گار ہیں۔ ایسے شامت زدوں کا بھلا کیا علاج! اِن کو معلوم نہیں ہے کہ جب عذاب الٰہی نمودار ہو گا تو وہ دیدار کر کے واپس نہیں چلا

وَمُنْذِرِيْنَ ج وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ
وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿٥٦﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ
بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ط اِنَّا جَعَلْنَا
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ط وَاِنْ تَدْعُهُمْ

بشارت دیں اور خبردار کر دیں[٦٣] اور اِن منکروں کا حال یہ ہے کہ باطل کی مدد سے کٹ حجتیاں کرتے ہیں کہ اِس کے ذریعے سے حق کو نیچا دکھائیں[٦٤] اور میری آیتوں کو اِنھوں نے مذاق بنا رکھا ہے اور اُس چیز کو بھی جس سے اِنھیں خبردار کیا گیا ہے۔ اُن سے بڑا ظالم کون ہو گا جنھیں اُن کے پروردگار کی آیتوں کے ذریعے سے یاددہانی کی جائے تو وہ اُن سے منہ پھیر لیں اور اپنے ہاتھوں کی کمائی بھول جائیں[٦٥] جو آگے بھیج چکے ہیں۔ اِن کے دلوں پر ہم نے (اِسی کے سبب سے) پردے ڈال دیے ہیں کہ اِس قرآن کو نہ سمجھیں اور

جائے گا، بلکہ اِن کا کچومر نکال کر رکھ دے گا تو اِس کے بعد یہ کس چیز پر ایمان لائیں گے؟

[٦٣] یعنی فیصلے کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو فرماں برداری کے اچھے اور نافرمانی کے برے نتائج سے خبردار کر دیں۔ مگر یہ احمق اِس سے فائدہ اٹھانے کے بجاے اُنھی برے نتائج کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں جن سے خدا کے پیغمبر اِنھیں بچانا چاہتے ہیں۔

[٦٤] یعنی جب کوئی حقیقی دلیل نہیں پاتے کہ اُس کے ذریعے سے قرآن کے انذار کو جھٹلائیں تو اِس طرح کی بے تکی باتوں سے کٹ حجتیاں کر کے اُس کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے، وہ آ کیوں نہیں جاتا اور جس قیامت کی خبر دی گئی ہے، وہ آخر کہاں رہ گئی ہے؟ آیت میں اِنھی بے اصل باتوں کو لفظ 'بَاطِل' سے تعبیر کیا ہے۔

[٦٥] یعنی اِس بات کو بھول جائیں کہ جو کچھ کر چکے ہیں، اُس کی بنا پر یہ ہر وقت عذاب الٰہی کے

اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٥٧﴾ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿٥٨﴾ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿٥٩﴾

اِن کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے کہ اِس کو نہ سنیں۔[٦٦] تم اِن کو کتنا ہی ہدایت کی طرف بلاؤ، یہ اِس حالت میں تو ہر گز کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار بڑا درگذر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ وہ اِن کے اعمال کی پاداش میں اِنھیں (اِسی وقت) پکڑنا چاہتا تو اِن پر فوراً عذاب بھیج دیتا، لیکن اِن کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ (وہ جب آ جائے گا تو) یہ اُس کے مقابل میں کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے۔ یہ بستیاں (تمھارے سامنے) ہیں۔[٦٧] جب اُن کے لوگ ظالم ہو گئے تو ہم نے اُنھیں ہلاک کر دیا اور اُن کی ہلاکت کے لیے بھی ہم نے ایک وقت مقرر کر رکھا تھا۔ ۵۴-۵۹

سزاوار ہیں۔

[٦٦] اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا'۔ اِن میں 'اَنْ' سے پہلے 'مِن' یا 'کراهة' کا لفظ عربیت کے اسلوب پر محذوف ہے۔ اِسی طرح 'فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا' کے بعد 'أن یسمعوه' کے الفاظ بھی تقابل کے قاعدے سے حذف ہو گئے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اِنھیں کھول دیا ہے۔

[٦٧] یہ مدین، ثمود، قوم لوط اور قوم سبا کے اجڑے دیاروں کی طرف اشارہ ہے جن سے اہل عرب اپنے سفروں میں گزرتے رہتے تھے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ
اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ

(اِن کے مقابل میں صبر کرو، اے پیغمبر، اور اِس کے لیے وہ واقعہ سامنے رکھو)، جب موسیٰ نے اپنے شاگرد[۶۸] سے کہا کہ میں چلتا رہوں گا، یہاں تک کہ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں[۶۹] یا اِسی طرح سال ہا سال چلتا رہوں[۷۰]۔ سو جب وہ دریاؤں کے

۶۸۔ اصل میں لفظ 'فَتٰی' استعمال ہوا ہے جس کے معنی نوجوان لڑکے کے ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ نے جس انداز سے اُس کے ساتھ گفتگو کی ہے، اُس سے واضح ہے کہ اُس کی حیثیت محض ایک خادم کی نہیں، بلکہ ایک نوجوان صحابی اور شاگرد کی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو اِس کا ترجمہ لفظ 'شاگرد' سے نہایت موزوں ہوگا۔

۶۹۔ یہ واقعہ عالم رؤیا کا بھی ہوسکتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کے رؤیا چونکہ 'بالحق' ہوتے ہیں، اِس لیے قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات بالکل اُسی طریقے سے بیان کیے جاتے ہیں، جس طرح عالم بیداری کے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدا میں دیکھیے تو واقعۂ اسرا اِسی طرح بیان ہوا ہے، مگر آگے اِسی سورہ میں قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ ایک رؤیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا۔ تاہم اِسے اگر عالم بیداری ہی کا واقعہ مانا جائے تو دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پھر وہی ہوسکتی ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریاے نیل کی دو بڑی شاخیں البحرالابیض اور البحرالازرق آکر ملتی ہیں۔ صاحب "تفہیم القرآن" نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی پوری زندگی جن علاقوں میں گزاری ہے، اُن میں اِس ایک مقام کے سوا کوئی مجمع البحرین نہیں پایا جاتا۔

۷۰۔ یہ اِس سفر کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عزم و جزم اور ذوق و شوق کا اظہار ہے اور اِس کے لفظ لفظ سے ٹپک رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

سَبِيۡلَهٗ فِى الۡبَحۡرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰٮهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدۡ
لَقِيۡنَا مِنۡ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَيۡتَ اِذۡ اَوَيۡنَاۤ اِلَى الصَّخۡرَةِ فَاِنِّىۡ
نَسِيۡتُ الۡحُوۡتَ ز وَمَاۤ اَنۡسٰنِيۡهُ اِلَّا الشَّيۡطٰنُ اَنۡ اَذۡكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ
سَبِيۡلَهٗ فِى الۡبَحۡرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبۡغِ ۖ فَارۡتَدَّا عَلٰٓى

ملنے کی جگہ پر پہنچے تو اپنی (ناشتے کی بھنی ہوئی) مچھلی[۱] بھول گئے اور اُس نے دریا میں سرنگ لگا کر اپنی راہ لی۔ پھر جب آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ اب ہمارا کھانا لاؤ۔ ہمارے اِس سفر سے تو ہم کو بڑی تکان ہو گئی۔ شاگرد نے کہا: کیا عرض کروں[۲]، جب ہم اُس چٹان کے پاس ٹھیرے ہوئے تھے تو اُس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہیں رہا اور یہ شیطان ہی تھا جس نے مجھے غافل کر دیا کہ میں اُسے یاد رکھوں[۳] اور اُس نے عجیب طریقے سے دریا میں اپنی راہ تلاش کر لی[۴]۔ موسیٰ نے کہا: یہی تو وہ جگہ ہے جو ہم

’’...فرماتے ہیں کہ میں یا تو مجمع البحرین میں اُس مقام تک پہنچ جاؤں گا، جہاں پہنچنے کے لیے مجھے ہدایت ہوئی ہے یا پھر اِسی منزل مقصود کی تلاش میں سال ہا سال گزار دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمت ہے تو اِس سفر میں ساتھ دو، ورنہ یہ بندہ تو بہر حال اِس محبوب سفر پر روانہ ہو رہا ہے اور اِس عزم کے ساتھ روانہ ہو رہا ہے کہ ـــــ یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید۔‘‘

(تدبر قرآن ۴/ ۶۰۵)

[۱] اِس کے لیے آگے لفظ ’غَدَآء‘ استعمال ہوا ہے۔ بے بھنی یا زندہ مچھلی کے لیے یہ لفظ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ اِس لیے یہ اِس بات کا واضح قرینہ ہے کہ مچھلی بھنی ہوئی تھی۔

[۲] اصل میں لفظ ’اَرَءَیْتَ‘ آیا ہے۔ یہ اِس جملے میں قائل کی جھجک کو ظاہر کر رہا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی رعایت سے کیا ہے۔

[۳] نہایت شستہ الفاظ میں یہ اپنی کوتاہی کی معذرت ہے۔

اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ۙ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ
عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ
رُشْدًا ﴿٦٦﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ

ڈھونڈ رہے تھے[۵]۔ چنانچہ وہ اپنے نقش قدم دیکھتے ہوئے لوٹے تو ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو وہاں پایا جسے ہم نے خاص اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنے پاس سے اُس کو ایک خاص علم عطا فرمایا تھا[۶]۔ ۶۰-۶۵

موسیٰ نے اُس سے درخواست کی کہ آپ مجھے اجازت دیں تو میں اِس شرط پر آپ کے ساتھ رہوں کہ جو علم[۷] آپ کو عطا ہوا ہے، آپ اُس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیں گے؟ اُس نے جواب دیا: تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے اور جو چیز تمھارے

---

[۴] یعنی واقعہ کچھ اس طرح ہوا کہ جب دونوں مجمع البحرین پہنچے تو ذرا دم لینے کے لیے کسی چٹان کے پاس ٹھیرے۔ پھر وہاں سے چلے تو شاگرد مچھلی ساتھ لینا بھول گیا۔ تھوڑا آگے چل کر اُسے یاد آیا تو اُس کو لینے کے لیے لوٹا، لیکن وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ناشتے کی بھنی ہوئی مچھلی تڑپ کر پانی میں جا رہی ہے۔ یہ واقعہ اتنا عجیب تھا کہ شاگرد نے غالباً اِس اندیشے سے اِسے حضرت موسیٰ کو نہیں بتایا کہ باور نہیں کریں گے اور شاید ناراض بھی ہوں۔

[۵] اِس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کو یہی بتایا گیا تھا کہ جس مقام پر اُن کے ناشتے کی مچھلی زندہ ہو کر دریا کی راہ لے گی، وہی اُن کی منزل مقصود ہے۔ چنانچہ وہ شاگرد کی بات سن کر پھڑک اٹھے اور فرمایا کہ اِسی کی تو تلاش تھی۔

[۶] روایتوں میں اِن کا نام خضر آیا ہے۔ اِن کے جو کام آگے بیان ہوئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً ملائکہ میں سے کوئی ہستی تھے جو انسانی صورت میں موسیٰ علیہ السلام کو ملے اور

عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ
مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ فَانْطَلَقَا وقفة حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ
اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمْ
اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا
نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾

دائرۂ علم سے باہر ہوگی، آخر تم اُس پر صبر کر بھی کس طرح سکتے ہو؟ موسیٰ نے کہا: اِن شاء اللہ، آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔ ۶۶-۶۹

اُس نے کہا: پھر اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھنا، جب تک میں خود تم سے اُس کا ذکر نہ کروں۔ بالآخر وہ دونوں چل پڑے، یہاں تک کہ جب (ایک جگہ) کشتی میں سوار ہوئے تو اُس شخص نے کشتی میں چھید کر دیا۔ موسیٰ نے کہا: آپ نے اِس میں چھید کر دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے بڑی ہی عجیب حرکت کر ڈالی ہے۔ اُس نے کہا: میں نے کہا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے؟ موسیٰ نے کہا: میں جس چیز کو بھول گیا، اُس پر میری گرفت نہ کیجیے اور

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسی نوعیت کے کاموں کے لیے مامور تھے جو آگے مذکور ہیں۔

۷۷ اصل میں لفظ 'رُشْد' آیا ہے۔ اِس کے معنی علم و حکمت کے ہیں، لیکن یہاں اِس سے مراد وہ خاص علم ہے جو اسرار کائنات سے متعلق اُس بندے کو دیا گیا تھا۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا
زَكِیَّةًۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ
لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ
بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾ فَانْطَلَقَا ۫
حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَیَاۤ اَهْلَ قَرْیَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا
فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ
لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَ بَیْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ

میرے معاملے میں مجھ پر زیادہ سختی نہ فرمائیے۔ ۷۰-۷۳

پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب (راستے میں) ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی تو اُس نے لڑکے کو قتل کر ڈالا۔ موسیٰ نے کہا: آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی، حالاں کہ اُس نے کسی کا خون نہیں کیا تھا؟ یہ تو آپ نے بہت برا کام کیا ہے۔ اُس نے کہا: میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے؟ موسیٰ نے کہا: اِس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ آپ میری طرف سے حد عذر کو پہنچ گئے۔ اِس پر دونوں آگے بڑھے، یہاں تک کہ جب ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو وہاں کے لوگوں سے کھانا کھلانے کو کہا، مگر اُنھوں نے اُن کی میزبانی سے انکار کر دیا۔ پھر اُنھوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی تو اُس نے وہ دیوار کھڑی کر دی۔ موسیٰ نے کہا: اگر آپ چاہتے تو اِس پر مزدوری لے سکتے تھے[۸۷]۔

---

[۸۷] مطلب یہ ہے کہ بستی کے لوگ تو ایسے لئیم تھے کہ اُنھوں نے ہماری درخواست پر ہمیں

بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۷۸
اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ
اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝۷۹
وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا

اُس نے کہا: اب یہ میرے اور تمھارے درمیان جدائی ہے۔ میں ابھی اُن باتوں کی حقیقت تمھیں بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہیں کر سکے ہو۔[۷۹] ۷۷-۷۸

اُس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ سو میں نے چاہا[۸۰] کہ اُسے عیب دار کر دوں، (اِس لیے کہ) اُن کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین رہا تھا۔[۸۱] ۷۹

رہا لڑکا تو اُس کے ماں باپ، دونوں ایمان والے تھے۔ سو ہمیں اندیشہ ہوا[۸۲] کہ کہیں

کھانا کھلانے سے انکار کر دیا، لیکن آپ نے اِس کے باوجود اُن کی دیوار درست کر دی۔ اِن کمینوں کے لیے آپ نے یہ محنت بے مُزد کیوں برداشت کی ہے؟ آپ اِس پر کچھ مزدوری لے سکتے تھے جس سے ہم کھانا ہی خرید لیتے۔

[۷۹] اِس سے واضح ہے کہ جدائی کا فیصلہ صرف اِس لیے نہیں ہوا کہ حضرت موسیٰ پر حجت تمام ہو گئی، بلکہ جس مقصد کے لیے یہ سفر کیا گیا تھا، وہ مقصد بھی حاصل ہو گیا۔

[۸۰] آگے وضاحت ہے کہ اُنھوں نے یہ کام اللہ کے حکم سے کیا، لیکن یہاں اُس کی نسبت اپنی طرف اِس لیے کی ہے کہ غالباً حکم صرف یہ تھا کہ کشتی کو بادشاہ کے غصب سے بچا لیا جائے۔ اِس کے لیے تدبیر کیا ہونی چاہیے؟ اِس کا فیصلہ اُنھوں نے خود کیا۔ چنانچہ اُس کو منسوب بھی اپنی طرف کیا ہے۔

[۸۱] یعنی اپنی کسی جنگی مہم کے لیے زبردستی قبضے میں کر رہا تھا۔

وَّ كُفْرًا ۚ ﴿٨٠﴾ فَاَرَدْنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾
وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ
تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ
اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖۗ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ

وہ (بڑا ہو کر) اپنی سرکشی اور کفر سے اُن کو تنگ نہ کرے۔ سو ہم نے چاہا کہ اُن کا پروردگار اُنھیں اِس کی جگہ ایسی اولاد دے جو پاکیزگی میں اِس سے بہتر اور شفقت و محبت میں اِس سے بڑھ کر ہو۔ ۸۰-۸۱

اور دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اُس کے نیچے اُن کا دفینہ تھا اور اُن کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ (یہ دفینہ اُسی نے رکھا تھا) سو تیرے پروردگار نے چاہا[۸۳] کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا دفینہ خود نکالیں[۸۴]۔ یہ تیرے پروردگار کی عنایت

۸۲؎ یہاں بھی وہی صورت ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ اُن کو حکم صرف یہ دیا گیا تھا کہ یہ لڑکا کافر ہوگا، اِس لیے اِس کو مار دیا جائے۔ اُنھوں نے اِس سے اندازہ کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے والدین پر عنایت فرمائی ہے کہ بڑا ہو کر وہ اپنی سرکشی اور کفر سے اُن کو ایذا نہ دے۔ چنانچہ اِس کے لیے 'خَشِيْنَا' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے نہیں، بلکہ اُن کے اپنے اجتہاد کی تعبیر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ رہی یہ بات کہ اُنھوں نے اِس کے لیے جمع کا صیغہ کیوں اختیار کیا؟ تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہاں اُس پوری جماعت کی نمایندگی کر رہے ہیں جو کارکنان قضا و قدر کی حیثیت سے اِنھی کاموں کے لیے مامور ہے۔ اپنے زمرے کی رعایت سے جمع کے صیغے کا استعمال ہماری زبان میں بھی عام ہے۔

۸۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَاَرَادَ رَبُّكَ'۔ یہ حکم جس طرح آگے نقل ہوا ہے، اُسی صورت میں دیا

عَنْ اَمْرِیْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾ؕ

سے ہوا۔ اور یہ جو کچھ میں نے کیا ہے، اپنی راے سے نہیں کیا ہے۔ یہ ہے اُن باتوں کی حقیقت جن پر تم صبر نہیں کر سکے ہو۔[۸۵] ۸۲

گیا اور اُنھوں نے اُس کی تعمیل کر دی۔ چنانچہ دیکھ لیجیے، یہاں فعل 'اَرَادَ' کی نسبت براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔

۸۴؎ مطلب یہ ہے کہ یہ عنایت اُن لئیموں پر نہیں کی گئی جو کسی مہمان کو کھانا کھلانے کے لیے بھی تیار نہیں ہوئے، بلکہ دو یتیموں پر کی گئی ہے کہ دیوار کے گرنے سے اُن کا خزانہ کہیں اُن لئیموں کے ہاتھ نہ لگ جائے اور اِس لیے کی گئی ہے کہ اُن کا باپ ایک صالح آدمی تھا۔

۸۵؎ یہ قصہ علم و حکمت کا ایک گنج گراں مایہ ہے۔ صبر و رضا کی تربیت کے لیے اِس سے جو اصول حکمت واضح ہوتے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک یہ کہ اِس دنیا میں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے، سب خدا کے اذن اور اُس کے ارادہ و مشیت کے تحت واقع ہوتا ہے۔ اُس کے اذن و ارادہ کے بغیر ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا۔
>
> دوسری یہ کہ خدا خیر مطلق اور حکیم ہے، اِس وجہ سے اُس کا کوئی ارادہ بھی خیر اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ اگر اہل باطل کو ڈھیل دیتا ہے تو اِس لیے نہیں کہ وہ باطل سے محبت کرتا یا اُس کے آگے بے بس اور مجبور ہے، بلکہ اُس کے اندر بھی وہ کسی خیر عظیم کی پرورش کرتا ہے۔ اِسی طرح اگر وہ اہل حق کو مصائب و آلام میں مبتلا کرتا ہے تو اِس لیے نہیں کہ اُسے اہل حق کے مصائب سے کوئی دل چسپی ہے، بلکہ وہ اِس طرح اُن کے لیے کسی بڑے خیر کی راہیں کھولتا ہے۔
>
> تیسری یہ کہ انسان کے علم کی رسائی محدود ہے، اِس وجہ سے وہ خدا کے ہر ارادہ کی حکمت کو اِس دنیا میں نہیں معلوم کر سکتا۔ اُس کے ارادوں کے تمام اسرار صرف آخرت ہی میں بے نقاب ہوں

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ

وہ تم سے ذوالقرنین[86] کے بارے میں بھی پوچھ رہے ہیں۔ اِن سے کہو، میں اُس کا کچھ

گے۔ اِس دنیا میں انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ خدا کے تمام فیصلوں پر صابر و شاکر رہتے ہوئے اپنا فرض ادا کرے اور مطمئن رہے کہ آج کی تلخیوں کے اندر جو شیرینی چھپی ہوئی ہے، اُس کے روح افزا جام اِن شاءاللہ کل سامنے آئیں گے۔" (تدبر قرآن ۵۹۹/۴)

۸۶ اِس کے لفظی معنی ہیں: دو سینگوں والا۔ یہاں اِس سے مراد غالباً قدیم ایرانی بادشاہ خسرو (Cyrus) ہے۔ اُس کا اصل نام کورش تھا۔ وہ چھٹی صدی قبل مسیح میں اپنے والد کمبوچیہ کی چھوٹی سی ریاست اَنشان کا والی مقرر ہوا۔ برسر اقتدار آتے ہی اُس کو مادا کے حکمران کے حملے کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں اُس کو فتح حاصل ہوئی۔ اُس کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور چند ہی برسوں میں اُس نے وقت کی تمام بڑی ریاستوں کو زیرنگیں کر لیا اور اُس کی سلطنت بتدریج دنیا کے دونوں کناروں (مشرق و مغرب) تک پھیل گئی۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس وقت کی پوری مہذب دنیا عملاً اُس کی تابع فرمان تھی۔ اِس سے پہلے اِس سے زیادہ وسیع اور پرشکوہ سلطنت کوئی اور قائم نہیں ہوئی تھی۔

وہ ایک صاحب ایمان اور عادل بادشاہ تھا۔ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں اُس کا نام خورس بیان کیا گیا ہے۔ یہ سائرس ہی کی ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے جو خسرو کے نام کا یونانی تلفظ ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

"خداوند اپنے ممسوح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اُس کا دہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اُس کے سامنے زیر کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں۔" (یسعیاہ ۱:۴۵)

بائیبل میں دانیال نبی کا ایک مکاشفہ نقل کیا گیا ہے، اُس میں وہ کہتے ہیں:

"تب میں نے آنکھ اٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ دونوں سینگ اونچے تھے، لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے

ذِكْرًا ﴿۸۳﴾ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾

تذکرہ ابھی تمھیں سناتا ہوں[۸۷]۔ ہم نے اُس کو زمین میں اقتدار عطا فرمایا تھا اور اُس کو ہر

> کے بعد نکلا تھا۔ میں نے اُس مینڈھے کو دیکھا کہ مغرب و شمال و جنوب کی طرف سینگ مارتا ہے، یہاں تک کہ نہ کوئی جانور اُس کے سامنے کھڑا ہو سکا اور نہ کوئی اُس سے چھڑا سکا۔“
>
> (دانی ایل ۸: ۳-۴)

اِس مکاشفے کی تعبیر جبریل علیہ السلام نے حضرت دانیال کو یہ بتائی کہ دو سینگوں سے مراد مادا اور فارس کی دو سلطنتیں ہیں جنھیں موعود بادشاہ زیرنگیں کرے گا۔ عرب کے یہود غالباً اِسی بنا پر خورس کو ذوالقرنین کہتے تھے، اِس لیے کہ یہ دونوں سلطنتیں اُس نے زیرنگیں کر لی تھیں۔ یہودیوں میں اِس ”دو سینگوں والے“ کا بڑا چرچا تھا، کیونکہ اِسی کی ٹکر نے بالآخر بابل کی سلطنت کو بھی پاش پاش کیا اور بنی اسرائیل کو اسیری سے نجات دلائی جس کے نتیجے میں یہود کے لیے ممکن ہوا کہ وہ بیت المقدس اور ہیکل کو از سر نو تعمیر کریں۔ اُس کا ایک مجسمہ ماضی قریب میں اصطخر کے نزدیک دریافت ہوا ہے جو اردشیر اول کے زمانے کا نصب کردہ ہے۔ اُس میں اُس کے تاج میں دو سینگ بھی ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی اُسی چیز کی علامت ہوں جس کی بنا پر یہود اُسے ذوالقرنین کہتے تھے۔

اُس کی جن مہمات کا ذکر آگے ہوا ہے، اُن میں سے دو مہمیں —— مشرقی اور مغربی —— تو تاریخ کی روشنی میں ثابت ہیں، اِس لیے کہ اُس کی فتوحات یقیناً مغرب میں ایشیاے کوچک اور شام کے سواحل تک اور مشرق میں باختر (بلخ) تک وسیع ہو گئی تھیں۔ مگر شمال یا جنوب میں اُس کی کسی بڑی مہم کا سراغ تاریخ میں نہیں ملتا، جب کہ قرآن اُس کا ذکر بڑی صراحت کے ساتھ کرتا ہے۔ تاہم شواہد و قرائن اِس کے بھی موجود ہیں، کیونکہ تاریخ کی رو سے خورس کی سلطنت شمال میں قفقاز تک وسیع ہو گئی تھی۔

[۸۷] آیت کی ابتدا ’سَاَتْلُوْا‘ سے ہوئی ہے اور تذکرے کے لیے اُس میں لفظ ’ذِكْر‘ آیا ہے۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ
فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّآ اَنْ

قسم کے اسباب و وسائل بخشے تھے۔ پھر اُس نے (ایک مرتبہ) ایک مہم کا سامان کیا، یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ تک پہنچا تو اُس نے سورج کو دیکھا کہ ایک سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈوب رہا ہے[۸۸] اور اُس کے پاس اُسے ایک قوم ملی۔

اِس میں، اگر غور کیجیے تو ایک قسم کی اپیل مضمر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ پوچھتے ہو تو میں اُن کی سرگذشت کا کچھ سبق آموز حصہ سناؤں گا۔ امید ہے گوش دل سے سنو گے اور اُس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ لفظ 'ذِکر' میں یاددہانی، تذکیر اور سبق آموزی کا جو مفہوم مضمر ہے، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۴/۶۱۶)

۸۸۔ اِس سے واضح ہے کہ پچھلے جملے میں سورج کے ڈوبنے کی جگہ تک پہنچنا درحقیقت مغرب کی جانب خشکی کے آخری سرے تک پہنچنے کی تعبیر ہے جس کے آگے سمندر تھا اور جہاں غروب آفتاب کے وقت ایسا نظر آتا تھا کہ گویا وہ کسی سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈوب رہا ہے۔ اِسے چشمہ غالباً اِس لیے کہا ہے کہ ایشیاے کوچک کے مغربی ساحل پر بحر ایجین چھوٹی چھوٹی خلیجوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ مغرب کی طرف اُس وقت کی تمام معلوم دنیا ذوالقرنین نے اِس مہم میں زیرنگیں کر لی تھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”یہ کیخسرو کی پہلی مہم کی طرف اشارہ ہے جو اِس کے دارالسلطنت ہک متانہ (موجودہ ہمدان) سے مغرب کے لیے ہوئی۔ اِس مہم میں اُس نے مادا (موجودہ عراق و شام) اور لیڈیا (موجودہ ترکی) کو زیرنگین کیا۔ لیڈیا کے دارالحکومت سارڈیس (نزد سمرنا) میں وہاں کے حکمران کروسس کو اُس نے شکست دی جس کو بابل، مصر اور اسپارٹا کی حکومتوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اِس مہم میں کیخسرو کے قدم بحیرۂ روم کے ساحل ہی پر جا کے رکے۔“ (تدبر قرآن ۴/۶۱۷)

تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا (۸۶) قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ
فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا (۸۷) وَاَمَّا
مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ِۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ
مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ؕ (۸۸)

ہم نے کہا: اے ذوالقرنین، (یہ تیرے اختیار میں ہیں کہ) چاہو تو اِنھیں سزا دو اور چاہو تو اِن کے بارے میں حسن سلوک کا رویہ اختیار کرو۔[۸۹] اُس نے کہا: جو اِن میں سے ظلم کرے گا، ہم اُس کو سزا دیں گے، پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ بھی اُس کو سخت سزا دے گا۔ اِس کے برخلاف جو ایمان لائے گا اور اچھا عمل کرے گا، اُس کے بدلے میں (اُس کے پروردگار کے پاس بھی) بھلائی ہے اور ہم بھی اُس کے ساتھ اپنا معاملہ آسان کریں گے۔[۹۰] ۸۳-۸۸

---

[۸۹] یہ صورت حال کی زبان سے ذوالقرنین کے اختیار و اقتدار کا بیان ہے۔ اِس کے لیے اُس کا مخاطبۂ الٰہی سے مشرف ہونا ضروری نہیں ہے۔ عربی زبان میں لفظ 'قَوْل' اِس طرح کی تعبیرات کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس فتح کے نتیجے میں ہم نے ایسا اختیار اِن لوگوں پر تمھیں دے دیا ہے کہ اب تم اِن کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہو۔ تمھارے اختیار و اقتدار میں کوئی مداخلت کرنے والا نہیں ہے۔ یہ اُسی طرح کی تعبیر ہے جو سورۂ صٓ (۳۸) کی آیت ۳۹ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے 'فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ' کے الفاظ میں آئی ہے۔ اِس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اجازت دے دی تھی کہ وہ چاہے ظلم کرے، چاہے انصاف سے کام لے۔

[۹۰] اوپر کی بات جس طرح زبان حال سے ہے، اُسی طرح یہ زبان عمل سے ہے، یعنی اُس نے اپنے رویے اور طرز عمل سے اِس بات کی شہادت دی۔ آیت میں دیکھیے تو 'سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

پھر اُس نے ایک دوسری مہم کا سامان کیا، یہاں تک کہ جب وہ طلوع آفتاب کی جگہ تک پہنچا[۹۱] تو اُس کو دیکھا کہ وہ ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جن کے لیے ہم نے آفتاب کے اِدھر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی[۹۲]۔ یہ اِسی طرح ہوا[۹۳] اور جو کچھ ذوالقرنین کے

اَمْرِنَا یُسْرًا' کے ٹکڑے میں بھی لفظ 'قَوْل' اِسی مفہوم میں ہے۔ ذوالقرنین کا ایمان و عقیدہ کیا تھا؟ یہ آیات اُس کا پتا دیتی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''اِن آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ایک مومن، موحد اور آخرت پر یقین رکھنے والا بادشاہ تھا۔ تاریخوں سے بھی اِس بات کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ سائرس زردشت کا ہم عصر اور اُس کا پیرو تھا۔ زردشت کی اصل تعلیمات میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا صحیح تصور ملتا ہے۔ اگرچہ بعد میں دوسرے مذاہب کی طرح یہ مذہب بھی تحریفات کی دست برد سے محفوظ نہیں رہا، بلکہ ثنویت کے تصورات اُس پر غالب آ گئے۔ دارا اپنے کتبوں میں اہورمزدا (اللہ) کا شکر ادا کرتا ہے۔ اپنی سلطنت کو اُس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا ہے اور اُس سے راہ راست پر قائم رہنے کی توفیق مانگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دین داری اُس کو ذوالقرنین ہی سے وراثت میں ملی۔ ذوالقرنین کو انبیاے بنی اسرائیل سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ یہ چیز بھی اُس کے اندر دینی رجحانات کی تقویت کا باعث ہوئی۔'' (تدبر قرآن ۶۱۹/۴)

۹۱ یعنی جس طرح مغرب میں خشکی کے آخری سرے تک پہنچ گیا تھا، اُسی طرح مشرق میں بھی پہنچ گیا۔

۹۲ مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل وحشی اور غیر متمدن تھے۔ عمارتیں بنانا تو درکنار، اپنے لیے خیمے بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ چنانچہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے اور کھلے میدانوں میں رہتے تھے،

ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ وَجَدَ مِنۡ
دُوۡنِهِمَا قَوۡمًا ۙ لَّا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَهُوۡنَ قَوۡلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوۡا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ

پاس تھا، اُسے ہم خوب جانتے تھے۔[۹۴] ۸۹-۹۱

اُس نے پھر ایک اور مہم کا سامان کیا،[۹۵] یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان (ایک درے تک) پہنچا[۹۶] تو اُن کے اِس طرف اُس کو ایسے لوگ ملے جو کوئی بات سمجھ نہیں

جہاں اُن کے اور سورج کے مابین کوئی آڑ نہیں تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ اِس سے مکران، قندھار اور بلخ کے وحشی اور صحرا گرد قبائل مراد ہیں جنھوں نے فارس کی مشرقی سرحد پر اُس زمانے میں بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ ذوالقرنین کو بالآخر اُن کی سرکوبی کے لیے اٹھنا پڑا جس کے نتیجے میں یہ علاقے بھی اُس نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔

[۹۳] یعنی فی الواقع یہی ہوا کہ وہ علاقے فتح کرتا ہوا اُس وقت کی متمدن دنیا کے آخری کنارے تک پہنچ گیا اور اپنی سلطنت مغرب سے مشرق تک وسیع کر لی۔

[۹۴] یہ اُسی طرح کا جملہ ہے، جیسے سورۂ انبیاء (۲۱) کی آیت ۵۱ میں ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اِبۡرٰهِیۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ وَکُنَّا بِهٖ عٰلِمِیۡنَ'۔ مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین کو یہ سرفرازی یوں ہی حاصل نہیں ہو گئی، بلکہ وہ اِس کی اہلیت رکھتا تھا۔ یہ ایک عظیم سلطنت تھی اور وہ بدرجۂ کمال اُن صلاحیتوں سے بہرہ مند تھا جو اِس کو سنبھالنے اور اِس کا نظم و نسق چلانے کے لیے ضروری تھیں۔ اِس کے ساتھ وہ اُن اخلاقی اوصاف سے بھی پوری طرح متصف تھا جو خداترس بادشاہوں میں ہونے چاہییں اور ہم اُس کی اِن تمام صلاحیتوں اور تمام اوصاف حمیدہ سے واقف تھے۔

[۹۵] یہ تیسری مہم کا ذکر ہے۔ اِس میں ذوالقرنین کو کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غالباً اِسی بنا پر مورخین اِس کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ تاہم اتنا بتاتے ہیں کہ بابل کی فتح کے بعد وہ

إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ
خَرْجًا عَلَىٰٓ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ

پاتے تھے۔[97] اُنھوں نے درخواست کی کہ اے ذوالقرنین، یاجوج اور ماجوج[98] اِس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔[99] تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم آپ کے لیے اخراجات کا بندوبست کریں اور آپ ہمارے اور اُن کے درمیان کوئی روک بنا دیں؟ اُس نے

شمال مشرق کی سمت ایک سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس کی منزل غالباً بحرخزر (کیسپین) کے مشرق میں ترکستان کی جانب رہی ہوگی۔

۹۶ آگے ذکر ہوا ہے کہ اِن دونوں پہاڑوں کے اُس طرف یاجوج و ماجوج کا علاقہ تھا۔ اِس لیے لامحالہ اِن سے مراد وہ پہاڑی سلسلے ہی ہو سکتے ہیں جو بحرخزر اور بحراسود کے درمیان واقع ہیں۔

۹۷ یعنی اُن کی زبان ذوالقرنین اور اُس کے ساتھیوں کے لیے قریب قریب بالکل اجنبی تھی۔ اِس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ وہ اپنے علاقے کے اندر محدود اور دوسروں سے بالکل بے تعلق زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنے علاقے کے باہر کے لوگوں کے ساتھ اُن کا کوئی میل جول نہیں تھا۔

۹۸ یہ دونوں نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے ہیں اور جو ایشیا کے شمالی علاقوں میں آباد ہوئی۔ صحیفۂ حزقی ایل میں اِن کا تعارف روس، ماسکو اور توبالسک کے فرماں روا کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ حزقی ایل فرماتے ہیں:

> ’’اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد، جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبل کا فرماں روا ہے متوجہ ہو اور اُس کے خلاف نبوت کر۔‘‘
>
> (حزقی ایل ۳۸: ۱-۲)
>
> ’’پس اے آدم زاد، تو جوج کے خلاف نبوت کر اور کہہ، خداوند خدا یوں فرماتا ہے: دیکھ اے جوج، روش، مسک اور توبل کے فرماں روا، میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دوں گا اور

رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِیْ
زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی

جواب دیا کہ جو کچھ میرے پروردگار نے میرے اختیار میں دے رکھا ہے، وہی بہت ہے[۱۰۰]۔ تم البتہ، ہاتھ پاؤں سے میری مدد کرو، میں تمھارے اور اُن کے درمیان ایک دیوار کھڑی کیے دیتا ہوں[۱۰۱]۔ مجھے لوہے کی سلیں لا دو۔ (چنانچہ وہ فراہم کر دی گئیں)، یہاں

تجھے لیے پھروں گا اور شمال کے دور اطراف سے چڑھا لاؤں گا۔ (حزقی ایل ۳۹: ۱-۲)

۹۹ یہ اُس زمانے کے وحشی قبائل تھے اور قدیم زمانے سے متمدن علاقے پر غارت گرانہ حملے کرتے رہتے تھے۔ ایران پر اِن کی تاخت ترکستان کے راستے سے بھی ہوتی تھی اور قفقاز پہاڑوں کے اُس درے سے بھی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

۱۰۰ اصل میں لفظ 'خَیْر' استعمال ہوا ہے۔ اِس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک یہ کہ یہ کافی ہے اور دوسرے یہ کہ یہ نہایت پاکیزہ مال ہے، اِس میں لوٹ مار اور تعدی کی کوئی آلایش نہیں ہے۔

۱۰۱ اِس طرح کی ایک قدیم دیوار کے آثار کوہ قفقاز کے درۂ داریال میں موجود ہیں۔ سیاح اپنے سفرناموں میں اِس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ دیوار ۵۰ میل لمبی، ۲۹۰ فٹ اونچی اور ۱۰ فٹ چوڑی تھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...روایات میں ہے کہ عباسی خلیفہ واثق نے اِس دیوار کی تحقیقات پر پچاس افراد کی ایک ٹیم مقرر کی جس نے اِس کے موقع و محل کا سراغ لگایا۔ اِس دیوار کو لوگ دارا یا نوشیرواں کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن زیادہ شواہد اِس بات کے حق میں ہیں کہ یہ کیخسرو نے تعمیر کرائی ہوگی۔ مثلاً یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ کیخسرو کی سلطنت کی شمالی حد کوہ قفقاز تک تھی۔ اتنا وسیع علاقہ زیرنگین کر لینا صرف اُس صورت میں ممکن ہے، جب اُس نے اِس علاقہ کو فتح کرنے کے

إِذَا جَعَلَهُ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ؕ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ
يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ
فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ؕ﴿۹۸﴾

تک کہ جب اُس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا[۱۰۲] کو پاٹ دیا تو کہا کہ دھونکو، حتیٰ کہ جب اُس کو آگ کر دیا تو حکم دیا کہ لاؤ، اب میں اِس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیل دوں۔ سو (یہ ایسی دیوار بن گئی کہ) یاجوج و ماجوج اب نہ اُس پر چڑھ سکتے تھے، نہ اُس میں نقب لگا سکتے تھے۔ ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے۔ پھر جب میرے پروردگار کے وعدے کا ظہور ہو گا تو وہ اِس کو ڈھا کر برابر کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ برحق ہے[۱۰۳]۔ ۹۲-۹۸

لیے کوئی اقدام کیا ہو۔ کورش نام کا ایک شہر اور ایک دریا کوہ قفقاز کے علاقے میں اب تک موجود ہے۔ آہنی دیوار کو گورا کا نام دیا جاتا ہے جو کورش ہی کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے۔ یہ دیوار دھات سے دو پہاڑیوں کے درمیان بنی ہوئی ہے اور اِس کے نچلے حصے میں برسات کے پانی کے نکلنے کے لیے کچھ جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔" (تدبر قرآن ۴/۶۲۱)

[۱۰۲] اصل میں 'سَاوٰی بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'صَدَف' خول اور خلا کو کہتے ہیں۔ یہاں اِس کے مثنیٰ استعمال کرنے میں اِس کے دونوں طرفوں کا لحاظ ہے۔

[۱۰۳] یہ قرآن نے نہایت خوبی کے ساتھ قصۂ ذوالقرنین کو سورہ کے مضمون سے متعلق کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس نے تنگ ظرفوں کی طرح یہ نہیں کہا کہ یہ میں وہ کارنامہ کیے جا رہا ہوں جس پر کبھی زوال نہ آئے گا، بلکہ نہایت عاجزی کے ساتھ اُسے اپنے پروردگار کی رحمت و عنایت اور اُس کے فضل و کرم کا کرشمہ قرار دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"پیچھے دو شخصوں کی تمثیل کے ذیل میں مغرورین دنیا کی یہ ذہنیت آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب

وَتَرَكۡنَا بَعۡضَهُمۡ يَوۡمَئِذٖ يَمُوجُ فِي بَعۡضٖۖ وَنُفِخَ فِي ٱلصُّورِ
فَجَمَعۡنَٰهُمۡ جَمۡعٗا ﴿٩٩﴾ وَعَرَضۡنَا جَهَنَّمَ يَوۡمَئِذٖ لِّلۡكَٰفِرِينَ عَرۡضًا ﴿١٠٠﴾

اُس دن[۱۰۴] ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ ایک دوسرے سے موجوں کی طرح ٹکرا رہے ہوں گے[۱۰۵] اور صور پھونکا جائے گا اور اِس طرح ہم اُن سب کو اکٹھا کر لیں گے۔[۱۰۶] اُس

> وہ اپنی کامیابی کے ہرے بھرے باغ میں داخل ہوتے ہیں تو غرور کے نشے میں کہتے ہیں کہ 'مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِیْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا'، ''میں گمان بھی نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو سکے گا۔'' اِس کے بعد ایک عبد شاکر کی ذہنیت نمایاں فرمائی ہے کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے کارنامہ پر بھی اپنے رب کا شکر گزار ہوتا ہے اور اللہ کے شدنی وعدۂ آخرت کو یاد رکھتا ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۴/ ۶۲۲)

۱۰۴۔ یعنی جس دن خدا کے وعدے کا ظہور ہو گا۔ اوپر ذوالقرنین کا قول نقل ہوا ہے کہ اُس نے اپنی بنائی ہوئی عظیم دیوار کو دیکھ کر کہا تھا کہ جب میرے پروردگار کے وعدے کے ظہور کا دن ہو گا تو وہ اِس کو ڈھا کر برابر کر دے گا۔ یہ قرآن نے اُسی پر عطف کر کے بات کو آگے بڑھا دیا ہے اور دیکھیے کہ کس بلاغت کے ساتھ بڑھایا ہے۔

۱۰۵۔ یہ اُس وقت کی تصویر ہے، جب یاجوج و ماجوج اپنے علاقوں سے نکل کر ہر بلندی سے لوگوں پر پل پڑیں گے۔ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ وہ نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد ہیں اور اُن کا اصل وطن وسط ایشیا کا علاقہ ہے۔ سورۂ انبیاء (۲۱) کی آیت ۹۶ میں اُن کے اِس خروج کا ذکر ہوا ہے۔ وہاں صاف اشارہ ہے کہ قیامت اُن کی اِسی عالم گیر یورش کے اندر سے نمودار ہو جائے گی۔ اِس لحاظ سے یاجوج و ماجوج کا خروج اور قیامت گویا ایک ہی دن کے واقعات ہیں۔

۱۰۶۔ آیت میں لفظ 'جَمۡعًا' اِس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اِس حشر سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ چھوٹے بڑے، عامی و عارف اور عابد و معبود، سب پکڑ بلائے جائیں گے۔

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾
اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ
اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾
قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ؕ ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ

دن ہم دوزخ کو اُن منکروں کے سامنے پیش کریں گے جن کی آنکھوں پر میری یاد دہانی سے پردہ پڑا رہا[۱۰۷] اور وہ سننے کی تاب نہیں لاتے تھے۔ ۹۹-۱۰۱

پھر کیا یہ منکرین اِس خیال میں ہیں کہ میرے بندوں کو یہ میرے سوا اپنا کارساز بنا لیں[۱۰۸]؟ (یہ محض خوش فہمی ہے)۔ ایسے منکروں کی مہمانی کے لیے ہم نے جہنم تیار کر رکھی ہے۔ ۱۰۲

اِن سے کہو، کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی تمام سعی و جہد دنیا کی زندگی میں اکارت ہو گئی اور وہ اِسی خیال میں رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی آیات اور اُس سے ملاقات کا انکار کیا۔ سو اُن کے

---

[۱۰۷] یعنی جس دوزخ کی یاد دہانی کی گئی اور اُسے عقل کی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے، اُسے سر کی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

[۱۰۸] اِس لیے کارساز بنا لیں کہ فیصلے کے دن وہ اِن کی سفارش سے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑا سکیں۔

لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا
اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ
نُزُلًا ۙ﴿۱۰۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ
اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

اعمال ضائع ہوئے۔ اب قیامت کے دن ہم اُن کو کوئی وزن نہ دیں گے۔ اُن کا بدلہ یہی جہنم ہے، اِس لیے کہ اُنھوں نے انکار کیا اور میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا ہے۔ ۱۰۳-۱۰۶

البتہ جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں، اُن کے لیے فردوس کے باغوں کی مہمانی ہے۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے، وہاں سے کبھی اٹھنا نہ چاہیں گے[۱۰۹]۔ ۱۰۷-۱۰۸

(یہ نشانیاں مانگتے ہیں)۔ اِنھیں بتاؤ، (اے پیغمبر) کہ میرے پروردگار کی نشانیوں[۱۱۰] کو لکھنے کے لیے اگر سمندر روشنائی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے، اِس سے پہلے کہ

---

[۱۰۹] یہ اِس لیے فرمایا کہ وہ مطمئن رہیں، خدا کی جنت کوئی اکتا جانے کی چیز نہیں ہے۔ اُن کی دل چسپی کے لیے ہر روز وہاں ایک نئی دنیا ہوگی جس میں اُن کے مدارج بھی ہمیشہ بلند ہوتے رہیں گے اور اُس کی نعمتیں بھی جدت طرازیوں کے ساتھ برابر بدلتی رہیں گی۔

[۱۱۰] اصل میں لفظ ’کَلِمٰت‘ آیا ہے۔ یہ ’کَلِمَة‘ کی جمع ہے جس کے معنی ’بات‘ کے ہیں، لیکن یہاں اِس سے مراد وہ عجائب قدرت و حکمت ہیں جن کا مشاہدہ ہم آفاق و انفس میں کرتے ہیں۔ ہم نے

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ
فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ
بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

سورة مريم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ ۚ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾ ۚ اِذْ

میرے پروردگار کی نشانیاں ختم ہوں، اگرچہ ہم اُس کے ساتھ اُسی کے مانند اور سمندر ملا دیں۔ ۱۰۹

اِن سے کہو، (تم کس سے نشانیاں مانگتے ہو)؟ میں بھی تمھاری ہی طرح ایک آدمی ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔ سو جسے اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو، اُسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھیرائے۔ ۱۱۰

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'کٓھٰیٰعٓصٓ'[۱۱۱] ہے۔ یہ تیرے پروردگار کے فضل و رحمت کا ذکر[۱۱۲] ہے جو اُس

ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۱۱۱] یہ سورہ کا نام ہے۔ اِس طرح کے جو نام قرآن میں آئے ہیں، اُن کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا ③ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ
الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا ④ وَاِنِّیْ خِفْتُ

نے اپنے بندے[۱۱۳] زکریا پر کیا تھا، جب اُس نے اپنے پروردگار کو چپکے چپکے پکارا[۱۱۴]۔ اُس نے عرض کیا[۱۱۵]: میرے پروردگار، میری ہڈیاں بوڑھی ہو گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے اور اے پروردگار، تجھ سے مانگ کر میں کبھی محروم نہیں رہا۔ مجھے اپنے

---

[۱۱۲] لفظ 'ذِکْر' یہاں اُسی مفہوم میں ہے جس میں آگے 'اُذْکُرْ' کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

[۱۱۳] آیت میں لفظ 'عَبْد' استعمال ہوا ہے۔ یہ حضرت زکریا کے اختصاص کو بیان کرتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنا بندہ کہہ کر یاد فرمائے، اُس کے لیے اِس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے۔ یہ زکریا کون تھے؟ ہم سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۳۷ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ سیدنا ہارون علیہ السلام کے خاندان سے اور سیدہ مریم کے خالو تھے۔ بنی اسرائیل میں کہانت کا جو نظام قائم کیا گیا تھا، اُس کی رو سے لاوی بن یعقوب کا گھرانا مذہبی خدمات کے لیے خاص تھا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی مقدس میں خداوند کے آگے بخور جلانے اور پاک ترین چیزوں کی تقدیس کی خدمت سیدنا ہارون کے خاندان کے سپرد تھی۔ دوسرے بنی لاوی مقدس کے اندر نہیں جا سکتے تھے، بلکہ صحنوں اور کوٹھڑیوں میں کام کرتے تھے۔ سبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے اور مقدس کی نگرانی میں بنی ہارون کی مدد کرتے تھے۔ زکریا بنی ہارون کے خاندان میں سے ابیاہ کے سربراہ تھے۔ چنانچہ اپنے خاندان کی طرف سے یہی معبد کی خدمت انجام دیتے تھے۔

[۱۱۴] یعنی راز و نیاز کے انداز میں۔ یہ دعا کے آداب میں سے ہے، اِس لیے کہ اِسی میں بندہ اپنے پروردگار کے لیے خاص ہو کر اپنی درخواست اُس کے حضور پیش کرتا ہے۔

[۱۱۵] آگے کی آیتوں میں اشارہ ہے کہ اُنھوں نے یہ درخواست ہیکل میں غالباً اعتکاف کی

الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ
وَلِيًّا ۙ ۝٥ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝٦

پیچھے اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے[١١٦] اور میری بیوی بانجھ ہے[١١٧]۔ سو اپنے پاس سے تو مجھے ایک وارث عطا فرما دے جو میرا بھی وارث ہو اور یعقوب کے خاندان کا بھی۔ اور میرے پروردگار، تو اُس کو ایک پسندیدہ انسان بنا[١١٨]۔ ١-٦

حالت میں پیش کی ہے۔

١١٦ یعنی وہ دینی اور اخلاقی لحاظ سے اچھے لوگ نہیں ہیں۔ چنانچہ اندیشہ ہے کہ میرے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد میری اور میرے خاندان کی اُن روایات کو قائم نہ رکھ سکیں گے جو ہمارا اصل سرمایۂ امتیاز ہیں۔

١١٧ یہاں تک اُس درخواست کی تمہید ہے جو اُنھوں نے آگے پیش فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...حضرت زکریا نے عرض مدعا سے پہلے اُس کے لیے تمہید استوار کی ہے اور اِس میں شبہ نہیں کہ ایسی موثر تمہید استوار کی ہے کہ اگر سوءِ ادب پر محمول نہ کیجیے تو عرض کروں کہ یہ خدا کی رحمت پر کمند ڈال دینے والی تمہید ہے۔ حضرت زکریا نے ایک تو اپنے ضعف و ناتوانی کو سفارش میں پیش کیا، دوسرے اپنے ساتھ زندگی بھر اپنے رب کے معاملے کو۔ فرماتے ہیں کہ اے رب، میں کبھی تجھے پکار کے محروم نہیں رہا۔ غور کیجیے کہ جو سائل جس در سے کبھی محروم نہیں لوٹا ہے، وہ اِس پیری و ناتوانی میں، جب کہ اُس کی ہڈیوں تک کی گود خشک ہو چکی ہے، اُس دروازے سے کس طرح محروم لوٹایا جائے گا۔“ (تدبر قرآن ٤/٦٣٥)

١١٨ یعنی پسندیدہ اخلاق کا حامل اور اُن کمزوریوں سے پاک جو اِس وقت خاندان میں در آئی ہیں۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اِۨسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ
قَبْلُ سَمِيًّا ۝٧ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا
وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝٨ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ
هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝٩ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ
لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝١٠ فَخَرَجَ

(فرمایا): اے زکریا، ہم تمھیں ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہو گا۔[۱۱۹] ہم نے اِس سے پہلے اُس کا کوئی نظیر نہیں بنایا ہے۔[۱۲۰] اُس نے عرض کیا: پروردگار، میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں؟ فرمایا: ایسا ہی ہوگا۔[۱۲۱] تمھارے پروردگار کا ارشاد ہے کہ یہ میرے لیے بہت آسان ہے۔ میں اِس سے پہلے تمھیں پیدا کر چکا ہوں، جب کہ تم کچھ بھی نہیں تھے۔ زکریا نے کہا: میرے پروردگار، میرے لیے کوئی نشانی ٹھیرا دیجیے۔[۱۲۲] فرمایا: تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین شب و روز لوگوں سے بات نہیں کر سکو گے، جب کہ تم بالکل تندرست

---

[۱۱۹] حضرت زکریا نے بالکل صحیح وقت پر، صحیح مقصد کے لیے اور نہایت سچے جذبے کے ساتھ دعا کی تھی۔ چنانچہ زبان سے نکلی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے قبول فرمالیا۔ بندے کی دعا اگر اِس یقین کا بے تابانہ اظہار ہو کہ میرے لیے ایک ہی دروازہ ہے، اِس سے پہلے بھی یہیں سے پایا ہے اور اب بھی یہیں سے پاؤں گا تو اُس کے لیے خدا کی رحمت اُن گوشوں سے نمودار ہو جاتی ہے، جہاں سے اُس کو وہم و گمان بھی نہ ہو۔

[۱۲۰] یعنی اِس سے پہلے کوئی بچہ اِس طرح کے بوڑھے باپ اور بانجھ ماں کو نہیں دیا ہے، اِس لیے عام قانون سے ہٹ کر یہ ہر لحاظ سے بے نظیر فرزند ہے۔

عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ⑪

ہو گئے۔[123] چنانچہ محراب عبادت سے نکل کر وہ اپنے لوگوں کے پاس آیا، پھر اشارے سے اُن کو ہدایت کی کہ صبح و شام خدا کی تسبیح کرتے رہو۔[124] ۷-۱۱

---

۱۲۱ قرینہ دلیل ہے کہ یہ جواب ہاتف غیب کی زبان سے ہے۔ آیت میں 'كَذٰلِكَ' کی خبر محذوف ہے۔ یہ زور اور تاکید کے لیے حذف کر دی گئی ہے۔

۱۲۲ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکریا کا گمان تو اگرچہ یہی تھا کہ یہ بشارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لیکن دل کے کسی گوشے میں یہ کھٹک ضرور تھی کہ ممکن ہے کہ یہ اپنے ہی گنبد دل کی صدا اور اپنی ہی آرزوؤں کے ہجوم میں شیطان کا کوئی القا ہو جسے وہ فرشتوں کا الہام سمجھ بیٹھے ہیں۔ چنانچہ یہ درخواست اُنھوں نے اپنے اطمینان کے لیے کی۔

۱۲۳ یعنی یہ حالت کسی مرض یا خرابی کی وجہ سے نہیں ہوگی، بلکہ خدا کی ایک نشانی ہوگی کہ تم خدا کی تسبیح و تہلیل تو کرو گے، لیکن لوگوں سے کوئی بات نہیں کر سکو گے۔ سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۴۱ میں اِس کی تصریح ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...ظاہر ہے کہ ایک آدمی پر ایسی حالت کا طاری ہو جانا کہ وہ ذکر الٰہی تو کر سکے، لیکن کوئی اور کلمہ زبان سے نہ نکال سکے، کوئی شیطانی حالت نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتی ہے تو رحمانی حالت ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ حالت حضرت زکریا پر طاری ہو گئی۔ وہ محراب عبادت سے نکل کر لوگوں میں آئے تو وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ صرف اشارے سے اُنھوں نے لوگوں کو تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنے کی ہدایت کی۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۶۳۸)

۱۲۴ لفظ 'مِحْرَاب' یہاں معبد کے اُن حجروں کے لیے آیا ہے جن میں بیٹھ کر لوگ عبادت کرتے تھے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ دعا اور بشارت کے وقت حضرت زکریا ہیکل ہی کے کسی گوشے میں مصروف عبادت تھے۔ سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۳۹ میں وضاحت ہے کہ جب یہ بشارت نازل ہوئی تو وہ نماز میں کھڑے تھے۔ اِسی طرح یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ باہر لوگ کسی وجہ سے

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۙ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا
مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ۙ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا

(یہ بشارت پوری ہوئی۔ چنانچہ وہ بچہ سن رشد کو پہنچا تو فرمایا): اے یحیٰی، ہماری کتاب[۱۲۵] کو مضبوط تھام لو۔ ہم نے اُس کو بچپن ہی میں (حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کر لینے کی صلاحیت سے نوازا اور خاص اپنی طرف سے سوز و گداز[۱۲۶] اور (ظاہر و باطن کی) پاکیزگی عطا فرمائی اور وہ نہایت پرہیز گار[۱۲۷] اور اپنے والدین کا فرماں بردار بھی تھا[۱۲۸]،

اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ انجیل میں ہے کہ لوگوں کا خیال تھا کہ اُنھوں نے مقدس میں کوئی رؤیا دیکھا ہے*۔ چنانچہ وہ باہر آئے تو اُنھوں نے اشارہ کیا کہ تسبیح و تہلیل کرو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس اشارے کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ وہ قدرت کے کسی بہت بڑے راز کے امین ہیں جس کے اظہار کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ لوگ خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول رہ کر اُس کا انتظار کریں اور دیکھیں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے؟“ (تدبر قرآن ۴/۶۳۸)

[۱۲۵] یعنی تورات کو۔ یہ ہدایت اِس لیے ہوئی کہ شیاطین جن و انس کو سب سے بڑھ کر دشمنی کتاب الٰہی ہی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اُس کے حاملین کو وہ اُس سے برگشتہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

[۱۲۶] اصل میں لفظ ’حَنَان‘ آیا ہے۔ اِس کے معنی محبت، ذوق و شوق اور سوز و گداز کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے پر خاص کرم فرماتا ہے تو اُسے اِن چیزوں سے بھی حصۂ وافر عطا کر دیتا ہے۔ اِس لیے کہ انسان کے قلب و روح کی زندگی اِنھی چیزوں سے عبارت ہے۔ حضرت یحیٰی پر یہ عنایت کس درجے میں تھی؟ اِس کا کچھ اندازہ انجیل میں اُن کے ارشادات سے کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی دعوت کا ایک خاص رنگ تھا۔ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے اور توبہ کرنے والوں کو روح و

---

* لوقا ۱:۲۲۔

عَصِيًّا ﴿۱۴﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾

سرکش اور نافرمان نہیں تھا۔ اور اُس پر سلامتی (کی بشارت) تھی، جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن مرے گا اور جس دن زندہ اٹھایا جائے گا۔[۱۲۹] ۱۲-۱۵

جسم، دونوں کی پاکیزگی کے لیے غسل کراتے تھے۔ اِسی بنا پر اُنھیں یوحنا بپتسمہ دینے والا (John the Baptist) کہا جاتا ہے۔ اُنھیں مسیح علیہ السلام کا ارہاص بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اُن کی منادی کرتے تھے کہ توبہ کرو، اِس لیے کہ خدا کی بادشاہی قریب آ گئی ہے۔* اِسی طرح کہتے تھے کہ میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔**

۱۲۷ حضرت مسیح نے فرمایا تھا کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں، اُن میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا۔*** اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زہد و تقویٰ میں بھی وہ کس مقام پر تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اُن کی ساری زندگی ترک دنیا کی زندگی تھی۔ اُنھوں نے توبہ کی منادی اِس زور و شور سے کی کہ اُس سے دشت و جبل گونج اٹھے۔ ہیکل میں تقریر کرتے تو لوگوں کے دل دہل جاتے۔ لیکن اِس دنیا سے اُن کا تعلق صرف دینے کے لیے تھا، اِس سے لیا اُنھوں نے کچھ بھی نہیں۔ جنگل کے شہد اور اُس کی ٹڈیوں پر گزارہ کرتے، کمبل کی پوشاک سے بدن ڈھانکتے اور جس سر کو چھپانے کے لیے اِس دنیا میں کوئی چھت نہیں بنائی، اُس کو خدا کی کتاب کی خاطر کٹوا کر اِس دنیا سے رخصت ہو گئے۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۶۳۹)

یہ واقعہ اِس طرح ہوا کہ اُس عہد کے یہودی فرماں روا ہیرود اینٹی پاس کی فاسقانہ حرکات پر حضرت یحییٰ کی تنقیدوں کے جرم میں اُنھیں قید کر دیا گیا۔ وہ جیل ہی میں تھے کہ ہیرود کی سالگرہ

---

* متی ۳:۲۔

** یوحنا ۱:۲۳۔

*** متی ۱۱:۱۱۔

کے جشن میں ہیرودیاس کی بیٹی کے رقص سے متاثر ہو کر ہیرود نے اُس سے پوچھا کہ مانگ کیا مانگتی ہے؟ یہ ہیرودیاس ہیرود کے بھائی فلپ کی بیوی تھی جسے اس نے اپنے گھر ڈال رکھا تھا۔ بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا کہ کیا مانگوں؟ ہیرودیاس حضرت یحییٰ کی دعوت کو اپنے جیسی عورتوں کے لیے خطرہ سمجھتی تھی۔ اُس نے بیٹی سے کہا کہ یحییٰ کا سر مانگ لے۔ ہیرود اگرچہ یحییٰ علیہ السلام کو ایک مقدس آدمی سمجھ کر اُن کا احترام کرتا تھا، مگر محبوبہ کی بیٹی کا تقاضا رد نہیں کر سکا۔ اُس نے قید خانے سے اُن کا سر کٹوا کر منگوایا اور رقاصہ کی فرمایش کے مطابق ایک تھال میں رکھ کر اُس کی نذر کر دیا۔*

یہاں یہ امر واضح رہے کہ یحییٰ علیہ السلام کی جس فقیرانہ زندگی کا ذکر اوپر ہوا ہے، وہ اُنھوں نے اِس لیے اختیار کی کہ وہ اور مسیح علیہ السلام، دونوں بنی اسرائیل پر اتمام حجت سے پہلے آخری اتمام حجت کے لیے آئے تھے۔ وہ اُس بستی میں گھر کیا بناتے جو سیلاب کی زد میں تھی اور اُس درخت کی بہار کیا دیکھتے جس کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ ایک ایک دروازے پر دستک دے کر لوگوں کو آنے والے طوفان سے خبردار کرنے والے اپنا گھر بسانے اور اپنا کھیت اگانے میں لگ جاتے تو اپنے فرض سے کوتاہی کے مرتکب قرار پاتے۔ چنانچہ دونوں نے تجرد و انقطاع کا طریقہ اختیار کیا، قوت لایموت پر اکتفا کی، درویشوں کا لباس پہنا اور زمین و آسمان ہی کو چھت اور بچھونا بنا کر زندگی بسر کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

۱۲۸ یعنی اِس کے باوجود نہایت فرماں بردار تھے کہ ولادت سے لے کر تعلیم و تربیت تک کسی معاملے میں بھی والدین کے محتاج نہیں رہے، بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں اِن تمام مراحل سے گزرے۔

۱۲۹ یہ زندگی کے ہر مرحلے میں اُن کے لیے فرشتوں کی مبارک سلامت کا حوالہ ہے جس سے وہ اُن کا استقبال کریں گے۔

---

* متی ۱۴: ۳-۱۲۔ مرقس ۶: ۱۷-۲۹۔ لوقا ۳: ۱۹-۲۰۔

مریم
۱۹

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا
شَرْقِيًّا ۙ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۣ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا
فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ
كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾
قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ
كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ

(اب) اِس کتاب میں مریم کا ذکر کرو، جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر (بیت المقدس کے) مشرقی جانب[۱۳۰] گوشہ نشین ہو گئی تھی اور اپنے آپ کو اُن سے پردے میں کر لیا تھا[۱۳۱]۔ پھر ہم نے اُس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ اُس کے سامنے ایک پورے آدمی کی صورت میں نمودار ہو گیا[۱۳۲]۔ مریم (نے اُسے دیکھا تو) بول اٹھی کہ میں تم سے خداے رحمٰن کی پناہ میں آتی ہوں، اگر تم اُس سے ڈرنے والے ہو۔ اُس نے کہا: میں تمھارے پروردگار ہی کا فرستادہ ہوں اور اِس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تمھیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ مریم نے کہا: میرے ہاں لڑکا کیسے ہو گا، نہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ میں کبھی بدکار رہی ہوں[۱۳۳]! اُس نے کہا: اِسی طرح ہو گا۔ تمھارا پروردگار فرماتا ہے کہ یہ

---

[۱۳۰] عورتوں کے اعتکاف و عبادت کی جگہ ہیکل میں مشرقی جانب تھی۔ یہاں اِس سمت کا ذکر اِسی رعایت سے ہوا ہے۔

[۱۳۱] اِس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعتکاف میں بیٹھ گئی تھیں۔

[۱۳۲] اِس سے غالباً حضرت مریم کا امتحان مقصود تھا۔ آگے کی آیات سے واضح ہے کہ وہ اِس میں پوری طرح کامیاب رہیں اور اِس نازک موقع پر اُسی کردار کا مظاہرہ کیا جو اُن جیسی جلیل القدر

وَرَحۡمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِيًّا ﴿۲۱﴾
فَحَمَلَتۡهُ فَانۡتَبَذَتۡ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ
اِلٰى جِذۡعِ النَّخۡلَةِ ۚ قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ﴿۲۳﴾

میرے لیے بہت آسان ہے۔ ہم یہ اِس لیے کریں گے کہ وہ ہمارا پیغمبر ہو اور اِس لیے کہ ہم اُس کو لوگوں کے لیے ایک نشانی[۱۳۴] اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔ اور یہ بات طے کر دی گئی ہے۔ ۱۶-۲۱

سو مریم اُس بچے سے حاملہ ہو گئی اور (بیت المقدس سے نکل کر) اُس حمل کو لیے ہوئے، سب سے الگ ایک دور کی جگہ چلی گئی۔[۱۳۵] پھر (وہ وقت بھی آ گیا کہ) زچگی کی تکلیف اُسے کھجور[۱۳۶] کے تنے کے پاس لے آئی۔ (اُس وقت سخت بے بسی کی حالت میں)

خاتون سے متوقع تھا۔

[۱۳۳] یہ الفاظ ایک کنواری عفیفہ ہی کی زبان سے موزوں ہو سکتے ہیں، اِس لیے صریح دلیل ہیں کہ کسی یوسف نامی شخص سے حضرت مریم کے نکاح کی جو روایت لوقا میں نقل ہوئی ہے، وہ بالکل بے بنیاد ہے۔

[۱۳۴] یعنی اپنی عظیم قدرت کی نشانی جس کو دیکھنے کے بعد کسی کو شبہ نہ رہے کہ ہم ایک دن تمام مخلوقات کو اِسی طرح دوبارہ پیدا کر ڈالیں گے۔ سورۂ زخرف (۴۳) کی آیت ۶۱ میں سیدنا مسیح کو اِسی بنا پر 'عِلۡمٌ لِّلسَّاعَةِ' (قیامت کی دلیل) کہا گیا ہے۔

[۱۳۵] انجیلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ بیت اللحم تھی۔ وہ جس صورت حال سے دوچار ہو گئی تھیں، اُس میں یہی ایک چارۂ کار تھا کہ لوگوں کی نظروں سے دور وہ کسی ایسی جگہ چلی جائیں، جہاں کم سے کم حمل کے دوران میں اُن کی لعنت ملامت سے بچی رہیں۔ وہ بنی ہارون کے مقدس ترین گھرانے کی لڑکی تھیں اور بیت المقدس میں معبد کی خدمت کے لیے وقف کر دی گئی

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾
وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِيْ
وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ

اُس نے کہا: اے کاش، میں اِس سے پہلے ہی مرجاتی اور بھولی بسری ہوجاتی۔[۱۳۷] ۲۲-۲۳

اِس پر مریم کے نیچے سے فرشتے نے اُس کو پکار کر کہا: غم نہ کرو، تمھارے پروردگار نے تمھارے پائیں سے ایک چشمہ جاری کر رکھا ہے۔ اور تم کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ، تمھارے اوپر تروتازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔[۱۳۸] سو کھاؤ پیو اور (بچے کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ پھر کوئی آدمی دیکھو (کہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے) تو اشارے سے

تھیں۔ اِس حالت میں ایک کنواری کا حمل اُن کے لیے جیسی پریشانی اور مصیبت کا باعث بن سکتا تھا، اُس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

[۱۳۶] اصل میں لفظ 'اَلنَّخْلَة' آیا ہے۔ یہ غالباً بستی سے باہر کھجور کا کوئی درخت ہوگا۔ وہ اتفاق سے اِس کی طرف آئیں یا اِس کے لیے اُنھیں کوئی غیبی اشارہ کیا گیا تھا، دونوں صورتوں کا امکان ہے۔ تاہم اتنی بات واضح ہے کہ یہ پہلے سے متعین تھا، اِس لیے کہ الف لام کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔

[۱۳۷] اِن الفاظ سے اُس کرب اور پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریم اُس وقت مبتلا ہو گئی تھیں۔ ایک کنواری بچہ جننے جا رہی ہے، اِس کے نتیجے میں جو کچھ رسوائی کا سامان اُن کے لیے ہو سکتا تھا، یہ فقرہ اُس کے لیے اُن کے احساسات کی بالکل صحیح تعبیر ہے۔

[۱۳۸] مطلب یہ ہے کہ اُن کے لیے وہاں یہ اہتمام کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جب اپنا کوئی مشن کسی کے سپرد کرتا ہے تو اُس کی رحمت اِسی طرح شامل حال ہوتی ہے۔ چنانچہ کھجور کے تنے کو ہلانے کی ہدایت بھی محض رحمت الٰہی کے ظہور کا بہانہ تھا، ورنہ، ظاہر ہے کہ جس عمر میں کھجور کے درخت کو پھل لگتا ہے، اُس کو ہلانے کی قوت حضرت مریم کے بازو میں نہیں ہو سکتی تھی۔

نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۚ﴿٢٦﴾
فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾
يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۖۚ﴿٢٨﴾
فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ

کہہ دو[۱۳۹] کہ میں نے خداے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مان رکھی ہے، اِس لیے آج میں کسی انسان سے کوئی بات نہ کروں گی۔[۱۴۰] ۲۴-۲۶

اِس کے بعد وہ بچے کو گود میں لیے ہوئے اپنے لوگوں کے پاس آئی۔ اُنھوں نے (دیکھا تو) کہا: مریم، تم نے یہ بڑی سنگین حرکت کر ڈالی ہے۔ اے ہارون کی بہن،[۱۴۱] نہ تمھارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمھاری ماں کوئی بدکار عورت تھی۔ ۲۷-۲۸

اُس نے جواب میں بچے کی طرف اشارہ کیا (کہ وہی بتائے گا)۔[۱۴۲] لوگوں نے کہا:

---

[۱۳۹] اصل میں لفظ 'قُوْلِیْ' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ جس طرح زبان سے کوئی بات کہنے کے لیے آتا ہے، اُسی طرح اشارہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

[۱۴۰] مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھ لو اور کوئی تعرض کرے تو اُس کو اِس طریقے سے ٹال دو۔ اِس سے معلوم ہوا کہ سیدہ جس حالت میں تھیں، یہود کی شریعت میں چپ کا روزہ اُس حالت میں بھی رکھا جا سکتا تھا۔ اسفار یہود سے اِس کی تصدیق ہوتی ہے۔

[۱۴۱] سیدہ بنی ہارون میں سے تھیں۔ قدیم قبائلی زبانوں میں یہ اسلوب موجود ہے کہ کسی شخص کو قبیلے کے جد اعلیٰ کی نسبت سے مخاطب کیا جائے۔ مثلاً عربی زبان میں قبیلۂ مضر کے آدمی کو 'یا أخا مضر' کہہ کر بلاتے ہیں۔ یہی معاملہ دوسرے قبیلوں کا ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں یہی معنی مراد ہیں، اِس لیے کہ ملامت کے موقع پر یہ کہنا نہایت موزوں ہے کہ اے ہارون کے مقدس خاندان کی لڑکی، تیرا باپ شریف اور تیری ماں عفیفہ، پھر حیف ہے کہ تم نے ایسی حرکت کر ڈالی ہے۔

صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ قف اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾ لا
وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ ص وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ
مَادُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ صلے وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ ز وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾
وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

ہم اُس سے کیا بات کریں جو گود میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟ بچہ بول اٹھا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا اور جہاں کہیں بھی ہوں، مجھے سرچشمۂ خیر و برکت ٹھیرایا ہے۔ اُس نے مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کروں اور مجھے اپنی ماں کا فرماں بردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا[۱۴۳]۔ اور مجھ پر سلامتی (کی بشارت) ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔ ۲۹-۳۳

---

[۱۴۲] اُنھیں غالباً بتا دیا گیا تھا کہ وہ خاموش رہیں گی اور نومولود سب تہمتوں کا جواب خود دے گا اور اُن کی پاک دامنی اور اپنی وجاہت کی شہادت سب کے سامنے پیش کر دے گا۔ وہ مطمئن رہیں، اُنھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ اُن کے حق میں ایک ایسی زبان کھولنے والا ہے جو سب کی زبانیں بند کر دے گی۔ اُس نے اگر اُنھیں ایسے غیر معمولی امتحان میں ڈالا ہے تو اُن کے لیے پوری عزت اور سرخ روئی کے ساتھ اُس سے نکلنے کا سامان بھی وہی کرے گا اور یہ اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔

[۱۴۳] سیدنا مسیح علیہ السلام کے یہ ارشادات نہایت معنی خیز ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”پہلی بات اُنھوں نے یہ فرمائی کہ ’اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ‘، میں اللہ کا بندہ ہوں۔ یعنی کوئی میری اِس خارق عادت ولادت سے اِس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو کہ میں کوئی مافوق بشر ہستی ہوں۔ میں اللہ کا

بندہ ہی ہوں۔ یہ قرآن نے اُن کے ارشاد 'اِبْنُ اللّٰہِ' کی صحیح تعبیر بتائی ہے۔ عبرانی میں 'اِبن' کا لفظ بندہ اور بیٹے، دونوں کے لیے آتا ہے۔ موقع و محل سے اُس کا تعین کرتے ہیں۔ حضرت مسیح کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اِس لفظ کی تاویل میں کسی التباس کی گنجایش نہیں تھی، لیکن پال نے اُس کو فتنے کا ذریعہ بنالیا اور تثلیث کا ایک پورا گورکھ دھندا تیار کر دیا۔ ہم انجیلوں کی روشنی میں اِس میتھالوجی کی تردید سورۂ آل عمران اور مائدہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

دوسری بات اُنھوں نے یہ فرمائی کہ خدا نے مجھے کتاب و نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اور میں جہاں کہیں بھی ہوں، میرا وجود وہاں کے لیے سراپا خیر و برکت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، تورات ہی کی شریعت پر عامل اور اُسی کے داعی اور مجدد تھے۔ البتہ اُنھوں نے اِس پر حکمت کا اضافہ فرمایا۔ یہی حکمت کے وعظ ہیں جو منتشر اور نا تمام حالت میں ہمیں انجیلوں میں ملتے ہیں۔ یہی لعل و گہر ہیں جو وہ اپنی زبان مبارک سے ہر دشت و چمن میں برساتے ہوئے گزرتے تھے اور جس دل میں ذرا بھی زندگی کی رمق ہوتی تھی، اُس کو زندۂ جاوید کر دیتے تھے۔

تیسری بات اُنھوں نے یہ فرمائی کہ مجھے زندگی بھر کے لیے نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت ہوئی ہے۔ دراصل یہی دو چیزیں ہیں جو تمام دین و شریعت کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِس وجہ سے تمام آسمانی شرائع میں سب سے پہلے اِنھی کا ذکر آتا ہے۔ اِن کی ظاہری شکلیں مختلف ادیان میں مختلف رہی ہیں، لیکن بندگی رب اور ہمدردی خلق کی روح اِن کی ہر شکل میں محفوظ رہی ہے۔ نماز آدمی کو اُس کے رب سے صحیح طور پر جوڑتی ہے اور زکوٰۃ سے اُس کا تعلق خلق کے ساتھ صحیح طور پر استوار ہوتا ہے۔ اِنھی دو چیزوں کی استواری پر تمام دین کے قیام کا انحصار ہے۔ اگر کوئی شخص اِن کو ڈھا دے تو وہ تمام دین کو ڈھا دے گا، اگرچہ وہ دین کے نام پر کتنی ہی لاف زنی کرے۔

چوتھی بات اُنھوں نے یہ فرمائی کہ خدا نے مجھے اپنی ماں کا فرماں بردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا ہے۔ یعنی ہر چند میری ولادت کی نوعیت خاص ہے، میرے اوپر میرے رب کے انعامات بھی خاص ہیں، لیکن اِن سب باتوں کے باوجود میں ایک ماں کا بیٹا اور فرماں بردار

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (۳۴) مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ (۳۵)

یہ تھا مریم کا بیٹا عیسیٰ۔ اُس کے بارے میں اصل حقیقت، جس میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ خدا کو شایاں نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ وہ پاک ہے۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کو اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا، پھر وہ ہو جاتی ہے[۱۴۴]۔ ۳۴-۳۵

بیٹا ہوں۔ خدا کے خاص انعامات کے معنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ میری حیثیت عرفی و بشری میں کوئی فرق آ گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ جو اپنے ماں باپ کا فرماں بردار نہیں، وہ جبار و شقی ہے۔ حضرت مسیح کے اِس ارشاد سے انجیل کی بعض اُن روایات کی تردید ہوتی ہے جن سے یہ گمان گزرتا ہے کہ خدانخواستہ وہ حضرت مریم کا واجبی احترام نہیں کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت مسیح پر دعواے الوہیت کی تہمت چپکائی گئی ہے تو اُس کی تائید فراہم کرنے کے لیے اِس قسم کی روایات بھی انجیلوں میں داخل کر دی گئیں۔'' (تدبر قرآن ۴/۶۴۸)

[۱۴۴] مطلب یہ ہے کہ خدا اپنے کسی ارادے اور منصوبے کو بروے کار لانے کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے کہ اُسے اولاد کی ضرورت ہو۔ ہر کام کے لیے اُس کا ایک کلمۂ 'کُن' ہی کافی ہے۔ اِس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ مسیح بھی اِسی کلمے کا ایک کرشمہ ہیں۔ اُن کی خارق عادت ولادت ہرگز اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ خدا کا جسدی ظہور ہیں یا اُن میں الوہیت کے قسم کی کوئی چیز پائی جاتی ہے۔

یہ پورا پیرا حضرت مسیح کے ارشادات کے درمیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جملۂ معترضہ ہے جس میں مخاطبین کو توجہ دلائی گئی ہے کہ حضرت مسیح کی اصل حقیقت یہ ہے جو اُنھوں نے اپنی پیدایش کے فوراً بعد خود اپنی زبان سے واضح کر دی تھی۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۳۶
فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ
مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۳۷ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ

اور (بچے نے کہا): یقیناً اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی، لہٰذا تم اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔[۱۴۵] ۳۶

(یہ مسیح کی تعلیم تھی)، پھر اُس کے ماننے والوں کے اندر سے مختلف فرقوں نے باہم اختلاف کیا۔ سو اب اُن کے لیے، جنھوں نے (اِن حقائق کا) انکار کر دیا ہے،[۱۴۶] ایک ہول ناک دن کی حاضری کے باعث خرابی ہے۔[۱۴۷] کیا خوب سنتے اور دیکھتے ہوں گے

---

[۱۴۵] یہ اُسی گفتگو کا حصہ ہے جو جملۂ معترضہ سے پہلے نقل ہوئی ہے۔ انجیل میں اللہ تعالیٰ کے لیے ’میرا باپ‘ اور ’تمھارا باپ‘ کی جو تعبیر جگہ جگہ آئی ہے، یہ قرآن نے اُس کی تصحیح کر دی ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ سیدنا مسیح نے جو بات فرمائی تھی، وہ درحقیقت یہ تھی، لیکن عبرانی زبان میں ’اَب‘ اور ’اِبن‘ کے الفاظ چونکہ باپ اور بیٹے اور رب اور بندے کے معنی میں مشترک تھے، اِس لیے نصاریٰ نے سیدنا مسیح کی الوہیت کا عقیدہ ایجاد کیا تو اِس اشتراک سے فائدہ اٹھا کر اُنھیں یہ صورت دے دی۔

[۱۴۶] سیدنا مسیح کے متبعین میں سے شمعون کے پیرو اِن سب حقائق کو مانتے تھے، لہٰذا یہ اشارہ سینٹ پال کے پیرووں کی طرف ہے جو خود بھی کئی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اِن میں سب سے نمایاں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ہیں۔

[۱۴۷] اِس لیے کہ اُس دن تمام حقائق واضح ہو جائیں گے اور سیدنا مسیح اُن کے خلاف خود گواہی کے لیے کھڑے ہوں گے۔ سورۂ مائدہ (۵) میں قرآن نے اِس ’مَشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ‘ کی تفصیل

الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ
اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّا
نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾
وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ

جس دن ہمارے سامنے حاضر ہوں گے، مگر آج یہ ظالم کھلی گم راہی میں پڑے ہیں۔ (اے پیغمبر)، اِنھیں حسرت کے اُس دن[۱۴۸] سے خبردار کر دو، جب معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اِس وقت تو یہ غفلت میں پڑے ہیں اور مان نہیں رہے ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ زمین اور زمین کے رہنے والوں کے وارث بالآخر ہم ہی ہوں گے اور یہ سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔[۱۴۹] ۳۸-۴۰

اور اِس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کرو۔[۱۵۰] بے شک، وہ ایک راست باز انسان[۱۵۱] اور

کر دی ہے۔

[۱۴۸] خدا کے سامنے حاضری کے دن کو حسرت کا دن اِس لیے کہا ہے کہ اُس دن سب لوگ حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ اے کاش، ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں جانا نصیب ہو جائے تاکہ ہم ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزار کر یہاں واپس آئیں۔

[۱۴۹] یعنی کسی اور کی طرف نہیں، بلکہ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اِس لیے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہاں کوئی اِن کی مدد کے لیے کھڑا ہو جائے گا یا اذن الٰہی کے بغیر یہ کسی سے اپنی سفارش کرا لیں گے۔

[۱۵۰] پیچھے نصاریٰ کو سیدنا مسیح علیہ السلام کے حوالے سے جن حقائق پر توجہ دلائی ہے، یہ اب اُنھی کو دوسرے انبیا علیہم السلام کی تعلیمات سے مؤکد کیا ہے۔ اِس میں سب سے پہلے

قَالَ لِاَبِیۡهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا یَسۡمَعُ وَ لَا یُبۡصِرُ وَ لَا یُغۡنِیۡ عَنۡكَ
شَیۡـًٔا ﴿۴۲﴾ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ قَدۡ جَآءَنِیۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ یَاۡتِكَ فَاتَّبِعۡنِیۡۤ
اَهۡدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ﴿۴۳﴾ یٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّیۡطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ
كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِیًّا ﴿۴۴﴾ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ
الرَّحۡمٰنِ فَتَكُوۡنَ لِلشَّیۡطٰنِ وَلِیًّا ﴿۴۵﴾

(اللہ کا) نبی تھا۔ یاد کرو، جب اُس نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان، آپ اُن چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کے کسی کام آ سکتی ہیں؟ ابا جان، حق یہ ہے کہ میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے، اِس لیے آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ ابا جان، آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، اِس میں شبہ نہیں کہ شیطان خداے رحمٰن کا بڑا ہی نافرمان ہے۔ ابا جان، (اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو) مجھے ڈر ہے کہ آپ کو خداے رحمٰن کا کوئی عذاب آ پکڑے گا اور آپ شیطان کے ساتھی بن کر رہ جائیں گے۔[۱۵۲] ۴۱-۴۵

ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہوا ہے، اِس لیے کہ دعوت و شہادت کے لیے ذریت ابراہیم کے انتخاب سے جس دور نبوت کی ابتدا ہوئی، اُس کے امام وہی ہیں۔

۱۵۱؎ اصل میں لفظ 'صِدِّیْق' آیا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ وصف یہاں اِس لیے نمایاں کیا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین، دونوں کو توجہ دلائی جائے کہ جن کو اپنا ابوالآبا کہتے ہو، وہ تمھاری طرح خدا سے بدعہدی اور بے وفائی کرنے والے نہیں تھے، بلکہ راست باز، صداقت شعار اور خدا کے کامل وفادار تھے۔ لہٰذا اُن سے نسبت اور اُن کی وراثت کے حق دار بننا چاہتے ہو تو ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اُن کے یہ اوصاف تم بھی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرو۔

۱۵۲؎ یہ نبوت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگوؤں کا خلاصہ ہے جو اُنھوں نے اپنے باپ آذر سے کی ہیں۔ اِس میں 'یٰٓاَبَتِ' کی تکرار بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم نے یہ گفتگو کس دل سوزی، دردمندی اور محبت کے ساتھ کی ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، ایک سعادت مند بیٹے کے اندر باپ کی گم راہی سے جو تعلق خاطر اور اضطراب ہونا چاہیے، وہ اِس گفتگو کے فقرے فقرے سے نمایاں ہے۔ اپنے باپ کو اُنھوں نے اِس گفتگو میں چند حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''سب سے پہلے اِس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ آخر اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی اِن پتھر کی مورتوں کو معبود مان کر اِن کی پوجا کرنے کا کیا تک ہے؟ کسی کو معبود بنا لینا کوئی شوق اور تفریح کی چیز نہیں ہے۔ اِس کا تعلق تو انسان کی سب سے بڑی احتیاج سے ہے۔ انسان خدا کو اِس لیے مانتا ہے اور اُس کی عبادت کرتا ہے کہ وہ اُس کی دعا و فریاد کو سنتا، اُس کے دکھ درد کو دیکھتا اور اُس کی ہر مشکل میں اُس کی دست گیری کرتا ہے۔ آخر یہ آپ کے اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی مورتیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، نہ آپ کے کچھ کام آ سکتی ہیں، کس مرض کی دوا ہیں کہ آپ اُن کے آگے ڈنڈوت کرتے ہیں؟ یہ گویا شرک کے بدیہی باطل ہونے کی دلیل ہے کہ اُس کے باطن سے قطع نظر اُس کا ظاہر ہی شہادت دیتا ہے کہ یہ کھلی ہوئی سفاہت اور عقل و فطرت سے بالکل بے جوڑ چیز ہے۔
>
> دوسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ خدا کے معاملے میں یہ طے کرنا کہ اُس کا کوئی شریک ہے یا نہیں اور ہے تو کون ہے، یہ مجرد ظن و گمان رکھنے والی چیز نہیں ہے۔ آدمی ایک خدا کو تو اِس لیے مانتا ہے کہ فطرت اور عقل، آفاق اور انفس کے اندر اُس کی شہادت موجود ہے اور ہر انسان، جس کی فطرت سلیم ہو، اُس کے ماننے پر مضطر ہے، لیکن دوسروں کو ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ خواہ مخواہ کو اُن کو بھی شریک خدا بنا کر اپنے سر پر لا دے؟ اِس معاملے میں اعتماد کی چیز 'العلم'، یعنی وہ علم حقیقی ہے جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے سے آتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کو دعوت دی کہ وہ ایسے اہم معاملہ میں مجرد وہم کی پیروی نہ کریں، بلکہ اُن کی پیروی کریں۔ وہ اُن کے سامنے اُس علم حقیقی کو پیش کر رہے ہیں جو خدا کی طرف سے اُن کے

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾

باپ نے کہا: ابراہیم، کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمھیں ضرور سنگ سار کر دوں گا۔[۱۵۳] اِس لیے تم (اپنی خیر چاہتے ہو تو) مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو۔ ۴۶

پاس آیا ہے۔ اِسی علم سے اُس راہ کی طرف رہنمائی ہو گی جو خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ ہے۔ 'سیدھی راہ'، یعنی یہ راہ بندے کو ہر واسطے اور ہر وسیلے سے بے نیاز کر کے براہ راست خدا تک پہنچانے والی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ راہ توحید کی راہ ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ شیطان کو سب سے زیادہ کد اور ضد، جیسا کہ قصۂ آدم و ابلیس سے واضح ہے، توحید کی صراط مستقیم ہی سے ہے۔ اُس نے یہ قسم کھا رکھی ہے کہ وہ ذریت آدم کو اِس صراط مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگا دے گا اور اُن کو شرک میں مبتلا کر کے چھوڑے گا۔ خداے رحمٰن کے ایسے کھلے ہوئے باغی کی ایسی وفادارانہ اطاعت درحقیقت اُس کی عبادت ہے اور بدقسمت ہے وہ انسان جو خدا کو چھوڑ کر شیطان کی عبادت کرے۔

چوتھی حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اب تک تو آپ کے لیے ایک عذر تھا کہ خدا کی ہدایت آپ کو نہیں پہنچی تھی، لیکن اب جب کہ خدا کی ہدایت آپ کو پہنچ چکی ہے، آپ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا، اِس وجہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ خدا کی پکڑ میں نہ آ جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر اُسی انجام سے نہ دوچار ہوں جو شیطان اور اُس کے اولیا کے لیے مقدر ہے۔''

(تدبر قرآن ۴/۶۵۸)

۱۵۳ قبائلی تمدن میں باپ کو بیٹوں پر اور آقاؤں کو اُن کے غلاموں پر اِسی طرح کے غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ جس طرح آقا کسی جرم کی پاداش میں اپنے غلاموں کو قتل تک کر سکتے تھے، اِسی طرح باپ بھی بیٹوں اور بیٹیوں کو جو سزا چاہیں، دے سکتے تھے۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيۡكَ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيۡ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعۡتَزِلُكُمۡ وَمَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَاَدۡعُوۡا رَبِّيۡ ۖۗ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّيۡ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾

ابراہیم نے کہا: (اچھا پھر) آپ کو میرا اسلام ہے[۱۵۴]۔ میں آپ کے لیے اب اپنے پروردگار سے بخشش کی دعا کروں گا[۱۵۵]۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ (اگر آپ کی راے یہی ہے تو) میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور اُن کو بھی جنھیں آپ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں۔ مَیں تو اپنے پروردگار ہی کو پکاروں گا۔ مجھے امید ہے کہ اپنے پروردگار کو پکار کر میں محروم نہ رہوں گا[۱۵۶]۔ ۴۷-۴۸

---

[۱۵۴] ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ہجرت و براءت کے اِس موقع پر، یہ نہایت شستہ اسلوب میں وداعی سلام ہے۔

[۱۵۵] باپ کی طرف سے نہایت سنگ دلانہ رویے کے باوجود یہ وعدہ دلیل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کس درجہ رقیق القلب، دردمند اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ دعا اُس وقت تک کرتے رہے، جب تک اللہ تعالیٰ نے اُن کو اِس سے روک نہیں دیا۔

[۱۵۶] اپنے باپ کے لیے دردمندی اور محبت کے ساتھ یہ اعلان براءت حق و صداقت کے لیے جس حمیت کا اظہار ہے، وہ بھی نہایت غیر معمولی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”حضرت ابراہیم کے اِس اعلان براءت میں جو زور، جو اعتماد علی اللہ اور خلق سے جو بے نیازی ہے، وہ لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اول تو حضرت ابراہیم نے جمع کا صیغہ ’وَاَعۡتَزِلُكُمۡ‘ استعمال کیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اُنھوں نے صرف آزر ہی سے نہیں، بلکہ اُس کے تمام حواریوں، ہم نواؤں اور خاندان سے بھی اعلان براءت کر دیا۔ اِس کے ساتھ ’وَمَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ
اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا (۴۹) وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ

پھر جب وہ اُن کو چھوڑ کر الگ ہو گیا اور اُن کو بھی جنھیں وہ خدا کے سوا پوجتے تھے تو ہم نے اُس کو اسحٰق اور یعقوب دیے اور اُن میں سے ہر ایک کو نبی بنایا[۱۵۷] اور اُن کو اپنی

اللّٰهِ ‘ کہہ کر اُن کے تمام معبودوں کو بھی اُن کے ساتھ شامل کر دیا، گویا اُنھیں بھی لات مار دی۔ پھر بات کو صرف منفی پہلو ہی سے کہنے پر بس نہیں کیا، بلکہ اُس کو مثبت پہلو سے بھی آشکارا کر دیا۔ فرمایا کہ 'وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ' میں صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اُس کے سوا میں کسی اور معبود سے آشنا نہیں۔ آخر میں اپنے رب پر اپنے غیر متزلزل اعتماد کا اظہار فرمایا کہ میں اپنے رب کو پکار کے کبھی محروم نہیں رہا ہوں، امید ہے کہ اِس آزمایش میں بھی اُس کی نصرت اور رہنمائی میرے ساتھ ہو گی۔ ایک طرف تو وہ نرمی، دوسری طرف یہ سختی! درحقیقت نرمی و سختی کا یہی امتزاج اور اُن کی یہی باہم آمیزی ہے جو ایک داعیِ حق کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ جب تک آدمی موم کی طرح نرم اور پتھر کی طرح سخت نہ ہو، وہ حق کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔“

(تدبر قرآن ۴/ ۶۶۰)

۱۵۷ اپنی قوم سے ہجرت کے بعد رسولوں کو بالعموم اٹھا لیا جاتا ہے، لیکن حضرت ابراہیم کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فلسطین اور جزیرہ نماے عرب میں توحید کے مراکز قائم کرنے کا ایک دوسرا مشن اُن کے سپرد کیا اور اُن کی قربانیوں کے صلے میں نبوت آیندہ کے لیے اُنھی کی نسل کے ساتھ خاص کر دی۔ چنانچہ یہ پوری نسل اب قیامت تک کے لیے خدا کی وہ منتخب امت ہے جو قوموں پر اتمام حجت کے لیے برپا کی گئی ہے۔ یہ اِسی امتنان کا ذکر ہے جس کے نتیجے میں اُن کے بیٹے اسحٰق اور اسحٰق کے بیٹے یعقوب اور یعقوب کے بیٹے یوسف، سب نبی بنا دیے گئے تاکہ اِس امت کی ابتدا اُسی شان اور اہتمام کے ساتھ کی جائے جو اُس کے منصب کا تقاضا ہے۔ یہ نبوت بالکل اُسی نوعیت کی تھی، جیسے انسانیت کی ابتدا کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو دی گئی۔

رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (۵۰)
وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ز اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ
رَسُوْلًا نَّبِيًّا (۵۱) وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ

رحمت سے حصہ ارزانی کیا اور اُن کو اونچے درجے کی سچی اور پایدار نام وری عطا فرمائی۔[۱۵۸] ۴۹-۵۰

اور اِس کتاب میں موسیٰ کا ذکر کرو۔ بے شک، وہ ایک برگزیدہ شخص[۱۵۹] اور رسول نبی[۱۶۰] تھا۔ ہم نے اُس کو طور کے مقدس[۱۶۱] کنارے سے آواز دی اور اُس کو اپنے قریب بلایا، ہم

اِس کے لیے کسی قوم کی طرف اُن کی بعثت ضروری نہیں تھی۔

اسمٰعیل علیہ السلام کا معاملہ، البتہ مختلف ہے۔ حضرت ابراہیم کے لیے ہجرت کی برکات میں سے اولین اور سب سے بڑی برکت وہی تھے۔ چنانچہ نبوت کے ساتھ وہ رسالت کے منصب پر بھی فائز کیے گئے اور اُن لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے جو بیت اللہ کے گردونواح میں آباد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا، بلکہ آگے مستقلاً اور پورے اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔

[۱۵۸] یہی نام وری ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم نے دعا کی تھی۔ سورۂ شعرا (۲۶) کی آیت ۸۴ میں اِس کا ذکر ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُن کی دعوت کو خوب فروغ دیا اور اُن کو وہ پایدار عزت و شہرت حاصل ہوئی جو دنیا میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اُس کی پایداری کا یہ عالم ہے کہ ہزاروں برس گزر گئے، لیکن اُس پر کہنگی نہیں آئی۔ سینکڑوں، ہزاروں جلیل القدر انبیا و مصلحین اِس مبارک خانوادے سے اٹھے اور حضرت ابراہیم کے مشن کو زندہ کرتے رہے۔ آخر میں حضرت اسمٰعیل کی نسل سے اِسی ملت ابراہیم پر حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جس سے اُس عظمت و شہرت کو بقائے دوام حاصل ہو گیا۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۶۶۲)

[۱۵۹] اصل میں لفظ 'مُخْلَصًا' آیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصی

نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾
وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ز اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ
رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ ج وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ص وَكَانَ عِنْدَ

اُس سے کچھ راز کی باتیں کر رہے تھے۔ اور اپنی عنایت سے اُس کے بھائی ہارون کو ہم نے نبی بنا کر اُسے (مددگار کے طور پر) دے دیا۔ ۵۱-۵۳

اور اِس کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کرو۔ بے شک، وہ وعدے کا سچا[۱۶۲] اور رسول نبی تھا۔

معاملہ کیا کہ اُن سے براہ راست کلام فرمایا۔ یہ لفظ اُن کے اِسی امتیازی وصف کو بیان کرتا ہے۔ آگے 'قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا' کے الفاظ میں اِس کی وضاحت کر دی ہے۔ انبیا علیہم السلام میں سے اِس نوعیت کے تقرب و تکلم اور راز و نیاز کے لیے وہی منتخب کیے گئے۔ ایک مددگار نبی کا ملنا بھی اِسی نوعیت کا خصوصی امتیاز ہے جو کسی دوسرے پیغمبر کو حاصل نہیں ہوا۔ اُن پر یہ عنایت، خود اُن کی خواہش پر اِس لیے کی گئی کہ وہ فرعون جیسے جابر بادشاہ کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور اِس کے ساتھ یہ ذمہ داری بھی اُن پر ڈالی گئی تھی کہ وہ بنی اسرائیل جیسی قوم کی اصلاح و تنظیم کا فریضہ انجام دیں جو دینی اور اخلاقی انحطاط کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

۱۶۰ یعنی نبوت کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جن لوگوں کی طرف مبعوث کیے گئے، اُن کی طرف خدا کی عدالت بن کر آئے تھے کہ اُن کا فیصلہ اِسی دنیا میں کر دیں۔

۱۶۱ اصل میں لفظ 'الْاَيْمَن' آیا ہے۔ اِس کے معنی داہنے کے بھی ہیں اور مبارک و مقدس کے بھی۔ ہم نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے، اِس لیے کہ سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۱۲ سے اِس کی تائید ہوتی ہے۔

۱۶۲ یہ اُس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو اُنھوں نے اپنے باپ سے اپنے ذبح کیے جانے

مریم
۱۹

رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾
وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۙ ﴿۵۶﴾
وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تلقین کرتا تھا[۱۶۳] اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا[۱۶۴]۔ ۵۴-۵۵

اور اِس کتاب میں ادریس کا ذکر کرو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بھی راست باز اور نبی تھا اور ہم نے (ابراہیم کی طرح) اُس کو بھی اونچے مرتبے تک پہنچایا تھا[۱۶۵]۔ ۵۶-۵۷

سے متعلق کیا تھا اور جب اُس کی تکمیل کا وقت آیا تو بغیر کسی ادنیٰ تردد کے اپنی گردن چھری کے نیچے دے دی تھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... ’صَادِقَ الْوَعْدِ‘ بظاہر مرکب تو صرف دو لفظوں سے ہے، لیکن یہ مومن و مسلم کے کردار کی ایک جامع تعبیر ہے۔ اللہ کا جو بندہ اپنے رب سے کیے ہوئے عہد میں راست باز ہے اور اُس کی خاطر اپنی گردن کٹوا سکتا ہے، اُس نے ایمان و اسلام کی معراج حاصل کر لی۔ رہے وہ لوگ جو ابراہیم و اسمٰعیل کے نام پر محض نسب فروشی اور لاف زنی کر رہے تھے، اُن کے سامنے قرآن نے یہ آئینہ رکھ دیا ہے کہ وہ اُس میں اپنی سیاہ روئی کا مشاہدہ کر لیں۔“
>
> (تدبر قرآن ۴/۶۶۵)

۱۶۳ تمام شریعت کی بنیاد اِنھی دو چیزوں پر ہے۔ یہاں اِن کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو یہ سرگذشتیں سنائی جا رہی ہیں، وہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد تھے، مگر نماز اور زکوٰۃ، دونوں سے بے پروا ہو چکے تھے۔

۱۶۴ یعنی اپنے پروردگار کے نزدیک بالکل ٹھیک ویسا ہی تھا، جیسا خدا اپنے بندوں کے لیے چاہتا ہے کہ وہ ہوں۔ کسی بندۂ مومن کے کامل العیار ہونے کا یہ آخری درجہ ہے جس کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجایش نہیں رہتی۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ
اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ
وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا
سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩ ﴿۵۸﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ
وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ

یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پیغمبروں میں سے اپنا فضل فرمایا، آدم کی اولاد میں سے[۱۶۶] اور اُن لوگوں کی نسل سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور اُن لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا تھا۔ اُن کو جب خداے رحمٰن کی آیتیں سنائی جاتی تھیں تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے جاتے تھے[۱۶۷]۔ پھر اُن کے بعد وہ ناخلف اُن کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے چل پڑے[۱۶۸]۔ سو عنقریب وہ اپنی گم راہی

---

[۱۶۵] یہ نوح علیہ السلام سے پہلے کے انبیا میں سے ہیں۔ یہاں اِن کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر نبوت کا جو سلسلہ ختم ہوا ہے، اُس کی ابتدا غالباً اِنھی سے ہوئی تھی۔ اِس لحاظ سے یہ اُن کے مثیل ہیں۔ چنانچہ اِن کی صفات بھی وہی بیان کی گئی ہیں جو اوپر سیدنا ابراہیم کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ اِن کے ذکر سے قرآن نے ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اور اُن کے بعد نبوت کے دونوں ادوار کا احاطہ کر لیا ہے۔

[۱۶۶] یہ اشارہ اُس راے کی تائید کرتا ہے جو ہم نے اوپر حضرت ادریس کے متعلق ظاہر کی ہے۔ چنانچہ عام خیال بھی یہی ہے کہ بائیبل میں جن بزرگ کا نام حنوک بتایا گیا ہے، وہی ادریس علیہ السلام ہیں۔

وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ﴿۶۰﴾
جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ
وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ

کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ البتہ جو توبہ کر لیں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہو گی۔ ہمیشہ رہنے والے باغوں میں، جن کا خداے رحمٰن نے اُس دنیا میں اپنے بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے جو آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔ اُس کا وعدہ یقیناً پورا ہو کر رہے گا۔ وہ اُس میں کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے، اُن کے لیے وہاں سلام ہی سلام ہو گا۔[۱۶۹] اُن

۱۶۷۔ یہ اُن لوگوں پر تعریض ہے جو پیغمبروں کے نام لیوا تھے، مگر اللہ کی آیتوں کو سن کر نہایت استکبار اور رعونت کے ساتھ اُنھیں جھٹلا دیتے تھے۔

۱۶۸۔ یہ وہ اصل مدعا ہے جس کے لیے اوپر کی سرگذشتیں سنائی گئی ہیں۔ گویا مخاطبین سے کہا ہے کہ تم پر افسوس، ابراہیم اور یعقوب اور دوسرے جلیل القدر انبیا کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہو، مگر اُن کے لائے ہوئے تمام دین کو برباد کیے بیٹھے ہو۔ اِس میں خاص طور پر نماز کو ضائع کر دینے کا ذکر کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ نماز ہی وہ چیز ہے جو صبح و شام بندے کو وہ عہد یاد دلاتی ہے جو اُس نے اپنے پروردگار سے باندھ رکھا ہے۔ یہ ضائع ہو جائے تو جلد یا بدیر آدمی پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد اتباع شہوات کا ذکر ہے جس کا لازمی نتیجہ اللہ کی راہ میں انفاق سے محرومی ہے۔ چنانچہ اصل مانع کا ذکر کر دیا ہے تاکہ زکوٰۃ اور انفاق کی طرف اشارہ بھی ہو جائے اور نماز اور زکوٰۃ، دونوں کے ضائع کر دینے کا سبب بھی سامنے آ جائے۔

۱۶۹۔ یعنی ایک دوسرے کی طرف سے بھی اور خدا کے فرشتوں کی طرف سے بھی جو اُن کی فیروزمندی پر ہر جگہ اُن کا خیر مقدم سلام و تحیت سے کریں گے۔

فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا
مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾
وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا

کا رزق صبح و شام اُس میں مہیا ہوگا۔[۱۷۰] یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اُن کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں گے۔[۱۷۱] ۵۸-۶۳

([۱۷۲] ہم کو معلوم ہے، اے محمد کہ تم ہمارے لیے منتظر رہتے ہو، لیکن ہمارا معاملہ یہ ہے کہ) ہم تمھارے پروردگار کے حکم ہی سے اترتے ہیں۔ ہمارے آگے اور پیچھے جو کچھ

---

[۱۷۰] آیت میں 'رِزْق' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ انوار و برکات الٰہی اور نفحات روح و ریحان کو بھی شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے جسم و جان اور دل و دماغ کے لیے یہ تمام عنایات صبح و شام اُن پر وہاں ہوتی رہیں گی۔

[۱۷۱] یہ آخر میں مخاطبین پر واضح کر دیا ہے کہ تم اپنے زعم میں جو چاہو، سمجھتے رہو، مگر خدا کا فیصلہ یہی ہے کہ اُس کی جنت پر مدعی اور بوالہوس کا حق نہیں ہے۔ یہ اُنھی کو ملے گی جو اُس سے ڈرنے والے ہیں۔

[۱۷۲] یہاں سے آگے یہ پورا پیرا درحقیقت ایک جملۂ معترضہ ہے جس میں جبریل امین کی زبان سے اُن کے دیر سے آنے پر معذرت بھی ہے اور وحی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق و اضطراب اور عجلت و بے قراری پر صبر و انتظار کی تلقین بھی۔ یہ معلوم ہے کہ اپنی قوم پر اتمام حجت آپ کا فریضۂ منصبی تھا۔ اِس طرح کی غیر معمولی ذمہ داری کو جلد سے جلد اور سرخ روئی کے ساتھ پورا کر دینے کی خواہش ایک فطری خواہش تھی۔ پھر قریش بھی بار بار تقاضا کرتے تھے کہ قرآن اگر خدا کی طرف سے نازل کیا جا رہا ہے تو ایک ہی مرتبہ پورا کیوں نازل نہیں کر دیا جاتا۔ قرآن جیسی بے نظیر کتاب کسی شخص کو کائنات کے بادشاہ اور جہانوں کے پروردگار کی طرف سے

دی جا رہی ہو اور اُس کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ پوری کتاب جلد اُسے مل جائے تو اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ آپ کے قلب کو تمام قوت، روح کو زندگی، عقل کو رہنمائی اور ارادے کو ثبات و استحکام قرآن ہی سے حاصل ہوتا تھا، یہ چیز بھی اُس کو جلد پالینے کے لیے شوق و اضطراب کا باعث بن جاتی تھی۔ اِن آیتوں میں اِسی بے قراری اور عجلت پر صبر و انتظار کی تلقین کی گئی ہے جس کا اظہار آپ کی طرف سے بعض ایسے موقعوں پر ہوا ہوگا، جب وحی کے آنے میں کچھ زیادہ وقفہ ہو گیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے بعض پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”اِس میں پہلی قابل توجہ چیز تو یہ ہے کہ یہ حضرت جبریل امین کی طرف سے آں حضرت کی خدمت میں ایک نوع کی معذرت ہے کہ اگر ہم جلدی جلدی، آپ کے شوق و انتظار کی تسکین کے لیے، وحی لے کر نہیں اترتے تو اِس میں ہماری کسی کوتاہی کو دخل نہیں ہے، بلکہ ہمارا اترنا تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہے۔ جب تک اُس کا حکم نہ ہو، نہ ہم اتر سکتے ہیں اور نہ ہم آپ کے پاس کوئی وحی لا سکتے ہیں۔ اِس معاملے میں ہمیں کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم صرف اُس کے احکام کی بجا آوری پر مامور ہیں۔
>
> دوسری چیز قابل توجہ یہ ہے کہ اِس سے حضرت جبریل امین اور پورے زمرۂ ملائکہ کی حیثیت واضح ہو گئی کہ اُن کے تمام پیش و عقب اور جو کچھ اُن کے مابین ہے، سب پر اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور اُس کا مکمل کنٹرول ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی سر مو اپنے دائرے سے تجاوز کر سکے یا کوئی اقدام اپنے ارادے سے کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو فراموش کرنے والا بھی نہیں ہے کہ کوئی اُس کی بھول چوک سے فائدہ اٹھا کر کسی معاملے میں اپنی آزادیٔ راے استعمال کر کے اُس کی پکڑ سے محفوظ رہ سکے ـــــ فرشتوں کی اِس حیثیت کا واضح ہونا اُن مشرکین عرب کی حماقت پر ضرب لگانے کے لیے ضروری تھا جو فرشتوں کی پوجا کر کے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اگر قیامت ہوئی تو یہ خدا کی بیٹیاں اپنے باپ سے کہہ سن کے اُن کو بخشوا ہی لیں گی۔ اِن بے وقوف لوگوں کو حضرت جبریل کا یہ بیان سنا کر آگاہ کر دیا گیا کہ جب رب ذوالجلال کی بارگاہ میں جبریل امین

وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (۶۴) رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (۶۵)
وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا (۶۶)
اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (۶۷)

ہے، سب اُسی کے اختیار میں ہے اور وہ بھی جو اُس کے درمیان ہے۔ (تم مطمئن رہو)، تمھارا پروردگار (کسی چیز کو) بھولنے والا نہیں ہے[۱۷۳]۔ وہ زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے، سو اُسی کی بندگی کرو اور اُس کی بندگی پر جمے رہو[۱۷۴]۔ کیا تمھارے علم میں اُس جیسا کوئی اور بھی ہے[۱۷۵]؟ ۶۴-۶۵

انسان[۱۷۶] کہتا ہے، کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم اِس سے پہلے اُس کو پیدا کر چکے ہیں، جب کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا[۱۷۷]۔

کی، جو تمام زمرۂ ملائکہ کے گل سر سبد ہیں، بے بسی کا یہ حال ہے تو تابہ دیگراں چہ رسد!''

(تدبر قرآن ۴/ ۶۷۵)

[۱۷۳] مطلب یہ ہے کہ اگر دیر ہوئی ہے تو کسی حکمت و مصلحت کے پیش نظر ہوئی ہے، تمھارا پروردگار تمھیں بھول نہیں گیا ہے۔

[۱۷۴] اصل الفاظ ہیں: 'وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ'۔ اِن میں لفظ 'عِبَادَة' اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے، یعنی عبادت اور اطاعت، دونوں کو شامل ہے۔ اِسی طرح 'صَبْر' کی جگہ 'اِصْطِبَار' ہے جس میں صبر کے مقابلے میں زیادہ زور ہے۔ پھر اُس کے بعد 'ل' کا صلہ ہے۔ یہ اِس طریقے سے آئے تو انتظار کے مفہوم پر متضمن ہوتا ہے۔ آیت کے یہ مضمرات اردو ترجمے میں منتقل کرنا آسان نہیں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اپنی قوم کے معاملے میں صبر کے ساتھ خدا کے فیصلے کا انتظار کرو اور جو کچھ بھی حکم دیا جائے، پوری استقامت کے ساتھ اُس کی تعمیل کرتے رہو۔ یہی تمھارے منصب کا تقاضا ہے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ
جِثِيًّا ۚ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ
عِتِيًّا ۚ ﴿۶۹﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾ وَاِنْ

سو تیرے پروردگار کی قسم، ہم اِن کو بھی ضرور اکٹھا کریں گے اور اِن کے شیطانوں کو بھی[۱۷۸]، پھر اِن سب کو جہنم کے گرد اِس طرح حاضر کریں گے کہ (مجرموں کی طرح) یہ گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ پھر ہر گروہ میں سے ہم اُن لوگوں کو چھانٹ کر الگ کر دیں گے جو خداے رحمٰن کے مقابل میں سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے بنے رہے[۱۷۹]۔ پھر اُن لوگوں کو سب سے بڑھ کر جاننے والے بھی ہم ہی ہوں گے جو سب سے زیادہ مستحق ہوں گے کہ جہنم میں جا پڑیں[۱۸۰]۔ (خداے رحمٰن کے مقابل میں اکڑنے

---

۱۷۵ یعنی جب اُس کا کوئی ہم پایہ، نظیر و مثیل اور ثانی نہیں ہے تو مطمئن رہو، اُس کے ارادوں میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں بن سکے گا۔

۱۷۶ جبریل علیہ السلام کا کلام اوپر ختم ہوا۔ یہاں سے اب براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہو رہا ہے۔ آیت میں 'اِنْسَان' کا لفظ اگرچہ عام ہے، لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اِس سے مراد مشرکین عرب ہی ہیں جو قیامت کے بارے میں ہر طرح کی متناقض باتیں کہتے رہتے تھے۔

۱۷۷ استاذ امام کے الفاظ میں، مطلب یہ ہے کہ جب 'کچھ نہیں' سے پیدا کر چکے ہیں تو 'کچھ ہے' سے پیدا کرنے میں کیا مشکل پیش آئے گی؟

۱۷۸ یعنی اُن شیطانوں کو، جن کی یہ جنوں اور انسانوں میں سے پیروی کرتے رہے۔

۱۷۹ تاکہ اب جہنم میں جھونکے جانے والوں میں سب سے آگے ہوں۔

۱۸۰ یعنی کسی اور کے بتانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ مشرکین کے غلط عقیدۂ شفاعت پر ایک لطیف تعریض ہے کہ خدا کے ہاں کسی کے لیے

مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِيًّا ۚ (۷۱)
ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيۡنَ فِيۡهَا جِثِيًّا (۷۲)

والو)، تم میں سے ہر ایک کو اُس میں لازماً داخل ہونا ہے۔[۱۸۱] یہ ایک طے شدہ بات ہے، (اے پیغمبر)، جس کو پورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے۔ ۶۶-۷۱

پھر ہم اُن کو نجات دیں گے[۱۸۲] جو خدا سے ڈرتے رہے اور اُن کو جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے، اُسی میں گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے چھوڑ دیں گے۔[۱۸۳] ۷۲

سفارش تو وہ کر سکے جو کسی کے بارے میں خدا سے زیادہ واقف ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ آخر ایسا برخود غلط کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ سکے کہ فلاں کو آپ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ وہ بڑا نیک آدمی ہے، اِس وجہ سے اُس کو کچھ نہ کہیے، بلکہ سیدھے جنت میں بھیج دیجیے۔”
(تدبر قرآن ۴/ ۶۷۸)

۱۸۱؎ یہاں شدت غضب کا اظہار مقصود ہے، اِس لیے غائب کا اسلوب خطاب کے اسلوب میں بدل گیا ہے۔

۱۸۲؎ یعنی اُس جہنم سے نجات دیں گے جو اگر وہ خدا کے مقابل میں اکڑتے اور تقویٰ اختیار نہ کرتے تو اُسی طرح اُن کا ٹھکانا بن جاتی، جس طرح اُن مجرموں کا ٹھکانا بنی ہے جن کا ذکر یہاں ہو رہا ہے۔ یہ لفظ بالکل اِسی طریقے سے رسول اور اُس کے ساتھیوں کے لیے اُس عذاب سے نجات کے لیے قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے جو اتمام حجت کے بعد اِسی دنیا میں آتا رہا ہے۔

۱۸۳؎ پیچھے اِنھی الفاظ میں اُس وقت کی حالت بیان ہوئی ہے، جب فیصلہ سننے کے منتظر ہوں گے اور یہاں اُس وقت کی، جب فیصلۂ الٰہی کے بعد جہنم کے داروغوں کے حوالے کر دیے جائیں گے اور وہاں اپنے اپنے درجات کے لحاظ سے عذاب کی جگہ پر جانے کے منتظر ہوں گے۔ مدعا یہ ہے کہ ہم اُن کو اِسی حالت میں چھوڑ کر بے التفات ہو جائیں گے کہ تمام رسوائی اور فضیحت کے بعد اب وہ اُن لوگوں کی گرفت میں ہیں جو اُنھیں اُن کے ٹھکانوں تک پہنچا دیں گے۔ اِس لحاظ سے

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ
اٰمَنُوْٓا ۙ اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا
قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْیًا ﴿۷۴﴾ قُلْ مَنْ كَانَ
فِی الضَّلٰلَةِ فَلْیَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ۬ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ

اِنھیں جب ہماری کھلی کھلی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو یہ منکرین ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ بتاؤ، ہم دونوں گروہوں میں سے کون اپنے مرتبے کے لحاظ سے بہتر ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شان دار ہیں[۱۸۴]؟ اِن سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر چھوڑی ہیں جو ساز و سامان اور ظاہری شان و شوکت میں اِن سے کہیں بڑھی ہوئی تھیں۔ اِن سے کہہ دو کہ جو لوگ گم راہی میں پڑے رہتے ہیں، (اُن کے معاملے میں) خداے رحمٰن کی شان یہی ہے[۱۸۵] کہ اُن کی رسی اچھی طرح دراز کرے، یہاں تک کہ جب وہ اُس چیز کو دیکھ لیں

دیکھیے تو آیت میں لفظ 'جِثِیًّا'، دونوں جگہ نہایت موزوں استعمال ہوا ہے، اِس لیے کہ انتظار کے مراحل میں مجرم بالعموم اِسی طرح بٹھائے جاتے تھے۔

[۱۸۴] یعنی صاف واضح ہے کہ ہم بہتر ہیں تو آگے کم تر کیوں ہو جائیں گے؟ جب خدا نے یہ سب یہاں ہمیں دیا ہے اور تم محروم رہے ہو تو آگے بھی ہمیں ہی ملے گا۔

[۱۸۵] اصل الفاظ ہیں: 'فَلْیَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا'۔ یہ اسلوب اِس لیے اختیار فرمایا ہے کہ اِس سے خدا کی سنت اور اُس کے شایانِ شان طریقے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی قدرت و حکمت اور اُس کے حسن تدبیر کا تقاضا یہی ہے کہ اُس نے دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے تو وہ لوگوں کو فوراً نہ پکڑے، بلکہ زیادہ سے زیادہ ڈھیل دے کہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور پکڑنے سے پہلے اُس کی حجت ہر لحاظ سے اُن پر پوری ہو جائے۔

اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

گے جس کا اُن سے وعدہ کیا جا رہا ہے ـــــ خواہ وہ عذاب الٰہی[۱۸۶] ہو یا قیامت کی گھڑی ـــــ تو اُس وقت خوب جان لیں گے کہ کس کا درجہ برا اور کس کا جتھا کمزور ہے۔[۱۸۷] ۷۳-۷۵

اِس کے برخلاف جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں، اللہ اُن کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے اور باقی رہنے والے اچھے اعمال[۱۸۸] تیرے پروردگار کے نزدیک اجر کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں اور مآل کار کے لحاظ سے بھی۔[۱۸۹] ۷۶

---

[۱۸۶] یہ اُس عذاب کا ذکر ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے۔

[۱۸۷] آیت میں تفضیل کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ عربیت کی رو سے ضروری نہیں ہے کہ اِنھیں تقابل کے مفہوم میں لیا جائے۔ یہ اُس سے مجرد ہو کر بھی آ جاتے ہیں۔

[۱۸۸] اصل میں 'اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ درحقیقت وہی اعمال صالحہ ہیں جو پایدار اور غیر فانی ہیں۔ جو اعمال چند روزہ اور فانی ہیں، وہ غیر صالح ہیں۔ رہا یہ سوال کہ باقی اعمال کون ہیں اور فانی کون ہیں تو اُس کا جواب یہ ہے کہ جو اعمال صرف دنیا کو مطلوب و مقصود بنا کر کیے جاتے ہیں، وہ فانی ہیں، اِس لیے کہ یہ دنیا خود فانی ہے۔ باقی رہنے والے اعمال صرف وہ ہیں جو خدا اور آخرت کو مقصود بنا کر کیے جائیں، اِس لیے کہ خدا بھی غیر فانی ہے اور آخرت بھی۔''
>
> (تدبر قرآن ۴/۶۸۱)

[۱۸۹] یہ اہل ایمان کے لیے تسلی ہے کہ نفع عاجل کے بجائے اُن چیزوں پر نگاہ رکھو گے جو

اَفَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوۡتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾
اَطَّلَعَ الۡغَيۡبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا ؕ سَنَكۡتُبُ مَا
يَقُوۡلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الۡعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوۡلُ وَيَاۡتِيۡنَا فَرۡدًا ﴿۸۰﴾

پھر تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے[۱۹۰] جس نے ہماری آیتوں کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور جس کا دعویٰ ہے کہ میں (آخرت میں بھی اِسی طرح) مال و اولاد سے ضرور نوازا جاؤں گا[۱۹۱]؟ کیا اُس نے غیب میں جھانک کر دیکھا ہے یا خداے رحمٰن سے کوئی عہد لے لیا ہے؟ ہرگز نہیں، وہ جو کچھ کہتا ہے، اُسے ہم لکھ رکھیں گے اور (اُس کے اِس ادعا کے باعث) اُس کے حق میں عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے اور وہ جن چیزوں کا مدعی ہے، اُس کے وارث ہم ہو جائیں گے اور وہ ہمارے سامنے اکیلا حاضر ہوگا[۱۹۲]۔ ۷۷-۸۰

آخرت میں کام آنے والی ہیں تو اطمینان رکھو، خدا کی ابدی بادشاہی تمھارے لیے منتظر ہے۔

[۱۹۰] اصل میں 'اَفَرَءَيۡتَ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب آگے کسی برخود غلط شخص یا کسی انتہائی احمقانہ بات کا حوالہ دینا پیش نظر ہو۔

[۱۹۱] یہ کسی ایک شخص کا حوالہ نہیں ہے، بلکہ ایک خاص گروہ کی ذہنیت کی تصویر ہے جو دنیا کی نعمتوں کو اپنے پروردگار کا عطیہ نہیں، بلکہ اپنے ذاتی استحقاق اور اپنی قابلیت کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ قرآن میں 'اَلَّذِىۡ' یا 'اَلَّتِىۡ' کے ساتھ تمثیل و تصویر کا یہ اسلوب کئی جگہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں، اگر غور کیجیے تو یہ بالکل مطابق واقعہ بھی ہے، اِس لیے کہ قریش مکہ کے تمام سادات و شیوخ اِسی خبط میں مبتلا تھے۔

[۱۹۲] یعنی اُس کے سروسامان، اعوان و انصار، خدم و حشم اور اُس کے معبودوں سمیت، ہر چیز یہیں رہ جائے گی۔ وہ خالی ہاتھ ہماری بارگاہ میں حاضر ہو جائے گا۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۭ
سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾
اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿٨٣﴾
فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾
يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَّنَسُوْقُ

اِن لوگوں نے اللہ کے سوا معبود بنا رکھے ہیں تا کہ وہ اُن کے پشت پناہ ہوں[۱۹۳]۔ ہرگز نہیں، (وہاں کوئی پشت پناہ نہ ہوگا)۔ وہ سب اِن کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور الٹے اِن کے مخالف بن جائیں گے۔ ۸۱-۸۲

تم نے دیکھا نہیں کہ اِن منکروں پر ہم نے شیطانوں کو چھوڑ دیا ہے[۱۹۴]۔ وہ اِنھیں خوب خوب اکسا رہے ہیں۔ سو اِن کے خلاف فیصلے کے لیے جلدی نہ کرو۔ ہم تو بس اِن کی گنتی پوری کر رہے ہیں[۱۹۵]۔ ۸۳-۸۴

اِنھیں یاد دلاؤ، جس دن ہم پرہیزگاروں کو خداے رحمٰن کی طرف مہمان بنا کر اکٹھا

---

[۱۹۳] تمام مشرکین یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ قریش مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر اُن کی پرستش کرتے تھے، چنانچہ امید رکھتے تھے کہ خدا کی یہ چہیتی بیٹیاں اپنے باپ سے سفارش کر کے اُن کو بچا لیں گی۔

[۱۹۴] یہ اُس سنت الٰہی کے مطابق فرمایا ہے جو سورۂ زخرف (۴۳) کی آیت ۳۶ میں بیان ہوئی ہے کہ جو لوگ خداے رحمٰن کی یاد دہانی سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اُن پر شیاطین مسلط کر دیے جاتے ہیں۔

[۱۹۵] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کی مخالفت اب اِس حد تک پہنچ گئی تھی کہ خود رسول اللہ

الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ
اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ
السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾

کرلائیں گے اور مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسا ہانکیں گے۔ اُس دن اُنھیں کوئی سفارش
لانے کا اختیار نہ ہوگا، مگر جس نے خداے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہو[۱۹۶]۔ ۸۵-۸۷

کہتے ہیں کہ خداے رحمٰن نے اولاد بنا رکھی ہے[۱۹۷]۔ یہ تم نے بڑی ہی سنگین بات کہی
ہے[۱۹۸]۔ قریب ہے کہ اِس سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر

صلی اللہ علیہ وسلم بھی فیصلۂ الٰہی کا انتظار کر رہے تھے۔

[۱۹۶] اِس طرح کا کوئی عہد، ظاہر ہے کہ کسی نے نہیں لے رکھا ہے، اِس لیے اِن مجرموں کے لیے شفاعت کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ اُسی طرح کا جملہ ہے، جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ قیامت کب آئے گی، کوئی نہیں جان سکتا، سواے اُس کے جسے خدا بتا دے۔

[۱۹۷] اوپر شفاعت باطل کی تردید کے بعد اب آگے شرک کی اُس بدترین قسم کی تردید فرمائی ہے جو شفاعت باطل کے اِس تصور ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کے مخاطبین میں سے یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب، تینوں کسی نہ کسی صورت میں اِس کے مرتکب ہوئے اور تینوں کے ہاں اِس کا محرک یہی تھا کہ کچھ ہستیاں ایسی ہونی چاہییں جو اپنی شفاعت سے ہم کو خدا کی گرفت سے بچا لیں۔

[۱۹۸] یہ غائب سے مخاطب کی طرف التفات ہے اور شدت غضب کے اظہار کے لیے ہوا ہے، جس طرح ہم پیچھے آیت ۷۱ میں دیکھ چکے ہیں۔

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۚ ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۗ ﴿۹۲﴾
اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۗ ﴿۹۳﴾ لَقَدْ
اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۗ ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

گر پڑیں کہ لوگوں نے خدائے رحمٰن کی طرف اولاد کی نسبت کی ہے[۱۹۹]۔ رحمٰن کو شایاں نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے۔ زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب رحمٰن کے حضور بندوں ہی کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں[۲۰۰]۔ وہ اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اُس نے اُنھیں اچھی طرح گن رکھا ہے[۲۰۱]۔ اُن میں سے ہر ایک قیامت کے دن اُس کے سامنے اکیلا حاضر ہوگا۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، عنقریب خدائے رحمٰن اُن کے لیے (اپنے حضور میں) مہر و محبت (کی فضا) پیدا کر دے گا[۲۰۲]۔ ۸۸-۹۶

---

[۱۹۹] یعنی یہ ایسی بات ہے کہ نہ خدا کی غیرت اِس کو گوارا کرتی ہے اور نہ اُس کی مخلوقات میں سے کوئی اپنے پروردگار کے بارے میں اِسے گوارا کر سکتا ہے۔ زمین و آسمان اور سر بہ فلک پہاڑوں کو اگر خدا روک کر نہ رکھے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی اِس بات کو برداشت نہ کریں اور غضب سے پھٹ پڑیں۔

[۲۰۰] یعنی بیٹوں اور بیٹیوں کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اُس کے عاجز بندوں ہی کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔

[۲۰۱] مطلب یہ ہے کہ نہ گنتی میں کسی غلطی کا امکان ہے اور نہ اِس کا کہ کوئی اُس کے قابو سے باہر ہو جائے۔

۲۰۲؎ یعنی قیامت کے دن، جب اُن کا خیر مقدم فرشتے بھی سلام و تحیت کے ساتھ کریں گے، وہ خود بھی ایک دوسرے کو مبارک سلامت کہہ رہے ہوں گے اور اُن کا پروردگار بھی سلام و رحمت سے اُن کے لیے اپنی خوشنودی کا اظہار کرے گا۔ گویا خداے رحمٰن کی طرف سے اُن کے لیے ہر طرف مہر و محبت کی فضا پیدا کر دی جائے گی۔

اِس مجموعۂ آیات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بار بار اسم رحمٰن سے ہوا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی یہی صفت ہے جس کے بارے میں غلط تصورات بہت سی گم راہیوں کا باعث بنے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’سورہ میں سب سے پہلے نصاریٰ کا ذکر ہے، اِس وجہ سے پہلے اُنھی کی گم راہی کو لیجیے۔ اُن کی گم راہی میں بڑا دخل اُن کے اِس واہمہ کو تھا کہ انسان چونکہ ازلی و ابدی گنہ گار ہے، اُس کی نجات کی کوئی شکل ہی نہیں ہے، اِس وجہ سے خداے رحمان نے اپنی رحمت سے اپنے بیٹے کو بھیجا جو قربان ہو کر اپنے تمام ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔
>
> یہود کی گم راہی اِس سورہ میں اگرچہ براہ راست زیر بحث نہیں آئی ہے، لیکن قرآن سے یہ بات واضح ہے کہ اُنھوں نے بھی اپنے جرائم کی پردہ پوشی کے لیے خدا کی رحمانیت ہی کی آڑ لی تھی۔ اُن کا تصور یہ تھا کہ ہم نبیوں اور ولیوں کی اولاد ہیں، اِس وجہ سے اول تو ہم دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس چند دن کے بعد کچھ تنبیہ کر کے خداے رحمان ہم کو بخش دے گا۔
>
> مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنا کر اُن کی پوجا کرتے تھے۔ اُن کا تصور یہ تھا کہ اول تو حشر نشر کی باتیں محض خیالی ہیں، لیکن اگر اُن کے اندر کچھ حقیقت ہے تو خداے رحمان کی یہ بیٹیاں سفارش کر کے اُن کو اپنے باپ سے بخشوا ہی لیں گی۔‘‘ (تدبر قرآن ۴/ ۶۸۸)

یہ گم راہیاں اور غلط فہمیاں ہیں جن کے پیش نظر اسم رحمٰن کا حوالہ بار بار آیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ رحمت اور عدل لازم و ملزوم ہیں۔ خدا کی رحمت اُس کے عدل کو باطل نہیں

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

سو، (اے پیغمبر)، ہم نے اِس قرآن[۲۰۳] کو تمھاری زبان میں اِسی لیے سہل اور موزوں بنا دیا ہے کہ تم اُن لوگوں کو اِس کے ذریعے سے بشارت دو جو خدا سے ڈرنے والے ہیں اور اِن ہٹ دھرم لوگوں کو اِس کے ذریعے سے خبردار کر دو۔[۲۰۴] اِن سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا ہے۔ کیا تم اُن میں سے کسی کی آہٹ پاتے ہو یا کسی کی بھنک کہیں سنتے ہو؟[۲۰۵] ۹۷-۹۸

کرتی، بلکہ یہ عدل رحمت ہی کے تقاضے سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔

[۲۰۳] اصل میں ضمیر آئی ہے، لیکن اُس کا مرجع اِس قدر واضح ہے کہ سننے والا بغیر کسی تردد کے سمجھ لیتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ اسلوب مرجع کی شان پر دلیل ہوتا ہے کہ ہر چند وہ مذکور نہیں ہے، لیکن بغیر ذکر کے بھی ہر شخص اُس کو جانتا ہے۔

[۲۰۴] سورہ کے مخاطبین قریش مکہ ہیں۔ یہ اُنھی کی طرف اشارہ ہے۔ قبائلی تمدن کے لوگ جو علمی روایات سے بے خبر ہوں، اُن میں بالعموم ایک طرح کا جمود، اکھڑپن اور تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ آیت میں لفظ 'لُدّ' سے اُسی کو بیان کیا ہے۔

[۲۰۵] مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ قومیں بے نام و نشان ہوئی ہیں، تمھاری تکذیب کے نتیجے میں یہ لوگ بھی ایک دن اُسی انجام کو پہنچیں گے۔ اِس لیے مطمئن رہو، تمھارا کام انذار و بشارت ہے اور اِس کے لیے جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے، وہ نہایت موزوں، مدلل اور قائل کر دینے والی ہے۔ پھر وہ تمھاری اور تمھاری قوم کی زبان میں ہے۔ تمھارے مخاطبین سمجھنا چاہیں تو اُن کے لیے

کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ چنانچہ اب کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی کافی ہے کہ اِس کے ذریعے سے تذکیر و نصیحت اور اتمام حجت کے بعد خدا اپنا فیصلہ سنا دے۔

کوالالمپور

۳۱/ دسمبر ۲۰۱۲ء

طٰه - الانبياء

٢٠ ـــــ ٢١

طٰہٰ - الانبیاء

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع انذار و بشارت ہے۔ پہلی سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس انذار و بشارت کے ردعمل پر صبر و انتظار کی تلقین ہے اور دوسری میں آپ کے مخاطبین کو شدید تنبیہ کہ اُن کے احتساب کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ اب پیغمبر کو زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اُن کی قیادت و سیادت کا دائرہ سمٹ رہا ہے۔ وہ متنبہ ہو جائیں، اُن کے لیے خدا کا فیصلہ عنقریب صادر ہونے والا ہے۔

پہلی سورہ میں خطاب تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور دوسری میں قریش مکہ سے ہے۔

اِن سورتوں کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب ہجرت کا مرحلہ قریب آ گیا ہے۔

سورۃ طٰہٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طٰہٰ ۚ﴿۱﴾ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ۙ﴿۲﴾ اِلَّا تَذۡکِرَۃً
لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ۙ﴿۳﴾ تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ؕ﴿۴﴾

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ ’طٰہٰ‘ ہے۔ ہم نے یہ قرآن تم پر اِس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ[1]۔ یہ تو صرف ایک یاد دہانی ہے[2] اُن کے لیے جو (بن دیکھے) اپنے پروردگار سے ڈریں[3]۔ یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اُس ہستی کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جس

---

[1] یہ نہایت دل نواز اور محبت بھرے انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ دوسروں کے ایمان کی فکر میں اپنی زندگی اجیرن نہ کریں۔ خدا نے آپ سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ آپ ایمان و اسلام کی اِس دعوت کو ہر حال میں اپنے مخاطبین کے اندر اتار دیں۔ یہ آپ کی قدر نہیں پہچان رہے تو آپ کو بھی اِن کے پیچھے جان ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے پروردگار نے آپ کو اِس کا مکلّف نہیں ٹھیرایا ہے۔

[2] یعنی اُن حقائق کی یاد دہانی ہے جو انسان کی فطرت میں ودیعت ہیں، جن کے دلائل خود اُس کی عقل کے خزینوں میں موجود اور اُس کی تاریخ میں محفوظ ہیں۔

[3] اِس سے یہ بات واضح ہوئی کہ خدا کے پیغمبر تذکیر و نصیحت کے لیے آتے ہیں، اُنھیں لوگوں کے لیے داروغہ بنا کر نہیں بھیجا جاتا۔ اُن کی ذمہ داری اِس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کو اُن کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیں۔ پھر یہ لوگوں کا کام ہے کہ اُس سے یاد دہانی حاصل کر کے فوز و

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی ۵ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَهُمَا وَمَا تَحۡتَ الثَّرٰی ۶

نے زمین کو اور (تمھارے اوپر) اِن اونچے آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ وہی رحمٰن، وہ (اِس کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے نیچے ہے، سب اُسی کے اختیار میں ہے[۴]۔ ۱-۶

فلاح سے ہم کنار ہوں یا اُسے جھٹلا کر جہنم کا ایندھن بن جائیں۔

[۴] یہ قرآن کی عظمت واضح فرمائی ہے کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے، بلکہ زمین و آسمان کے خالق کا فرمان واجب الاذعان ہے۔ اُس کی رحمت کا تقاضا تھا کہ لوگوں کی ہدایت کا سامان کرے۔ چنانچہ اُس نے یہ کتاب اتاری۔ وہ اِس کائنات کو پیدا کر کے اِس سے الگ نہیں ہو بیٹھا ہے، بلکہ اِس کے تخت سلطنت پر متمکن ہے اور اپنی مخلوقات پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ اِس کتاب کے ذریعے سے اُس نے لوگوں کو اپنے احکام و قوانین سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب اگر اُنھوں نے اِس کی قدر نہیں پہچانی اور اِسی طرح اِس کو رد کرتے رہے تو اِس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ وہ اِس کے نتائج خود بھگتیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ اشارہ بھی ہے کہ اِس کو اُسی طرح لوگوں کے سامنے پیش کیجیے، جس طرح آسمان و زمین کے خالق و مالک کا کلام پیش کیا جانا چاہیے۔ اِس کے لیے نہ زیادہ استمالت کی ضرورت ہے، نہ کسی الحاح و اصرار کی۔ اِس کے قبول کرنے میں لوگوں کا اپنا نفع ہے نہ کہ خدا کا۔ یہ کوئی ملتجیانہ درخواست نہیں ہے، بلکہ خلق کے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اِس کو رد کرنے والے خود اپنی شامت بلائیں گے، آپ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔“

(تدبر قرآن ۵/۱۶)

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ⑦ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ⑧

تم چاہے اپنی بات علانیہ کہو یا چپکے سے کہو، اُس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے[۵]، اِس لیے کہ وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات، بلکہ اُس سے زیادہ مخفی باتوں کو بھی جانتا ہے[۶]۔ وہ اللہ ہے، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے[۷]۔ تمام اچھے نام اُسی کے ہیں[۸]۔ ۷-۸

---

[۵] جملے کا یہ حصہ عربیت کے اسلوب پر اصل میں حذف ہے۔

[۶] یہ ایک دوسرے پہلو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل و دماغ کے مخفی گوشوں میں چھپے ہوئے سوالات اور پریشانیاں ہوں یا آپ کی دعا و مناجات میں ظاہر ہونے والی مشکلات اور تمنائیں، اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ آپ مطمئن رہیں، وہ آپ کی ہر مشکل کو آسان کرے گا اور اِس دعوت کے کسی مرحلے میں بھی آپ اُس کی رہنمائی سے محروم نہیں رہیں گے۔

[۷] یہ کامل تفویض کی ہدایت ہے کہ آپ اپنا معاملہ اُسی کے حوالے کیجیے۔ وہ تنہا معبود ہے۔ اُس کے ہوتے ہوئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

[۸] استاذ امام کے الفاظ میں، یہ ٹکڑا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور طمانیت کا خزانہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تسلی دی گئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اُس کی عظمت، اُس کی رحمت، اُس کی حاکمیت، اُس کی یکتائی اور اُس کے علم کے مقتضیات کی روشنی میں دی گئی ہے، لیکن خدا کی صفات اتنی ہی تو نہیں ہیں۔ وہ تو تمام اچھی اور اعلیٰ صفتوں سے متصف ہے تو ظاہر ہے کہ اُن صفات کے مقتضیات بھی حضور کے لیے حالات کے اعتبار سے ظاہر ہوں گے۔ گویا اِس ٹکڑے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ تمام اچھی صفتیں خدا ہی کے لیے ہیں اور وہ سب آپ کے اوپر سایہ فگن ہیں۔ آپ اُن میں سے جس کا

وَهَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ⑨ اِذۡ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّىۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّىۡۤ اٰتِيۡكُمۡ مِّنۡهَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ⑩

تمھیں کچھ موسیٰ کی سرگذشت بھی پہنچی ہے؟[۹] جب اُس نے (دور) ایک شعلہ دیکھا تو اپنے گھر والوں سے کہا:[۱۰] تم لوگ ذرا ٹھیرو، مجھے آگ سی دکھائی دی ہے۔[۱۱] (میں وہاں جاتا ہوں)، شاید اُس میں سے تمھارے لیے ایک آدھ انگارا لے آؤں یا آگ پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے مجھے راستے کا کچھ پتا مل جائے۔[۱۲] ۹-۱۰

سہارا بھی لیں گے، اُس کی برکتوں سے متمتع ہوں گے۔ اُن کے سوا آپ کسی اور سہارے کے محتاج نہیں ہیں۔'' (تدبر قرآن ۵/۱۷)

۹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اوپر صفات الٰہی کے حوالے سے جو تسلی دی گئی ہے، یہ اُسی کے حقائق اب موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت سے سمجھنے کی تشویق ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جو کچھ بتایا گیا ہے، اُسے آپ ایک جلیل القدر پیغمبر کی زندگی اور دعوت کی جدوجہد میں بھی دیکھ لیں جو آپ ہی کی طرح خدا کی کتاب اور شریعت کے ساتھ اپنے مخاطبین کے لیے خدا کا فیصلہ لے کر مبعوث ہوئے تھے۔

۱۰ یہ اُس وقت کا قصہ ہے، جب موسیٰ علیہ السلام چند سال مدین میں گزارنے کے بعد اپنی بیوی کو لے کر مصر جا رہے تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کے ہاتھوں ایک مصری ہلاک ہو گیا تھا اور وہ اِس اندیشے سے کہ اُن کے ساتھ انصاف کا معاملہ نہیں ہو گا، مصر سے بھاگ کر مدین میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ وہاں اُن کی شادی ہوئی اور اپنے خسر کے ساتھ قرارداده مدت پوری کرنے کے بعد اب اُن کے لیے ممکن ہو گیا تھا کہ وہ واپس اپنے لوگوں کے پاس چلے جائیں۔

۱۱ اصل میں لفظ 'اٰنَسۡتُ' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اُنھوں نے آگ کا

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی ﴿۱۱﴾ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ
اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی ﴿۱۲﴾ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا
یُوْحٰی ﴿۱۳﴾ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ

پھر جب وہ اُس کے پاس پہنچا تو آواز آئی: اے موسیٰ، یہ تو میں تمھارا پروردگار ہوں، سو اپنے جوتے اتار دو،[۱۳] اِس لیے کہ تم طویٰ[۱۴] کی مقدس وادی میں ہو۔ اور میں نے تمھیں منتخب کر لیا ہے، لہٰذا جو وحی کی جا رہی ہے، اُس کو توجہ سے سنو۔[۱۵] اِس میں شبہ نہیں کہ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔[۱۶] سو میری ہی بندگی کرو[۱۷] اور

کوئی جلتا ہوا الاؤ نہیں، بلکہ ایک شعلہ سا دیکھا تھا جو اچانک چمکا اور غائب ہو گیا اور اُن کے سوا شاید کسی اور کو نظر بھی نہیں آیا۔

[۱۲] دوسری جگہ تصریح ہے کہ وہ یہ انگارا اِس لیے لانا چاہتے تھے کہ اپنے اہل و عیال کو رات بھر گرم رکھنے کا کچھ سامان کر سکیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ سردی کا زمانہ تھا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جب وہ وادی طور کے پاس پہنچے تو رات ہو چکی تھی اور اُنھیں راستے کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

[۱۳] اِس سے واضح ہے کہ خدا کی بارگاہ میں جوتے اتار کر حاضر ہونا تواضع کے آداب میں سے ہے، لہٰذا عام حالات میں اِسی کا اہتمام کرنا چاہیے۔

[۱۴] یہ اُس میدان کا نام ہے جو کوہ سینا کے دامن میں واقع ہے۔ اِس کو مقدس اِس لیے کہا گیا ہے کہ یہاں حضرت موسیٰ اپنے پروردگار کی تجلی اور اُس کے کلام سے نوازے گئے۔ اللہ تعالیٰ زمین کے کسی ٹکڑے یا کسی علاقے کو اپنے لیے خاص کر لیں تو اُس کو تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ سرزمین فلسطین کو قرآن کی سورۂ مائدہ (۵) میں اِسی بنا پر ’اَلْاَرْضُ الْمُقَدَّسَةُ‘ کہا گیا ہے۔

[۱۵] اِس لیے کہ جس منصب پر تم سرفراز کیے گئے ہو، وہ ایک عظیم ذمہ داری ہے اور تمھیں اُس

لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ

میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام رکھو۔[18] حقیقت یہ ہے کہ قیامت ضرور آنے والی ہے[19]
ـــــ میں اُس کو چھپائے رکھنے کو ہوں[20] ـــــ اِس لیے آنے والی ہے کہ ہر شخص کو

ذمہ داری کو ہر حال میں پورا کرنا ہے۔

۱۶ ہر نبی کو سب سے پہلے یہی تعلیم دی گئی، اِس لیے کہ تمام دین کا انحصار اِسی عقیدے پر ہے۔

۱۷ توحید پر ایمان کے بعد دین کا پہلا حکم یہی ہے کہ جب اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو پھر عبادت بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔ اِس عبادت کے بارے میں ہم جگہ جگہ بیان کر چکے ہیں کہ اِس کی حقیقت خضوع اور تذلل ہے، جس کا اولین ظہور پرستش کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر انسان کے عملی وجود کی رعایت سے یہی پرستش اطاعت کو شامل ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت کے مظاہر تسبیح و تحمید، دعا و مناجات، رکوع و سجود، نذر، نیاز، قربانی اور اعتکاف ہیں۔ دوسری صورت میں آدمی کسی کے لیے خدائی اختیارات مانتا اور مستقل بالذات شارع و حاکم کی حیثیت سے اُس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اللہ، پروردگار عالم کا فیصلہ ہے کہ اِن میں سے کوئی چیز بھی اُس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتی۔

۱۸ ایمانیات میں جو حیثیت توحید کی ہے، وہی اعمال میں نماز کی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات الٰہی کی تذکیر سے خدا کی جو معرفت حاصل ہوتی اور اُس سے اللہ تعالیٰ کے لیے محبت اور شکر گزاری کے جو جذبات انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں یا ہونے چاہییں، اُن کا پہلا ثمرہ یہی نماز ہے۔

۱۹ اثبات قیامت کے پہلو بہ پہلو اُس کی قطعیت پر یہ زور اِس لیے ہے کہ بالعموم لوگ اُس کو مستبعد سمجھتے رہے ہیں۔ اُنھیں کسی طرح باور نہیں آتا کہ مرنے کے بعد جب مٹی ہو جائیں گے تو

بِمَا تَسْعٰی ⑮ فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَتَرْدٰی ⑯

اُس کے عمل کا بدلہ دیا جائے[۲۱]۔ چنانچہ کوئی ایسا شخص جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے، تم کو نماز سے[۲۲] روک نہ دے کہ تم ہلاک ہو جاؤ۔ ۱۱-۱۶

دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔

۲۰ یہ الفاظ آیت کے بیچ میں بطور جملۂ معترضہ کے آئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ جملۂ معترضہ نہایت بلیغ ہے۔ صرف یہ نہیں فرمایا کہ میں قیامت کو چھپائے رکھوں گا، بلکہ فرمایا کہ قریب ہے کہ میں اُس کو چھپائے ہی رکھوں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ لفظ ’اَکَادُ‘ سے جملے کے اندر یہ مضمون پیدا ہو گیا ہے کہ ہر چند میں نے تو ابھی قیامت پر پردہ ڈال رکھا ہے اور یہ پردہ ابھی ڈالے ہی رکھوں گا، لیکن خود قیامت کا یہ حال ہے کہ وہ بے نقاب ہو جانے کے لیے بالکل بے قرار ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۳۳)

۲۱ یہ قیامت کا مقصد بیان کر دیا ہے کہ وہ اِس لیے اٹل اور شدنی ہے کہ لوگوں کو اُن کے اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ کارخانۂ ہستی کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، اِس سے زیادہ اِس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ پھر اِس میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے عمل ہی کا بدلہ پائے اور کسی کی سفارش و شفاعت یا رشتہ و پیوند اُس کے بارے میں خدا کے فیصلے پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ آیت میں ’بِمَا تَسْعٰی‘ کا لفظ اِسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

۲۲ اصل میں ’هَا‘ کی ضمیر ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ اِس کا مرجع بھی قیامت ہی کو ہونا چاہیے، مگر زبان کا ذوق رکھنے والا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اِس کے لیے ’یَصُدَّنَّ‘ کا فعل کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اِس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اِس کا مرجع نماز ہے جس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ پھر روکنے والے کی جو صفات بیان ہوئی ہیں، وہ بھی ترک نماز کے ساتھ لازم و ملزوم کا رشتہ رکھتی ہیں۔ اِس طرح کے قرائن موجود ہوں تو ضمیر کا انتشار کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ اِس سے، اگر

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (١٧) قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا
عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (١٨) قَالَ
اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى (١٩) فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى (٢٠) قَالَ خُذْهَا

اور یہ تمھارے ہاتھ[۲۳] میں کیا ہے،[۲۴] اے موسیٰ؟ اُس نے کہا: یہ میری لاٹھی ہے، میں اِس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اِس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں[۲۵] اور اِس میں میرے کچھ دوسرے کام بھی ہیں۔[۲۶] فرمایا: اِس کو (زمین پر) ڈال دو، اے موسیٰ! اِس پر موسیٰ نے لاٹھی کو (زمین پر) ڈال دیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا

غور کیجیے تو کلام میں ایجاز کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہود کی بدقسمتی ہے کہ اُنھوں نے نماز بھی ضائع کر دی اور آخرت کو بھی بھلا بیٹھے، دراں حالیکہ اُن کے پیغمبر کو سب سے پہلے اِنھی دو چیزوں کی تعلیم دی گئی تھی۔

[۲۳] اصل میں لفظ 'یَمِیْن' آیا ہے۔ یہ دائیں بائیں کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض ہاتھ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ اِسی معنی میں ہے۔

[۲۴] یہ سوال طلب علم کے لیے نہیں، بلکہ التفات و نوازش کے اظہار کے لیے ہے تاکہ حضرت موسیٰ اُس لاٹھی کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جائیں، جس سے حیرت انگیز معجزے ظہور میں آنے والے تھے۔

[۲۵] پتے بالعموم درختوں سے اور بکریوں کے اوپر جھاڑے جاتے ہیں۔ آیت میں 'عَلٰی غَنَمِیْ' کے الفاظ اِسی رعایت سے آئے ہیں۔

[۲۶] موسیٰ علیہ السلام جواب میں صرف اتنی بات بھی کہہ سکتے تھے کہ حضور، یہ لاٹھی ہے۔ مگر اُنھوں نے سوال کے انداز سے بھانپ لیا کہ التفات خاص کا موقع ہے، چنانچہ لمبا جواب دیا۔ گویا وہی صورت پیدا ہو گئی کہ —— 'لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم'۔ استاذ امام کے الفاظ میں، مخاطب

وَلَا تَخَفۡ ؕ وقفۃ سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى ﴿۲۱﴾ وَاضۡمُمۡ يَدَكَ
اِلٰى جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ اٰيَةً اُخۡرٰى ﴿۲۲﴾ ۙ
لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى ﴿۲۳﴾ ۚ

ہے۔ فرمایا: اِس کو اٹھالو اور ڈرو نہیں، ابھی ہم اِس کو ویسا ہی کر دیں گے، جیسی یہ پہلے تھی۔ اور اپنے ہاتھ کو (ذرا) تم اپنے بازو کی طرف سکیڑو، وہ بغیر کسی بیماری کے[۲۷] سفید ہو کر نکلے گا، ایک دوسری نشانی کے طور پر[۲۸]۔ یہ اِس لیے کہ (اِن کے ذریعے سے) ہم اپنی کچھ بڑی بڑی نشانیاں تمھیں دکھائیں[۲۹]۔ ۱۷-۲۳

کرنے والا محبوب و مطلوب ہو تو گفتگو کو طویل کرنے کی خواہش ایک امر فطری ہے۔

[۲۷] یہ اضافہ صاف واضح کر رہا ہے کہ یہاں بائیبل کی تردید مقصود ہے، جس میں ہاتھ کی سفیدی کو برص بتایا گیا ہے۔

[۲۸] یعنی اُسی طرح ایک نشانی کے طور پر جیسے عصا سانپ بن جائے گا۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ کسی بیماری کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ہاتھ کی سفیدی مستقل نہیں تھی، بلکہ اُسی وقت ظاہر ہوتی تھی، جب اُسے ایک نشانی کے طور پر دکھانے کے لیے بغل میں ڈال کر نکالا جاتا تھا۔

[۲۹] اشارہ ہے اُن بڑی بڑی نشانیوں کی طرف جو بعد میں اِنھی دو نشانیوں کے اندر سے ظاہر ہوتی رہیں۔ انبیا علیہم السلام کو معجزات بالعموم اُن کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں دیے جاتے ہیں، لیکن موسیٰ علیہ السلام کو یہ ابتدا ہی میں اِس لیے دے دیے گئے کہ وہ ایک منتقم و جبار اور سرکش بادشاہ کی طرف رسول بنا کر بھیجے جا رہے تھے جو آسانی کے ساتھ اُن کی کوئی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں اُن کو دو ایسے معجزوں سے مسلح کر دیا جن کی مدد سے وہ اپنے دشمن کی ہر تعدی سے محفوظ رہے اور اُنھوں نے فرعون کے سامنے جاتے ہی، جیسا کہ آگے کی

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ

(اچھا، اب) فرعون کے پاس جاؤ،[٣٠] وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔[٣١] موسیٰ نے عرض کیا:[٣٢]

آیات سے واضح ہوگا، اپنے اِن معجزات کا اظہار بھی کر دیا تا کہ وہ خبردار رہے کہ اگر اُس نے کوئی غلط اقدام کیا تو وہ بھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہیں، بلکہ اُن کے ہاتھ میں بھی وہ عصا ہے جو ہر کبر و غرور کا سر پاش پاش کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔" (تدبر قرآن ٥/٣٦)

٣٠ مصر کے اصل باشندے قبطی تھے۔ اُن کی طرف بھیجنے کے بجاے یہ فرعون کی طرف جانے کی ہدایت اِس لیے کی گئی ہے کہ اُس وقت کے نظام میں بادشاہ کے دل و دماغ کو مفتوح کیے بغیر اُس کی رعایا تک دعوت پہنچانا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

٣١ یہاں اجمال ہے، لیکن دوسرے مقامات میں قرآن نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ فرعون سورج دیوتا کے مظہر کی حیثیت سے خود رب اعلیٰ بنا ہوا تھا اور خدا کے بندوں پر اُس کے مظالم اِس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ بنی اسرائیل کے بیٹے قتل کر دیے جاتے تھے اور صرف لڑکیاں لونڈیوں کی خدمت انجام دینے کے لیے زندہ رکھی جاتی تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام اِن سب چیزوں سے واقف تھے، بلکہ خود ظلم و عدوان ہی کے اندیشے سے جلاوطنی کی زندگی گزار کر آرہے تھے، اِس لیے قرآن نے صرف اشارے پر اکتفا کی ہے۔

٣٢ یہ اِس موقع پر موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے، جس کی کوئی نظیر انبیا علیہم السلام کی تاریخ سے بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "... اِس دعا کے لفظ لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اِس بوجھ کو کتنا بھاری محسوس کیا ہے اور کس دل سوزی کے ساتھ اِس بارگراں کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ سے مدد و رہنمائی کے لیے التجا کی ہے۔ دنیا پرست لیڈروں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ لیڈری ہی کی ہوس میں جیتے اور اُسی کے عشق میں مرتے ہیں، لیکن حضرات انبیا علیہم السلام کا سینہ اِس ہوس سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ اُن کو اللہ تعالیٰ جب امامت کے منصب پر مامور فرماتا ہے تو وہ اُس

لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ لا وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ لا وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ
لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ لا يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ ص وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ لا

پروردگار، تو میرا سینہ کھول دے[۳۳] اور میرے کام کو میرے لیے آسان بنا دے[۳۴] اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے کہ لوگ میری بات کو سمجھیں[۳۵]۔ اور میرے خاندان سے

> کی ذمہ داریوں کے تصور سے کانپ اٹھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ جب اُس نے اُن پر یہ بوجھ ڈالا ہے تو وہی اُس کے اٹھانے کے لیے ہمت و قوت بخشے اور ہر قدم پر دستگیری و رہنمائی فرمائے۔'' (تدبر قرآن ۵/۳۷)

۳۳ موسیٰ علیہ السلام پر جس عظیم منصب کی ذمہ داری ڈالی جا رہی تھی، اُس کو سنبھالنے کے لیے جیسا کچھ اضطراب و تردد کسی فرض شناس آدمی کو ہو سکتا ہے، یہ اُس کو دور کرنے کی درخواست ہے اور اِس لیے کی گئی ہے کہ سینے کی یہ خلش اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایت ہی سے دور ہوتی ہے۔

۳۴ پہلی درخواست دل و دماغ کے اندر کی خلش دور کرنے کے لیے تھی۔ یہ اب حالات کی مساعدت، راہ کی ہمواری اور پیش نظر مقصد کے حصول میں کامیابی کی درخواست ہے۔

۳۵ اُس زمانے میں دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کا موثر ترین ذریعہ خطابت تھی۔ دوسری جگہ وضاحت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کوئی زبان آور خطیب نہیں تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے درخواست کی کہ جس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اُنھیں بھیجا جا رہا ہے، اُس کے لیے اظہار و بیان کی قوت بھی عطا فرمائی جائے تاکہ اپنی دعوت کو وہ اِس طرح پیش کر سکیں کہ مخاطبین اُن کی بات کو سمجھیں اور وہ اُن کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو۔ اُنھوں نے یہ درخواست، اگر غور کیجیے تو غایت درجہ تواضع کے اسلوب میں پیش کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... حضرت موسیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ مجھے دلوں کو تسخیر کرنے والا ایک جادو بیان خطیب بنا دے، بلکہ نہایت خاکسارانہ انداز میں فرمایا کہ میری زبان کو وہ روانی عطا فرما کہ لوگ میری بات سمجھیں۔ یہ دعا کرنے کے لیے لکنت کا مریض ہونے کی ضرورت نہیں ہے، (جیسا کہ لوگوں

هٰرُوْنَ اَخِي ۙ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۙ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۙ﴿٣٢﴾

تو میرے لیے ایک وزیر مقرر کر دے۔ ہارون کو، جو میرا بھائی ہے۔[۳۶] اُس کے ذریعے سے تو میری کمر کو مضبوط کر اور اُس کو میری ذمہ داری میں شریک بنا دے[۳۷]

نے بالعموم سمجھا ہے)، بلکہ ایک قادرالکلام بھی یہ دعا کرتا ہے اور اُسے کرنی چاہیے۔ بسا اوقات معانی و حقائق کا جوش اِس طرح سینے میں امنڈتا ہے کہ ایک قادرالکلام آدمی بھی اپنی زبان اور اپنے قلم کو اُس کی تعبیر سے قاصر محسوس کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو عام لیڈروں کی طرح صرف نعرہ نہیں لگانا تھا، بلکہ دین کے حقائق و اسرار کی تفہیم کرنی تھی اور وہ بھی ایسے لوگوں کے سامنے جو نہ صرف اُن کی تکذیب پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، بلکہ اُن کی جان کے دشمن تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ حضرت موسیٰ کو صرف چھدا اتارنے کی خواہش نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے مخالفوں کے دل میں اتر جانے کا ارمان رکھتے تھے۔ مخالفوں سے تو یہ امید نہ تھی کہ اُن کے دل اور ہو جائیں گے، اِس لیے اُنھوں نے اپنے رب سے زبان ہی اور مانگی تا کہ اُن کو اپنی بات سمجھا سکیں۔‘‘

(تدبر قرآن ۵/ ۴۰)

۳۶؎ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے کہ یہ درخواست بھی اصلاً اُسی قوت کی تلافی کے لیے کی گئی تھی، جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یہودی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون علیہ السلام اپنی قوم میں فصاحت بیان کے لیے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ جب میرا بڑا بھائی اُن تمام صفات سے متصف ہے جو پیش نظر ذمہ داری کو ادا کرنے میں معاون ہو سکتی ہیں تو اُسی کو میرا وزیر بنا دیا جائے۔ اِس سے واضح ہے کہ اپنے بھائی کو اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی وہ پوری طرح اِس منصب کا اہل سمجھتے تھے۔

۳۷؎ یعنی میں صرف ایک ساتھی نہیں چاہتا، بلکہ اپنے ساتھ ایک شریک نبوت چاہتا ہوں تا کہ اُسے بھی میری طرح براہ راست آپ کی رہنمائی اور آپ کی طرف سے عصمت حاصل ہو اور اِس فریضۂ نبوت کو وہ بھی اپنے آپ کو مسئول اور ذمہ دار سمجھ کر ادا کرے۔ یہ درخواست غیر معمولی تھی۔

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا
بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾

کہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح و تقدیس کریں اور زیادہ سے زیادہ تیرا چرچا پھیلائیں[۳۸]۔ بے شک، تو برابر ہمارے حال پر نگران رہا ہے[۳۹]۔ فرمایا: تمھاری درخواست منظور ہوئی، اے موسیٰ![۴۰] ۳۴-۳۶

موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کسی نبی کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ ایک دوسرا نبی اُس کا وزیر بنایا گیا ہو۔

۳۸ مدعا یہ ہے کہ اپنے علم و عمل اور انذار و تبلیغ میں صبح و شام ہر جگہ، خلوت ہو یا جلوت اِسی ذکر و تسبیح میں لگے رہیں، اِس لیے کہ یہی ایمان کا اظہار اور یہی فریضۂ نبوت کی ادائی ہے۔ آیت میں اِس کے لیے دو لفظ، ایک تسبیح اور دوسرا ذکر استعمال ہوئے ہیں۔ استاذ امام نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور ذکر میں اثبات کا اور یہ نفی و اثبات، دونوں خدا کے ساتھ صحیح تعلق کو استوار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ جو چیزیں خدا کی شان، اُس کی صفات اور اُس کی مرضیات و احکام کے منافی ہیں، اُن کی نفی کی جائے اور جو چیزیں اُس کی شان، اُس کی صفات اور اُس کے احکام کے موافق ہیں، اُن کا اثبات و اظہار کیا جائے۔ اِن دونوں چیزوں سے مل کر مومن کا عقیدہ اور کردار بنتا ہے۔ اور نفی اثبات پر مقدم ہے۔ جب تک آپ ماسوی اللہ سے بغاوت کا اعلان نہیں کرتے، اُس وقت تک آپ اللہ کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ 'اِلَّا اللّٰہُ' سے پہلے 'لَآ اِلٰہَ' کا اعلان ضروری ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/۴۱)

۳۹ یہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا کے حق میں خود اپنے پروردگار ہی کے فضل و کرم کو سفارش میں پیش کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیری شفقت بن مانگے ہم دونوں کو حاصل رہی ہے اور تو برابر ہمارے حال پر نگران رہا ہے۔ پھر تیری عنایتوں سے اب کس طرح محروم ہو سکتے ہیں، جب کہ ہم تیری

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۙ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا
يُوْحٰٓى ۙ﴿۳۸﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ

اور (یاد کرو)، ہم تمھارے اوپر ایک مرتبہ اور بھی احسان کر چکے ہیں، جب ہم نے تمھاری ماں کو وہ بات الہام کی تھی[۴۱] جو (اِس وقت تمھیں) وحی کی جا رہی ہے[۴۲] کہ اِس بچے کو صندوق میں رکھو، پھر صندوق کو دریا میں ڈال دو[۴۳]۔ پھر دریا اُس کو

ہی دعوت لے کر اٹھ رہے ہیں؟

[۴۰] سبحان اللہ، کیا شان کریمی ہے! استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہاں موسیٰ کے خطاب میں بھی بڑا پیار ہے اور منظوری کے الفاظ میں بھی بڑی شان جھلک رہی ہے۔ دعا کے ختم ہوتے ہی بشارت سنا دی گئی کہ تمھاری عرضی منظور! گویا بہ یک جنبش قلم، بلا کسی توقف اور بلا کسی استثنا کے سب منظور! ظاہر ہے کہ اِس منظوری میں اُن کی وہ دعا بھی شامل ہے جو اُنھوں نے اظہار و بیان کی قوت بخشے جانے کے لیے کی۔ وہ بھی اُن کو عطا ہوئی اور حضرت ہارون اُن کے وزیر بھی بنا دیے گئے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۴۲)

[۴۱] اِس الہام کی نوعیت، ظاہر ہے کہ یہی رہی ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بات اُن کے دل میں ڈال دی اور اُنھیں اطمینان بھی ہو گیا کہ یہ خدا کی ڈالی ہوئی بات ہے، ورنہ ایک ماں کے لیے اِس طرح کا اقدام آسان نہیں تھا۔ اِس کے بعد بھی، نہیں کہا جا سکتا کہ اُنھوں نے کس دل و جگر سے اور کس طرح کلیجے پر پتھر رکھ کر اپنی اِس متاع عزیز کو دریا کی موجوں کے سپرد کیا ہو گا۔

[۴۲] موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات اُن کی والدہ ماجدہ نے ضرور بتائی ہو گی، لیکن اِس کے اندر دست غیب کی جو کارفرمائیاں تھیں، اُن کی طرف اب اُنھیں وحی کے ذریعے سے توجہ دلائی جا رہی ہے۔

[۴۳] یہ ہدایت اِس لیے کی گئی کہ فرعون نے اُس زمانے میں اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا تھا۔ سورۂ قصص (۲۸) کی آیت ۴ میں قرآن نے اِس کی صراحت فرمائی ہے۔ یہاں اِس

بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ڬ
وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ (٣٩) اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ

کنارے پر ڈال دے[۴۴] کہ اُس کو وہ شخص اٹھا لے جو میرا بھی دشمن ہے اور اِس بچے کا بھی دشمن ہے[۴۵]۔ اور میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت کا ایک پرتو ڈال دیا تھا تاکہ وہ بھی شفقت کے لیے مجبور ہو جائے[۴۶] اور تاکہ تم میری نگرانی میں پالے جاؤ[۴۷]۔ اُس وقت، جب تمھاری بہن (اجنبی بن کر) بار بار جاتی، پھر اُن سے کہتی تھی[۴۸] کہ (تم کہو

واقعے کی یاددہانی سے مقصود یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا اضطراب رفع کیا جائے کہ بغیر کسی تردد کے وہ فرعون کے پاس جائیں اور اطمینان رکھیں کہ جس خدا نے اُس وقت اُنھیں بچا لیا تھا، وہی اب بھی حفاظت فرمائے گا۔ وہ اُن کے ساتھ ہے، اِس لیے اُنھیں اِس مہم سے ہرگز کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

[۴۴] یعنی ایک طرف تمھاری ماں کے دل میں وہ بات ڈالی گئی اور دوسری طرف دریا کو بھی یہ حکم دے دیا گیا۔

[۴۵] یہ حوالہ اِس لیے دیا گیا ہے کہ اب خدا اِسی دشمن سے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرانے والا تھا۔ چنانچہ قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ہوا اور فرعون اور اُس کی بیوی نے نیل کے کنارے سیر کرتے ہوئے بچے کو صندوق میں دیکھا اور اِس خیال کے باوجود کہ یہ غالباً کوئی اسرائیلی بچہ ہے جسے قتل کے اندیشے سے تن بہ تقدیر دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا گیا ہے، اُن کے دل میں ایسا رحم پیدا ہوا کہ اُنھوں نے اُسے اٹھا لیا۔

[۴۶] یہ جملہ معللہ کا معطوف علیہ ہے جو اصل میں محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بچہ یوں بھی موہنا ہی ہوتا ہے، لیکن ہم نے مزید عنایت یہ کی کہ تمھاری حفاظت کے لیے تم پر اپنی طرف سے محبت کا ایک پرتو بھی ڈال دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

عَلٰی مَنۡ یَّکۡفُلُہٗ ؕ فَرَجَعۡنٰکَ اِلٰۤی اُمِّکَ کَیۡ تَقَرَّ عَیۡنُہَا وَ لَا تَحۡزَنَ ۬ؕ

تو) میں تمھیں اُن لوگوں کا پتا دوں جو اِس بچے کی پرورش کریں؟ اِس طرح ہم نے تم کو تمھاری ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اُس کو غم نہ رہے[۴۹]۔ ۳۷-۴۰

’’...کون اندازہ کرسکتا ہے اُس بچے کے موہنے پن کا جس پر محبت الٰہی کا پرتو ہو! ایک ایسا موہنا بچہ جب وہ سرکنڈوں کی ایک ٹوکری میں، دریا کی موجوں کا پھینکا ہوا، یکہ وتنہا، معصومیت و دل آویزی کی مورت بنا ہوا پڑا ہو تو آخر کس کا دل اُس کو دیکھ کر تڑپ نہیں جائے گا! فرعون آخر فرعون ہی تھا، کوئی پتھر تو نہیں تھا۔‘‘ (تدبر قرآن ۵/ ۴۴)

[۴۷] یعنی محبت کا جو پرتو تم پر ڈالا گیا، وہ تمھارا محافظ بن جائے اور فرعون جیسا دشمن بھی شفقت کے لیے مجبور ہو جائے۔ آیت میں ’لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ‘ کے الفاظ سے اِسی حفاظت اور نگرانی سے تعبیر فرمایا ہے۔

[۴۸] اصل میں مضارع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اور مضارع سے پہلے ایک فعل ناقص عربیت کے قاعدے سے محذوف ہے۔ ترجمے میں بار بار جانے کی صراحت اِسی بنا پر کی گئی ہے۔

[۴۹] یہاں اجمال ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے دریا میں ڈالے جانے کے بعد اُن کی ماں کی طرف لوٹائے جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہ تدبیر سورۂ قصص (۲۸) کی آیات ۷-۱۳ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...جب فرعون کی بیوی نے بچے کو دیکھا تو اُنھوں نے فرعون سے کہا کہ بڑا موہنا بچہ ہے۔ اِس کو قتل نہ ہونے دو۔ یہ میری اور تمھاری، دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ ہمارے کام آئے گا یا ہم اِس کو لے پالک بنا لیں گے۔ اِدھر والدۂ حضرت موسیٰ کا یہ حال تھا کہ اُنھوں نے بچے کو ایماے خداوندی سے دریا میں ڈال تو دیا، لیکن غم سے کلیجا پھٹا جا رہا تھا۔ اُنھوں نے حضرت موسیٰ کی بہن سے کہا کہ وہ دیکھتی رہیں کہ صندوق کدھر بہ کے جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظر

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا قف ؕ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ؕ لا ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾

اور (یاد کرو کہ) تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔[50] پھر ہم نے تم کو اِس غم سے بھی نجات دی[51] اور تم کو خوب خوب جانچا۔[52] پھر (ہماری عنایت سے) تم کئی سال مدین کے

بچا کر اُس کو دیکھتی رہیں۔ بالآخر اُن کو معلوم ہو گیا کہ صندوق فرعون کے محل کے پاس پہنچا اور وہاں دریا نے اُس کو کنارے پر ڈال دیا اور فرعون اور اُس کی بیوی نے بچے کو اٹھا لیا۔ حضرت موسیٰ کی بہن فرعون کے محل میں پہنچیں۔ وہاں اُنھوں نے دیکھا کہ بچے کو کسی دایہ کا دودھ پلانے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن بچہ مچلا ہوا ہے، وہ کسی کی چھاتی منہ ہی سے نہیں لگاتا۔ حضرت موسیٰ کی بہن نے فرعون کی بیوی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر آپ لوگ کہیں تو میں ایک ایسے گھر والوں کا پتا دے سکتی ہوں جو اِس بچے کی نہایت اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے اور بچے کو مانوس کر لیں گے۔ چونکہ حضرت موسیٰ کے دودھ نہ پینے کے سبب سے فرعون اور اُس کے گھر والوں کو نہایت پریشانی تھی، اِس وجہ سے یہ تجویز مان لی گئی اور اِس طرح حضرت موسیٰ پھر اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گئے۔'' (تدبر قرآن ۵/۴۶)

[50] سورۂ قصص (۲۸) میں ہے کہ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے، جب حضرت موسیٰ جوانی کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور گاہے گاہے اپنی قوم کے حالات کو دیکھنے کے لیے فرعون کے محلات سے نکل کر شہر میں جاتے رہتے تھے۔ ایک دن اِسی طرح جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور ایک قبطی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ سے فریاد کی۔ وہ اُس کی مدد کے لیے آگے بڑھے تو قبطی اُن سے الجھ پڑا۔ اِس پر اُنھوں نے اُس کو ایک گھونسا مارا جو کہیں ایسا بے ڈھب پڑا کہ قبطی وہیں ڈھیر ہو کے رہ گیا۔

[51] یہ قتل اگرچہ بلا قصد ہوا تھا، مگر حضرت موسیٰ ایک خدا ترس آدمی تھے، لہٰذا سخت غم زدہ ہوئے کہ یہ کیا حادثہ ہو گیا ہے، جس پر ہو سکتا ہے کہ مجھے خدا کے ہاں مسئول ٹھیرایا جائے۔ پھر

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿٤١﴾ج

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾ج

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾صلے فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ

لوگوں میں رہے۔[۵۳] پھر ٹھیک ایک اندازہ کیے ہوئے وقت پر (یہاں) پہنچ گئے ہو، اے موسیٰ![۵۴] اور (اب اِن سب مراحل سے گزار کر) میں نے تمھیں اپنے (اِس کارِ خاص کے) لیے تیار کر لیا ہے۔[۵۵] ۴۰-۴۱

(اِس کے بعد موسیٰ مصر پہنچے تو ارشاد ہوا): تم اور تمھارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ اور دیکھو، میرے ذکر میں سستی نہ کرنا۔[۵۶] تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ سو اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا،[۵۷] شاید وہ

اُنھیں یہ تردد بھی تھا کہ ممکن ہے جس کو مظلوم سمجھ کر اُس کی حمایت میں یہ فعل اُن سے صادر ہوا، زیادتی اُسی کی رہی ہو۔ اِسی طرح یہ چیز بھی باعث غم ہوئی ہوگی کہ فرعونیوں سے انصاف کی توقع نہیں ہے، وہ لازماً اِسے قتل عمد ٹھیرائیں گے۔ چنانچہ سورۂ قصص (۲۸) ہی میں ہے کہ اُنھوں نے بہت استغفار کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی غلطی معاف کر دی اور وہ غم کی اِس حالت سے نکل آئے۔

[۵۲] یعنی ہر طرح کی آزمایشوں سے گزارا تاکہ جس عظیم ذمہ داری کے لیے اُن کو منتخب کرنا مقصود ہے، وہ اُس کے پوری طرح اہل بن جائیں۔

[۵۳] یعنی تم کو وہاں پناہ مل گئی، تمھارا گھر آباد ہوا اور تم فرعونیوں کی نگاہ میں ایک مجرم قرار پا جانے کے باوجود اُن کے تعاقب سے بچے رہے۔

[۵۴] یعنی ٹھیک ہماری اسکیم اور ہمارے مقرر کیے ہوئے پروگرام کے مطابق پہنچ گئے ہو۔

[۵۵] مطلب یہ ہے کہ اتنی بھٹیوں سے تپا کر اور اتنے امتحانوں میں ڈال کر تیار کر لیا ہے تو اب

يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ

یاد دہانی حاصل کرے یا میرے عتاب سے ڈرے[۵۸]۔ ۴۲-۴۴

اُنھوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار، ہمیں اندیشہ ہے کہ اِس کو سنتے

یہ ذمہ داری تم کو اٹھانی ہی ہے۔ اِن سب مراحل سے تم اِسی کے لیے گزارے گئے ہو۔

۵۶؎ موسیٰ علیہ السلام کی تسکین و تسلی کے بعد یہ اب اُسی حکم کا اعادہ ہے جو طور سینا کے دامن میں دیا گیا تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ دونوں جاؤ اور فرعون کو انذار کرو اور اِس انذار و دعوت کے دوران میں کوئی غفلت نہیں ہونی چاہیے، نہ مجھے یاد کرنے میں اور نہ دوسروں کو میری یاد دہانی کرانے میں۔

۵۷؎ انبیا علیہم السلام اپنی دعوت ہمیشہ اِسی اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ یہ اُسی کی تاکید ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... اِس ہدایت کی ضرورت صرف اِس پہلو سے نہیں تھی کہ اب حضرت موسیٰ فرعون کے سامنے ایک بے بس اسرائیلی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ خدا کے ایک سفیر کی حیثیت سے جا رہے تھے اور ہاتھ میں عصاے موسوی بھی تھا، بلکہ لینت اور نرمی دعوت حق کی فطرت ہے۔ حضرات انبیا کی بعثت تعلیم و اصلاح کے لیے ہوئی، اِس وجہ سے اُن کی دعوت اور اُن کے انذار میں ایک معلم کی شفقت اور ایک غم گسار کی دل سوزی ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔ کسی نبی کے متعلق یہ بات علم میں نہیں آئی کہ اُس نے ہیکڑی جتائی اور دھونس جمائی ہو۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اُن کا طرز خطاب اور انداز جواب نہایت ہی نرم، موثر اور ہم دردانہ رہا ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/۵۳)

۵۸؎ یعنی غفلت سے بیدار ہو یا اگر یہ نہیں تو میرے عتاب کے خوف ہی سے متوجہ ہو کر سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہو جائے۔

لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى (۴۶) فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا
رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۵ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ
مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (۴۷) اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ

ہی وہ ہم پر زیادتی کرے یا اُس کی سرکشی کچھ اور بڑھ جائے[۵۹]۔ فرمایا: اندیشہ نہ کرو، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، (سب کچھ) سنتا اور دیکھتا ہوں[۶۰]۔ سو اُس کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں[۶۱]، اِس لیے بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو[۶۲] اور اُن کو ستاؤ نہیں۔ ہم تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بڑی نشانی لے کر تیرے پاس آئے ہیں اور (یہ پیغام بھی کہ) سلامتی اُنھی پر ہے جو ہدایت

---

[۵۹] یعنی کچھ سننے اور سمجھنے سے پہلے ہی ہم پر ہاتھ ڈال دے یا ہماری بات سنتے ہی برہم ہو کر بنی اسرائیل پر اور زیادہ ظلم و ستم کرنے لگے۔ آیت میں 'یَفْرُطَ' کے بعد 'عَلٰی' ہے، جس سے کسی کے خلاف عاجلانہ اقدام کے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ یہی معاملہ 'اَنْ یَّطْغٰی' کا ہے۔ اوپر 'اِنَّهٗ طَغٰی' کے بعد اب وہ بھی محض طغیان کے معنی میں نہیں رہا۔ ہم نے ترجمہ اِنھی سب چیزوں کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۶۰] اِس اجمال میں جو تفصیل مضمر ہے اور 'سنتا اور دیکھتا ہوں' کے الفاظ جس سطوت و جلالت اور تحفظ و ضمانت کو ظاہر کر رہے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

[۶۱] اصل میں 'رَسُوْل' کا لفظ ہے۔ یہ نبوت سے آگے ایک خاص منصب کے حاملین کے لیے بھی آتا ہے اور خدا کے فرستادوں کے لیے ایک عام لفظ کے طور پر بھی۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ اِسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[۶۲] بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کا یہ مطالبہ، معاذ اللہ کسی قوم پرست لیڈر کی طرف سے

اِلَيۡنَاۤ اَنَّ الۡعَذَابَ عَلٰى مَنۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۴۸)

کی پیروی کریں۔[۶۳] ہم کو وحی کی گئی ہے کہ اُن پر، البتہ عذاب ہے جو جھٹلائیں اور منہ موڑیں۔[۶۴] ۴۵-۴۸

اپنی قوم کو غلامی سے چھڑانے کا مطالبہ نہیں تھا، بلکہ خدا کی اُس اسکیم کو بروے کار لانے کے لیے کیا گیا تھا، جس کے تحت سیدنا ابراہیم کی ذریت کو عالمی سطح پر ابلاغ دعوت اور اتمام حجت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اِس اسکیم کے مطابق یہ ضروری تھا کہ اُنھیں ایک خاص علاقے میں آباد کر کے وہاں دعوت حق کا مرکز قائم کیا جائے۔ بائیبل کی کتاب خروج کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ پوری اسکیم فرعون اور اُس کے درباریوں کے سامنے واضح نہیں فرمائی، بلکہ صرف اتنا کہا کہ وہ قربانی کی عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانا چاہتے ہیں، اِس لیے کہ جس چیز کی قربانی کرنا پیش نظر ہے، اُس کی قربانی اگر مصر میں کی گئی تو وہاں کے لوگ اُنھیں سنگ سار کر دیں گے۔

۶۳؎ یہ دعوت کا بڑا ہی موثر اسلوب ہے، جس میں تنبیہ اور خیر خواہی، دونوں کی آمیزش محسوس کی جا سکتی ہے۔

۶۴؎ اِس آیت میں لطافت بیان کے جو پہلو ملحوظ ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”ایک تو یہ کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے عام لیڈروں کی طرح فرعون پر اپنی طرف سے عذاب کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اُس کو صرف اللہ تعالیٰ کی اُس وحی کی خبر دی جو اُن پر آئی تھی کہ تکذیب اور اعراض کرنے والوں پر اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اُنھوں نے اِسی لیے اختیار فرمایا کہ اپنی طرف سے فرعون کے لیے کوئی وجہ اشتعال نہ پیدا ہونے دیں۔
>
> دوسری یہ کہ اُنھوں نے فرعون کو مخاطب کر کے یوں نہیں فرمایا کہ اگر تو جھٹلائے گا اور

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی ۴۹ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ۵۰ قَالَ فَمَا بَالُ الۡقُرُوۡنِ الۡاُوۡلٰی ۵۱

(اُنھوں نے یہی بات آ کر کہہ دی تو) فرعون نے پوچھا: اچھا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے، اے موسیٰ؟[۶۵] اُس نے جواب دیا: ہمارا رب وہی ہے، جس نے ہر چیز کو اُس کی خِلقت عطا کی، پھر رہنمائی فرمائی ہے۔[۶۶] فرعون نے کہا: پھر اگلی قوموں

اعراض کرے گا تو تجھ پر عذاب الٰہی آ دھمکے گا، بلکہ بصیغۂ عام یوں فرمایا کہ جو ایسا کرے گا، اُس کا انجام یہ ہوگا تا کہ فرعون کے کانوں میں بات پڑ بھی جائے اور اُس کی انانیت کو ٹھیس بھی نہ لگے۔

تیسری یہ کہ 'کَذَّبَ' کے مفعول اور 'تَوَلّٰی' کے متعلق، دونوں کو یہاں حذف کر دیا۔ یوں نہیں فرمایا کہ جو ہماری رسالت کی تکذیب اور ہماری لائی ہوئی ہدایت سے اعراض کرے گا، اُس پر عذاب آئے گا۔ اِس لیے کہ یہ بات از خود واضح تھی اور اِس کے اظہار سے بھی بہر حال فرعون کے پندار کو چوٹ لگتی۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۵۵)

۶۵؎ یہ سوال طنز و تحقیر کے لیے ہے اور جس ذہنی پس منظر کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ قرآن نے دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ پورا مصر تو سورج دیوتا کے مظہر کی حیثیت سے مجھے اپنا پروردگار مانتا ہے، پھر یہ تم دونوں کس پروردگار کے رسول بن کر آ گئے ہو؟ اِس سے پہلے تو میں نے کسی ایسے پروردگار کا ذکر تم لوگوں سے نہیں سنا جو میری بادشاہی میں مداخلت کرے اور مجھ سے کہے کہ میں بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دوں۔ زمین و آسمان کا کوئی خالق ہے تو ہوا کرے، اِس سر زمین کے لوگوں کا رب اور معبود تو میں ہی ہوں۔

۶۶؎ یہ جواب نہایت مختصر ہے، مگر اپنے اندر حقائق و معارف کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ اِس سے موسیٰ علیہ السلام نے نہایت بلیغ اسلوب میں یہ حقیقت فرعون پر واضح کر دی ہے کہ رب ہونے کا حق دار فی الواقع کون ہو سکتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شے اپنے مقصد وجود کے اعتبار سے ایک خاص قالب و ہیئت رکھتی ہے اور پھر اِس مقصد وجود کی تحصیل و تکمیل کے لیے اپنے اندر ایک جبلی رہنمائی بھی رکھتی ہے۔ شہد کی مکھی کو جس مقصد کے لیے خالق نے پیدا کیا ہے، اُس کی تکمیل کے لیے اُس کے ننھے سے وجود کے اندر اُس نے وہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں جو اُس کے لیے ضروری ہیں اور پھر اُس کی جبلت کو یہ الہام بھی فرما دیا کہ وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرے اور اپنے لیے شہد کا ذخیرہ فراہم کرے۔ یہی حال اِس کائنات کی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا ہے۔ ایک چیونٹی، ایک بھنگا، ایک مکڑی، ایک بکری، ایک شیر، سب کو قدرت کی طرف سے ایک خاص نوع کی خلقت اور اُس کی ضرورت کے اعتبار سے ایک جبلی ہدایت عطا ہوئی ہے۔ سب کو خدا نے الہام فرمایا ہے کہ کس طرح اور کس نوع کی اپنے لیے غذا حاصل کریں، کس طرح توالد و تناسل کا سلسلہ قائم کریں، کس طرح اپنی اور اپنی نسل کی حفاظت کریں، کس چیز سے بچیں، اور کس چیز کو اختیار کریں اور پھر کس طرح اِس کائنات کی مجموعی خدمت میں اپنا فریضہ ادا کریں۔

بلبل کی نغمہ سنجی، طوطی کی شکر فشانی اور کوئل کی کوک کس کا الہام ہے؟ ظاہر ہے کہ اُن کے خالق ہی کا! تو وہی خالق اُن کا اور سب کا رب بھی ہے۔

صرف جان دار چیزوں ہی تک قدرت کا یہ فیض محدود نہیں ہے، بلکہ چمن کے بیل بوٹے جو ثمر باری اور گل ریزی کرتے ہیں؛ سوسن، بنفشہ، گلاب اور سرو و صنوبر جو چمن آرائی کرتے ہیں؛ سیب، انار اور انگور جو دعوت شوق دیتے ہیں، آخر یہ کس کی بخشی ہوئی خلقت اور یہ کس کی عطا کردہ جبلت ہے؟ آخر کون ہے جو اِن میں سے کسی ایک چیز کے بھی خلق کا دعویٰ کر سکے یا یہ کہہ سکے کہ یہ اُس کا کرشمہ ہے کہ اُس نے سیب کے اندر سیب کی خاصیت ودیعت کی اور کیکر کے اندر کیکر کی؟ چمن کے ہر پودے، میدان کی ہر گھاس اور جنگل کی ہر جھاڑی میں یہ الگ الگ مزاج، الگ الگ رنگ و بو اور الگ الگ فوائد و نقصانات کون ودیعت کرتا ہے؟ جو کرتا ہے، وہی رب ہے، نہ کہ ہر خرنامشخص جو سر پر تاج اوڑھ لے اور خدائی کا دعوے دار بن بیٹھے، وہ رب بن جائے۔

قَالَ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ کِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیۡ وَ لَا یَنۡسَی (٥٢) الَّذِیۡ

کا کیا حال ہے[٦٧]؟ موسیٰ نے جواب دیا: اُن کا علم میرے پروردگار کے پاس ایک نوشتے

زمین ہی نہیں، ایک نظر آسمان پر بھی ڈالیے۔ یہ سورج، یہ چاند، یہ کہکشاں، یہ قوس قزح، یہ آسمان، یہ ابر، یہ ہوا، آخر کس نے اِن کو پیدا کیا اور کون ہے، جس نے اِن کے فرائض اِن کو الہام کیے؟ جس نے اِن کو پیدا کیا اور اِن کو اِن کے فرائض الہام کیے، وہی رب ہے۔ سورج کا اوتار بن کر تخت پر براجمان ہو جانا تو بہت آسان ہے، لیکن کون ہے جو ایک منٹ کے لیے سورج کو اُس کے وقت سے پہلے نمودار کر سکے یا افق سے اُس کو غائب کر سکے؟

اِس کائنات میں اشرف المخلوقات کی حیثیت انسان کو حاصل ہے۔ اُس کو قدرت نے بہترین خلقت بھی عطا فرمائی ہے اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے، لیکن نہ کسی کو اپنی خلقت کے معاملے میں کوئی دخل ہے، نہ اپنی صلاحیتوں کی تخلیق ہی میں کسی کا کوئی حصہ ہے۔ یہ خدا ہی ہے، جس نے ہمیں ہاتھ، پاؤں، ناک، کان اور آنکھ کی قوتیں دیں اور اُسی نے ہمیں جبلت و فطرت اور عقل و ادراک و شعور کی نعمتیں بخشیں۔ یہ اِنھی چیزوں کا فیض ہے کہ آج خشکی و تری، دریا اور پہاڑ سب ہمارے لیے یکساں ہیں۔ ہم سمندروں کا سینہ چیرتے اور فضاؤں میں اڑتے ہیں۔ ہماری رسائی زمین کے بعید ترین گوشوں اور کونوں ہی تک نہیں، بلکہ چاند اور مریخ تک ہے۔ بجلی اور ایٹم، سب پر ہمارا تصرف ہے۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن ایک لمحے کے لیے بھی یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ آپ کی اپنی پیدا کردہ صلاحیتوں کا کرشمہ ہے! جو اِس مغالطے میں ہے، وہ احمق ہے! یہ سب خدا کی بخشی ہوئی عقل کا کرشمہ ہے، جس کی بدولت انسان قدرت کے کچھ نوامیس دریافت کر کے چاند اور مریخ پر تاخت کرتا پھر رہا ہے۔ اگر یہ خدا کی بخشی ہوئی عقل کی رہنمائی سے اُس کے کچھ قوانین دریافت کر لے اور اُن سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت پیدا کر لے تو اِس پر اتنا مغرور نہ ہو جائے کہ خدا کی خدائی ہی کو چیلنج کر دے۔‘‘ (تدبر قرآن ۵/ ۵۶)

٦٧ یعنی اُن کا انجام کیا ہوا؟ وہ بھی تو ہمارے اِسی دین کے ماننے والے تھے۔ یہ، ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی تذکیر پر سنجیدہ طریقے سے غور کرنے کے بجائے بات کا رخ پھیرنے اور اپنے

جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا
وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾ مِنْهَا

میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ بھٹکتا ہے، نہ بھولتا ہے[۶۸] ـــــ وہی[۶۹] جس نے زمین کو تمھارے لیے گہوارہ بنایا اور اُس میں تمھارے لیے راہیں نکال دیں اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اُس سے ہم نے مختلف نباتات کی گونا گوں قسمیں پیدا کر دیں۔ کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ۔ اِس کے اندر عقل والوں کے لیے، یقیناً بڑی نشانیاں ہیں[۷۰]۔ (تم اگر

گردوپیش کے لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے فرعون کی شرارت تھی۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ اُس کے اہل دربار جب اپنے بزرگوں پر موسیٰ علیہ السلام کی تنقید سنیں گے تو یقیناً بھڑک اُٹھیں گے اور اِس کے نتیجے میں اُس کا بھرم قائم رہ جائے گا۔ وہ اِس بات کی طرف توجہ نہیں کریں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اُسے لاجواب کر دیا ہے۔

۶۸ مطلب یہ ہے کہ خاطر جمع رکھو، اُنھوں نے جو کچھ مانا اور جو کچھ کیا ہے، وہ سب میرے رب کے ریکارڈ میں محفوظ ہے اور یہ خیال نہ کرو کہ اُس میں سے کوئی چیز رہ گئی ہوگی یا صحیح طریقے سے ثبت نہیں ہوئی ہوگی یا میرا رب اُس کو بھول گیا ہوگا۔ وقت آنے پر وہ اُن کی ہر چیز سامنے لے آئے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ آخری بات الفاظ میں بیان نہیں کی، لیکن انداز کلام اِس کو صاف ظاہر کر رہا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ اِس لیے کہ بعض مواقع میں کنایہ جتنا موثر ہوتا ہے، صراحت اتنی موثر نہیں ہوتی۔

۶۹ یہاں سے آگے کی آیتیں موسیٰ علیہ السلام کے کلام کا حصہ نہیں ہیں، بلکہ تضمین کے طور پر براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اِن میں سورہ کے مخاطبین، یعنی قریش مکہ کو خطاب کر کے اُنھی حقائق کی تفصیل کر دی ہے جن کی طرف موسیٰ علیہ السلام نے اوپر بالاجمال اشارہ کیا

خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۵۵
وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ۵۶ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا
مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۵۷ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ

سمجھو تو حقیقت یہ ہے کہ) ہم نے اِسی زمین سے تم کو پیدا کیا ہے، ہم اِسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اِسی سے تم کو دوبارہ نکال کھڑا کریں گے۔ ۴۹-۵۵

ہم نے فرعون کو اپنی سب نشانیاں دکھا دیں[۱]۔ اِس پر بھی وہ جھٹلائے چلا گیا اور نہیں مانا۔ اُس نے کہا: موسیٰ، کیا تم اِس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرو[۲]؟ یہی بات ہے تو ہم بھی تمھارے مقابل

ہے۔ قرآن میں اِس کی مثالیں کئی جگہ موجود ہیں۔

[۷] یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ جس کی قدرت و حکمت کے یہ کرشمے ہر طرف دیکھ رہے ہو، وہی تمھارا رب ہے اور وہی اِس کا سزاوار ہے کہ اُس کو رب مانا جائے۔ پھر یہی نہیں، اُس کا یہ اہتمامِ ربوبیت اِس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے، جس میں اُس کے کامل عدل کا ظہور ہو اور یہ اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ یہی نتیجہ ہے جسے اگلی آیت میں بیان کر دیا ہے کہ جس مٹی سے پیدا کیے گئے ہو، اُسی میں دفن ہو گے اور اُسی سے ایک دن نکال کھڑے کیے جاؤ گے۔

[۱] یہ اُن نشانیوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر سورۂ اعراف (۷) میں ہوا ہے۔ ہم نے آیت ۱۳۳ کے تحت وہاں اِن نشانیوں کی تفصیل کر دی ہے۔

[۲] یعنی لوگوں کو متاثر کر کے اپنے پیچھے لگا لو اور وہ ہمارے خلاف بغاوت کر کے ہم کو ہمارے ملک سے نکال دیں۔ فرعون نے یہ بات اِس لیے کہی کہ ایک تو اِس سے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا اثر مٹانے کی کوشش کی جائے، دوسرے اُنھیں ایک سیاسی خطرہ قرار دے کر اپنے

بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى (٥٨)
قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى (٥٩) فَتَوَلّٰى
فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى (٦٠) قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا

میں ایسا ہی جادو لے کر آ جائیں گے۔ سو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ ٹھیرا لو، کوئی بیچ کی جگہ[۳]، نہ ہم اُس کی خلاف ورزی کریں نہ تم کرو گے۔ ۵۶-۵۸

موسیٰ نے کہا: تمھارے ساتھ جشن کے دن کا وعدہ ہے[۴] اور یہ کہ (اِس کے لیے) لوگ دن چڑھے جمع کیے جائیں گے[۵]۔ (یہ بات طے ہو گئی) تو فرعون وہاں سے ہٹا اور اپنے سارے داؤ اکٹھے کیے[۶]، پھر مقابلے پر آ گیا۔ (اُس دن، جب لوگ جمع ہوئے تو) موسیٰ نے (مقابلے سے پہلے اُنھیں تنبیہ کی)، فرمایا: شامت کے مارو، (اللہ

اعیان واکابر اور اپنی قوم کے لوگوں کو ایسا مشتعل کر دیا جائے کہ وہ اُن کی دعوت کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکیں۔

[۳] یعنی جہاں ہمارے اور تمھارے آدمی آسانی کے ساتھ جمع ہو سکیں۔

[۴] یہ غالباً کسی میلے یا فرعون کی سال گرہ کا دن تھا، جس کی تاریخ اُس وقت سامنے تھی۔ اِسے 'یَوْمُ الزِّیْنَةِ' اِس لیے کہا ہے کہ لوگ اِس طرح کے موقعوں پر اپنے آپ کو بھی آراستہ کرتے اور شہروں کو بھی سجاتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہی دن نامزد کر دیا کہ جب لوگ تمام ملک سے کھیچ کر وہاں پہنچے ہوئے ہوں گے تو سب کے سامنے اور دن کی پوری روشنی میں وہیں فرعونی تہذیب کا سارا طلسم باطل کر دیا جائے۔

[۵] یعنی چاشت کے وقت۔ اِس طرح کے موقعوں پر لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو جمع کرنا پیش نظر ہو تو یہی وقت موزوں ہوتا ہے۔

[۶] قرآن کے دوسرے مقامات میں وضاحت ہے کہ فرعون نے اپنے اعیان واکابر سے

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾
فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾ قَالُوْٓا اِنْ
هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا

کے شریک ٹھیرا کر) تم اللہ پر جھوٹ نہ باندھو کہ کسی عذاب سے وہ تمھاری جڑ اکھاڑ دے[۷۷]۔ (یاد رکھو)، خدا پر جس نے بھی جھوٹ باندھا، وہ نامراد ہوا ہے[۷۸]۔ ۵۹-۶۱

اِس پر وہ[۷۹] اپنے اُس معاملے میں باہم بحثا بحثی اور چپکے چپکے مشورے کرنے لگے۔ (بالآخر) اُنھوں نے کہا: یہ دونوں یقیناً بڑے ماہر جادوگر ہیں[۸۰]۔ یہ چاہتے

مشورہ کیا اور بالآخر یہ طے پایا کہ اِس معاملے کو معمولی نہ سمجھا جائے، بلکہ تمام ملک میں ہرکارے دوڑائے جائیں اور ماہر ترین جادوگروں کو بلا لیا جائے۔ آیت میں اُس کی اِنھی تدبیروں کو داؤ اکٹھے کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[۷۷] فرعون اور اُس کی قوم کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اصلاً یہی تھی کہ وہ اپنے مشرکانہ تصورات و عقائد سے دست بردار ہو کر خداے واحد کے سامنے سر جھکا دیں۔ لوگوں کے اجتماع سے فائدہ اٹھا کر اُنھوں نے سب سے پہلے اِسی کو پیش کیا ہے اور اِس کی یہ دلیل بھی واضح کر دی ہے کہ علم و عقل میں شرک کی کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ سراسر افتراء علی اللہ ہے۔

[۷۸] یہ اُس تاریخ کی طرف اشارہ ہے جس میں رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہ نامرادی بار بار سامنے آتی رہی۔

[۷۹] یعنی تمام اعیان حکومت اور تمام ساحر جو مقابلے کا لائحۂ عمل طے کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے۔

[۸۰] یہ بات، ظاہر ہے کہ جادوگروں کے اندر پیشہ ورانہ رقابت کا جذبہ بھڑکانے کے لیے کہی گئی ہے۔

وَيَذۡهَبَا بِطَرِيۡقَتِكُمُ الۡمُثۡلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ ثُمَّ ائۡتُوۡا صَفًّا ۚ
وَقَدۡ اَفۡلَحَ الۡيَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰى ﴿۶۴﴾
قَالُوۡا يٰمُوۡسٰۤى اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِىَ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰى ﴿۶۵﴾
قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ

ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمھارے ملک سے نکال دیں اور تمھارے اِس مثالی طریق زندگی کا خاتمہ کر دیں[۸۱]۔ سو اپنی سب تدبیریں اکٹھی کرلو، پھر متحد ہو کر (اِن کے مقابلے میں) آؤ اور (اچھی طرح سمجھ لو کہ) آج وہی کامیاب رہے گا جو غلبہ پا لے گا۔ ۶۲-۶۴

جادوگر بولے: موسیٰ، یا تم پھینکو یا پھر یہ ہو کہ پہلے ہم ہی پھینکتے ہیں[۸۲]؟ موسیٰ نے کہا: نہیں، بلکہ تم ہی پھینکو[۸۳]۔ (اُنھوں نے پھینکا) تو یکایک اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں اُن کے

۸۱۔ یہ اُس طرح کی بات ہے جو اربابِ اقتدار جب عوام کو اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو بالعموم کہتے ہیں، ورنہ معلوم ہے کہ برتر طریق زندگی جس کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ اُس وقت کی اشرافیہ ہی کے لیے تھا۔ فرعونی تہذیب میں عوام کی حیثیت غلاموں اور قلیوں سے زیادہ نہیں تھی۔

۸۲۔ یہ بات اُنھوں نے پیشہ ورانہ اخلاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہی، لیکن جملے کا اسلوب ایسا ہے کہ اُن کی یہ خواہش صاف ظاہر ہو رہی ہے کہ وہی پہل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ابتدا ہی میں حاضرین کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیں۔ اِس طرح کے مقابلوں میں پہل کا موقع مل جائے تو اِس کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

۸۳۔ موسیٰ علیہ السلام کو پورا اعتماد تھا کہ اُن کا پروردگار اُن کے ساتھ ہے، اِس لیے اُنھوں نے

اَنَّهَا تَسْعٰی (۶۶) فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی (۶۷) قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (۶۸) وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی (۶۹) فَاُلْقِیَ

جادو کے زور سے اُس کو اِس طرح دکھائی دینے لگیں کہ گویا دوڑ رہی ہیں۔[۸۴] اِس پر موسیٰ اپنے دل ہی دل میں کچھ ڈرا۔[۸۵] ہم نے کہا: ڈرو نہیں، یقیناً تم ہی غالب رہو گے اور اُس کو جو تمھارے ہاتھ میں ہے، (زمین پر) ڈال دو۔ اُنھوں نے جو کچھ بنایا ہے، یہ ابھی اُس کو نگل جائے گا۔ (اِس لیے کہ) جو کچھ اُنھوں نے بنایا ہے، یہ محض جادوگر کا فریب ہے اور جادوگر جہاں سے بھی آئے، (حق کے مقابل میں) وہ کبھی

پہلے اُنھی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں۔ جادوگر جب اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو جوے کے تیروں کی طرح کوئی چیز دیکھنے والوں کے سامنے پھینکتے اور اُس پر اپنا جادو دکھاتے ہیں۔ آیت میں 'اِلْقَاء' یعنی پھینکنے کا لفظ اِسی مناسبت سے استعمال ہوا ہے۔

[۸۴] موسیٰ علیہ السلام چونکہ لٹھیا کو سانپ بنا کر پیش کرتے تھے، اِس لیے جادوگروں نے بھی اُسی قسم کے جادو کا انتخاب کیا اور لاٹھیوں کے ساتھ ساتھ رسیوں کو بھی سانپ بنا کر دکھا دیا۔ لیکن قرآن نے 'یُخَیَّلُ اِلَیْهِ' کے الفاظ سے واضح کر دیا ہے کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی۔ وہ محض نگاہ اور قوت متخیلہ کو متاثر کرتا ہے، جس سے انسان وہی کچھ دیکھنے لگتا ہے جو جادوگر دکھانا چاہتا ہے۔

[۸۵] یہ ایک وقتی ہراس تھا جو اِس طرح کی صورت حال میں فطری طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ غالباً توقع نہیں کر رہے تھے کہ جادوگر کوئی ایسی چیز پیش کر دیں گے جو اُسی طرح کی ہو گی، جیسی وہ پیش کر رہے تھے۔

طٰہٰ
۲۰

السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿٧٠﴾
قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ
عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ

کامیاب نہیں ہوتا[۸۶]۔ آخر کو یہی ہوا کہ جادوگر سجدے میں گر پڑے[۸۷]۔ اُنھوں نے بے اختیار کہا: ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے ہیں[۸۸]۔ ۶۵-۷۰

(اِس پر) فرعون نے کہا: تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اُس کی تصدیق کر دی ہے؟ یقیناً وہی تمھارا گرو ہے، جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا تو اب میں

---

[۸۶] اِس لیے کہ حق کے سامنے آتے ہی ہر شخص پر واضح ہو جاتا ہے کہ جادو کیا ہے اور معجزہ کیا چیز ہوتی ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ ماہ نخشب کے مقابلے میں خورشید جہاں تاب نکل آئے۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ منطق و استدلال سے دونوں کا فرق واضح کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

[۸۷] یعنی جب عصا پھینکا گیا اور اُس نے سانپ کی طرح لہراتی ہوئی ہر رسی اور ہر لاٹھی کو اُسی طرح رسی اور لاٹھی بنا دیا، جس طرح کہ وہ حقیقت میں تھی اور سارا طلسم نابود ہو گیا تو جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ آیت میں اِس کے لیے 'اُلْقِیَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ جادوگروں کے جذبۂ تعظیم و اکرام کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ سحر و ساحری اور اِس طرح کے دوسرے علوم کو اُن کے ماہرین ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں اور معجزے میں فرق کے لیے یہ نہایت واضح معیار ہے کہ اِن علوم و فنون کے ماہرین بھی اُس کے سامنے اعتراف عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

[۸۸] یہ فرعون کی خدائی اور بادشاہی، دونوں کا صاف انکار تھا جسے، ظاہر ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ فِیۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ ۫ وَلَتَعۡلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰی ﴿۷۱﴾

تمھارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کٹواؤں گا اور تمھیں (سب کے سامنے) ضرور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ تمھیں خوب پتا چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کی سزا زیادہ سخت اور زیادہ دیر تک رہنے والی ہے۔[89] ۷۱

---

۸۹ یعنی میری یا تمھارے گرو موسیٰ کی۔ یہ اُس سزا کی طرف اشارہ ہے جو نفسی علوم کے ماہرین اپنے شاگردوں کی نافرمانی پر اُنھیں دیتے ہیں۔ اِس طرح کے لوگ بالعموم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اُنھوں نے گرو کی مرضی کے خلاف کچھ کیا تو اپنے جادو کے زور سے وہ اُنھیں کسی بڑی آفت میں مبتلا کردے گا۔ اوپر جادوگروں کے جس اعتراف حق کا بیان ہے، اُس سے مجمع پر جو اثر پڑا اور فرعون اور اُس کے درباری جس طرح رسوا ہو کر رہ گئے، اُس کی خفت مٹانے اور بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے کے لیے یہ فرعون نے فوراً اُن پر سازش کا الزام رکھ کر سزا سنا دی ہے کہ سب تمھاری اور تمھارے گرو، موسیٰ کی ملی بھگت ہے۔ اُس نے ڈرا دھمکا کر تمھیں اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور اب تم لوگ ہمارے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہو۔ تم نے یہ سب اِسی لیے کیا ہے کہ کھلے میدان میں اپنے گرو کے سامنے شکست مان لو گے تو اُس کی دھاک عام لوگوں پر بیٹھ جائے گی اور ہماری حکومت کے خلاف تمھاری سازش کامیاب ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے میری اجازت کا انتظار بھی نہیں کیا اور موسیٰ پر ایمان کا اعلان کر دیا ہے۔ اب میں تمھیں وہی سزا دوں گا جو سلطنت کے باغیوں کو دی جاتی ہے اور وہ اُس سزا سے کہیں زیادہ سخت اور عبرت انگیز ہو گی، جس کے خوف سے تم نے فتح و شکست کا یہ ڈراما رچایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... ہرچند یہ بات بالکل بے تکی تھی۔ فرعون خود اپنے ہی منتخب کیے ہوئے میدان میں خود اپنی ہی لائی ہوئی فوج سے ہارا تھا، لیکن اِس شکست کا اثر مٹانے کے لیے اُس کو کوئی نہ کوئی بات تو

قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ وَالَّذِىۡ فَطَرَنَا
فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقۡضِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ؕ (۷۲) اِنَّاۤ
اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغۡفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَاۤ اَكۡرَهۡتَنَا عَلَيۡهِ مِنَ
السِّحۡرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى (۷۳)

جادوگروں نے جواب دیا: ہم اُن روشن نشانیوں پر ہرگز تم کو ترجیح نہ دیں گے جو ہمارے سامنے آ چکی ہیں اور نہ اُس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اِس لیے تمھیں جو کرنا ہے، کر گزرو[۹۰]۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو، اِسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں، اِس لیے کہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اُس جادو کو بھی معاف فرمائے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا ہے[۹۱]۔ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے[۹۲]۔ ۷۲-۷۳

آخر بنائی تھی۔ چنانچہ اُس نے بنائی اور داد دینی چاہیے کہ اُس نے بڑی سیاسی ذہانت کا ثبوت دیا اور کیا عجب کہ اِس طرح وہ بہتوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا ہو، لیکن حق کو اِس قسم کی پرفریب باتوں سے نہیں دبایا جا سکتا۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۶۷)

[۹۰] اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سچا ایمان آن کی آن میں انسان کو کس بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ وہی جادوگر ہیں جن کا حال قرآن میں دوسری جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ جب وہ مقابلے کے لیے بلائے گئے تو اُنھوں نے بڑی لجاجت کے ساتھ فرعون سے اپنی کامیابی کی صورت میں انعام کی درخواست کی یا اب ایمان کے نور نے اُن کے دلوں کو اِس طرح منور کر دیا کہ خدا اور آخرت کے سوا اِس دنیا کی کسی چیز کی اُن کی نگاہوں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کی راہ میں اپنی زندگی بھی قربان کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا
وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ

حقیقت[۹۳] یہ ہے کہ جو شخص بھی مجرم بن کر اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوگا، اُس کے لیے جہنم ہے، وہ اُس میں نہ مرے گا، نہ جیے گا[۹۴]۔ اِس کے برخلاف جو مومن ہو کر اُس کے حضور آئیں گے، جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے[۹۵] تو یہی لوگ

---

۹۱ اِس سے معلوم ہوا کہ مقابلے پر آنے سے پہلے ہی جادوگر کسی حد تک سمجھ چکے تھے کہ معاملہ اُن کے کسی ہم پیشہ سے نہیں ہے، بلکہ کسی اور ہی دنیا کے آدمی سے ہے۔ چنانچہ وہ طوعاً و کرہاً اپنے جادو کا کرتب دکھانے کے لیے تیار ہوئے۔

۹۲ یہ فرعون کی بات کا جواب ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ تمھیں پتا چل جائے گا کہ 'اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى'۔ جادوگروں نے اُس کا نہایت صحیح اور بھرپور جواب دیا ہے کہ ہمیں ڈراتے ہو تو سن لو کہ ہم نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے اور 'اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى'۔

۹۳ یہاں سے آگے آیت ۷۶ تک تضمین ہے۔ انداز کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ عبارت جادوگروں کے قول کا حصہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی بات کے ساتھ اپنی بات ملا کر اُس کو پورا اور مطابق حال کر دیا ہے۔

۹۴ یہ عذاب دوزخ کی شدت، اُس کی ہمیشگی اور بے پناہی کی ایسی تعبیر ہے کہ الفاظ سے اُس کی شرح و وضاحت کا تقاضا کیا جائے تو اعتراف عجز کر لیتے ہیں۔ اِس سے جو تصویر سامنے آتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اُس سے روح کانپتی اور جسم پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔

۹۵ اِس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُسی ایمان کا اعتبار ہے، جس کے ساتھ اچھا عمل بھی ہو۔ 'مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ' کا اسلوب اِسی مدعا پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن جس دین کی دعوت دیتا ہے، اُس میں ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ ایمان کے بغیر جس طرح

لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۙ ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾
وَلَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى ۙ۬ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ

ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہیں۔ ہمیشہ رہنے والے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اُن کا جو پاکیزگی اختیار کریں[۹۶]۔ ۷۴-۷۶

(اِس کے بعد کچھ عرصہ گزرا، یہاں تک کہ حجت پوری ہوگئی، تب) ہم نے موسیٰ کو وحی بھیج دی کہ میرے بندوں کو رات میں لے کر نکل جاؤ[۹۷]۔ پھر دریا (سامنے آئے

اعمال بے نتیجہ ہیں، اُسی طرح اعمال صالحہ کے بغیر ایمان کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، ایسا ایمان ایک ٹھونٹھ درخت کے مانند ہے جو برگ و بار سے بالکل خالی ہے۔ جس درخت نے دنیا میں اپنے برگ و بار پیدا نہیں کیے، آخر وہ آخرت میں کس طرح ثمر بار ہو جائے گا!

[۹۶] یہی دین کی تمام دعوت کا خلاصہ اور اُس کے نزول کا مقصد ہے۔ خدا کی جنت کے دروازے اُنھی لوگوں کے لیے کھلیں گے جو اپنے ظاہر و باطن کو ہر لحاظ سے پاکیزہ بنانے کی کوشش کریں۔

[۹۷] یہ ہجرت کی ہدایت ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے یہ مطالبہ ابتدا ہی میں کر دیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو اُن کے ساتھ جانے کی اجازت دے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون اور اُس کی قوم پر اتمام حجت کے ساتھ وہ اِس لیے بھی مبعوث کیے گئے تھے کہ بنی اسرائیل اپنی قومی حیثیت میں شہادت حق کے جس منصب پر فائز کیے گئے ہیں، اُس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے وہ اُنھیں اُس سرزمین میں لا کر آباد کریں، جس کے بارے میں فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ اُسے توحید کی دعوت کا مرکز بنایا جائے گا۔ چنانچہ ہجرت کی یہ ہدایت اصلاً تو اُنھی کے لیے ہے، لیکن تبعاً اِس میں

طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى (77) فَاَتْبَعَهُمْ
فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ؕ (78)
وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى (79)

طٰہٰ
۲۰

تو اپنے عصا سے اُس) میں اُن کے لیے ایک سوکھا راستہ بنا لو،[۹۸] (تم اطمینان سے پار ہو جاؤ گے)۔ تمھیں نہ کسی کے آ پکڑنے کا خطرہ ہوگا، نہ ڈوبنے کا اندیشہ[۹۹]۔ پھر جب وہ نکلے تو فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ اُن کا پیچھا کیا۔ پھر اُس کو اور اُس کی فوجوں کو دریا سے ڈھانپ لیا، جس چیز نے ڈھانپ لیا[۱۰۰]۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کو گم راہ ہی کیا تھا، (اُس کو) صحیح راہ نہیں دکھائی تھی۔ ۷۷-۷۹

وہ لوگ بھی شامل ہوں گے جو مصریوں میں سے ایمان لے آئے تھے۔

[۹۸] اصل میں 'فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی محاورے کے لحاظ سے 'ضرب طریق' کے معنی راستہ بنا لینے کے ہیں، لیکن اِس کے استعمال میں ایک لطیف کنایہ حضرت موسیٰ کے عصا کی طرف بھی ہے، جس کی ضرب ہی سے بحر احمر کی شمالی خلیج میں یہ راستہ بنایا گیا تھا۔ آیت میں 'الْبَحْر' کا الف لام اِس بات کا قرینہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے متعین طور پر بتا دیا تھا کہ اُنھیں کہاں سے نکلنا ہے۔ بائیبل کی کتاب خروج میں ہے:

> ''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے؟ بنی اسرائیل سے کہہ کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اُس کو دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے... پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اُسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا۔ اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور اُن کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔'' (۱۴: ۱۵-۲۹)

[۹۹] اصل الفاظ ہیں: 'لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى'۔ اِن میں 'تَخْشٰى' کا مفعول عربیت

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝٨٠ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ

اے بنی اسرائیل، ہم نے اِس طرح تمھارے اِس دشمن سے تم کو نجات دی تھی اور تم سے طور کے مقدس کنارے کا وعدہ ٹھیرایا[۱۰۱] اور تم پر من و سلویٰ اتارا تھا[۱۰۲]، (اِس

کے قاعدے سے تقابل کے اصول پر حذف کر دیا گیا ہے، یعنی 'وَلَا تَخْشٰی غَرَقًا'۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

[۱۰۰] کسی چیز کی ہول ناکی یا غیر معمولی عظمت و جلالت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ اسلوب قرآن میں کئی جگہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ اُس موقع پر اختیار کیا جاتا ہے، جب الفاظ تعبیر سے قاصر ہو جائیں۔ بائیبل کی کتاب خروج میں، یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ''جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اُس کے خادموں کا دل اُن لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ یہ ہم نے کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر اُن کو جانے دیا۔ تب اُس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا اور اُس نے چھ سو چنے ہوئے رتھ، بلکہ مصر کے سب رتھ لیے اور اُن سبھوں میں سرداروں کو بٹھایا... اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور اُن کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آ گیا اور مصری الٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا۔ اور پانی پلٹ کر آیا اور اُس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا، غرق کر دیا اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چھوٹا۔'' (۱۴: ۵-۲۸)

[۱۰۱] یہ اُس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو دریا پار کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو

وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ
تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٨٢﴾

ہدایت کے ساتھ کہ) ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اُن کے معاملے میں سرکشی نہ کرو[103] کہ تم پر میرا غضب نازل ہو جائے اور (یاد رکھو کہ) جس پر میرا غضب نازل ہوا، وہ پھر گر کے رہا[104]۔ البتہ، جو توبہ کریں اور ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، پھر ہدایت پر رہیں تو اُن کے لیے میں بہت زیادہ بخشنے والا ہوں۔ ٨٠-٨٢

اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ قرآن نے دوسری جگہ اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ بنی اسرائیل اِس کے لیے طور کے اُسی مقدس جانب بلائے گئے تھے، جہاں حضرت موسیٰ کو نبوت عطا ہوئی۔ بائیبل میں ہے:

> ’’اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ پہاڑ پر میرے پاس آ اور وہیں ٹھیرا رہ اور میں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام جو میں نے لکھے ہیں، دوں گا تاکہ تو اُن کو سکھائے۔ اور موسیٰ اور اُس کا خادم یشوع اٹھے اور موسیٰ خدا کے پہاڑ کے اوپر گیا۔ اور بزرگوں سے کہہ گیا کہ جب تک ہم لوٹ کر تمھارے پاس نہ آ جائیں، تم ہمارے لیے یہیں ٹھیرے رہو اور دیکھو ہارون اور حور تمھارے ساتھ ہیں۔ جس کسی کا مقدمہ ہو، وہ اُن کے پاس جائے۔‘‘ (خروج ٢٤: ١٢-١٤)

[102] یہ من وسلویٰ کیا ہے؟ اِس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ (٢) کی آیت ٥٧ کے تحت کر چکے ہیں۔

[103] یعنی اُن کو پا کر اُن کا جو حق تم پر عائد ہوتا ہے، اُس کو ادا کرنے میں سرکشی کا رویہ اختیار نہ کرو، بلکہ خدا کے شکر گزار بن کر رہو کہ اُس نے یہ چیزیں اِن حالات میں اور اِس فراوانی کے ساتھ تمھیں عطا فرمائی ہیں۔

[104] یعنی اپنے اُس مقام سے گر کر رہا جو اُس کو میں نے عطا فرمایا تھا۔

وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمۡ اُولَآءِ عَلٰٓى
اَثَرِىۡ وَعَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ
مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوۡسٰٓى اِلٰى قَوۡمِهٖ

(پھر ہوا یہ کہ موسیٰ اُس وعدے کے لیے وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا، فرمایا): یہ اپنی قوم کو چھوڑ کر تم جلدی کیوں چلے آئے ہو، موسیٰ؟[۱۰۵] اُس نے عرض کیا: وہ لوگ بھی یہ میرے پیچھے ہی ہیں[۱۰۶] اور پروردگار، میں تیری خوشنودی کے لیے تیرے حضور جلدی چلا آیا ہوں[۱۰۷]۔ فرمایا: اچھا یہ بات ہے تو سن لو کہ ہم نے تمھاری قوم کو تمھارے پیچھے فتنے میں ڈال دیا[۱۰۸] اور سامری[۱۰۹] نے اُن کو گم راہ کر ڈالا ہے۔ اِس پر موسیٰ سخت غصے

---

[۱۰۵] اصل الفاظ ہیں: 'وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ'۔ اِن میں 'اَعۡجَلَكَ' کے بعد 'عَنۡ' اِس بات کا قرینہ ہے کہ یہ چھوڑ کر آنے کے مفہوم میں کسی فعل پر متضمن ہو گیا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۱۰۶] مطلب یہ ہے کہ آپ ہی کی جانب آ رہے ہیں کہ آپ کی شریعت سے بہرہ یاب ہوں۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اپنی قوم پر اعتماد کا اظہار ہے کہ وہ کہیں نہیں جائیں گے، وہیں پہنچیں گے، جہاں اُن کو پہنچنے کے لیے کہا گیا ہے۔

[۱۰۷] یعنی فرط شوق میں جلدی چلا آیا ہوں کہ آپ سے ہم کلام ہوں اور آپ بھی خوش ہوں کہ بندہ میری محبت میں اور میری شریعت کو جلد سے جلد پا لینے کے لیے وقت سے پہلے ہی حاضر ہو گیا ہے۔

[۱۰۸] مطلب یہ ہے کہ اپنی سنت کے مطابق اُس کو چھوڑ دیا ہے کہ فتنے میں پڑ جائے۔ اِس سے تم پر واضح ہو جائے گا کہ میری محبت اور مجھ سے ملاقات کا شوق بھی اِس کا باعث نہیں بننا چاہیے کہ تم اپنی قوم سے غافل ہو جاؤ۔ تمھاری اصل ذمہ داری اِس قوم کی تعلیم و تربیت ہے تا کہ یہ اُس

غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ۬ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿٨٦﴾

اور افسوس کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ اُس نے (جا کر) اُن سے کہا: میری قوم کے لوگو، کیا تمھارے پروردگار نے تم سے نہایت اچھا وعدہ[۱۱۰] نہیں کیا تھا؟ پھر کیا تم پر زیادہ وقت گزر گیا یا تم نے یہ چاہا کہ تم پر تمھارے پروردگار کا غضب نازل ہو، اِس لیے تم نے میرے عہد[۱۱۱] کی خلاف ورزی کر ڈالی ہے؟ ۸۳-۸۶

کام کے لیے تیار ہو جائے، جس کے لیے میں اِس کو مصر سے نکال کر لایا ہوں۔ تم اِس بات سے واقف تھے کہ اِس قوم کے عوام مشرکانہ عقائد سے متاثر ہیں اور تمھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہارون اِن بگڑے ہوئے لوگوں کو قابو میں نہیں رکھ سکیں گے، مگر اِس کے باوجود تم نے جلدی کی اور اُن کو اچھی طرح قاعدے میں لانے سے پہلے ہی یہاں چلے آئے ہو۔ یہ ایک غلطی تھی اور اِس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ ایک ایسے فتنے میں مبتلا ہو گئے ہیں، جس سے نمٹنا آسان نہیں ہوگا۔

۱۰۹ یہ اُس شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ کسی قبیلے یا نسل یا مقام کی طرف نسبت ہے۔ ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں کہ مصریوں میں سے بھی کچھ لوگ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے اور ہجرت کے اِس سفر میں بنی اسرائیل کے ساتھ شریک تھے۔ یہ غالباً اُنھی میں سے کوئی فتین اور کیاد متصوف تھا، جس نے موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے سادہ لوح عوام کو اپنے گرد جمع کر لینے کی کوشش کی اور اِس کے لیے اُسی طرح کا ڈھونگ رچایا، جس طرح کے ڈھونگ اِس قبیل کے لوگ رچایا کرتے ہیں۔

۱۱۰ یعنی اپنی شریعت اور اپنا ہدایت نامہ عطا فرمانے کا وعدہ۔

۱۱۱ یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن قوم کے سرداروں کی طرف ہے۔ لہٰذا یہ اُسی عہد

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾

اُنھوں نے جواب دیا: ہم نے آپ کے ساتھ وعدے کی خلاف ورزی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی ہے، بلکہ ہوا یہ کہ ہم سے لوگوں کے زیورات کا بوجھ اٹھوایا گیا تھا۔ پھر (اُن کے مطالبے پر) وہ ہم نے اتار پھینکا اور اِس طرح سامری نے یہ ہنر دکھایا ہے۔[۱۱۲] ۸۷

کی طرف اشارہ ہے، جس کا حوالہ ہم پیچھے نقل کر آئے ہیں کہ طور پر جاتے وقت قوم کے سرداروں کو حضرت موسیٰ نے پابند کر دیا تھا کہ جب تک وہ اُن کے لیے خدا کی شریعت لے کر واپس نہیں آ جاتے، وہ لوگوں کو ادھر ادھر نہیں ہونے دیں گے اور تمام معاملات میں ہارون علیہ السلام کی ہدایات کی پیروی کریں گے۔

[۱۱۲] اصل الفاظ ہیں: 'اَلْقَى السَّامِرِيُّ'۔ اِن میں لفظ 'اَلْقٰى' بالکل اُسی مفہوم میں ہے، جس میں یہ پیچھے اِسی سورہ کی آیت ۶۵ میں آیا ہے، یعنی پانسا پھینکنے اور کوئی ہنر یا کرتب دکھانے کے مفہوم میں۔ مطلب یہ ہے کہ سفر کی آپا دھاپی میں ضائع ہو جانے کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے لوگوں نے اپنے زیورات ہماری امانت میں رکھ دیے تھے۔ ہم اُنھیں ایک بوجھ ہی سمجھ کر اٹھائے ہوئے تھے۔ لوگ ہمارے پاس آئے اور اُنھوں نے اپنے زیورات مانگے تو ہم نے یہ بوجھ اتار پھینکا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ ایک ذمہ داری تھی، اچھا ہوا کہ لوگوں نے ہمارے سر سے اتار دی، مگر وہ اُنھیں اکٹھا کر کے سامری کے پاس لے گئے اور اُس نے یہ کرتب دکھا دیا۔ اِس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمیں تو معلوم بھی نہیں تھا کہ لوگ اپنے زیورات کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں، اِس لیے ہمارے متعلق یہ گمان نہ فرمائیے کہ ہم نے زیورات واپس کیے ہیں تو سامری کی اِس فتنہ پردازی میں ہمارا بھی کوئی دخل ہے۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ
وَاِلٰهُ مُوْسٰى ٥ فَنَسِىَ ؕ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ٥ وَّلَا
يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

سو[۱۱۳] (اُنھی کے زیورات سے) سامری نے اُن کے لیے ایک بچھڑا (بنا کر) نکال کھڑا کیا، ایک دھڑ جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی[۱۱۴]۔ اِس پر وہ کہنے لگے کہ یہی تمھارا معبود ہے اور یہی موسیٰ کا معبود ہے، مگر وہ اُسے بھول گیا ہے[۱۱۵]۔ (اُن پر افسوس)، پھر کیا وہ دیکھتے نہیں تھے کہ وہ نہ اُن کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ اُن کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ ۸۸-۸۹

---

[۱۱۳] قوم کے سرداروں کا جواب اوپر ختم ہو گیا۔ یہاں سے آگے انداز کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ واقعے کی تفصیل اللہ تعالیٰ خود بتا رہا ہے۔

[۱۱۴] اُس زمانے کے مصر میں بت گری کا فن جس درجے کو پہنچا ہوا تھا، اُس سے واقف کسی شخص کے لیے ایک ایسا بچھڑا ڈھال لینا کچھ مشکل نہ تھا، جس میں سے اُس کے ڈکرانے کی آواز نکلتی ہو۔ چنانچہ اِس بچھڑے کی مورت بناتے وقت یہ صنعت گری بھی کی گئی تھی کہ اُس میں سے جب ہوا گزرتی تو جس طرح بچھڑے ڈکراتے ہیں، اُسی طرح کی آواز اُس سے نکلتی تھی۔ یہود کی بدقسمتی ہے کہ اُنھوں نے جس طرح زیورات کے بارے میں یہ روایت گھڑ لی کہ وہ اُنھوں نے قبطیوں کو دھوکا دے کر اُن سے لوٹ لیے تھے اور اِس کی ہدایت اُنھیں اللہ کے نبی نے اور خود نبی کو اللہ تعالیٰ نے دی تھی، اُسی طرح بچھڑا بنانے کا الزام بھی اپنے پیغمبر حضرت ہارون پر رکھ دیا ہے*۔ قرآن نے یہ دونوں ہی باتوں کی تردید کر دی ہے۔

[۱۱۵] یعنی طور پر جا کر اُسے فراموش کر بیٹھا ہے، ورنہ اُسے بھی معلوم ہے کہ اُس کا الٰہ درحقیقت

---

* خروج ۳: ۱۴-۲۲_ ۱۱: ۲-۳_ ۱۲: ۳۵-۳۶_ ۳۲: ۱-۵۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ
وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا لَنْ
نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿٩١﴾

ہارون اِس سے پہلے ہی اُن سے کہہ چکا تھا کہ میری قوم کے لوگو، تم اِس بچھڑے کے ذریعے سے فتنے میں ڈال دیے گئے ہو۔ تمھارا پروردگار تو حقیقت میں خداے رحمٰن ہے۔ سو تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔[۱۱۶] مگر اُنھوں نے کہہ دیا کہ ہم تو اِسی بچھڑے کی پرستش میں لگے رہیں گے، جب تک موسیٰ لوٹ کر ہمارے پاس نہ آ جائے۔[۱۱۷] ۹۰-۹۱

یہی ہے۔

۱۱۶ یہ قرآن نے مزید واضح کر دیا ہے کہ بچھڑا بنانے کے گناہ عظیم میں حضرت ہارون کا ہرگز کوئی دخل نہ تھا، بلکہ اُنھوں نے تو ابتدا ہی سے اپنی قوم کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بائیبل اِس معاملے میں اپنی غلط بیانی کا راز خود ہی فاش کر دیتی ہے۔ اُس کا اپنا بیان ہے کہ اِس جرم کے مرتکبین کے بارے میں خدا کا حکم تھا کہ اُنھیں قتل کر دیا جائے گا اور اُن کے نام خدا کی کتاب سے مٹا دیے جائیں گے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب اِس جرم کی پاداش میں لوگوں کو سزا دی گئی تو نہ ہارون علیہ السلام کا نام کتاب سے مٹایا گیا اور نہ اُنھیں قتل کیا گیا، بلکہ خود بائیبل کی روایت کے مطابق اُن کو اور اُن کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب، یعنی بنی لاوی کی سرداری اور مقدس کی کہانت سے سرفراز کر دیا گیا۔*

۱۱۷ اِس جملے سے مترشح ہے کہ حضرت ہارون کے سمجھانے سے لوگوں کو کسی حد تک اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا، لیکن ہر حماقت کی طرح اب اِس حماقت سے بھی پیچھا چھڑانا آسان نہیں تھا۔

---

* خروج ۳۲: ۲۷-۳۳۔ گنتی ۱۸: ۱-۷۔

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۙ ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ
اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا
بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

(سو قوم کے سرداروں سے پوچھنے کے بعد) موسیٰ (ہارون کی طرف پلٹا اور) بولا: ہارون، جب تم نے دیکھا کہ یہ گم راہ ہوئے جا رہے ہیں تو تمھارا ہاتھ کس چیز نے پکڑ لیا تھا کہ تم میری پیروی نہ کرو؟[۱۱۸] پھر کیا تم نے میرے حکم کی نافرمانی کر ڈالی؟[۱۱۹] ہارون نے جواب دیا: اے میری ماں کے جنے، نہ میری ڈاڑھی پکڑو، نہ میرا سر۔[۱۲۰] مجھے اندیشہ ہوا کہ تم (آکر) کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان

چنانچہ اُنھوں نے معاملے کو موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک ٹال دیا۔

[۱۱۸] یعنی کس چیز نے روکا کہ اِس طرح کے موقعوں پر جو میرا طریقہ رہا ہے اور جس کی میں تمھیں ہدایت کرتا رہا ہوں، اُس پر عمل نہ کرو؟ یہ سوال کسی بدگمانی کی بنا پر نہیں، بلکہ حضرت ہارون کا عذر معلوم کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'اَلَّا تَتَّبِعَنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'لَا' ہمارے نزدیک زائد نہیں ہے، بلکہ زبان کے معروف قاعدے کے مطابق فعل کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی موجود ہے۔

[۱۱۹] یہ اُس حکم کی طرف اشارہ ہے جو طور پر جاتے وقت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو دیا تھا۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۴۲ میں ہے کہ اُنھوں نے ہارون علیہ السلام کو ہدایت فرمائی تھی کہ میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرو گے اور لوگوں کی اصلاح کرتے رہو گے اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہیں چلو گے۔

[۱۲۰] دوسری جگہ ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اِس موقع پر جوشِ حمیت اور غلبۂ حال میں تورات کی الواح ایک طرف پھینک دی تھیں اور حضرت ہارون کے بال پکڑ کر اُنھیں جھنجھوڑنے

وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿٩٤﴾
قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ
فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ

پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہیں کیا ہے[۱۲۱]۔ ۹۲-۹۴

موسیٰ نے کہا: اور سامری، تیرا کیا معاملہ ہے؟ اُس نے جواب دیا: میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی تو (اُسی کے مطابق) میں نے فرستادۂ الٰہی کے نقش قدم سے ایک مٹھی خاک اٹھالی، پھر اُس کو بچھڑے میں ڈال دیا[۱۲۲]۔ میرے

لگے تھے کہ اصل ذمہ داری تمھاری تھی، تم نے اِس فتنے کو کیوں سر اٹھانے دیا۔ ہارون علیہ السلام نے یہ بات اِسی موقع پر کہی ہے۔

[۱۲۱] سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۵۰ میں صراحت ہے کہ حضرت ہارون نے لوگوں کو اِس فتنے سے روکنے کی انتہائی کوشش کی تھی، مگر اُنھوں نے آں جناب کے خلاف فساد کھڑا کر دیا اور آپ کو مار ڈالنے پر تل گئے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اب دو ہی صورتیں باقی رہ گئیں تھیں: یا تو حضرت ہارون اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہو جائیں یا چند دن حضرت موسیٰ کی واپسی کا انتظار کریں۔ پہلی صورت میں اندیشہ تفریق ملت اور باہمی کشت و خون کا تھا۔ دوسری صورت میں توقع تھی کہ حضرت موسیٰ اپنے دبدبہ اور حسن تدبیر سے حالات پر قابو پالیں گے۔ اِسی توقع کی بنا پر اُنھوں نے پہلی صورت اختیار نہ کی کہ اُس سے اصلاح کی جگہ فساد کا اندیشہ تھا اور وہ حتی الامکان اِس فساد سے قوم کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔“ (تدبر قرآن ۵/۸۰)

[۱۲۲] یہ سامری نے اپنے آپ کو معذور ٹھیرانے کے لیے بات بنائی ہے کہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ سب میں نے اپنے ایک کشف کے زیر اثر کیا ہے۔ مجھے ایک مشاہدہ ہوا تھا

لِیْ نَفْسِیْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِی الْحَیٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۖ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰۤی اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾

نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا تھا۔[۱۲۳] موسیٰ نے کہا: یہ بات ہے تو دور ہو، اب زندگی بھر تجھے یہی کہنا ہے کہ مجھے کوئی چھوئے نہیں[۱۲۴] اور (مرنے کے بعد) تیرے لیے وعدے کا ایک وقت اور بھی ہے جو تجھ سے کسی طرح ٹلے گا نہیں۔ اور اپنے اُس معبود کو دیکھ جس پر تو لگا بیٹھا تھا۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم ابھی اُس کو جلا دیں گے، پھر

جو دوسروں کو نہیں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ جبریل امین آئے ہیں اور میں نے اُن کے نقش قدم سے ایک مٹھی خاک اٹھالی ہے اور ایک بچھڑا بنا کر اُس کے اندر ڈال دی ہے، جس سے وہ بولنے لگا ہے۔ چنانچہ کشف میں جہاں سے مٹی اٹھائی تھی، وہیں سے اٹھا کر میں نے اِس بچھڑے میں ڈال دی۔ میں نے یہ سب بطور خود اور کسی شرارت کے ارادے سے نہیں کیا ہے۔

[۱۲۳] یہ سامری کا اعتراف جرم ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اُسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب حضرت موسیٰ کی گرفت سے اُس کے لیے چھوٹنا آسان نہیں ہے اور اِس قسم کی دھونس اُن کے آگے چلنے والی نہیں ہے، اِس وجہ سے اُس نے یہ اعتراف بھی کرلیا کہ یہ جو کچھ ہوا، محض مغالطے کا نتیجہ ہے کہ میں اپنے نفس کے ایک فریب کو کشف سمجھ بیٹھا اور مجھ سے یہ جرم صادر ہوگیا۔“ (تدبر قرآن ۸۱/۵)

[۱۲۴] سامری جس اخلاقی کوڑھ میں مبتلا تھا، اُس کی سزا اُسے یہ دی گئی کہ اُسے جسمانی کوڑھ میں مبتلا کر دیا گیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں جو قاعدہ کوڑھیوں کی چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، وہ اُس پر بھی نافذ ہوگیا کہ اب وہ زندگی بھر اپنی زبان سے یہ منادی کرتا پھرے گا کہ لوگو، میں ناپاک ہوں، مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ یہ، ظاہر ہے کہ ذلت و

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾
كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَیْنٰكَ
مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ ۖۚ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ یَحْمِلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ
وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ ۙ یَّوْمَ

دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے۔ (لوگو)، تمھارا معبود تو صرف اللہ ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے[۱۲۵]۔ ۹۵-۹۸

اِسی طرح، (اے پیغمبر)، ہم تمھیں ماضی کی سرگذشتیں سناتے ہیں[۱۲۶] اور اِس کے لیے ہم نے خاص اپنے پاس سے تم کو ایک یاددہانی عطا فرما دی ہے[۱۲۷]۔ جو اِس سے منہ موڑیں گے، وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے[۱۲۸] اور ہمیشہ اُسی کے وبال میں رہیں گے، اور قیامت کے دن وہ اُن کے لیے بہت برا بوجھ ہو گا۔ جس

رذالت کی آخری حد تھی، جس سے آگے کسی حد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بائیبل کی کتاب احبار میں یہ قاعدہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ’’اور جو کوڑھی اِس بلا میں مبتلا ہو، اُس کے کپڑے پھٹے اور اُس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک۔ جتنے دنوں تک وہ اِس بلا میں مبتلا رہے، وہ ناپاک رہے گا اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہا کرے۔ اُس کا مکان لشکرگاہ کے باہر ہو۔‘‘ (۱۳: ۴۵-۴۶)

[۱۲۵] یہ توحید کی دلیل ہے کہ جب خدا کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو اُس کو یہ احتیاج کیوں لاحق ہو گی کہ وہ کسی کو اپنا شریک بنائے؟

[۱۲۶] یعنی جس طرح پیچھے موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت سنائی ہے۔

[۱۲۷] یعنی قرآن مجید۔

ۖ يُّنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۝١٠٢
يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝١٠٣ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ

دن صور پھونکا جائے گا[۱۲۹] اور مجرموں کو ہم اُس دن اِس حال میں اکٹھا کریں گے کہ (خوف کے مارے) اُن کی آنکھیں نیلی پڑی ہوں گی۔ وہ چپکے چپکے آپس میں کہتے ہوں گے کہ تم (دنیا میں) مشکل سے دس دن رہے ہو گے۔[۱۳۰] ہمیں خوب معلوم ہے

۱۲۸؎ اِس لیے کہ وہ اُن کی گم راہی کا بوجھ بھی ہو گا اور اُن لوگوں کی گم راہی کا بوجھ بھی جو اُن کے گم راہ کرنے سے گم راہ ہوئے۔

۱۲۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ'۔ اِس میں مجہول کا صیغہ صورت حال کی ہول ناکی کی تعبیر کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کی ہول ناک آواز سے ہر طرف ہلچل تو برپا ہو جائے گی، لیکن پوچھنے والے پوچھ رہے ہوں گے اور اُنھیں معلوم نہ ہو گا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ یہ صور وہی چیز ہے جسے ہماری زبان میں نرسنگھا، بوق یا قرنا کہا جاتا ہے۔ اِس کی اصل حقیقت کو جاننا تو کسی کے لیے ممکن نہیں ہے، اِس لیے کہ اِس کا تعلق امور متشابہات سے ہے۔ تاہم جو لفظ اِس کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اِس کا کچھ تصور اُس سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے نظم کو سمجھانے کے لیے وہی الفاظ و اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو خود انسانوں کے ہاں اُس سے ملتے جلتے نظم کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اِس سے مقصود ہمارے تصور کو اصل چیز کے قریب لے جانا ہوتا ہے، نہ یہ کہ ہم اُس چیز کو بعینہٖ اُس طرح سمجھ لیں، جس طرح وہ دنیا میں پائی جاتی ہے۔ قدیم ایام میں شاہی جلوس یا اعلان جنگ وغیرہ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہی ایک چیز قیامت برپا کرنے کے لیے بھی پھونکی جائے گی، جس کی نوعیت ہمارے نرسنگھے جیسی ہو گی۔ اِس سے تمام مخلوقات پر شدید گھبراہٹ اور ہول کی کیفیت طاری ہو گی، لوگوں کو اپنی عزیز ترین چیزوں تک کا ہوش نہ رہے گا، جنگلوں کے جانور

اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾
وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ۙ
فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ۙ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ؕ يَوْمَىِٕذٍ
يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ

جو کچھ وہ کہیں گے، جب کہ اُن میں سے جو (اُن کے خیال میں) سب سے بہتر اندازہ لگانے والا ہوگا، وہ کہے گا کہ تم ایک دن سے زیادہ نہیں رہے ہو۔ ۹۹-۱۰۴

وہ تم سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ اُس دن اُن کا کیا بنے گا)[۱۳۱]؟ تو کہو کہ میرا رب اُن کو دھول بنا کر اڑا دے گا، پھر زمین[۱۳۲] کو چٹیل میدان بنا کر چھوڑ دے گا کہ تم اُس میں کوئی موڑ اور کوئی ٹیلا نہ دیکھو گے۔ اُس دن سب پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے، اُس سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہو سکیں گے اور تمام آوازیں

بدحواس ہو کر اکٹھے ہو جائیں گے، یہاں تک کہ اُس کی ہول ناک آواز سے تمام مخلوقات بے ہوش ہو جائیں گی۔

۱۳۰؎ یعنی جس کو آج بہت دور کی چیز سمجھتے اور 'حدیث خرافة' کہتے ہیں، اُس وقت اُس کے بارے میں اِس طرح کے اندازے لگا رہے ہوں گے۔

۱۳۱؎ اہل عرب کا عام خیال تھا کہ ہر چیز فنا ہو سکتی ہے، مگر سر بہ فلک پہاڑ فنا نہیں ہو سکتے۔ زہیر جیسا حکیم شاعر بھی کہتا تھا کہ حوادث روزگار کے مقابل میں کوئی چیز بھی قائم و دائم نہیں رہ سکتی، 'إلا الجبال الرواسیا'۔ یہ سوال اِسی مغالطے کی بنا پر اور طنز اور مذاق کے انداز میں کیا جاتا تھا۔

۱۳۲؎ اصل میں 'ھا' کی ضمیر ہے، جس کا مرجع بالکل ظاہر ہے۔ یہ عربی زبان کا معروف اسلوب

فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ
لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ
وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَقَدْ خَابَ

خداے رحمٰن کے آگے پست ہو جائیں گی، سو تم ایک دبی دبی سرگوشی کے سوا کچھ نہ سنو گے۔ اُس دن شفاعت نفع نہ دے گی[۱۳۳]، اِلّا یہ کہ رحمٰن کسی کو اجازت دے اور اُس کے لیے کوئی بات کہنا پسند کرے۔ (اِس لیے کہ) وہ اُن کے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے، اُس کو جانتا ہے اور اُن کا علم اُس کا احاطہ نہیں کر سکتا[۱۳۴]۔ سب کے چہرے اُس حی و قیوم کے سامنے جھکے ہوں گے[۱۳۵]۔ (اُس دن) نامرادی ہے اُن کے لیے

ہے۔ زمین و آسمان کے لیے اِس طرح ضمیریں قرآن میں متعدد مقامات پر آئی ہیں۔

۱۳۳؎ یہ اہل عرب کی مزعومہ شفاعت کی تردید ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اُن کا زعم یہ تھا کہ وہ جن معبودوں کو پوجتے ہیں، وہ خدا کے لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ وہ خود آگے بڑھ کر اپنے پجاریوں میں سے جس کے لیے چاہیں گے، سفارش کریں گے اور اُس کو خدا سے چھڑا لیں گے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۹۲)

۱۳۴؎ یعنی جب لوگوں کے ماضی اور مستقبل کی ہر چیز سے وہ خود واقف ہے اور کوئی دوسرا اُس کے علم کے کسی حصے کو بھی اُس کی مرضی کے بغیر اپنی گرفت ادراک میں نہیں لے سکتا تو سفارش کس بنا پر کی جائے گی؟ کیا کوئی شخص اِس لیے سفارش کرے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے؟

۱۳۵؎ یعنی عام لوگ تو ایک طرف، جن کے بارے میں گمان کرتے ہو کہ خدا کے ہاں اُنھیں ناز و تدلل کا مقام حاصل ہے اور اِسی بنا پر وہ اُس سے جو چاہیں گے، منوا لیں گے، وہ بھی اُس روز خشیت و تذلل کے ساتھ سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور جانتے ہو کس کے

مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿١١١﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ

طٰہٰ
۲۰

جو ظلم[۱۳۶] کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ اِس کے برخلاف جو نیک عمل کرے گا اور اِس کے ساتھ ایمان بھی رکھتا ہو گا، اُس کو، البتہ (اُس دن) کسی زیادتی اور کسی حق تلفی کا اندیشہ نہ ہو گا۔ ۱۰۵-۱۱۲

ہم نے، (اے پیغمبر)، اِس یاددہانی کو اِسی طرح عربی قرآن کی صورت میں اتارا ہے[۱۳۷] اور اِس میں اپنی وعید طرح طرح سے بیان کر دی ہے تاکہ یہ لوگ خدا کے غضب سے بچیں یا اِن کے اندر وہ کچھ سوچ پیدا کر دے۔ سو برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی۔

سامنے؟ اُس ہستی کے سامنے جو کوئی خاموش علۃ العلل نہیں ہے، بلکہ زندہ خدا ہے اور اپنی کائنات کا نظم خود سنبھالے ہوئے ہے۔

[۱۳۶] 'ظُلْم' کا لفظ قرآن میں اِس طریقے سے آئے، جس طریقے سے یہاں آیا ہے تو اِس سے شرک مراد ہوتا ہے۔

[۱۳۷] یعنی اِسی تذکیر و نصیحت اور انذار و بشارت کا حامل بنا کر عربی زبان میں اتارا ہے، اِس لیے کہ جن لوگوں پر اتمام حجت کے لیے یہ نازل کیا گیا ہے، اُن کی زبان عربی ہے۔ چنانچہ ہم نے عنایت فرمائی ہے کہ خود اُن کی زبان میں اُن پر اپنی حجت پوری کر دی ہے تاکہ اب جو فیصلہ اُن کے لیے صادر ہونے والا ہے، اُس کے خلاف اُن کے پاس کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔

وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ ۫ وَقُلۡ
رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾
وَلَقَدۡ عَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَہٗ عَزۡمًا ﴿۱۱۵﴾
وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی ﴿۱۱۶﴾

(وہ اپنی حکمت کے مطابق اِس کو اُسی تدریج سے اتارے گا جو اُس نے مقرر کر دی ہے)۔ اور دیکھو تم اپنی طرف اِس کی وحی کے پورا ہو جانے سے پہلے اِس قرآن کو پانے کی جلدی نہ کرو، اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار، میرا علم زیادہ کر دے[۱۳۸]۔ ۱۱۳-۱۱۴

(اِس لیے کہ تم جس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، وہ ایک بھاری ذمہ داری ہے[۱۳۹])۔ ہم نے اِس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تھی تو وہ بھول گیا تھا اور ہم نے اُس میں ارادے کی پختگی نہیں پائی تھی[۱۴۰]۔ یاد کرو، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو[۱۴۱] تو وہ سجدہ ریز ہو گئے، مگر ابلیس نہیں مانا[۱۴۲]، اُس

---

[۱۳۸] اپنی قوم پر اتمام حجت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضۂ منصبی تھا۔ اِس طرح کی غیر معمولی ذمہ داری کو جلد سے جلد اور سرخ روئی کے ساتھ پورا کرنے کی خواہش ایک فطری خواہش تھی۔ پھر قریش بھی بار بار تقاضا کرتے تھے کہ قرآن اگر خدا کی طرف سے نازل کیا جا رہا ہے تو ایک ہی مرتبہ پورا کیوں نازل نہیں کر دیا جاتا۔ قرآن جیسی بے نظیر کتاب کسی شخص کو کائنات کے بادشاہ اور جہانوں کے پروردگار کی طرف سے دی جا رہی ہو اور اُس کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ پوری کتاب جلد اُسے مل جائے تو اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ آپ کے قلب کو تمام قوت، روح کو زندگی، عقل کو رہنمائی اور ارادے کو ثبات و استحکام قرآن ہی سے حاصل ہوتا تھا، یہ چیز بھی اُس کو جلد پا لینے کے لیے شوق و اضطراب کا باعث بن جاتی تھی۔ اِس آیت میں اِسی بے قراری اور عجلت پر صبر و انتظار کی تلقین کی گئی ہے۔

فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ

نے انکار کر دیا۔ اِس پر ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے[۱۴۳]

۱۳۹ یعنی یہ ذمہ داری کہ قوم پر اتمام حجت کے بعد اُس کا فیصلہ کر دیا جائے۔

۱۴۰ انسان کی یہی کم زوری ہے، جس سے وہ حدود سے تجاوز کرتا اور گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیچھے موسیٰ علیہ السلام کی عجلت کا نتیجہ دیکھ چکے ہو۔ تمھارے باپ آدم سے بھی یہی غلطی ہوئی تھی۔ وہ بھی حیات ابدی کو پانے کے لیے جلدی کے راستے پر چل پڑے تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسان جس چیز کے لیے جدوجہد کرتا ہے، اُس کا نتیجہ بہت جلد دیکھنا چاہتا ہے، لیکن اِسی میں بسا اوقات اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھتا ہے۔ اِس لیے جتنا قرآن نازل ہوتا جائے، اُسی کو اپنی قوم کے سامنے پیش کرو۔ اِس کتاب کا جو حصہ جس وقت نازل ہونا چاہیے، وہ اُسی وقت نازل ہوگا اور اِس کا فیصلہ اللہ، بادشاہ حقیقی کرے گا۔ اِس کے لیے کسی جلدی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا کرو گے تو اندیشہ ہے کہ کوئی ابلیس یا کوئی سامری اِس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو فتنے میں مبتلا کر دے گا۔

۱۴۱ یہ سجدہ تعظیم کے لیے تھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا، اِس لیے اِس میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اطاعت کا یہ امتحان جس وجہ سے لیا، وہ یہ تھی کہ اولاً، آدم پر واضح ہو جائے کہ اصلی سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے، لہٰذا اُسے بھی اپنی انانیت کو ایک طرف رکھ کر ہمیشہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ ثانیاً، وہ یہ سمجھ لے کہ اُسے جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اُس کو سجدہ کیا تو یہ بات کسی طرح اُس کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی برتر مخلوق کو بھی خدا کا شریک سمجھ کر اُس کی پرستش کرے۔ بندگی اور پرستش اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ وہ اگر اِس حق میں کسی کو شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی اہانت نہیں کرتا، بلکہ خود اپنی بھی اہانت کرتا ہے۔

الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا
تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ
هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰی ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ

تو ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو اِس باغ[۱۴۴] سے نکلوا دے، پھر تم محروم ہو کر رہ جاؤ۔ یہاں تو تمھیں یہ آسایش ہے کہ نہ اِس میں بھوکے رہتے ہو نہ لباس کی ضرورت ہوتی ہے، نہ تم کو اِس میں پیاس ستاتی ہے نہ دھوپ لگتی ہے[۱۴۵]۔ لیکن شیطان نے اُس کو ورغلایا۔ اُس نے کہا: آدم، میں تم کو وہ درخت بتاؤں جس میں ہمیشہ کی زندگی ہے اور اُس

---

[۱۴۲] قرآن کی سورۂ کہف (۱۸) میں صراحت ہے کہ ابلیس جنات میں سے تھا، اِس لیے یہ استثنا دلیل ہے کہ جنات چونکہ اپنی خلقت کے لحاظ سے فرشتوں سے زیادہ دور نہیں ہیں، اِس لیے اُنھیں جب سجدے کا حکم دیا گیا تو علی سبیل التغلیب جنات بھی اُس میں شامل تھے۔

[۱۴۳] یہ اِس لیے فرمایا کہ ذریت آدم سے ابلیس کی دشمنی اُس چیلنج سے واضح ہو گئی تھی جو اُس نے سجدے سے انکار کے بعد دیا تھا۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۶-۱۷ میں ہے کہ اُس نے کہا تھا کہ میں اولاد آدم کے لیے تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر اُن کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے اُن پر تاخت کروں گا اور تو اُن میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔

[۱۴۴] یہ غالباً اِسی دنیا کا کوئی باغ تھا جسے آدم و حوا کا مستقر قرار دیا گیا۔ اِس میں جو امتحان اُنھیں پیش آیا، اُس سے دونوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ شیطان اُن پر حملہ کرے گا تو کہاں سے کرے گا۔

[۱۴۵] یہ الفاظ اپنے لازم کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ باغ میں اور ایسے معتدل موسم کی جگہ پر ٹھیرائے گئے ہو کہ سردی اور گرمی، دونوں کے آزار سے محفوظ

لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؗ وَعَصٰٓى

بادشاہی کا پتا دوں جس پر کبھی زوال نہ آئے گا؟[۱۴۶] سو (اُس کی ترغیب سے آدم و حوا)، دونوں نے اُس درخت کا پھل کھالیا[۱۴۷] تو اُن کی پردے کی چیزیں اُن پر ظاہر ہو گئیں[۱۴۸] اور (اُن کو چھپانے کے لیے) وہ دونوں اپنے اوپر اُس باغ کے پتے گانٹھنے لگے۔[۱۴۹] اِس

رہتے ہو۔ چنانچہ جو کچھ میسر ہے، وہی کفایت کرتا ہے، زندگی کو قائم رکھنے کے لیے کسی غیر معمولی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...سردی کے آزار میں سے بھوک اور عریانی ہے اور گرمی کی تکالیف میں سے پیاس اور دھوپ۔ جن لوگوں کی نظر اہل عرب کے کلام پر ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ بسا اوقات سردی اور گرمی کی تکالیف کا ذکر اِسی طرح کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ اور دھوپ کا ذکر عریانی کے ساتھ زیادہ موزوں ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہ راے عربیت کے ذوق سے محرومی کا نتیجہ ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۹۸)

۱۴۶؎ یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ لفظ ’شَجَرَة‘ یہاں مجازی مفہوم میں ہے اور اِس سے مراد وہی شجرۂ تناسل ہے، جس کا پھل کھانے ہی سے انسان اِس دنیا میں اپنے آپ کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ ابلیس نے یہ لالچ دے کر آدم و حوا کو اُس درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی کہ حیات جاوداں اور ابدی بادشاہی کا راز اِسی درخت کے پھل میں ہے، جس سے تمھیں محروم کر دیا گیا ہے۔ اِس کا پھل کھاؤ گے تو باقی رہو گے، ورنہ جلد یا بدیر موت سے دوچار ہو جاؤ گے۔ شیطان کی یہ بات، اگر غور کیجیے تو ایسی غلط بھی نہیں تھی، اِس لیے کہ یہ اِسی درخت کا پھل ہے، جس کے کھانے سے انسان کی زندگی کا تسلسل دنیا میں قائم ہے۔

۱۴۷؎ اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، اِس لیے کہ اِس پھل کی خواہش میں جو غیر معمولی کیفیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے، اُس سے مغلوب ہو کر وہ آج بھی اِس کے بارے میں خدا کی ہدایت کو بھول جاتا ہے۔

اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ۖؗ ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰی ﴿۱۲۲﴾
قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًاۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ

طرح آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اُس کے پروردگار نے اُس کو برگزیدہ کیا۔[۱۵۰] سو اپنی عنایت سے اُس کی توبہ قبول فرمائی[۱۵۱] اور اُسے راستہ دکھا دیا۔[۱۵۲] فرمایا: تم دونوں فریق یہاں سے اتر جاؤ، اکٹھے۔[۱۵۳] تم ایک دوسرے

---

۱۴۸ یعنی اُن کے بارے میں یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ صرف رفع حاجت کا ذریعہ نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسری چیز بھی اِن کے اندر چھپی ہوتی ہے جو اِن کا پھل کھانے کے بعد ہی کھلتی ہے۔

۱۴۹ اِس سے واضح ہے کہ جنس اور جنسی اعضا کے ساتھ شرم کا احساس انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے اور نہ تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا ہوئی ہے، بلکہ ایک ایسا احساس ہے جو خدا نے انسان کے اندر الہام کر دیا ہے۔ جنس کے معاملات سے واقف ہوتے ہی یہ آپ سے آپ نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسان اپنے اُن اعضا کو ڈھانکنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کے لیے جنسی تلذذ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

۱۵۰ یعنی اپنے کار خاص کے لیے منتخب کر لیا۔ چنانچہ توبہ کی توفیق دی اور توبہ جن الفاظ میں کرنی چاہیے، وہ بھی از راہ عنایت القا فرما دیے۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۳ میں توبہ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ اِن سے واضح ہے کہ آدم علیہ السلام سے جب لغزش ہوئی تو اُس کے فوراً بعد ہی وہ سخت نادم ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہی چیز توفیق توبہ اور نتیجے کے طور پر نبوت کے لیے انتخاب الٰہی کا باعث بن گئی۔

۱۵۱ اصل الفاظ ہیں: 'فَتَابَ عَلَيْهِ'۔ اِن میں 'عَلٰی' اِس بات پر دلیل ہے کہ یہ 'أقبل' کے مفہوم پر متضمن ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا التفات اور توجہ اُس کو پھر حاصل ہوگئی۔

مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿١٢٤﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿١٢٥﴾

کے دشمن رہو گے۔[۱۵۴] پھر میری طرف سے اگر کوئی ہدایت تمھارے پاس آئے تو اُس کی پیروی کرو، اِس لیے کہ جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ گم راہ ہو گا نہ محروم رہے گا۔[۱۵۵] اور جو میری یاددہانی سے منہ موڑے گا تو اُس کے لیے تنگی کی زندگی ہے[۱۵۶] اور قیامت کے دن ہم اُس کو اندھا اٹھائیں گے۔[۱۵۷] وہ کہے گا: پروردگار، تو نے

---

۱۵۲ یعنی آگے کے مراحل کے لیے راستہ دکھا دیا تاکہ وہ شیطان کے فتنوں کا مقابلہ کر سکے۔

۱۵۳ یہ خطاب آدم و حوا سے نہیں ہے، بلکہ آدم اور ابلیس سے بحیثیت دو فریقوں کے ہے۔ آیت میں لفظ 'جَمِیْعًا' کی تاکید اِس کو بالکل واضح کر دیتی ہے۔ دوسرے مقامات میں اِسی بنا پر جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

۱۵۴ ابلیس نے قیامت تک کے لیے اپنی دشمنی کا اعلان کر رکھا ہے۔ اِس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اولاد آدم بھی اگر بالکل ہی احمق اور ناعاقبت اندیش نہیں ہو گی تو اُسے اپنا دشمن ہی سمجھے گی۔ یہ اِسی حقیقت کا بیان ہے۔

۱۵۵ یہ اُس ہدایت کا ذکر ہے جو وحی کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اُس نے عقل و فطرت کی ہدایت کے ساتھ یہ ہدایت بھی انسان کو عطا فرمائی تاکہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں وہ ٹھیک اُس راستے پر قائم رہے، جس کی منزل خدا کی جنت ہے۔ یہ ہدایت سب سے پہلے خود آدم علیہ السلام کو دی گئی اور وہ اِسی مقصد سے نبی بنائے گئے۔ اِس کے لیے، ظاہر ہے کہ اُن کے حالات کے لحاظ سے کوئی شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے

اُنھیں لازماً دی ہوگی۔

۱۵۶ یعنی ایسی زندگی ہے جو سکون وطمانیت، شرح صدر اور فراغ خاطر سے محروم ہوگی۔

استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...انسان کے اندر ایک خلا ہے جو اللہ کے ایمان کے سوا اور کسی چیز سے نہیں بھر سکتا۔ اِس وجہ سے، جب تک اُس کو ایمان حاصل نہ ہو، کوئی دوسری چیز اُس کو تسلی وطمانیت سے بہرہ مند نہیں کر سکتی۔ دوسری چیزیں، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی شان دار اور دل فریب کیوں نہ ہوں، وقتی بہلاوے کا کام تو دے سکتی ہیں، لیکن قلب وروح کی بے قراری کو رفع نہیں کر سکتیں۔ جب بچہ بھوک سے روتا ہے تو اُس کے منہ میں چسنی یا نپل دے کر کچھ دیر کے لیے بہلایا جا سکتا ہے، لیکن وہ آسودہ اُسی وقت ہوتا ہے، جب ماں اُس کو چھاتی سے لگاتی اور اُس کو دودھ پلاتی ہے۔ اِس کے بغیر اُس کی بے چینی نہیں جاتی۔ یہی حال انسان کا ہے۔ وہ اپنے لیے جو اسباب وسامان بھی مہیا کر لے، لیکن اگر وہ خدا کے ایمان سے محروم ہے تو وہ غیر مطمئن، ڈانواں ڈول، اندیشہ ناک، مضطرب اور اندرونی خلفشار میں مبتلا رہے گا، اگرچہ وہ اپنی نمایشوں سے اُس پر کتنا ہی پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ نفس مطمئنہ کی بادشاہی صرف سچے اور پکے ایمان ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ’اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ‘۔
>
> ممکن ہے، کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ بہت سے لوگ ایمان کے مدعی ہوتے ہیں، لیکن اُن کی زندگی نہایت پریشان حالی و پراگندہ بالی کی ہوتی ہے۔ برعکس اِس کے کتنے ہیں جو خدا کو محض ایک وہم سمجھتے ہیں، لیکن وہ بڑی بے فکری وطمانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہاں بحث ایمان کے مدعیوں سے نہیں، بلکہ حقیقی اہل ایمان سے ہے۔ ثانیاً، جن لوگوں کو خدا سے بے پروا ہونے کے باوجود ہم مطمئن خیال کرتے ہیں، ہم صرف اُن کے ظاہری کروفر کو دیکھتے ہیں۔ اگر کبھی اُن کے سینوں میں جھانک کر دیکھنے کا موقع ملے، تب معلوم ہو کہ اُن کے اندر کتنے خطرے اور کتنے خلجان چھپے ہوئے بیٹھے ہیں، لیکن یہ ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ اِن کو وہ خود دیکھتے ہیں یا وہ لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے اندر ایمانی بصیرت ہو۔“
>
> (تدبر قرآن ۵/ ۱۰۳)

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتۡكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيۡتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الۡيَوۡمَ تُنۡسٰى ﴿١٢٦﴾
وَكَذٰلِكَ نَجۡزِيۡ مَنۡ اَسۡرَفَ وَلَمۡ يُؤۡمِنۡۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ
الۡاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبۡقٰى ﴿١٢٧﴾

اَفَلَمۡ يَهۡدِ لَهُمۡ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ يَمۡشُوۡنَ
فِيۡ مَسٰكِنِهِمۡ ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿١٢٨﴾ وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ

مجھے اندھا کیوں اٹھایا ہے، میں تو آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا: ہماری آیتیں تمھارے پاس آئی تھیں تو تم نے اِسی طرح اُنھیں نظر انداز کر دیا تھا۔ آج تمھیں بھی اُسی طرح نظر انداز کر دیا جائے گا۔ ہم اُن کو جو حد سے گزر گئے اور اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان نہیں لائے، اِسی طرح بدلہ دیں گے۔[۱۵۸] اور آخرت کا عذاب تو زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔ ۱۱۵-۱۲۷

پھر کیا اِن لوگوں کو اِس سے ہدایت نہیں ہوئی کہ اِن سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کی بستیوں میں اب یہ چلتے پھرتے ہیں؟[۱۵۹] حقیقت یہ ہے

---

[۱۵۷] یہ اندھا پن باعتبار نتیجہ ہوگا، یعنی اگرچہ دیکھ رہے ہوں گے، مگر اُس نور سے محروم ہوں گے جو اُس روز اہل ایمان کے پاس ہوگا اور اُس کی روشنی میں وہ ہر مرحلے پر اپنا جادہ و منزل اپنے لیے متعین کر لیں گے۔ سورۂ حدید (۵۷) کی آیت ۱۳ میں اِس کی وضاحت ہو گئی ہے۔

[۱۵۸] اشارہ ہے اُس تنگی کی طرف جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

[۱۵۹] یہ عاد و ثمود وغیرہ کی اُن بستیوں کی طرف اشارہ ہے جن کے برباد شدہ آثار اور کھنڈروں پر سے قریش کے لوگ اپنے تجارتی سفروں میں برابر گزرتے رہتے تھے۔

سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ؕ ﴿۱۲۹﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى
مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ
غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

کہ اِس میں عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ تمھارے پروردگار کی طرف سے، (اے پیغمبر)، اگر ایک بات پہلے طے نہ کر دی گئی ہوتی اور (مہلت کی) ایک مقرر مدت نہ ہوتی تو (جو رویہ اِنھوں نے اختیار کیا ہے، اُس کی پاداش میں اِن پر) لازماً عذاب آ جاتا۔ سو جو کچھ یہ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے رہو[۱۶۰]، سورج کے نکلنے اور اُس کے غروب ہونے سے پہلے[۱۶۱] اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو[۱۶۲] اور دن کے کناروں پر بھی[۱۶۳]۔ اِس لیے کہ

---

[۱۶۰] یہ ذکر کے پہلو سے نماز کی تعبیر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ ذکر دو عنصروں سے مرکب ہے: ایک 'تَسْبِيْح'، دوسرا 'حَمْد'۔ 'تَسْبِيْح' میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو اُن باتوں سے پاک و منزہ قرار دینا جو اُس کی شان کے منافی ہیں۔ 'حَمْد' میں اثبات کا پہلو نمایاں ہے، یعنی اُس کو اُن صفات سے متصف قرار دینا جو اُس کے شایان شان ہیں۔ یہ نفی اور یہ اثبات، دونوں مل کر اللہ تعالیٰ کے صحیح تصور کو دل میں راسخ کرتے ہیں اور اِسی رسوخ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا صحیح تعلق قائم ہوتا ہے جو تمام صبر و توکل کی بنیاد ہے۔ اگر اِن کے اندر کسی پہلو سے کوئی ضعف یا عدم توازن پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے متعلق آدمی کا تصور غلط ہو جاتا ہے اور یہ غلطی اُس کے سارے نظام فکر و عمل کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۵۶۷)

[۱۶۱] یعنی فجر اور عصر کے وقت۔

[۱۶۲] عشا اور تہجد کی نماز رات میں پڑھی جاتی ہے۔ یہ اُس کی طرف اشارہ ہے۔ آیت میں

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٣١﴾ وَاْمُرْ

(اُس کے صلے میں خدا کی عنایتوں سے) نہال ہو جاؤ۔[۱۶۴] اور اِن کے بعض گروہوں کو دنیوی زندگی کی رونق[۱۶۵] کا جو ساز و سامان ہم نے اُس میں اُن کی آزمایش کے لیے دے رکھا ہے،[۱۶۶] اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو[۱۶۷] اور (یاد رکھو کہ) تمھارے

فعل کا اعادہ تاکید پر دلالت کر رہا ہے۔

[۱۶۳] یہ تین ہی ہو سکتے ہیں: ایک صبح، دوسرا زوال آفتاب اور تیسرا شام کا کنارہ۔ چاشت، ظہر اور مغرب کی نمازیں دن کے اِنھی کناروں پر ادا کی جاتی ہیں۔

نماز کی یہ ہدایت صبر حاصل کرنے کی ایک تدبیر کے طور پر ہوئی ہے، اِس لیے کہ صبر کی توفیق جس کو بھی حاصل ہوتی ہے، اللہ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا واحد ذریعہ نماز ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یہ آیات حق و باطل کی کشمکش کے نہایت مشکل دور میں نازل ہوئی ہیں۔ اِن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے امت کو وہ تدبیر بتائی گئی ہے جو مشکلات و مصائب میں ثابت قدم رکھنے والی اور خدا کی رحمت و نصرت کا حق دار بنانے والی ہے۔ اِس طرح کے حالات میں صرف فرض نمازوں ہی کا اہتمام مطلوب نہیں ہے، بلکہ نوافل کا اہتمام بھی مطلوب ہے۔ قرآن، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سلف صالحین کے عمل، ہر چیز سے ہمارے اِس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ عام حالات میں تو تہجد و اشراق کی نمازوں کی حیثیت بہر حال نفلی نمازوں ہی کی ہے، لیکن مشکلات و مصائب میں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، اِن کا اہتمام ضروری ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۱۰۷)

[۱۶۴] اِن دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی جو دنیا چھپی ہوئی ہے، اُس کا اندازہ ہر صاحب ذوق کر سکتا ہے۔

اَهۡلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا ؕ لَا نَسۡـَٔلُكَ رِزۡقًا ؕ نَحۡنُ

پروردگار کا رزق ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے[١٦٨]۔ تم اپنے لوگوں کو[١٦٩] نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اُس کے پابند رہو۔ ہم (اُن کے لیے) تم سے کوئی رزق نہیں

١٦٥۔ اصل میں 'زُهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ 'مَتَّعۡنَا بِهٖ' میں 'بِهٖ' کی ضمیر مجرور سے حال واقع ہوئے ہیں اور مجرور سے حال واقع ہونا فصیح عربی میں معروف ہے۔ بعض گروہوں سے اشارہ مکہ اور طائف کے اُن لوگوں کی طرف ہے جو وہاں عزت و اقتدار رکھتے تھے۔ اُن کے مال و دولت اور عزت و اقتدار کو 'زُهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا' کہہ کر قرآن نے اشارہ کر دیا ہے کہ جو کچھ اُن کے پاس ہے، اُس کی چمک دمک چند روزہ ہے۔

١٦٦۔ یعنی اِس لیے نہیں دے رکھا کہ یہ اُس کے حق دار تھے، بلکہ اِس لیے دے رکھا ہے کہ اِن کا امتحان کریں کہ ہماری نعمتیں پا کر یہ شکر گزاری کا رویہ اختیار کرتے ہیں یا ہمارے آگے ہی اکڑنے لگتے ہیں۔

١٦٧۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کی محبت اور اِن لوگوں کے لیے سچے جذبۂ خیر خواہی و ہم دردی کی بنا پر اِن کے ایمان کے خواہاں تھے۔ قریش کے اِن اغنیا اور سادات و امرا کی طرف آپ کے التفات کا باعث یہی تھا، اِس میں کسی طمع و حرص کا، معاذ اللہ، کوئی شائبہ نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اِس سے بھی روک دیا ہے، اِس لیے کہ اپنے گریز و فرار اور استکبار کی وجہ سے وہ دعوت کے اِس مرحلے میں اب اِس کے مستحق نہیں رہے تھے۔

١٦٨۔ یعنی موت کے بعد بھی باقی رہنے والا ہے، بلکہ اُس لازوال اور ابدی بادشاہی کی صورت اختیار کرنے والا ہے، جس سے آگے کسی نعمت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

١٦٩۔ اصل میں لفظ 'اَهۡلَكَ' آیا ہے۔ اِس سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو اُس وقت ایمان لا چکے تھے۔ عربی زبان میں لفظ 'أهل' اِس وسعت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اِس کے استعمال میں یہ بلاغت ہے کہ غربائے مسلمین کی عزت اِس سے اِس درجہ بڑھ گئی ہے کہ وہ گویا سرور عالم

نَرۡزُقُكَ ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰی ﴿۱۳۲﴾
وَقَالُوۡا لَوۡلَا يَاۡتِيۡنَا بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمۡ تَاۡتِهِمۡ بَيِّنَةُ مَا فِی
الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی ﴿۱۳۳﴾ وَلَوۡ اَنَّاۤ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ بِعَذَابٍ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَقَالُوۡا

مانگتے (کہ تمھیں کسی کے سازوسامان کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہو)[۱۷۰]۔ رزق تو ہم تمھیں دیں گے[۱۷۱]۔ (ہم تم سے تقویٰ کا تقاضا کرتے ہیں[۱۷۲]) اور انجام کی فیروزمندی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔ ۱۲۸-۱۳۲

اِنھیں اصرار ہے کہ اپنے پروردگار کے پاس سے یہ ہمارے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے؟ کیا اِن کے پاس اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے، اُس کی گواہی نہیں پہنچی[۱۷۳]؟ اگر ہم اِن کو اِس سے پہلے ہی کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے کہ

کے اہل میں شامل ہو گئے ہیں۔

[۱۷۰] مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ تقاضا تم سے کبھی نہیں کیا کہ تم یہ خیال کرو کہ اِن لوگوں نے ایمان قبول نہ کیا تو ہماری دعوت اور اُس کو آگے بڑھ کر قبول کرنے والے غربا ے مسلمین اِس سرزمین میں بے یارومددگار ہو کر رہ جائیں گے۔ نہیں، اِن میں سے کسی چیز کو بھی خاطر میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی دعوت اور اپنے ساتھیوں کے لیے اِن ناقدروں کی مدد اور سرپرستی کے محتاج نہیں ہو۔ تمھارے ساتھ خدا ہے اور تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی مدد، تقویت اور کفالت کے لیے وہی کافی ہے۔

[۱۷۱] یعنی تمھیں بھی اور اُن کو بھی جو دعوت کے اِس کام میں تمھارے ساتھی بنیں گے۔ یہ ہمارا کام ہے اور ہم جب اپنا کوئی کام کسی کے سپرد کرتے ہیں تو اُس کے رزق کی ذمہ داری اِسی طرح اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔ اِس لیے تم ہمارا کام کرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ باقی جو ذمہ داری ہماری ہے، اُس کو ہم پر چھوڑ دو۔ اُس کے لیے تمھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی

رَبَّنَا لَوۡلَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّذِلَّ وَنَخۡزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلۡ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوۡا ۚ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَصۡحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِىِّ وَمَنِ اهۡتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

پروردگار، تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے[۱۷۷/۴] ہم تیری آیتوں کی پیروی اختیار کر لیتے؟ اِن سے کہو کہ ہر ایک منتظر ہے[۱۷۷/۵] تو تم بھی انتظار کرو،[۱۷۷/۶] پھر عنقریب جان لوگے کہ کون سیدھی راہ پر چلنے والا ہے اور کون برسر غلط ہے، اور کون منزل تک پہنچا اور کون راہ سے بھٹک گیا ہے۔[۱۷۷/۷] ۱۳۳-۱۳۵

ڈیوٹی پر ہو تو مسیح (علیہ السلام) کے الفاظ میں، اپنی مزدوری کے حق دار ہو۔

[۱۷۷/۲] یعنی علم و عمل میں بھی اور اُس کام میں بھی جو ہم نے تمھارے سپرد کیا ہے۔

[۱۷۷/۳] یہ جس سوال کا جواب ہے، وہ چونکہ اہل کتاب کا القا کیا ہوا تھا، اِس لیے جواب بھی اُنھی کو پیش نظر رکھ کر دیا ہے۔

[۱۷۷/۴] اصل الفاظ ہیں: 'مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّذِلَّ وَ نَخۡزٰی'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''ذلت' اور 'خزی' کے الفاظ اپنے عام استعمال میں ایک دوسرے کے مفہوم میں بھی آتے ہیں، لیکن جب یہ دونوں ایک ساتھ آئیں، جس طرح یہاں آئے ہیں تو اِن کے درمیان ایک نازک سا فرق ہو جاتا ہے۔ اِس صورت میں 'ذلت' سے مراد وہ ذلت ہوتی ہے، جس کا احساس ایک ذلیل ہونے والا خود اپنے باطن میں کرتا ہے اور 'خزی' سے وہ رسوائی مراد ہوتی ہے جو دوسروں کے سامنے اُس کو ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ نہ ہم اپنی نگاہوں ہی میں ذلیل ہوتے اور نہ دوسروں کے آگے ہی رسوائی اور فضیحتا کی یہ نوبت آتی۔'' (تدبر قرآن ۵/۱۱۲)

[۱۷۷/۵] یعنی ہم بھی اور وہ سب لوگ بھی جو اِس کشمکش کو دیکھ رہے ہیں۔

سورة الانبیاء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ﴿۱﴾
مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡہُ وَ ہُمۡ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

لوگوں کے لیے اُن کے حساب کا وقت قریب آ لگا ہے[۱۷۸] اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کیے جا رہے ہیں[۱۷۹]۔ اُن کے پروردگار کی طرف سے جو تازہ یاد دہانی

---

[۱۷۶] یہ خطاب کا اسلوب شدت عتاب کے اظہار کے لیے ہے۔

[۱۷۷] اِس جملے میں مقابل کے فقرے عربیت کے اسلوب پر محذوف ہیں۔ ہم نے اُنھیں کھول دیا ہے۔

[۱۷۸] یعنی مشرکین مکہ کے لیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اب سنت الٰہی کے مطابق کسی وقت بھی عذاب سے دوچار ہو سکتے تھے۔ پیچھے سورۂ طٰہٰ کے آخر میں جس چیز کے بارے میں فرمایا تھا کہ اُس کا انتظار کرو، یہ اُسی کے قریب آ لگنے کا ذکر ہے، جس سے بغیر کسی تمہید کے یہ سورہ شروع ہو گئی ہے۔ یہ لوگ چونکہ خدا کی یاد دہانی سے منہ موڑے ہوئے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اِن سے منہ موڑ کر ایک عام لفظ ’النَّاس‘ سے اِن کا ذکر فرمایا ہے۔

[۱۷۹] آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: ایک غفلت، دوسرا اعراض۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...غفلت، یعنی زندگی کے اصل حقائق سے بے پروائی، بجائے خود بھی انسان کی شامت

يَلْعَبُوْنَ ② لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ڰ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③

بھی اُن کے پاس آتی ہے، وہ اُس کو سنتے ہیں تو کھیل میں لگے ہوتے ہیں۔ اُن کے دل غافل ہیں اور وہ ظالم چپکے چپکے (آپس میں) سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص ہے ہی کیا، یہ تو تمھارے ہی جیسا آدمی ہے، پھر کیا آنکھوں دیکھتے اِس کے جادو میں پڑتے ہو؟[180] ۱-۳

کی دلیل ہے اور ایک بہت بڑا جرم ہے، لیکن یہ جرم اُس صورت میں بہت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے، جب کوئی اللہ کا بندہ جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہو، لیکن لوگ ایسے غفلت کے ماتے ہوں کہ اُس کی کوئی نصیحت بھی سننے کے لیے تیار نہ ہوں۔''

(تدبر قرآن ۵/۱۲۲)

[180] یہاں جادو کا لفظ ٹھیک اُس مفہوم میں ہے، جس میں یہ 'إن من البیان لسحرًا' کے جملے میں آیا ہے، یعنی اُس کلام کا جادو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سنا رہے تھے۔ کسی کلام کی غیر معمولی تاثیر و تسخیر کے لیے یہ تعبیر اہل عرب کے ہاں بھی رائج تھی اور ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ اِس سے وہ اپنے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ تم جس چیز سے متاثر ہو رہے ہو، وہ سراسر الفاظ کی ساحری ہے، اِسے کوئی الہامی کلام اور اِس کے پیش کرنے والے کو خدا کا رسول قرار دے کر اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا نہ کرو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِس کلام کا زور اور اِس کی سطوت و جلالت فی الواقع دلوں کو تسخیر کرتی ہے، لیکن اِس سے زیادہ اِس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ لفظ و معنی کے ربط و نظام کا غیر معمولی کمال ہے، جس کا مظاہرہ یہ نبوت و رسالت کے مدعی بن کر تمھارے سامنے کر رہے ہیں۔ تم سوچنے سمجھنے والے لوگ ہو، تمھیں تو اِس شخص کے فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ یہ آخری بات، ظاہر ہے کہ مخاطبین کے اندر احساس برتری کو

قٰلَ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِی السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ۫ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۴﴾
بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۭ بَلِ افۡتَرٰىہُ بَلۡ ہُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلۡیَاۡتِنَا
بِاٰیَۃٍ کَمَاۤ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۵﴾

(اِس پر) رسول نے کہا[۱۸۱]: (یہ کیا سرگوشیاں کرتے ہیں)؟ میرا پروردگار ہر اُس بات کو جانتا ہے جو زمین و آسمان میں کی جائے اور وہ سمیع و علیم ہے۔ ۴

یہی نہیں کہ صرف جادو کہتے ہیں، بلکہ اُنھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ بھی کہ اِس نے اپنی طرف سے اِس قرآن کو گھڑ لیا ہے، بلکہ یہ بھی کہ یہ محض ایک شاعر ہے۔[۱۸۲] سو (اگر یہ واقعی پیغمبر ہے تو) ہمارے پاس اُسی طرح کوئی نشانی لائے، جس طرح اگلے پیغمبر نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔[۱۸۳] ۵

ابھارنے کے لیے کہی جاتی تھی۔

[۱۸۱] یعنی اُن کو مخاطب کیے بغیر اپنے دل میں کہا اور اِس طرح گویا معاملے کو اللہ کے حوالے کر دیا کہ وہی اِن کے فتنوں کا تدارک کرے گا۔ آگے اِسی تفویض کا بیان ہے۔

[۱۸۲] اِس سے واضح ہے کہ قرآن کے مخاطبین اُس کی ہیبت و جلالت سے سخت مرعوب تھے، لیکن چونکہ ماننا نہیں چاہتے تھے کہ وہ خدا کا کلام ہے، اِس لیے کبھی اُس کو پیغمبر کے واہمہ کی خلاقی، کبھی اُس کی من گھڑت اور کبھی شاعر کی سحر آفرینی کہہ کر لوگوں کے دلوں پر سے اُس کی ہیبت کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

[۱۸۳] آیت میں 'کَمَآ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ' کے بعد 'بِالۡاٰیٰتِ' کا لفظ دلالت قرینہ کی بنا پر حذف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِن کا یہ حربہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں، اِن کے زعم کے مطابق، سب

مَآ اٰمَنَتۡ قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا ۚ اَفَهُمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ ⑥
وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ
اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ⑦ وَمَا جَعَلۡنٰهُمۡ جَسَدًا لَّا يَاۡكُلُوۡنَ

ہم نے جن بستیوں کو ہلاک کیا ہے، اُن میں سے کوئی بھی اِن سے پہلے (اِس طرح کی نشانی دیکھ کر) ایمان نہیں لائی تو کیا یہ ایمان لائیں گے؟ (کہتے ہیں کہ ہمارے جیسا آدمی ہے)۔ تم سے پہلے بھی ہم نے جس کو رسول بنا کر بھیجا، آدمیوں ہی میں سے بھیجا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ سو یاددہانی والوں سے پوچھ لو، اگر تم لوگ نہیں جانتے ہو[184]۔ ہم نے اُن رسولوں کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ

سے زیادہ کارگر حربہ تھا، اِس لیے کہ قرآن کی دعوت تمام تر آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے دلائل پر مبنی تھی۔ وہ معجزات و خوارق اور نشانی عذاب کے بجائے لوگوں کو آنکھیں کھولنے اور عقل و بصیرت سے کام لینے پر ابھارتا تھا کہ ایمان کا فطری راستہ عقل و دل کا راستہ ہے۔ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے، وہ خوارق دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے اور عذاب کی نشانی دیکھ کر جو لوگ ایمان لاتے ہیں، اُن کا ایمان لانا بے سود ہوتا ہے۔ قرآن کی یہ بات بالکل برحق تھی، لیکن مخالفین اُس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گریز پر محمول کر کے لوگوں کو ورغلاتے کہ دیکھو، اگر یہ سچ مچ کوئی رسول ہوتے تو اِن کے لیے ہمارا یہ مطالبہ پورا کر دینا کیا مشکل تھا! لیکن جب یہ اِس سے گریز کر رہے ہیں تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنے دعوے میں (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۱۲۵)

[184] اِس میں مخاطبین پر ایک نوعیت کی تعریض ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی اولاد ہونے کے باوجود نہیں جانتے ہو تو اُن اہل کتاب سے پوچھ لو جن کے پاس اِس سے پہلے اِسی طرح یاددہانی بھیجی گئی۔ اِس بدیہی حقیقت کا انکار تو وہ بھی نہیں کر

الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (۸) ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ
وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (۹)
لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰)
وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا

وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ (دنیا میں) ہمیشہ رہنے والے بھی نہیں تھے۔[۱۸۵] پھر دیکھ لو کہ اُن سے اپنا وعدہ ہم نے پورا کر دیا[۱۸۶] اور اُن کو اور (اُن کے ساتھ) جن کو ہم چاہتے تھے، بچا لیا اور حد سے گزرنے والوں کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا۔ ۶-۹

(لوگو)، ہم نے تمھاری طرف بھی ایک کتاب نازل کر دی ہے، جس میں تمھارے حصے کی یاد دہانی ہے۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو؟[۱۸۷] کتنی ہی بستیاں ہم نے توڑ پھوڑ کر برابر کر دیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہی تھیں[۱۸۸] اور اُن کے بعد دوسرے لوگ اٹھا کھڑے

سکتے۔

[۱۸۵] یہ اُن باتوں کا جواب ہے جو وہ کہتے تھے کہ یہ تو اُسی طرح کھاتے اور پیتے ہیں، جس طرح تم کھاتے اور پیتے ہو، پھر یہ رسول کس طرح ہو سکتے ہیں؟

[۱۸۶] یعنی یہ وعدہ کہ اُن کے جھٹلانے والوں کو ہم لازماً ہلاک کر دیں گے اور اُنھیں اور اُن کے ساتھیوں کو نجات دیں گے۔ رسولوں سے متعلق یہ اُسی سنت الٰہی کا ذکر ہے، جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں۔

[۱۸۷] یعنی اِس بات کو سمجھتے نہیں ہو کہ یہ خدا کی یاد دہانی ہے اور اِس کو رد کر دینے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ تمھاری عقل کہاں کھوئی گئی ہے؟ تم کیوں اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہو؟

[۱۸۸] لفظ ’ظَالِم‘ یہاں ’ظالم لنفسہ‘ کے معنی میں ہے۔ قرآن میں یہ متعدد مقامات پر

اٰخَرِیْنَ ⑪ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَرْكُضُوْنَ ؕ ⑫ لَا
تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْۤا اِلٰی مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ⑬
قَالُوْا یٰوَیْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ⑭ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰی
جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ ⑮

کیے۔[۱۸۹] پھر جب اُنھوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی تو اُسی وقت وہاں سے بھاگنے لگے۔ (ہم نے کہا): اب بھاگو نہیں، اپنے اُسی سازوسامان کی طرف جس میں تم مزے کر رہے تھے اور اپنے اُنھی گھروں کی طرف لوٹ جاؤ جو تمھاری عشرت گاہیں تھیں[۱۹۰] تاکہ تم سے پوچھا جائے[۱۹۱]۔ اُنھوں نے واویلا کیا کہ ہائے ہماری بدبختی، بے شک، ہم ہی ظالم تھے۔ سو یہی واویلا کرتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے اُن کو کاٹ کر ڈھیر کر دیا، گویا بجھے ہوئے پڑے ہیں[۱۹۲]۔ ۱۰-۱۵

اِس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۱۸۹] مطلب یہ ہے کہ نہیں مانو گے تو تمھارے ساتھ بھی یہی ہوگا اور اِس سے خدا کی دنیا اجڑ نہیں جائے گی۔ وہ تمھاری جگہ دوسروں کو لا بسائے گا۔ یہ اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

[۱۹۰] یہ فقرہ اصل میں مقدر ہے۔ اِس کا قرینہ یہ ہے کہ یہاں خطاب امرا و اغنیا سے ہے، جیسا کہ 'مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ' کے الفاظ سے واضح ہے، اور یہ اُنھی کے گھر ہیں۔

[۱۹۱] یہ طنز و تضحیک کا جملہ ہے، یعنی تمھاری خبر لی جائے۔

[۱۹۲] اصل میں 'حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ⑯ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖق اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ⑰ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ

ہم نے زمین و آسمان کو اور اُس کو جو اُن کے درمیان ہے، کچھ کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔[۱۹۳] اگر ہم کوئی کھیل بنانا چاہتے تو اُس کا اہتمام اپنے پاس ہی سے کر لیتے، اگر ہم کو یہی کرنا ہوتا۔[۱۹۴] ہرگز نہیں،[۱۹۵] بلکہ (ایک دن آنے والا ہے[۱۹۶] کہ) ہم حق کو باطل پر ماریں گے اور وہ اُس کا سر توڑ دے گا۔ پھر اُسی وقت دیکھو گے

> ”...(اِس) میں یہ مضمون مضمر ہے کہ جس طرح گھاس کاٹ کر اُس کے خشک انبار میں آگ لگا دی جائے اور وہ راکھ کا ڈھیر ہو کے رہ جائے، اُسی طرح ہم نے اُن کو خاک اور راکھ بنا دیا۔
>
> لفظ ’خٰمِدِيْنَ‘ یہاں مستعارلہ کی رعایت سے آیا ہے اور یہ عربی کا معروف اسلوب ہے۔“
>
> (تدبرقرآن ۵/۱۲۹)

[۱۹۳] پیچھے فرمایا تھا کہ ایسا ایک دن آنا لازمی ہے، جس میں پوچھا جائے گا کہ کیا کرتے رہے ہو۔ یہ اُس کی دلیل بیان کی ہے کہ اگر جزا و سزا نہیں ہے، جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا کسی بھگوان کی لیلا، کسی کھلنڈرے کا کھیل یا کسی دیوتا کا اکھاڑا ہے۔ تم واقعی یہ سمجھتے ہو تو سن لو کہ ہم نے اِس کو کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اِس کی ایک ایک چیز گواہی دے رہی ہے کہ یہ نہایت پُرحکمت کارخانہ ہے اور اِس کے بنانے والے نے اِسے ایک عظیم مقصد اور عظیم غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ایک دن ایسا لازماً آئے گا، جس میں یہ مقصد ظاہر ہو جائے گا۔

[۱۹۴] یعنی اول تو یہ ہمارے شایانِ شان نہیں کہ ایسا کرتے، لیکن بالفرض کرنا ہی تھا تو اِس کے لیے روم کا یہ اکھاڑا بنا کر اپنے ہی ذی حس اور ذی شعور بندوں اور بندیوں کا تماشا دیکھنا

الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾
وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ
عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾

کہ وہ نابود ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارے لیے بڑی خرابی ہے اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بیان کرتے ہو۔[۱۹۷] ۱۶-۱۸

اُسی کے ہیں جو زمین اور آسمانوں میں ہیں اور جو اُس کی بارگاہ میں ہیں، (جنھیں اُس کی اولاد بنا کر پوجتے ہو)[۱۹۸]، وہ اُس کی بندگی سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔ رات دن اُس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، کبھی دم نہیں لیتے۔ ۱۹-۲۰

تو ظلم اور شقاوت کی انتہا ہے۔ تم خداے رحمٰن کے بارے میں یہ خیال کس طرح کرتے ہو کہ اُس نے حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت اور ظلم و مظلومی کی یہ رزم گاہ صرف اِس لیے قائم کر رکھی ہے کہ خود ایک تماشائی بن کر اِس کا تماشا دیکھتا رہے۔ خدا کے بندو، یہ اُس کے عدل اور رحم کے بالکل منافی ہے۔

۱۹۵ یعنی یہ دنیا ہرگز کھیل تماشا نہیں ہے۔ تمھارا یہ خیال بالکل باطل ہے۔

۱۹۶ یعنی قیامت کا دن، جب اُس امتحان کا نتیجہ سامنے آئے گا جو اِس وقت برپا ہے کہ تم میں سے کون حق کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون باطل ہی پر قائم رہ کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

۱۹۷ یعنی یہ باتیں کہ دنیا محض ایک کھیل تماشا ہے اور آخرت اگر ہوئی بھی تو ہمارے شرکا و شفعا ہم کو ہر خطرے سے بچا لیں گے۔

۱۹۸ یہ فرشتوں کا ذکر ہے جن کے بارے میں مشرکین عرب کا گمان تھا کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور وہ چونکہ اُن کو پوجتے ہیں، اِس لیے اُن کی سفارش سے وہ خدا کی پکڑ سے بچ

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ
اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾
لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ

کیا اِنھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھیرا لیے ہیں جو اُس کو جلا اٹھاتے ہیں؟[۱۹۹] اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا دوسرے معبود بھی ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔[۲۰۰] سو اللہ، عرش کا مالک[۲۰۱] اُن سب چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، اُس کے لیے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں ہے اور یہ سب جائیں گے۔

---

[۱۹۹] یعنی زندگی بخشتے اور شاداب کر دیتے ہیں۔ اہل عرب کے علم الاصنام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کو وہ خدا کی سلطنت میں ایک دور کی جگہ سمجھ کر یہ خیال کرتے تھے کہ اُس کا نظم و نسق اُس نے دوسروں کے حوالے کر رکھا ہے اور خود اُس سے الگ تھلگ آسمانوں پر اپنی حکومت چلا رہا ہے۔ یہ اِسی واہمے کی تردید ہے۔

[۲۰۰] یہ توحید کی وہی دلیل ہے جسے دلیل توافق کہا جاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ اِس کائنات کے بقا کا انحصار اِس امر پر ہے کہ اِس کے مختلف اجزا و عناصر اور اِس کے تمام اضداد میں نہایت گہرا توافق ہے۔ اگر یہ توافق ایک لمحے کے لیے بھی ختم ہو جائے تو اِس کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ یہ توافق صریح طور پر اِس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اِس پوری کائنات پر ایک ہی ذات کا ارادہ (mind) کارفرما ہے۔ اگر اِس میں بہت سے ارادے کارفرما ہوتے تو آسمان و زمین کا باقی رہنا ناممکن تھا۔“ (تدبر قرآن ۵/۱۳۶)

[۲۰۱] یعنی کائنات کے تخت سلطنت کا مالک۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَآ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا
فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

جواب دہ ہیں۔[۲۰۲] کیا اِنھوں نے خدا کے سوا دوسرے معبود ٹھیرا لیے ہیں؟ اِن سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ اُن کی یاددہانی موجود ہے جو میرے ساتھ ہیں اور اُن کی یاددہانی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے ہیں۔[۲۰۳] نہیں، کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اِن میں سے زیادہ حق کو نہیں جانتے، اِس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے ہیں، اُن کی طرف ہم یہی وحی کرتے رہے ہیں[۲۰۴] کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، سو میری ہی بندگی کرو۔[۲۰۵] ۲۱-۲۵

۲۰۲۔ اِس لیے یہ تصور نہایت احمقانہ ہے کہ کوئی اُس کے ارادوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

۲۰۳۔ یہ اب توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں انبیا علیہم السلام کی تذکیر کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن بھی موجود ہے جو میرے ماننے والوں کے لیے یاددہانی بن کر نازل ہوا ہے اور تورات، زبور، انجیل اور انبیا کے دوسرے صحائف بھی۔ اُنھیں دیکھ لو، اُن میں سے کسی میں بھی شرک کی تعلیم نہیں پائی جاتی، وہ سب توحید ہی کی شہادت دیتے ہیں۔

۲۰۴۔ اصل میں 'نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'نُوْحِيْ' سے پہلے ایک فعل ناقص عربیت کے اسلوب پر حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۰۵۔ اوپر اگلوں کی جس یاددہانی کا حوالہ دیا ہے، یہ اُس کی مزید وضاحت کر دی ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ ۙ
لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ
اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ
مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ
دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

یہ کہتے ہیں کہ خداے رحمٰن کے اولاد ہے۔ وہ (اِس تہمت سے) پاک ہے۔ فرشتے، جن کو یہ خدا کی بیٹیاں سمجھتے ہیں، وہ اُس کی اولاد نہیں، بلکہ مقرب بندے ہیں[۲۰۶]۔ وہ اُس کے حضور کبھی بڑھ کر نہیں بولتے اور اُس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں[۲۰۷]۔ اُن کے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے، سب اُس کو معلوم ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے، اُس کے سوا جس کے لیے اللہ پسند فرمائے اور اُس کی ہیبت سے لرزتے رہتے ہیں۔ اُن میں سے جو یہ کہنے کی جسارت کرے کہ اللہ کے سوا میں الٰہ ہوں تو اُس کو ہم جہنم کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو اِسی طرح سزا دیتے ہیں[۲۰۸]۔ ۲۶-۲۹

---

[۲۰۶] اِس لیے کہ وہ شرک سے بالکل پاک ہیں، خدا کی سچی معرفت رکھتے ہیں اور کامل وفاداری کے ساتھ اُس کی بندگی کا حق ادا کرتے ہیں۔ اِس کا صلہ خدا کا تقرب ہے، نہ کہ زور و اثر اور ناز و تدلل جس سے وہ، اِن کے زعم کے مطابق، خدا سے جو چاہیں گے، منوا لیں گے۔

[۲۰۷] مطلب یہ ہے کہ جن کی حیثیت خدا کے آگے یہ ہے، اُن کے بارے میں یہ خیال کر لینا کہ وہ خدا کی بارگاہ میں ایسا زور و اثر رکھتے ہیں کہ اپنے ماننے والوں کو اُس کی پکڑ سے بچا لیں گے، محض حماقت ہے۔

اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۰﴾

(یہ نشانیاں مانگتے ہیں)۔ کیا اِن منکروں نے بارہا دیکھا نہیں کہ آسمان اور زمین، دونوں بند ہیں،[۲۰۹] پھر ہم نے اُن کو کھول دیا[۲۱۰] اور ہم نے ہر زندہ چیز کو آسمان کے پانی ہی سے پیدا کیا ہے؟ کیا وہ پھر بھی ایمان نہ لائیں گے؟ اور ہم نے زمین میں

---

۲۰۸ یہ پوری تقریر اُسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے فرمائی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی یہ حیثیت مان لی جائے کہ وہ اپنی سفارش سے مجرموں کو چھڑا سکتا ہے تو عقیدۂ آخرت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا کے بارے میں بھی یہ ماننا ممکن نہیں رہتا کہ وہ کوئی عادل اور حکیم ہستی ہے، جس کے وعدوں پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

۲۰۹ یعنی آسمان سے بارش نہیں ہوئی اور زمین سے سبزہ نہیں اگا۔ اِسی کو آیت میں ’رَتْق‘، یعنی بند ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

۲۱۰ یعنی آسمان کو کھول دیا اور اُس نے دھڑا دھڑ پانی برسانا شروع کر دیا۔ اِس کے نتیجے میں زمین بھی کھل جاتی ہے اور نباتات کے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔

یہ مشاہدہ جن حقائق پر دلالت کرتا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”اِس میں نہایت واضح دلیل توحید کی موجود ہے۔ اگر آسمان میں الگ الٰہ اور زمین میں الگ معبود ہوتے تو آسمان کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین کو زندہ و شاداب رکھنے کے لیے اپنے ذخیرے کا پانی صرف کرتا؟ زمین و آسمان میں یہ زوجین کی سی سازگاری اِس بات کی صاف شہادت ہے کہ دونوں کا خالق و مالک ایک ہے اور دونوں پر اُسی کا ارادہ کارفرما ہے۔
>
> دوسری شہادت اِس کے اندر معاد کی ہے۔ جب زمین خشک و بے آب و گیاہ یا بالفاظ دیگر

وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ ص وَجَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا
سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ (۳۱) وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ج صلے
وَّهُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ (۳۲) وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ

پہاڑ جما دیے کہ وہ اُن کو لے کر جھک نہ پڑے[۲۱۱] اور اُن پہاڑوں کے اندر راستے کے لیے درے بنائے تاکہ لوگ (اپنے لیے) راہ پا لیں[۲۱۲]۔ اور آسمان کو ہم نے ایک محفوظ چھت بنا دیا[۲۱۳] اور یہ لوگ ہیں کہ اُس کی نشانیوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا

> مردہ ہو کر از سر نو زندہ و شاداب ہو جاتی ہے تو موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو کیوں مستبعد خیال کیا جائے؟
>
> تیسری شہادت اِس کے اندر انسان کے مسئول ہونے کی ہے۔ جب خدا نے انسان کی پرورش کے لیے یہ کچھ اہتمام فرمایا ہے کہ اپنے آسمان و زمین، سورج چاند اور ابر و ہوا، ہر چیز کو اُس کی خاطر سرگرم کار رکھتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اُس کو بالکل شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دے، محاسبے کا کوئی دن اُس کے لیے مقرر نہ کرے۔'' (تدبر قرآن ۵/۱۴۱)

[۲۱۱] یہ غالباً وہی چیز ہے جسے جدید سائنس میں ’isostasy‘ کہا جاتا ہے۔ قرآن کے اِس بیان سے پہاڑوں کے بارے میں یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمندروں کے نیچے کے کثیف مادے کو متوازن رکھنے کے لیے سطح زمین پر ابھرے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو زمین اُسی طرح ہلتی رہتی، جس طرح اب زلزلہ آ جائے تو ہلتی ہے۔ اِس کے لیے جو الفاظ قرآن میں آئے ہیں، اُن میں ’اَنْ‘ سے پہلے لام علت عربیت کے اسلوب پر مقدر ہے۔ ہم نے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ یہ اُسی طرح کا اسلوب ہے، جیسے ہم کہتے ہیں: ’ھذا دواء للحمی‘۔

[۲۱۲] یعنی سفر کی راہ بھی اور جس پروردگار کی قدرت، عظمت اور حکمت اِن راستوں کے

وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۳۳
وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ
الْخٰلِدُوْنَ ۝۳۴ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ

کیا ہے۔ اِن میں سے ہر ایک (اپنے) ایک مدار میں گردش کر رہا ہے[۲۱۴]۔ ۳۰-۳۳

(یہ تم کو نہیں مانتے، اِس لیے کہ تمھیں بھی ایک دن مر جانا ہے)۔ تم سے پہلے بھی، (اے پیغمبر)، ہم نے کسی انسان کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی، تو کیا اگر تم مر گئے تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں[۲۱۵]؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔

وجود سے ظاہر ہوتی ہے، اُس تک پہنچنے کی راہ بھی۔ یہ بلیغ فقرہ، اگر غور کیجیے تو نہایت خوبی کے ساتھ اِن دونوں مفاہیم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۲۱۳؎ یعنی ایک ایسی چھت جس کی وسعت و پہنائی کی کوئی حد نہیں ہے، لیکن نہ کہنہ ہوتی ہے، نہ اِس میں کوئی خلل پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایسی محکم ہے کہ دیکھنے والے اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ازل سے ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔ اور یہی نہیں، اب تو ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اِس کی ترکیب اِس طرح ہے کہ یہ ہم کو سورج کی نقصان دہ شعاعوں سے بھی بچاتی ہے اور شہاب ثاقب کی اُس بارش سے بھی جو دس کھرب روزانہ کے اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں۔ پھر اِس کے خالق نے اِسے ایسے قمقموں سے سجا دیا ہے جن کی حسن افروزی اور فیض بخشی ہر اندازے اور خیال سے باہر ہے۔

۲۱۴؎ یہ اِس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کوئی ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتا، بلکہ ٹھیک اُس قانون کے مطابق گردش کرتا رہتا ہے جو اُس ہستی نے اُس کے لیے مقرر کر دیا ہے، جس کے ہاتھ میں اُس کی باگ ہے اور جو کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے اُس کو مسخر کیے ہوئے ہے۔

وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝۳۵
وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۶

اور (یہ اپنی حیثیت پر اترائیں نہیں)، ہم اچھے اور برے حالات سے تم لوگوں کو آزما رہے ہیں، پرکھنے کے لیے اور (ایک دن) تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔[۲۱۶] ۳۴-۳۵

یہ منکرین جب تم کو دیکھتے ہیں تو اِس کے سوا کچھ نہیں کرتے کہ تمھیں مذاق بنا لیتے ہیں۔ (کہتے ہیں[۲۱۷]): اچھا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے[۲۱۸] اور اپنا حال یہ ہے کہ یہ خود خداے رحمٰن کے ذکر ہی کے منکر ہیں۔[۲۱۹] ۳۶

---

۲۱۵ مطلب یہ ہے کہ جب خود بھی فانی ہیں تو آخر رسول کے بارے میں کیوں چاہتے ہیں کہ اُسے غیر فانی ہونا چاہیے۔

۲۱۶ یعنی یہ خیال نہ کریں کہ اِن کے اچھے حالات اِن کا ذاتی استحقاق ہیں اور اِس کی بنا پر اب نبوت بھی اِنھیں ہی ملنی چاہیے تھی، لہٰذا مال و دولت اور عز و جاہ میں فروتر کسی شخص کو یہ خدا کا پیغمبر کیوں مانیں، بلکہ اِس بات کو سمجھیں کہ اِس دنیا میں غربت و امارت اور رنج و راحت، سب امتحان کے لیے ہے۔ اِن میں سے کوئی چیز بھی کسی کا ذاتی استحقاق نہیں ہے۔

۲۱۷ یعنی تحقیر کے انداز میں کہتے ہیں۔

۲۱۸ اصل میں 'یَذْکُرُ اٰلِھَتَکُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ضمیر خطاب اپنے عوام کو بھڑکانے کے لیے ہے، ورنہ موقع کلام کا تقاضا تھا کہ 'یذکر الھتنا' کہا جاتا اور 'ذِکر' سے مراد برائی کے ساتھ ذکر کرنا ہے۔ یہ اسلوب بتا رہا ہے کہ 'یَذْکُرُ اٰلِھَتَکُمْ' کے بعد 'بالسوء' کا لفظ وہ اپنے معبودوں کے لیے غیرت و حمیت کی بنا پر حذف کر دیتے تھے۔ استاذ امام کے الفاظ

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾
وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ
وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾
وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا

(یہ عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ) انسان عجلت کے خمیر سے پیدا ہوا ہے۔ میں عنقریب اپنی نشانیاں تمھیں دکھاؤں گا، اِس لیے مجھ سے جلدی نہ مچاؤ۔ اور کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا، اگر تم سچے ہو؟ اے کاش، اِن منکروں کو اُس وقت کی خبر ہوتی، جب یہ دوزخ کی آگ کو نہ اپنے چہروں سے ہٹا سکیں گے، نہ اپنی پیٹھوں سے اور نہ اِن کو کہیں سے مدد پہنچے گی۔ یہ مصیبت بتا کر نہیں آئے گی،[۲۲۰] بلکہ اِن پر اچانک آموجود ہوگی اور اِنھیں مبہوت کر دے گی۔ پھر نہ اُس کو دفع کر سکیں گے اور نہ اِنھیں مہلت ہی دی جائے گی۔ ۳۷-۴۰

تم سے پہلے بھی، (اے پیغمبر)، رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے۔ پھر جنھوں

میں، گویا اپنے بتوں کے لیے برائی کا لفظ زبان پر لانا اُنھیں بطور نقل کفر بھی گوارا نہیں تھا۔

[۲۱۹] یعنی اپنے ٹھیرائے ہوئے معبودوں کے لیے تو ایسی غیرت و حمیت رکھتے ہیں، مگر معبود حقیقی کے معاملے میں حال یہ ہے کہ اُس کے ذکر کے بھی روادار نہیں ہیں۔

[۲۲۰] یعنی روز قیامت کی مصیبت جس کا ذکر پچھلے جملے سے مفہوم ہو رہا ہے۔

مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ
مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ
تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ
مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾

بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا
يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

نے اُن کا مذاق اڑایا تھا، اُن کو اُسی چیز نے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اِن سے پوچھو، (اگر وہی چیز تمھیں آ گھیرے تو) رات اور دن میں کون خداے رحمٰن سے تمھاری حفاظت کر سکتا ہے؟ کوئی نہیں، بلکہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی یاددہانی سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ کیا اِن کے لیے ہمارے سوا کچھ اور معبود ہیں جو اِن کو بچا لیں گے؟ (ہرگز نہیں)، وہ نہ خود اپنی مدد کر سکیں گے اور نہ ہمارے مقابل میں کوئی اُن کا ساتھ دے سکتا ہے۔ ۴۱-۴۳

بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اِن کو اور اِن کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا، یہاں تک کہ اِن پر ایک لمبی مدت اِسی حال میں گزر گئی۔[۲۲۱] تاہم، کیا یہ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ اِس سرزمین کو ہم اِس کے کناروں سے کم کرتے ہوئے اِس کی طرف بڑھ رہے ہیں؟[۲۲۲] پھر کیا یہی غالب رہنے والے ہیں؟[۲۲۳] ۴۴

---

[۲۲۱] یہ اُن کے اعراض و استکبار کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ عزت و اقتدار اور خوش حالی کی سرمستی میں ایک مدت گزارنے کی وجہ سے یہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور اِن کا یہی زعم خدا کے پیغمبر سے اِن کی بے پروائی کا باعث بن گیا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۚ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۚ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

اِن سے کہو، میں بس وحی کے ذریعے سے تم کو متنبہ کر رہا ہوں ـــــ مگر (یہ بہرے ہیں اور) بہرے پکار کو نہیں سنا کرتے، (اے پیغمبر)، جب اُنھیں خبردار کیا جائے۔ (اِس وقت تو یہ مطالبے کر رہے ہیں اور اُدھر) واقعہ یہ ہے کہ تمھارے پروردگار کے عذاب کا کوئی جھونکا بھی اِنھیں چھو جائے تو پکار اُٹھیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! بے شک، ہم ہی ظالم تھے۔ ۴۵-۴۶

(اِنھیں بتاؤ کہ) روز قیامت کے لیے ہم انصاف کی ترازو رکھ دیں گے۔ پھر کسی جان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو

۲۲۲؎ یعنی سرزمین حرم کو۔ یہ اُن فتوحات کی طرف اشارہ ہے جو اسلام کی دعوت کو مکہ کے اطراف میں حاصل ہو رہی تھیں۔ خدا نے اِسے اپنے اقدام سے تعبیر فرمایا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر کوئی نشانی ہی دیکھنا چاہتے ہیں تو اِس نشانی کو کیوں نہیں دیکھتے جو اِن کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہو رہی ہے کہ ہماری دعوت کے آثار گردوپیش کے قبائل میں پھیلتے جا رہے ہیں، اِن کا دائرہ تنگ ہو رہا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ اِن کا یہ شہر بھی ایک دن اِس دعوت کی یلغار سے اِسی طرح مفتوح ہو جائے گا۔

۲۲۳؎ یعنی غلبۂ حق کے اِن آثار کو دیکھنے کے بعد بھی کیا اِن کا گمان ہے کہ یہی غالب رہیں

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ لا
الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾
وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ط اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

ہم اُس کو لا موجود کریں گے۔[۲۲۴] اور ہم (لوگوں کا) حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔ ۴۷

ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور خدا ترسوں کے لیے ایک روشنی اور یاد دہانی عطا فرمائی تھی،[۲۲۵] جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور قیامت کا خطرہ رکھنے والے ہیں۔[۲۲۶] ۴۸-۴۹

اُسی طرح یہ قرآن بھی ایک بابرکت یاد دہانی ہے جو ہم نے نازل فرمائی ہے، پھر کیا تم لوگ اِس کے منکر ہی بنے رہو گے؟ ۵۰

گے؟

۲۲۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ، اَتَيْنَا بِهَا'۔ اِن میں 'كَانَ' کا اسم ہمارے نزدیک بربنائے قرینہ محذوف ہے اور 'بِهَا' میں ضمیر مونث لفظ 'حَبَّة' کی مناسبت سے آ گئی ہے۔

۲۲۵؎ یعنی تورات جو حق و باطل کا فرق دکھانے والی کسوٹی تھی، جس سے فکر و عمل کی تاریکیوں میں ہدایت و معرفت کی روشنی حاصل ہوتی تھی اور جس میں اُن سب حقائق کی یاد دہانی کرائی گئی جو اِس وقت زیر بحث ہیں۔

۲۲۶؎ اِس لیے کہ انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے جو ہدایت نازل کی جاتی ہے، اُس سے وہی نفع اٹھا سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص خدا سے بے خوف ہے اور اپنے انجام کا بھی کوئی اندیشہ نہیں رکھتا تو اِس ہدایت سے اُس کو کوئی نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ نافع اُنھی کے لیے ہوتی ہے جو خدا اور آخرت کے بارے میں اپنی فطرت کے الہام کو سنتے اور سنجیدگی کے ساتھ اُس پر غور کرتے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿٥٢﴾ قَالُوْا

اِس سے پہلے ابراہیم کو بھی ہم نے (اُس کے شایان شان) اُس کے حصے کی[۲۲۷] ہدایت عطا کی تھی اور ہم اُس کو خوب جانتے تھے۔[۲۲۸] جب اُس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا: یہ کیا مورتیں ہیں جن سے تم لگے بیٹھے ہو؟[۲۲۹] اُنھوں

رہتے ہیں۔

۲۲۷۔ اصل میں لفظ 'رُشْدَهٗ' آیا ہے۔ اِس کی اضافت سے اِس کے اندر ایک خاص امتیاز کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے، یعنی ابراہیم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ ہدایت و معرفت عطا ہوئی جو اُسی کے درجے اور مرتبے کے کسی شخص کو ملنی چاہیے۔

۲۲۸۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ دیا تھا، یوں ہی نہیں دیا تھا، اُس کو خوب جانچ اور پرکھ کر اور اپنے اُس علم کے مطابق دیا تھا جو ہم اُس کے بارے میں رکھتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِس فقرے میں اُن لوگوں پر تعریض بھی ہے جو اپنے اندر ہمت تو حضرت ابراہیم کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ سنت پر عمل کرنے کی بھی نہیں رکھتے تھے، لیکن اُن کے ساتھ نسبت کے دعوے دار اور اِس نسبت کے بل پر اپنے آپ کو دنیا اور آخرت، دونوں میں بڑے سے بڑے مرتبے کا حق دار سمجھے بیٹھے تھے۔ فرمایا کہ خدا کے ہاں اِس غلط بخشی کی گنجایش نہیں ہے۔ وہ جس کو اپنی معرفت و حکمت بخشتا ہے، اُس کے ظرف اور اُس کے حوصلہ کو دیکھ کر بخشتا ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۵/۱۵۸)

۲۲۹۔ ابراہیم علیہ السلام کے عنفوان شباب کا یہ واقعہ اُسی ہدایت و معرفت کا اظہار ہے جو اُن کو عطا ہوئی تھی۔ اُن کی قوم بت پرست اور باپ بت خانے کا پروہت تھا، لیکن آگے جو کچھ بیان ہوا ہے، اُس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی سے وہ توحید کے معاملے میں کیسا شرح صدر رکھتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿٥٣﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٤﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿٥٥﴾ قَالَ
بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ
مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾

نے جواب دیا: ہم نے اپنے باپ دادا کو اِنھی کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔ اُس نے کہا: حقیقت یہ ہے کہ تم بھی اور تمھارے باپ دادا بھی ایک کھلی گم راہی میں پڑے رہے ہو[٢٣٠]۔ اُنھوں نے پوچھا: کیا ہمارے پاس سوچی سمجھی بات لے کر آئے ہو یا ہنسی مسخری کر رہے ہو[٢٣١]؟ اُس نے کہا: نہیں، بلکہ تمھارا پروردگار وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا پروردگار ہے، جس نے اُن کو پیدا کیا ہے اور میں (تمھارے سامنے) اُس پر گواہی دے رہا ہوں[٢٣٢] ــــــ (پھر اپنے دل میں کہا): خدا کی قسم، جب تم پیٹھ پھیر کر جا چکو گے تو میں تمھارے بتوں کے ساتھ ضرور ایک چال کروں گا[٢٣٣]۔

> ”...اِس فقرے میں اِن بتوں کے لیے جو استخفاف و تحقیر ہے اور لفظ 'عٰکِفُوْنَ' میں باپ اور قوم کی بلادت اور اُن کے جمود پر جو طنز ہے، وہ عربی زبان کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ اِس عمر میں اور ایسے ماحول کے اندر یہ نعرۂ حق وہی بلند کر سکتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ توفیق خاص سے نوازے اور جس کے ایمان کی سطوت و جلالت ہر خوف اور ہر طمع سے بالکل بے پروا و بے نیاز ہو۔“ (تدبر قرآن ١٥٨/٥)

[٢٣٠] مطلب یہ ہے کہ کوئی ضلالت مجرد اِس دلیل سے ہدایت نہیں بن جاتی کہ وہ باپ دادا کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ علم و عقل کا قطعی فیصلہ یہی ہے کہ جو کچھ کر رہے ہو، وہ ایک کھلی گم راہی ہے۔

[٢٣١] یہ سوال بتا رہا ہے کہ اُنھیں یقین نہیں ہوا کہ اِس طرح کی بات کوئی شخص سوچ سمجھ کر

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ (۵۸)
قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۹) قَالُوْا
سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ (۶۰)ؕ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ

چنانچہ (وہ چلے گئے تو) ابراہیم نے اُن سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اُن کے ایک بڑے کے سوا تاکہ وہ اُسی کی طرف رجوع کریں[۲۳۴]۔ ۵۱-۵۸

(اُنھوں نے آکر بتوں کی یہ حالت دیکھی تو) کہنے لگے: ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے[۲۳۵]؟ یقیناً وہ بڑا ہی ظالم ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ ہم نے ایک نوجوان کو اِنھیں کچھ برا کہتے ہوئے سنا تھا،[۲۳۶] جس کو ابراہیم پکارتے ہیں[۲۳۷]۔ اُنھوں

بھی کہہ سکتا ہے۔

۲۳۲؎ یعنی اُس کا اعلان کر رہا ہوں اور تمھیں بھی اُس کی دعوت دیتا ہوں۔ آیت میں لفظ 'شہادت' دعوت اور اعلان کے معنی میں ہے اور قرآن میں یہ لفظ اِس معنی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

۲۳۳؎ اِس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعوت بت خانے کے اندر کسی اجتماع کے موقع پر دی، اور اُسی وقت ارادہ کر لیا کہ اب وہ عملاً بھی اُنھیں دکھا دیں گے کہ یہ بت کتنے بے حقیقت ہیں۔ اِس کے لیے جو اسکیم اُنھوں نے اپنے ذہن میں تیار کر رکھی تھی، اُسی کو آیت میں لفظ 'کَید' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۳۴؎ یعنی اگر اُن سے باز پرس کی جائے تو کہہ سکیں کہ اپنے اِسی بڑے سے پوچھ لو کہ اُس نے یہ سب کیوں کیا ہے اور اُن کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے کہ اُسی کی طرف رجوع کریں یا اعتراف کر لیں کہ جن کو وہ خدا بنائے بیٹھے ہیں، وہ اتنے بے بس ہیں کہ نہ اپنے اوپر آئی ہوئی مصیبت کو دفع کر سکتے ہیں اور نہ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ مصیبت کس کے

النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ ﴿٦١﴾ قَالُوٓا ءَأَنتَ فَعَلْتَ هَٰذَا بِـَٔالِهَتِنَا
يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهُۥ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَسْـَٔلُوهُمْ إِن كَانُوا

نے کہا: تو اُس کو سب لوگوں کے سامنے حاضر کرو تا کہ وہ بھی دیکھ لیں۔[۲۳۸] (چنانچہ ابراہیم لائے گئے تو) اُنھوں نے پوچھا: ابراہیم، یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ تمھی نے کی ہے؟ ابراہیم نے جواب دیا: بلکہ اِن کے اِس بڑے نے کی ہو

ہاتھوں آئی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ طریقہ نہی عن المنکر کے لیے نہیں، بلکہ اپنے خاص طریقے پر استدلال کے لیے اختیار کیا ہے، جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

۲۳۵۔ یعنی پہلے حیرت اور پریشانی کے عالم میں یہ سوال کیا، پھر غصے میں آ کر وہ بات کہی جو اگلے جملے میں بیان ہوئی ہے کہ جس نے بھی یہ حرکت کی ہے، وہ بڑا ہی ظالم ہے۔

۲۳۶۔ اصل میں 'یَذْکُرُھُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کے بعد بھی 'بالسوء' کا لفظ اُسی طرح محذوف ہے، جس طرح آیت ۳۶ میں ہے۔ اِس کی بلاغت ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں۔

۲۳۷۔ اِس جملے کا اسلوب بتا رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ابھی اتنے روشناس نہیں ہوئے تھے کہ ایک ایک شخص اُن سے واقف ہو گیا ہو۔ اُن کی باتیں ضرور لوگوں کے کانوں میں پڑ چکی تھیں، لیکن ابھی وہ اُن کی طرف کچھ زیادہ متوجہ نہیں تھے۔ بت خانے میں اجتماع کے موقع پر اُنھوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ اگرچہ سب کے سامنے اور ڈنکے کی چوٹ کہا تھا، مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اُسے نوجوانی کی ترنگ اور جسارت پر محمول کیا اور اُس پر متنبہ ہو کر اپنے بتوں کی حفاظت کے اقدامات نہیں کیے۔ اُن کا خیال یہی رہا ہو گا کہ اِس نے ایک بات کر دی ہے۔ اِس سے آگے یہ ہمارے بتوں کے خلاف کسی اقدام کی جسارت نہیں کر سکتا۔

۲۳۸۔ مدعا یہ تھا کہ ہم اگر اُس کے خلاف کوئی فتویٰ دیں یا کارروائی کریں تو اُس پر گواہ

يَنۡطِقُوۡنَ ﴿۶۳﴾ فَرَجَعُوۡۤا اِلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ فَقَالُوۡۤا اِنَّکُمۡ اَنۡتُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾ۙ
ثُمَّ نُکِسُوۡا عَلٰی رُءُوۡسِہِمۡ ۚ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا ہٰۤؤُلَآءِ یَنۡطِقُوۡنَ ﴿۶۵﴾

گی۔ تو اِنھی سے پوچھ لو، اگر یہ بولتے ہوں[۲۳۹]۔ اِس پر اُن کو اپنے باطن کی طرف ذرا تنبہ ہوا اور اُنھوں نے ایک دوسرے سے کہا: حقیقت میں تم ہی ظالم ہو[۲۴۰]۔ لیکن پھر اوندھے ہو گئے[۲۴۱] اور بولے: تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں[۲۴۲]۔ ابراہیم نے

رہیں کہ ہم نے فی الواقع ایک مجرم کو سزا دی ہے اور اُس کی سزا عبرت کی موجب بھی ہو۔ اُس زمانے میں اِس طرح کے جرائم کی سزائیں بالعموم مذہبی پیشوا ہی سناتے تھے، بلکہ اکثر اِس کے مجاز بھی ہوتے تھے کہ خود ہی اِن کا نفاذ بھی کر دیں۔

۲۳۹۔ اِس فقرے میں نہ خوف کا کوئی شائبہ ہے، نہ اِسے جھوٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں نے اِسے خوف یا کذب پر محمول کیا ہے، اُن کے بارے میں اِس کے سوا کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست۔ اِس کو اگر تعبیر کر سکتے ہیں تو استاذ امام کے الفاظ میں، ایک لطیف طنز، ایک پر معنی استہزا اور ایک حکیمانہ استدراج سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک فقرہ ہزار تقریروں پر بھاری ہے۔ ابراہیم علیہ السلام جو کچھ کہنا چاہتے تھے، وہ اُنھوں نے بالکل ممثل کر کے دکھا دیا ہے کہ جن کو معبود سمجھتے ہو، اُن کی بے بسی دیکھ لو اور یہ بھی دیکھ لو کہ اگر کائنات میں بہت سے خدا ہوتے تو اُن کا کوئی بڑا بھی اِسی طرح چھوٹے خداؤں کی کسی بات پر بگڑ کر سب کا کچومر بنا ڈالتا۔ یہ حکیمانہ استدلال و استدراج اور شرک اور اہل شرک کی تفضیح و تضحیک کا ایسا اسلوب ہے کہ اِس کی شاید ہی کوئی دوسری مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

۲۴۰۔ مطلب یہ ہے کہ تم بتوں کے توڑنے والے کو ظالم کہہ رہے تھے، لیکن اِس نوجوان نے جس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے، اُس سے تو یہی واضح ہو رہا ہے کہ ظالم وہ نہیں، بلکہ

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ؕ ﴿۶۶﴾
اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾
قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْنَا يٰنَارُ

کہا: پھر کیا اللہ کے سوا اُن چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو تمھیں نہ کوئی نفع پہنچا سکیں نہ نقصان؟ تف ہے تم پر اور اُن پر بھی جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو؟[۲۴۳] ۵۹-۶۷

(اِس پر) وہ بولے کہ اگر کچھ کرنے کا ارادہ ہے تو اِس کو آگ میں جلا دو اور

ظالم تم خود ہو جو اِن گونگے اور بہرے پتھروں کو معبود بنائے بیٹھے ہو۔

۲۴۱ یعنی ذرا دیر کے لیے اُنھوں نے آنکھیں کھولیں، لیکن اِس کے بعد فوراً ہی عصبیت کے جذبات ابھر آئے اور اُن پر جہالت سوار ہو گئی، جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی کی عقل اوندھ جاتی ہے۔

۲۴۲ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم اپنے حریفوں کو لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے لا کھڑا کیا اور وہ اعتراف شکست کے لیے مجبور ہو گئے۔

۲۴۳ ابراہیم علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا، اِسی حقیقت کی تبلیغ کے لیے کیا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یہ تقریر، ظاہر ہے کہ بتوں کی بے بسی کو اِس طرح آشکارا کر دینے کے بعد جتنی موثر ہو سکتی تھی، اُس کے بغیر اتنی موثر نہیں ہو سکتی تھی۔ اِس کے بغیر اگر یہی بات اُن کے سامنے لائی جاتی تو وہ اِس کے جواب میں سو باتیں بنا سکتے تھے، لیکن اب جب کہ وہ پاش پاش ہو کر سامنے پڑے ہوئے اپنی زبان حال سے اپنی بے حقیقتی اور بے بسی کی کہانی خود ہی سنا رہے تھے تو اُن کے پجاری اُن کی حمایت میں کیا چیز پیش کر سکتے تھے؟“ (تدبر قرآن ۵/ ۱۶۴)

كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۙ (۶۹) وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ
الْاَخْسَرِيْنَ ۚ (۷۰)
وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ (۷۱)
وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ (۷۲)

اپنے معبودوں کی مدد کرو۔[۲۴۴] (چنانچہ ابراہیم کو آگ میں جھونک دیا گیا، تب) ہم نے حکم دیا کہ اے آگ، تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا۔[۲۴۵] اُنھوں نے چاہا تھا کہ (ابراہیم سے نجات کے لیے) اُس کے ساتھ ایک چال چلیں،[۲۴۶] مگر ہم نے اُن کو بری طرح ناکام بنا دیا۔ ۶۸-۷۰

اور اُس کو اور (اُس کے بھتیجے) لوط کو بچا کر ہم اُس سرزمین کی طرف نکال لے گئے، جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی تھیں۔[۲۴۷] اور (اُس کی قربانیوں کے صلے میں) ہم نے اُس کو اسحٰق عطا فرمایا[۲۴۸] اور اُس پر مزید یعقوب بھی، اور ہم نے

---

[۲۴۴] مطلب یہ ہے کہ اگر اِس وقت اِس فتنے کا سد باب نہ کیا گیا تو آبا و اجداد کا دین تباہ ہو کر رہ جائے گا، اِس لیے ابھی اٹھو اور اپنے معبودوں کی حمایت میں اِس نوجوان کا خاتمہ کر دو۔ اِس سے کم کوئی دوسری تجویز موثر نہ ہو گی۔ اِس وقت یہی ایک طریقہ ہے، جس سے ہم دین کو بچا سکتے ہیں۔

[۲۴۵] اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اُس کے رسول اپنے دشمنوں سے کبھی مغلوب نہیں ہوتے۔ یہ اُسی وعدے کا ظہور تھا، جس کے تحت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کو گلزار بنا دیا گیا۔

[۲۴۶] یہ کیا چال تھی؟ سورۂ صافات (۳۷) کی آیت ۹۸ کے تحت ہم اِن شاء اللہ اِس کی وضاحت کریں گے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ
الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ۙ
وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ
تَّعْمَلُ الْخَبٰٓىِٕثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ

ہر ایک کو صالح بنایا۔ اور ہم نے اُن کو امامت عطا فرمائی[۲۴۹] کہ ہماری ہدایت کے مطابق (دنیا والوں کی) رہنمائی کرتے تھے اور اُن کو نیک کام کرنے اور نماز کا اہتمام رکھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھیجا اور وہ ہماری بندگی کرنے والے تھے۔ ۷۱-۷۳

ہم نے لوط کو بھی حکم اور علم عطا فرمایا تھا[۲۵۰] اور اِسی طرح اُس کو بھی اُس بستی سے نجات دی تھی جہاں کے لوگ بدکاریاں کرتے تھے[۲۵۱]۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے ہی برے، نا ہنجار لوگ تھے۔ اور (دنیا اور آخرت، دونوں کے اندر) اُس کو ہم نے خاص

---

[۲۴۷] یہ ارض کنعان کی طرف اشارہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کم و بیش دو ہزار سال تک اپنی دعوت کے لیے خاص کیے رکھا۔ اِس کی برکتوں سے مراد وہی دعوت و ہدایت ہے جو اِس سرزمین سے دنیا والوں کے لیے عام کی گئی۔

[۲۴۸] قرآن میں اشارہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق اُن کے بڑے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے صلے میں ملے تھے۔

[۲۴۹] یعنی بنی اسرائیل کی امامت جو ان انبیا علیہم السلام کی قیادت میں دنیا والوں پر دین حق کی شہادت کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔

[۲۵۰] یعنی صحیح قوت فیصلہ اور علم نبوت۔ پہلی چیز عقل و فطرت کی پاکیزگی اور دوسری وحی الٰہی کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔

[۲۵۱] یہ امرد پرستی اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خبائث و فواحش کی طرف اشارہ

فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ۚ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾

اپنی رحمت میں داخل کیا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ صالح لوگوں میں سے تھا۔ ۷۴-۷۵

یہی معاملہ ہم نے نوح کے ساتھ کیا تھا[۲۵۲]۔ یاد کرو، اِن سب لوگوں سے پہلے جب اُس نے پکارا[۲۵۳] تو ہم نے اُس کی دعا قبول کی اور اُسے اور اُس کے لوگوں[۲۵۴] کو بڑی مصیبت سے نجات بخشی اور اُس کی مدد میں اُن لوگوں سے انتقام لیا[۲۵۵] جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا تھا۔ یقیناً وہ بڑے ہی برے لوگ تھے، سو ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا[۲۵۶]۔ ۷۶-۷۷

ہے، جس میں قوم لوط مبتلا تھی۔

[۲۵۲] آیت میں لفظ 'نُوح' منصوب ہے۔ اِس کا نصب اُس مفہوم سے پیدا ہوا ہے جو سلسلۂ کلام سے مستفاد ہو رہا ہے۔

[۲۵۳] یہ اُس دعا کی طرف اشارہ ہے جو حضرت نوح نے ایک مدت دراز تک اپنی قوم کو دعوت دینے کے بعد بالآخر تھک کر مانگی تھی۔ سورۂ نوح (۷۱) میں یہ دعا تفصیل کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

[۲۵۴] اصل میں لفظ 'اَهل' استعمال ہوا ہے۔ یہ کسی شخص کے اہل خانہ اور اتباع واحباب، سب کے لیے آجاتا ہے۔ یہاں بھی اِسی مفہوم میں ہے۔

[۲۵۵] اصل الفاظ ہیں: 'وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا'۔ اِن میں 'نَصَرْنَا'

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۙ﴿٧٨﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ

اور داؤد و سلیمان کو بھی ہم نے اپنی نعمت سے سرفراز فرمایا۔[٢٥٧] یاد کرو، جب وہ کھیتی کے مقدمے کا فیصلہ کر رہے تھے، جب اُس میں رات کے وقت کچھ لوگوں کی بکریاں جا پڑی تھیں[٢٥٨] اور اُن کا یہ فیصلہ ہم خود دیکھ رہے تھے۔[٢٥٩] سو ہم نے سلیمان کو وہ

کے بعد 'مِنْ' اِس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'اِنتقمنا' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[٢٥٦] یعنی کم و بیش ساڑھے نو سو برس کی دعوت اور اتمام حجت کے بعد بھی جب ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے تو بالآخر غلاظت کے اِس ڈھیر سے اپنی زمین کو دھو کر پاک کر دیا۔

[٢٥٧] آیت میں 'دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ' کا نصب بھی اُسی طرح ہے، جس طرح اوپر 'نُوْحًا' کا نصب بیان ہوا ہے۔

[٢٥٨] اِس مقدمے کی اللہ تعالیٰ نے اِس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں فرمائی ہے کہ کسی کی بکریوں کا ریوڑ کسی کے کھیت میں جا پڑا تھا اور وہ نقصان کی تلافی کے لیے اپنا مقدمہ لے کر داؤد علیہ السلام کی عدالت میں آیا تھا، اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا مقصد یہاں مقدمے کی روداد پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ حضرت داؤد ایک حکمران اور پیغمبر ہونے کے باوجود اپنے فیصلوں میں کس قدر محتاط تھے اور کس طرح ہر وقت تیار رہتے تھے کہ اپنے سے فروتر کوئی شخص بھی اگر غلطی پر متنبہ کرے تو اُسے بغیر کسی تردد کے تسلیم کر لیں۔

[٢٥٩] اِس لیے کہ پیغمبر کی حکومت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکومت ہوتی ہے۔ اُس کے تمام فیصلے براہ راست اُس کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی جگہ اگر غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فوراً اُس کی اصلاح کر دیتا ہے۔

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ

قضیہ سمجھا دیا اور ہم نے دونوں کو حکم اور علم عطا فرمایا تھا۔[۲۶۰] اور پہاڑوں اور پرندوں کو ہم نے داؤد کا ہم نوا کر دیا تھا،[۲۶۱] وہ (اُس کے ساتھ) خدا کی تسبیح کرتے تھے،[۲۶۲]

۲۶۰ یعنی اگرچہ دونوں کو صحیح قوت فیصلہ اور علم نبوت عطا ہوا تھا، لیکن حضرت داؤد اِس قضیے میں معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکے۔ چنانچہ بیٹے نے رائے دی جو زیادہ صائب اور قرین عدل تھی اور اُنھوں نے اُسی کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ اُس کو محض اِس لیے رد نہیں کر دیا کہ اِس سے اُن کے اجتہاد کا ضعف نمایاں ہوتا تھا۔

۲۶۱ آیت میں فعل 'یُسَبِّحْنَ' کو 'طَیْر' پر مقدم کر دیا ہے، دراں حالیکہ یہ 'جِبَال' اور 'طَیْر'، دونوں سے متعلق ہے اور بظاہر اِس کو بعد میں آنا چاہیے تھا، اِس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ پرندوں کے نغمے تو ہم سب سنتے ہیں، لیکن پہاڑوں کی نواسنجی ایک نادر بات تھی، چنانچہ ضروری تھا کہ اُسے نمایاں کیا جائے۔

۲۶۲ مطلب یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام جس طرح عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کرتے تھے، اُسی طرح دعا ومناجات کے لیے بھی کمال انابت کے ساتھ نغمہ سنج ہوتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...تورات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت داؤد نہایت خوش الحان تھے اور اِس خوش الحانی کے ساتھ ساتھ اُن کے اندر سوز و درد بھی تھا۔ مزید براں یہ کہ اُن کی تمام مناجاتیں گیتوں اور نغموں کی شکل میں ہیں اور یہ گیت الہامی ہیں۔ اِن گیتوں کا حال یہ ہے کہ زبور پڑھیے تو اگرچہ ترجمے میں اِن کی شعری روح نکل چکی ہے، لیکن آج بھی اِن کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل سینے سے نکل پڑے گا۔ حضرت داؤد جیسا خوش الحان اور صاحب سوز و درد جب اِن الہامی گیتوں کو پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر، سحر کے سہانے وقت میں، پڑھتا رہا ہوگا تو یقیناً پہاڑوں سے بھی اُن کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی ہوگی اور پرندے بھی اُن کی ہم نوائی

وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿٧٩﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿٨٠﴾

اور (اُن کے لیے یہ) ہم ہی کرنے والے تھے۔[۲۶۳] اور ہم نے اُس کو تمھارے لیے ایک جنگی لباس کی صنعت سکھائی تھی تاکہ وہ تمھاری جنگوں میں تمھیں بچائے رکھے۔[۲۶۴] (وہ اِن سب نعمتوں کو پا کر اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتا تھا)۔ پھر کیا تم بھی (اِس طرح) شکرگزار بنتے ہو؟[۲۶۵] ۷۹-۸۰

کرتے رہے ہوں گے۔ یہ نہ خیال فرمائیے کہ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اِس کائنات کی ہر چیز، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اپنے رب کی تسبیح کرتی ہے، لیکن ہم اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اُن کا یہ شوق تسبیح اُس وقت اور بھڑک اٹھتا ہے، جب کوئی صاحب درد کوئی ایسا نغمہ چھیڑ دیتا ہے جو اُن کے دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُس وقت وہ بھی جھوم اٹھتے ہیں اور اُس کی لے میں اپنی لے ملاتے ہیں۔" (تدبر قرآن ۵/ ۱۷۳)

[۲۶۳] یعنی اِس میں اُن کا کوئی ذاتی کمال نہیں تھا، بلکہ یہ سب نعمتیں ہم ہی نے اُن کو عطا فرمائی تھیں۔

[۲۶۴] مطلب یہ ہے کہ اُن کے دور میں سائنسی علوم میں بھی ایسی ترقی ہوئی کہ اعلیٰ درجے کی زرہیں بنائی گئیں جنھوں نے داؤد علیہ السلام کی فوج کو ناقابل تسخیر بنا دیا اور اِس کے نتیجے میں وہ دنیا کی سب سے بڑی سیاسی قوت بن گئے۔ آیت میں لفظ 'عَلَّمْنٰهُ' آیا ہے۔ اِس میں ضمیر کا مرجع داؤد علیہ السلام ہیں، لیکن اِس سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اُسی طرح کی نسبت ہے، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ تاج محل شاہ جہان نے بنایا تھا۔

[۲۶۵] اوپر تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے: ایک حق پرستی، دوسرے بندگی و انابت میں ایسا انہماک کہ پہاڑ اور پرندے بھی دعا و مناجات میں ہم نوا بن جائیں، تیسرے عظیم سیاسی قوت۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ
بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ (٨١) وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ

اور سلیمان کے لیے ہم نے تیز ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا[٢٦٦] جو اُس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھیں، جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں[٢٦٧] اور ہم ہر چیز کے جاننے

اِس کے بعد وہ کون سی چیز ہے، جس کی انسان دنیا میں تمنا کر سکتا ہے؟ قرآن نے اپنے مخاطبین کو توجہ دلائی ہے کہ تم اپنی رفاہیت پر اکڑ رہے ہو۔ اِدھر ذرا خدا کے اِس بندے کو دیکھو کہ یہ سب نعمتیں پا کر بھی نہ اُس میں دین داری کا غرور پیدا ہوا اور نہ مال و دولت اور دنیوی اقتدار کی نخوت۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتا رہا، اُس کے مقابل میں کبھی سرکش نہیں ہوا۔ پھر کیا تم بھی سرکشی چھوڑ کر اِسی طرح خدا کے شکر گزار بنتے ہو؟

٢٦٦ یعنی خدمت میں لگا دیا تھا۔ آیت میں 'سُلَیْمٰنَ' کا 'ل' اِس بات کا قرینہ ہے کہ فعل 'سخرنا' یہاں محذوف ہے۔

٢٦٧ یہ اُن علاقوں کے لیے الہامی صحائف کی خاص تعبیر ہے جو بنی اسرائیل کے لیے خاص کیے گئے تھے اور اُن کے لیے دینی اور دنیوی، ہر قسم کی برکتیں اُن میں رکھ دی گئی تھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کی بری قوت تو بہت تھی، لیکن اُن کی حکومت میں بحری قوت میں بے مثال ترقی حضرت سلیمان کے عہد میں ہوئی۔ اُنھوں نے ایسے بادبانی جہاز ایجاد کیے جو ہندوستان اور مغربی جزائر تک سفر کرتے تھے۔ اُن کا بحری بیڑا وقت کا سب سے زیادہ طاقت ور بیڑا تھا۔ بحر احمر میں اُس کا مرکز ترسیس تھا جو خلیج عقبہ میں واقع تھا اور بحر متوسط میں صور، طائر اور یافہ کی بندرگاہیں۔ اُس زمانے تک سمندری ہواؤں کو کنٹرول کرنے کا ذریعہ بادبان ہی تھے۔ یہی بادبان جہازوں کے لیے انجن کا کام دیتے تھے۔ حضرت سلیمان نے ایسے بادبان ایجاد کیے جو تند ہواؤں میں بھی جہاز کی آمد و رفت

يَغُوصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِينَ ﴿٨٢﴾ وَاَيُّوبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٨٣﴾

والے تھے۔[۲۶۸] اور شیاطین[۲۶۹] میں سے بھی ہم نے اُس کے تابع کیے تھے جو اُس کے لیے (سمندروں میں) غوطے لگاتے تھے اور اُس کے سوا دوسرے کام بھی کرتے تھے، اور ہم ہی اُن کو تھامے ہوئے تھے۔[۲۷۰] ۸۱-۸۲

اور ہم نے ایوب پر بھی عنایت فرمائی تھی،[۲۷۱] جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ میں آزار میں مبتلا ہوں اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے

میں خلل واقع نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ اپنی معینہ سمتوں میں، موافق و ناموافق ہر قسم کی ہوا میں، اپنے لمبے لمبے سفر بے خوف و خطر جاری رکھتے۔ یہ چیز چونکہ خدا کی سکھائی ہوئی سائنس کا ثمرہ تھی، اِس وجہ سے فرمایا کہ ہم نے سلیمان کے لیے تند ہوائیں مسخر کر دی تھیں جو اُس کے حکم سے چلتی تھیں۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۱۷۵)

۲۶۸؎ یعنی اِس چیز کے بھی جاننے والے تھے کہ جس شخص کو ہواؤں پر یہ تصرف بخشا گیا، وہ فی الواقع اِس فضل و عنایت کا اہل ہے اور اِس کے بھی کہ وہ ہماری بخشی ہوئی قوتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔

۲۶۹؎ یعنی شیاطین جن۔ دوسری جگہ قرآن نے اِس کی وضاحت کر دی ہے۔

۲۷۰؎ مطلب یہ ہے کہ وہ علم بھی ہمارا عطا کردہ تھا، جس سے اُنھیں مسخر کیا گیا تھا اور اُس کے بعد بھی اُن کے اصلی نگران ہم ہی تھے۔ اُن میں سے کسی کے لیے ممکن نہ تھا کہ بھاگ سکے یا حضرت سلیمان کے منشا کے خلاف کوئی کام کرے۔

۲۷۱؎ یعنی اُس کو بھی علم و حکمت سے اُسی طرح نوازا تھا، جس طرح اوپر جن پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے، اُن کو نوازا تھا۔ قرآن میں ایوب علیہ السلام کا ذکر جس طریقے سے ہوا ہے، اُس

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ

والا ہے۔[۲۷۲] (اُس نے پکارا) تو ہم نے اُس کی فریاد سن لی اور جس تکلیف میں وہ مبتلا تھا، اُس کو دور کر دیا اور اُس کے اہل و عیال بھی اُس کو دیے، بلکہ اُن کے

سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اسرائیلی پیغمبر تھے جو غالباً نویں صدی قبل مسیح میں کسی وقت ہوئے ہیں۔ بائیبل کا بیان ہے کہ یہ ابتدا میں بہت دولت مند تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...خدا نے اُنھیں بڑا خاندان اور بڑی دولت دے رکھی تھی۔ اُن کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بیل اور پانچ سو بار برداری کے گدھے اُن کے پاس تھے۔ اُن کے نوکر چاکر بھی بے شمار تھے۔ اہل مشرق میں اِس درجے کا مال دار کوئی اور نہ تھا۔ لیکن یہ تمام خدم و حشم رکھنے کے باوجود وہ خدا کے نہایت شکر گزار اور فرماں بردار بندے تھے۔ کبھی کسی برائی سے وہ آلودہ نہ ہوئے۔“ (تدبر قرآن ۵/۱۷۷)

[۲۷۲] اِس دعا کا پس منظر سفر ایوب میں یہ بیان ہوا ہے کہ اِس قدر دولت مندی کے باوجود ایوب علیہ السلام کی نیکی، تقویٰ اور خدا پرستی پر شیطان اور اُس کے ایجنٹوں کو حسد ہوا اور اُنھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ تمام نیکی، تقویٰ اور خدا پرستی اِس لیے ہے کہ خدا نے اِسے اتنا کچھ دے رکھا ہے۔ یہ سب نعمتیں اگر اِس سے چھین لی جائیں تو پھر دیکھیے گا، یہ بھی خدا کا شکر گزار نہ ہوگا۔ اِس کے بعد خدا کی آزمایشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے مال و دولت اور خاندان کا صفایا ہوا، لیکن خدا سے مایوس ہونے کے بجائے ایوب علیہ السلام اُسی کے دروازے پر گر پڑے۔ سفر ایوب میں ہے:

> ”تب ایوب نے اٹھ کر اپنا پیراہن چاک کیا اور سر منڈایا اور زمین پر گر کر سجدہ کیا اور کہا: ننگا میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو۔“ (۱:۲۲)

اِس کے بعد وہ آزار شروع ہوا، جس کا ذکر دعا میں کیا گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی

مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

ساتھ اتنے ہی اور بھی[۲۷۳]، اپنی خاص رحمت سے اور اِس لیے کہ یہ ایک یاددہانی ہو خدا کی بندگی کرنے والوں کے لیے۔ ۸۳-۸۴

کہ سفر ایوب کے مطابق ایوب علیہ السلام کے تلوے سے لے کر سر کی چاندی تک سارے جسم میں جلتے ہوئے پھوڑے نکل آئے اور وہ ایک ٹھیکرا لے کر اپنا جسم کھجاتے اور راکھ پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایوب علیہ السلام نے یہ دعا اِسی موقع پر کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس دعا کی اِس بلاغت کو ملحوظ رکھیے کہ حضرت ایوب نے اپنے دکھ اور درد کا حوالہ تو دیا، لیکن حرف مدعا کو زبان پر نہیں لائے، اُس کو خدا کی رحمت پر چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ میں دکھی ہوں اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا دکھ تیرے آگے پیش کرتا ہوں اور معاملہ تیری رحمت کے حوالہ کرتا ہوں۔ تو جو کچھ کرے گا، اپنی شان رحیمی کے مطابق کرے گا اور اُسی میں میرے لیے برکت و رحمت ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جس کو مقام رضا کہتے ہیں۔ جو اِس مقام کو حاصل کر لیتا ہے، اُسی کو آخرت میں ’رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً‘ کا درجہ حاصل ہوگا۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۱۷۸)

[۲۷۳] یعنی جب صبر و رضا کے اِس امتحان میں وہ کامیاب ہو گئے تو خدا نے وہ بھی دیا جو اُنھوں نے مانگا تھا اور وہ بھی جس کا وہ اپنی تواضع کے سبب سے اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھ رہے تھے:

> ”...خداوند نے ایوب کو، جتنا اُس کے پاس پہلے تھا، اُس کا دو چند دیا۔ تب اُس کے سب بھائی اور سب بہنیں اور اُس کے سب اگلے جان پہچان اُس کے پاس آئے اور اُس کے گھر میں اُس کے ساتھ کھانا کھایا... یوں خداوند نے ایوب کے آخری ایام میں ابتدا کی نسبت زیادہ برکت بخشی اور اُس کے پاس چودہ ہزار بھیڑ بکریاں اور چھ ہزار اونٹ اور ہزار جوڑی بیل اور ہزار گدھیاں ہو گئیں۔ اُس کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں بھی ہوئیں... اور اِس کے

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ ۚۖ
وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾
وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ

اور یہی عنایت اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل پر بھی ہوئی۔ یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔[۲۷۴] اِن کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ (ہمارے) نیک بندوں میں سے تھے۔ ۸۵-۸۶

اور مچھلی والے (یونس) پر بھی[۲۷۵]، جب وہ (اپنی قوم سے) برہم ہو کر چلا گیا[۲۷۶] اور

بعد ایوب ایک سو چالیس برس جیتا رہا اور اپنے بیٹے اور پوتے چوتھی پشت تک دیکھے۔“

(سفر ایوب ۴۲: ۱۰-۱۶)

[۲۷۴] یعنی اِن کو بھی اِسی طرح صبر و رضا کے امتحان سے گزارا اور یہ بھی ہر لحاظ سے ثابت قدم رہے۔ حضرت اسمٰعیل کا امتحان تو معلوم و معروف ہے، لیکن حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل کی سرگذشت حیات بالکل پردۂ خفا میں ہے۔ اُن کے بارے میں ہم اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا قرآن نے یہاں اور دوسرے مقامات میں بیان کر دیا ہے۔

[۲۷۵] پرانے صحیفوں میں اِن کا نام یوناہ آیا ہے۔ یہ عراق کے ایک قدیم شہر نینویٰ کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے، جس کی آبادی اُس وقت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ اِن کو چونکہ مچھلی نے نگل لیا تھا، اِس لیے قرآن میں اِن کا ذکر ایک قسم کے پیار کے ساتھ اور اِس واقعے کی تلمیح کے لیے مچھلی والے کے لقب سے ہوا ہے۔

[۲۷۶] رسولوں کے بارے میں خدا کی سنت ہے کہ اتمام حجت کے بعد اگر اُن کے مخاطبین بدستور رسول کے منکر بنے رہیں تو رسول کو حکم دیا جاتا ہے کہ اُن لوگوں کو چھوڑ کر وہ اُن کی بستی سے نکل جائے۔ اِس کے بعد لوگوں پر عذاب آ جاتا ہے۔ یونس علیہ السلام نے خیال کیا کہ

فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ

اُس نے خیال کیا کہ ہم اُس پر کوئی گرفت نہ کریں گے۔[۲۷۷] لیکن پھر اندھیروں میں[۲۷۸] پکار اٹھا کہ (پروردگار)، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی

اپنی قوم کو سمجھانے کے لیے جو کچھ میں کر سکتا تھا، کر چکا ہوں۔ یہ نہایت سنگ دل لوگ ہیں اور حق کی ناقدری کا فیصلہ کیے بیٹھے ہیں، اِس لیے اب اِن سے ہجرت کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ خدا کی طرف سے اُس کا حکم ملے بغیر وہ اُن سے مایوس اور آزردہ ہو کر اُنھیں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ اِسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

۲۷۷ یعنی اُنھوں نے خیال کیا کہ میں چونکہ یہ اقدام اپنی طرف سے دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر دینے کے بعد اور بالکل صحیح وقت پر کر رہا ہوں، اِس لیے اِس پر کسی گرفت کا اندیشہ نہیں ہے، لیکن اُن کا یہ خیال صحیح نہیں تھا، اِس لیے کہ قوم پر اتمام حجت ہوا ہے یا نہیں، اِس کا فیصلہ کوئی شخص اپنی راے اور اجتہاد سے نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اِس پر گرفت ہوئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''حضرت یونس کا یہ خیال بجاے خود ایک پاکیزہ جذبے پر مبنی تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو آزمایشیں مقرر کر رکھی ہیں، وہ لازماً پوری ہو کے رہتی ہیں۔ وہ قوم سے بے زار ہو کر، ایک کشتی میں، جو سفر پر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی، سوار ہو گئے۔ کشتی کچھ منزل طے کرنے کے بعد طوفان میں گھر گئی۔ جب طوفان کسی طرح ٹلتا نظر نہیں آیا تو ملاحوں نے اُس زمانے کے عام وہم کے مطابق یہ خیال کیا کہ ہو نہ ہو اِس کشتی میں اپنے آقا سے بھاگا ہوا کوئی غلام سوار ہو گیا ہے، جب تک اُسے پکڑ کر سمندر کے حوالے نہ کیا جائے گا، اِس طوفان سے نجات نہیں مل سکتی۔ بالآخر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کشتی میں مفرور غلام کون ہے، قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ ڈالنے کی خدمت، جیسا کہ سورۂ صافات میں اشارہ ہے، حضرت یونس ہی کے سپرد ہوئی۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہو گی کہ تمام اہل کشتی میں لوگوں کو سب سے زیادہ

الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ

قصوروار ہوں۔[۲۷۹] تب اُس کی دعا ہم نے قبول کر لی اور اُس کو غم سے نجات دی۔[۲۸۰]

ثقہ آدمی وہی نظر آئے ہوں گے۔ بہرحال قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ حضرت یونس کے نام کا نکلا جس کے نتیجے میں وہ کشتی سے سمندر میں لڑھکا دیے گئے۔ سمندر میں اُن کو کسی بڑی مچھلی، غالباً وہیل نے نگل لیا۔*" (تدبر قرآن ۵/۱۸۱)

۲۷۸۔ یعنی مچھلی کے پیٹ اور پاتال کی گہرائیوں کے اندھیروں میں، جہاں سے صرف زمین و آسمان کا پروردگار ہی کسی فریاد کرنے والے کی فریاد سن سکتا تھا۔ اِس میں جمع اندھیرے کی شدت اور اُس کے اطراف کی وسعت اور اُس کے ناپیدا کنار ہونے کو ظاہر کر رہی ہے۔

۲۷۹۔ اِس دعا کا ذکر صحیفۂ یونس میں بھی ہوا ہے اور اِسی مضمون کی ایک مفصل دعا نقل کی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... اِس دعا میں اُن کی طرف سے طلب و تمنا کسی چیز کی بھی نہیں ہے۔ صرف اپنی تقصیر کا اعتراف و اظہار ہے۔ اعتراف تقصیر کے بعد اُنھوں نے اپنے معاملے کو اپنے رب پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو فیصلہ فرمائے، وہی حق ہے اور اُسی میں حکمت و رحمت ہے، اِس لیے کہ وہ ہر عیب سے پاک ہے۔ سب سے پہلے خدا ہی کے معبود اور ملجا و ماویٰ ہونے کا اظہار کیا ہے، اِس کے بعد اُس کو ہر نقص و عیب سے پاک اور منزہ قرار دیا ہے، پھر اپنی تقصیر کا اعتراف فرمایا ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا، سرتاسر میری اپنی ہی غلطی کا نتیجہ ہے۔ میں نے خود ہی اپنی جان پر ظلم ڈھایا، میرے رب نے مجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا۔" (تدبر قرآن ۵/۱۸۳)

۲۸۰۔ یعنی اُس غم سے بھی نجات دی جو اُنھیں اپنی قوم کی طرف سے پیش آیا اور اُس غم سے بھی جس سے وہ اپنی قوم کو چھوڑنے کے بعد خدا کی گرفت کے باعث دوچار ہوئے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور مچھلی نے اُن کو ساحل کی ریت پر اگل دیا۔ وہاں

---

* یہ تمام تفصیل صحیفۂ یونس اور قرآن کی تصریحات و اشارات پر مبنی ہے۔

نُنۡجِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۸﴾

ایمان والوں کو ہم اِسی طرح نجات دیتے ہیں۔[۲۸۱] ۸۷-۸۸

اللہ تعالیٰ نے اُن کے نڈھال جسم کو گرمی اور دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے کدو یا اِسی قسم کی کوئی بیل اگا رکھی تھی، جس کے نیچے اُن کو پناہ ملی۔ جب اِس حادثے سے اوسان بجا ہوئے اور جسم میں کچھ جان آئی تو اُن کو پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت ہوئی۔ صحیفۂ یونس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دوبارہ انذار کے لیے قدرت نے ایک موثر تقریب بھی پیدا کر دی۔ وہ یوں کہ وہ بیل جس کے سایے نے حضرت یونس کو امان دی تھی، کسی سبب سے دفعتاً سوکھ گئی۔ احسان شناس لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے احسان کی بھی قدر کرتے ہیں۔ حضرت یونس کو اِس یادگار بیل کے یوں خشک ہو جانے کا احساس ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس پر اُن کو توجہ دلائی کہ ایک حقیر بیل، جس کے لگانے اور پروان چڑھانے پر تم نے کوئی محنت نہیں کی، سوکھ جانے پر تم یوں ملول ہوئے تو غور کرو کہ میں اُس عظیم نینوا کو کس طرح اپنے عذاب کے حوالے کر سکتا ہوں، جس کو میں نے پیدا کیا، جس کی پرورش کی اور جس کو پروان چڑھایا ہے؟ جاؤ، اُن کو پھر دعوت دو، شاید وہ نیکی کی راہ اختیار کریں اور میری رحمت کے مستحق ٹھہریں۔ اِس ہدایت کے مطابق حضرت یونس پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے گئے اور اُن کی اِس دوبارہ دعوت و تذکیر کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ سے لے کر نینوا کے عام باشندے تک سب کانپ اٹھے، سب خدا پر ایمان لائے، بادشاہ نے شاہی لباس اتار کر ٹاٹ کا پیرہن پہن لیا اور باشندوں کے نام فرمان جاری کیا کہ ہر کوئی اپنی بری راہ سے باز آ جائے، روزہ رکھے، خدا کے حضور زاری کرے اور توبہ و انابت کا سر جھکائے۔*" (تدبر قرآن ۵/۱۸۱)

[۲۸۱] اِس فقرے سے تمام سرگزشت مطابق حال ہو گئی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو بھی اطمینان دلا دیا گیا ہے کہ اِس وقت جن تاریکیوں میں آپ لوگ گھرے ہوئے ہیں، وہ بھی ایک دن اِسی طرح کافور ہو جائیں گی۔

---

* یہ تمام تفصیل صحیفۂ یونس اور قرآن کی تصریحات و اشارات پر مبنی ہے۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ
خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ﴿۸۹﴾ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی وَاَصْلَحْنَا
لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا
وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ ﴿۹۰﴾

اور زکریا پر بھی، جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ میرے پروردگار، مجھے اکیلا نہ چھوڑ[۲۸۲] اور تو سب وارثوں سے بہتر وارث ہے[۲۸۳]۔ پھر اُس کی یہ دعا ہم نے قبول کی[۲۸۴] اور اُسے یحییٰ عطا فرمایا اور اُس کی بیوی کو اُس کے لیے بھلا چنگا کر دیا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں سبقت کرتے تھے اور امید و بیم کی ہر حالت میں ہم کو پکارتے اور ہمارے آگے سرافگندہ رہنے والے تھے[۲۸۵]۔ ۸۹-۹۰

۲۸۲؎ یعنی اکیلا نہ چھوڑ، بلکہ کوئی ایسا وارث عطا فرما جو میری اور یعقوب کے خاندان کی دینی روایات کا حامل ہو۔ سورۂ مریم (۱۹) کی آیات ۵-۶ میں وضاحت ہے کہ حضرت زکریا کی بیوی بانجھ تھیں اور اُنھوں نے یہ دعا اُس وقت کی جب وہ خود بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں یہ سرگذشت تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔

۲۸۳؎ یہ جملہ دعا کے ایک خاص پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ میں یہ دعا جو کر رہا ہوں، صرف اِس لیے کر رہا ہوں کہ تیرے دین کی خدمت کی جو سعادت اِس خاندان کو تیرے فضل سے حاصل رہی ہے، اُس سے یہ خاندان محروم نہ رہ جائے، ورنہ میں جانتا ہوں کہ تو جس کو چاہے گا، اِس خدمت کے لیے اٹھا کھڑا کرے گا، تو کسی کا محتاج نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/۱۸۴)

۲۸۴؎ یہ دعا ایک اعلیٰ دینی مقصد کے لیے تھی، اِس لیے درخور قبول ٹھیری۔

۲۸۵؎ یعنی خدا کے خالص بندے تھے۔ اُن کا کردار منافقانہ یا مشرکانہ نہیں تھا۔ یہ زکریا

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩١﴾

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾

اور اُس خاتون پر بھی[۲۸۶] جس نے اپنا دامن پاک رکھا[۲۸۷] تو ہم نے اُس کے اندر اپنی روح پھونک دی[۲۸۸] اور اُس کو اور اُس کے بیٹے (عیسیٰ) کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔ ۹۱

(چنانچہ) یہ حقیقت ہے کہ یہ تمھاری امت ہے، ایک ہی امت[۲۸۹] اور میں ہی تمھارا

علیہ السلام کے خاص اہل بیت اور اُن سے وابستہ لوگوں کا ذکر ہے۔ اُن کے بنی اعمام اِس کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ اُن کی حالت جیسی کچھ تھی، وہ سورۂ مریم (۱۹) میں بیان ہو چکی ہے۔

[۲۸۶] سیدہ مریم مراد ہیں۔ آگے جو صفت بیان ہوئی ہے، وہ اُن کے ساتھ ایسی خاص ہو چکی ہے کہ اُن کا نام لیے بغیر ہی قرآن کا ہر قاری سمجھ لیتا ہے کہ اُس کا مصداق کیا ہے۔

[۲۸۷] اصل الفاظ ہیں: 'اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا'۔ اِس میں لفظ 'فَرْج' اندیشے کی جگہ کے معنی میں آیا ہے اور یہ عربی زبان میں اُسی طرح کا ایک محاورہ ہے، جس طرح 'سد الثلمة'، 'رتق الفتق' اور 'جبر الكسر' وغیرہ کے محاورات آتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے وجود کے اُن تمام حصوں پر پہرا لگائے رکھا، جہاں سے کوئی بدی راہ پا سکتی تھی۔ آگے اِسی کا صلہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا اور اُن کے لیے اپنی وہ شان ظاہر فرمائی جو استاذ امام کے الفاظ میں، اِس آسمان کے نیچے کسی کے لیے بھی ظاہر نہیں فرمائی۔

[۲۸۸] یعنی اُس کے ہاں بیٹے کی پیدایش کے لیے عام قانون سے ہٹ کر اپنا حکم اُسی طرح

وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾

پروردگار ہوں، اِس لیے میری ہی بندگی کرو[٢٩٠]۔ مگر (یہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے[٢٩١]۔ (تم اِن کی پروا نہ کرو)، یہ سب ہماری ہی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پھر جو نیک عمل کرے گا اور ایمان پر بھی ہوگا[٢٩٢] تو اُس کی محنت کی ناقدری نہ ہوگی۔ ہم اُس کے لیے اُسے لکھ رہے ہیں۔ ٩٢-٩٤

براہ راست نازل کر دیا، جس طرح آدم و حوا کے لیے نازل کیا تھا۔

٢٨٩۔ یہ تمام نبیوں کا ذکر کرنے کے بعد بطور خلاصۂ بحث فرمایا ہے کہ تم سب ایک ہی امت ہو، اِس لیے کہ جن کو اپنا پیشوا مانتے ہو، اُن سب کا دین اور اُن کی دعوت ابتدا سے انتہا تک ایک ہی ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے وہ الگ الگ دین لے کر نہیں آئے، بلکہ ایک ہی طریقے پر اور ایک ہی پروردگار کے راستے کی دعوت دیتے رہے ہیں۔

٢٩٠۔ یہ اُس دعوت کا خلاصہ بیان کر دیا ہے جو خدا کے پیغمبروں نے ہمیشہ دی ہے۔

٢٩١۔ یعنی خدا کے دین میں اپنی طرف سے نئی نئی بحثیں پیدا کر کے اُس کے جو مختلف ایڈیشن تیار کیے گئے ہیں، وہ سب لوگوں کی ایجاد ہیں اور اُنھی نے دین حق کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کئی دینوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اِس تقسیم و تفریق کا خدا اور اُس کے بھیجے ہوئے نبیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

٢٩٢۔ اچھے عمل کی قبولیت کے لیے یہ لازمی شرط ہے۔ اِس کے بغیر خدا کے ہاں کسی عمل کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اُس کے ہاں وہی عمل درخور قبول ہے جو اُس کے لیے اور اُس پر ایمان کے ساتھ کیا گیا ہے۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا
فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾
وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ

(اب[۲۹۳] اِن منکروں کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اے پیغمبر۔ اِس لیے کہ) ہم نے جس بستی والوں کے لیے (اپنے قانون کے مطابق) ہلاکت مقدر کر رکھی ہے[۲۹۴]، اُن کے لیے حرام ہے کہ وہ حق کی طرف رجوع کریں[۲۹۵]، اِس لیے کہ وہ کبھی رجوع نہ کریں گے، یہاں تک کہ وہ وقت آ جائے، جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں[۲۹۶] اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں اور (قیامت کا) وعدۂ برحق قریب آ جائے تو ناگہاں اِن منکروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں اور بول

---

[۲۹۳] یہاں سے آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اِن میں اُسی مضمون کو از سر نو لے لیا ہے، جس سے سورہ شروع ہوئی تھی۔ یہ 'عود علی البدء' کا اسلوب ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا اگر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے تو خاتمۂ کلام میں اُس کو ایک مرتبہ پھر مخاطب کے ذہن میں تازہ کر دیا جائے۔

[۲۹۴] آیت میں فعل 'اَهْلَكْنَا' استعمال ہوا ہے۔ یہ فیصلۂ فعل کے معنی میں ہے۔

[۲۹۵] یہ فقرہ اصل میں محذوف ہے۔ اِس کی وضاحت 'اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ' کے جملے نے کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے مخاطبین سنت الٰہی کی زد میں آ چکے ہیں، اِس لیے اب یہ اُسی انجام کو پہنچیں گے، جس کو پچھلی قومیں پہنچی ہیں۔ اِن کے لیے ممکن نہیں ہے کہ توبہ و انابت کی توفیق پائیں اور باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف رجوع کریں۔ اِن کی ہٹ دھرمی کے باعث اِن کے لیے ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔

۲۹۶؎ یعنی ظہور قیامت کے قطعی آثار نمودار ہو جائیں اور اُس کے بارے میں کسی بحث کی گنجایش نہ رہے۔ اگلی آیت سے واضح ہے کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کے بعد یہی صورت پیدا ہو جائے گی۔ یہ دونوں نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے ہیں جو ایشیا کے شمالی علاقوں میں آباد ہوئی۔ پھر اُنھی کے بعض قبائل یورپ پہنچے اور اِس کے بعد امریکا اور آسٹریلیا کو آباد کیا۔ صحیفۂ حزقی ایل میں اِن کا تعارف روس، ماسکو اور توبالسک کے فرماں روا کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ حزقی ایل فرماتے ہیں:

> ”اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد، جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبل کا فرماں روا ہے متوجہ ہو اور اُس کے خلاف نبوت کر۔“
>
> (۳۸:۱-۲)
>
> ”پس اے آدم زاد، تو جوج کے خلاف نبوت کر اور کہہ: خداوند یوں فرماتا ہے: دیکھ اے جوج، روش، مسک اور توبل کے فرماں روا، میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دوں گا اور تجھے لیے پھروں گا اور شمال کی دور اطراف سے چڑھا لاؤں گا۔“ (۳۹:۱-۲)

یوحنا عارف کے مکاشفے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے خروج کی ابتدا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ایک ہزار سال بعد کسی وقت ہو گی۔ اُس زمانے میں یہ زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گے۔ اِن کا فساد جب انتہا کو پہنچے گا تو ایک آگ آسمان سے اترے گی اور قیامت کا زلزلہ برپا ہو جائے گا:

> ”اور جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور اُن قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی، یعنی جوج و ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لیے جمع کرنے کو نکلے گا۔ اُن کا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہو گا، اور وہ تمام زمین پر پھیل جائیں گی اور مقدسوں کی لشکر گاہ اور عزیز شہر* کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور آسمان پر سے آگ نازل ہو کر اُنھیں

---

* مقدسوں کی لشکر گاہ سے مراد مدینہ اور عزیز شہر سے مراد شہر امین مکہ ہے۔ یہ تعبیرات اتنی واضح ہیں کہ الہامی صحائف کے اسالیب اور اِن شہروں کی تاریخ سے واقف کسی شخص کو اِنھیں سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔

يٰوَيۡلَنَا قَدۡ كُنَّا فِيۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا بَلۡ كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۹۷﴾
اِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنۡتُمۡ لَهَا
وٰرِدُوۡنَ ﴿۹۸﴾ لَوۡ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوۡهَا ؕ وَكُلٌّ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۹۹﴾
لَهُمۡ فِيۡهَا زَفِيۡرٌ وَّهُمۡ فِيۡهَا لَا يَسۡمَعُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

اٹھیں کہ ہاے ہماری کم بختی! ہم اِس سے غفلت میں پڑے رہے، بلکہ ہم ظالم تھے[۲۹۷]۔ ۹۵-۹۷

تم اور تمھارے معبود جن کو اللہ کے سوا پوجتے رہے ہو[۲۹۸]، اب جہنم کا ایندھن ہیں۔ تم (روؤ یا فریاد کرو)، اُس میں داخل ہو کر رہو گے۔ اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو اُس میں نہ پڑتے ـــــ (یہ پوجنے والے اور جن کو پوجا گیا)، سب ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔ اب پوجنے والوں کو اُس میں چلانا ہے اور جن کو پوجتے رہے ہو، اُن کا حال یہ ہو گا کہ اُس میں کچھ نہ سنیں گے[۲۹۹]۔ ۹۸-۱۰۰

کھا جائے گی۔‘‘ (مکاشفہ ۲۰: ۷-۹)

[۲۹۷] یعنی یہ بات بھی نہیں کہ ہمیں کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا اور ہم غفلت میں پڑے رہے، بلکہ خبردار کرنے والوں کو جھٹلا کر اور اُن کی تنبیہات کا مذاق اڑا کر یہ ظلم اپنی جانوں پر ہم نے خود ڈھایا ہے۔

[۲۹۸] یعنی تمھارے اصنام و احجار۔ یہاں چونکہ مشرکین عرب مخاطب ہیں، اِس لیے وہی مراد ہوں گے۔ آیت میں اِن کے لیے 'مَا' کا استعمال اِس کا مزید قرینہ ہے۔ قرآن نے دوسری جگہ 'وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ' کے الفاظ میں اِس کی تصریح کر دی ہے۔ اِنھیں جہنم کا ایندھن بنانے سے مقصود اِن پتھروں کو سزا دینا نہیں ہے، بلکہ اِن کے پوجنے والوں کی فضیحت ہے کہ دیکھ لو، جن کو معبود بنا کر پوجتے رہے ہو، اُن پر یہاں کیا گزر رہی ہے۔ اِن کے ساتھ، البتہ اُن

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤی ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (۱۰۱) ۙ
لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا ۚ وَهُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ (۱۰۲) ۚ
لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا یَوْمُكُمُ

جن کے لیے، البتہ ہماری طرف سے اچھے انجام کا وعدہ ہو چکا ہے[۳۰۰]، وہ اُس سے دور رکھے جائیں گے، وہ اُس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور ہمیشہ اپنے من بھاتے عیش میں رہیں گے[۳۰۱]۔ وہ بڑی گھبراہٹ[۳۰۲] اُن کو ذرا غم میں نہ ڈالے گی اور خدا کے

جنوں اور انسانوں کو بھی شامل سمجھیے جنھوں نے پسند کیا کہ اللہ کے بجائے اُن کی بندگی کی جائے۔

۲۹۹ اصل الفاظ ہیں: 'هُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ'۔ آیت پر غور کیا جائے تو بادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے کہ 'هُمْ' کا مرجع پوجنے والوں کے معبود ہی ہیں جن کے لیے اوپر 'وَمَا تَعْبُدُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ بظاہر انتشار ضمیر ہے، لیکن مرجع میں التباس کا اندیشہ نہ ہو تو استاذ امام کے الفاظ میں، یہ ایجاز کے پہلو سے کلام کا حسن ہے۔ اِس کے ساتھ یہ امر بھی واضح رہے کہ یہاں ضمیر اور فعل پوجنے والوں کے تصور کے لحاظ سے وہی استعمال ہوئے ہیں جو ذی عقل ہستیوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تو اُنھیں سمیع و بصیر سمجھ کر ہی اُن سے دعائیں کرتے اور اُن کے پورا ہونے کی توقع رکھتے تھے۔

۳۰۰ اِس وعدے کا ذکر پیچھے آیت ۹۴ میں گزر چکا ہے۔

۳۰۱ یہ اِس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ اُنھیں جو کچھ دیا جائے گا، اُس کی یکسانی اُنھیں کبھی افسردہ نہ کرے گی کہ اُس سے اکتا کر وہ آگے کسی چیز کی خواہش کریں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...انسان ایک ذی ارادہ و اختیار ہستی ہے، اِس وجہ سے بڑے سے بڑے عیش کو بھی وہ اپنی ہی شرائط پر پسند کرتا ہے۔ اُس کی فطرت کے اِس تقاضے کی رعایت سے اللہ تعالیٰ نے

الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾
یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ
خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَیْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِیْنَ ﴿۱۰۴﴾

فرشتے اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اور کہیں گے: یہ تمھارا وہی دن ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ۱۰۱-۱۰۳

اُس دن، جب کہ ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے، جس طرح طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ ہم نے جس طرح پہلی خلقت[۳۰۳] کی ابتدا کی تھی، اُسی طرح ہم اُس کا اعادہ کر دیں گے۔ یہ ہمارے ذمے ایک حتمی وعدہ ہے[۳۰۴]، ہم اِس کو ضرور کر کے رہیں گے۔ ۱۰۴

اپنے باایمان بندوں کے لیے جنت بھی ایسی بنائی ہے، جس میں وہ اپنی پسند کے مطابق جس طرح کا تنوع چاہیں گے، پیدا کر لیں گے۔ اُن کی کسی خواہش میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی حائل نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ عیش دوام اور اُس کے اندر حسب منشا تنوع اور رنگارنگی پیدا کرنے کی یہ آزادی اِس دنیا میں ہفت اقلیم کے کسی شاہنشاہ کو بھی نہ حاصل ہوئی، نہ حاصل ہو سکتی۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۱۹۳)

۳۰۲؎ یہ اُس گھبراہٹ اور ہلچل کی طرف اشارہ ہے جو نفخ صور کے بعد تمام کائنات میں برپا ہوگی۔ اِس کی ہول ناک تصویر قرآن کے آخری باب کی سورتوں میں دیکھ لی جا سکتی ہے۔

۳۰۳؎ اصل میں 'اَوَّلَ خَلْقٍ' کے الفاظ ہیں۔ یہ یہاں ظرف کے محل میں ہیں، جس طرح دوسرے مقامات میں اِسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے 'اَوَّلَ مَرَّةٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔

۳۰۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَعْدًا عَلَیْنَا'۔ اِن میں مصدر تاکید کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا

ہم نے پند و نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا[305] کہ (اُس دن جو) زمین[306] (وجود

اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۰۵ یہ زبور کے مزمور ۳۷ کا حوالہ ہے۔ اِسے دیکھیے تو اِس کی نوعیت ایک ترکیب بند کی ہے، جس میں موعظت و نصیحت کی باتوں کے بعد بار بار ایک ترجیع یا ٹیپ کے مصرعے کی طرح یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ زمین کے وارث خدا کے نیک اور متقی بندے ہوں گے اور یہ وراثت ابدی ہوگی۔ آیت میں 'مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ' کے الفاظ سے قرآن نے اِسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اِس کے چند الفاظ یہ ہیں:

> ”اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر... خداوند پر توکل کر اور نیکی کر... وہ تیری راست بازی کو نور کی طرح اور تیرے حق کو دوپہر کی طرح روشن کرے گا۔ کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے، لیکن جن کو خداوند کی آس ہے، ملک کے وارث ہوں گے۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا۔ تو اُس کی جگہ غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہوگا، لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے اور سلامتی کی فراوانی سے شادمان رہیں گے... اُن کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی... صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اُس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔“ (۱-۲۹)

استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اترے ہوئے نغمات الٰہی کا مجموعہ ہے۔ حضرت داؤد، جیسا کہ اِسی سورہ میں بیان ہوا ہے، نبی بھی تھے اور اِس زمین کے ایک جلیل القدر بادشاہ بھی۔ ایک بادشاہ کی زبان ہی سے یہ اعلان سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا کہ زمین کے حقیقی اور آخری وارث صرف اللہ کے نیک بندے ہی ہوں گے۔ جب ایک صاحب جبروت بادشاہ اِس حقیقت کی منادی کر گیا ہے تو کسی دوسرے کے لیے اِس میں مجال سخن کہاں باقی رہی!“
>
> (تدبر قرآن ۵/ ۱۹۸)

۳۰۶ اصل میں لفظ 'الْاَرْض' استعمال ہوا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اُس کے وارث

عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (۱۰۵) اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ؕ (۱۰۶) وَمَآ
اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۱۰۷) قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۸) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰی
سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (۱۰۹) اِنَّهٗ یَعْلَمُ

میں آئے گی، اُس) کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔ اِس میں اُن لوگوں کے لیے بڑی آگاہی[۳۰۷] ہے جو (ہماری) بندگی کرنے والے ہیں۔ (یہ تم سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں) اور ہم نے (اے پیغمبر)، تم کو جو بھیجا ہے تو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ میری طرف تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا تم اپنے آپ کو اُس کے حوالے کرتے ہو؟ پھر اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ میں نے تم سب کو یکساں خبردار کر دیا ہے[۳۰۸]۔ میں نہیں جانتا کہ وہ وقت قریب ہے یا دور جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (اب

بلاشرکت غیرے صرف اللہ کے نیکوکار بندے ہوں گے۔ یہی بات زبور کے اُس مزمور میں بیان ہوئی ہے، جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اُس میں مزید صراحت ہے کہ یہ وراثت ابدی ہوگی۔ اِس سے واضح ہے کہ 'الْاَرْض' سے مراد یہاں اُس جہان نو کی زمین ہے جو قیامت کے بعد نئے نوامیس وقوانین کے ساتھ وجود میں آئے گی۔ سورۂ ابراہیم (۱۴) کی آیت ۴۸ میں اُسی کے بارے میں فرمایا ہے: 'یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ' (اُس دن کو یاد رکھو، جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی)۔

[۳۰۷] اصل میں لفظ 'بَلٰغًا' آیا ہے۔ اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے اور اپنے مدعا کے لحاظ سے یہ عام منادی اور عام بشارت، دونوں کو شامل ہے۔

[۳۰۸] یعنی امیر و غریب، چھوٹے بڑے، لیڈر اور پیرو، سب کو بغیر کسی فرق و تمیز کے خبردار

الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ
فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾
قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

معاملہ خدا کے حوالے ہے)۔ بے شک، وہی جانتا ہے اُس کو بھی جو سامنے کہہ رہے ہو اور اُس کو بھی جسے تم چھپاتے ہو۔[۳۰۹] اور مجھے نہیں معلوم، شاید یہ فرصت تمھارے لیے ایک آزمایش اور ایک خاص وقت تک فائدہ اٹھالینے کی مہلت ہو۔ ۱۰۵-۱۱۱

پیغمبر نے دعا کی کہ میرے پروردگار، حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، اور فرمایا: ہمارا پروردگار رحمٰن ہی ہے، جس سے ہم اُن باتوں کے مقابلے میں مدد مانگتے ہیں جو تم بیان کرتے ہو۔[۳۱۰] ۱۱۲

کر دیا ہے۔

[۳۰۹] مطلب یہ ہے کہ تم جو مطالبہ مجھ سے کر رہے ہو، اُس کو بھی جانتا ہے اور اُس کو بھی جو اُس مطالبے کی تہ میں چھپا ہوا ہے۔ اُس پر سب کچھ واضح ہے، اِس لیے وہی اپنے قانون اور اپنی حکمت کے مطابق فیصلہ کرے گا کہ تمھارے ساتھ اب کیا کرنا ہے۔

[۳۱۰] سورہ کے آخر میں یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی ہے اور ہجرت و براءت کے اِس مرحلے میں اپنے منکرین کو وداع بھی۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ صرف فیصلے ہی کا انتظار باقی رہ جاتا ہے۔

کوالالمپور

۱۵/ اپریل ۲۰۱۳ء

الحج - المؤمنون

٢٢ ــــ ٢٣

الحج - المؤمنون

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع انذار و بشارت ہے جو پچھلی سورتوں سے چلا آ رہا ہے۔ پہلی سورہ میں قریش مکہ کو، خاص کر حرم کی تولیت کے حوالے سے آخری انذار و تنبیہ اور دوسری میں اُن کے لیے اُسی انذار و تنبیہ کے نتائج کی وضاحت ہے جس میں ایمان والوں کی کامیابی کا مضمون بہت نمایاں ہو گیا ہے۔

دونوں سورتوں میں خطاب اصلاً قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۂ حج کی چند آیات، البتہ مدنی ہیں جو اُس اقدام کی وضاحت کے لیے سورہ کا حصہ بنا دی گئی ہیں جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد خدا کا فیصلہ قریش مکہ کے لیے ظاہر ہو جائے گا۔

سورة الحج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ①
يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ
ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى
وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

لوگو[1]، اپنے پروردگار سے ڈرو[2]۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا بھونچال بڑی ہی ہول ناک چیز ہے۔ تم جس دن اُس کو دیکھو گے، ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی، اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے، حالاں کہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہو گا[3]۔ ۱-۲

---

[1] یہ لفظ اگرچہ عام ہے، لیکن اِس سے مراد وہی متمردین قریش ہیں جو قیامت کو جھٹلاتے اور عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے۔

[2] یعنی اُس کے مقابلے میں سرکشی اختیار نہ کرو، اِس لیے کہ اُس کا عذاب پناہ مانگنے کی چیز ہے، وہ مطالبہ کرنے کی چیز نہیں ہے۔

[3] آیت میں مخاطبین کے لیے ایک جگہ جمع اور دوسری جگہ واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ہم دوسری جگہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جمع کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا جائے تو اُس میں

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۙ ﴿۳﴾ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ

اِدھر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُن میں ایسے (احمق) بھی ہیں[4] جو بغیر کسی علم کے[5] خدا کے بارے میں جھگڑتے[6] اور ہر سرکش شیطان[7] کی پیروی کرنے لگتے ہیں، جس کی نسبت لکھ دیا گیا ہے[8] کہ جو اُس کو دوست بنائے گا تو یوں ہے کہ اُس کو وہ گم راہ

مخاطبین کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مراد ہوتا ہے اور کلام میں جمع کے بالمقابل زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے۔

[4] 'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ' کا یہ اسلوب تحسین اور تقبیح، دونوں کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ تقبیح کے لیے ہے۔ لفظ 'احمق' کے اضافے سے ہم نے اِسی کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

[5] یعنی عقل و فطرت، علم و استدلال اور کتاب الٰہی کی کسی شہادت کے بغیر ہی مناظرے اور مجادلے کے لیے آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... اِس طرح کے لوگ کسی معاشرے میں بھی تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہوتے، بلکہ اِن کا ایک خاص طائفہ ہی ہوتا ہے۔ اِن کا علم بھی بس سنی سنائی اور رٹی رٹائی باتوں پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن زبان درازی میں طاق اور لاف زنی میں مشّاق ہوتے ہیں، اِس وجہ سے شاطر لوگوں کے ایجنٹ بن کر بے چارے سادہ لوح عوام کو گم راہ کرنے کی خدمت خوب انجام دیتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۵/۲۰۸)

[6] یہ اُس جھگڑے کا ذکر ہے جو وہ خدا کی توحید اور اُس کے حضور میں جواب دہی کے متعلق پیدا کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ کسی طرح باور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ قیامت برپا ہو گی اور بالفرض ہو گی تو اُنھیں تنہا خدا سے معاملہ پڑے گا اور اُن کے شرکا وشفعا وہاں اُن کے کام نہ آئیں گے۔

وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ④

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى

کر دے گا اور اُس کو دوزخ کے عذاب میں پہنچائے گا۔ ۳-۴

لوگو، اگر تمھیں دوبارہ جی اٹھنے کے بارے میں کچھ شک ہے[۹] تو غور کرو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے[۱۰]، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے[۱۱]، جو پوری بھی ہوتی ہے اور ادھوری بھی[۱۲]۔ اِس لیے کہ تم پر کچھ حقائق واضح کریں (جو تم کو سمجھنے چاہییں)[۱۳]۔ ہم جو چاہتے ہیں، ایک مقرر مدت تک رحموں

---

[۷] یعنی خواہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

[۸] یہ اُس مہلت کی طرف اشارہ ہے جو خدا نے شیطان کو دے رکھی ہے اور اِس طرح گویا اُس کے لیے طے کر دیا ہے کہ قیامت تک وہ یہی خدمت انجام دیتا رہے۔

[۹] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ مشرکین عرب قیامت کے بارے میں فی الواقع ایک نوعیت کے شک اور تردد میں مبتلا تھے، اُس کا صریحاً انکار نہیں کرتے تھے۔

[۱۰] یعنی ابتدا میں، جب انسان زمین کے پیٹ میں اُنھی مراحل سے گزر کر پیدا ہوا جن سے وہ اب ماں کے پیٹ میں گزرتا ہے۔

[۱۱] یہ اُن بڑے بڑے تغیرات کا ذکر کیا ہے جن سے اُس زمانے کا ایک عام بدو بھی واقف تھا۔

[۱۲] یعنی ضروری نہیں کہ پوری ہو کر بچے کی صورت اختیار کرے، بعض اوقات ادھوری ہی رہ جاتی ہے اور کسی کے بس میں نہیں ہوتا کہ اُسے مکمل کر دے۔

اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ
يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ

میں ٹھیرائے رکھتے ہیں۔ پھر ایک بچے کی صورت میں تمھیں نکال لاتے ہیں۔ پھر ایک وقت دیتے ہیں[۱۴] کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی[۱۵] بلا لیا جاتا ہے اور کوئی (بڑھاپے کی) نکمی عمر کو پہنچایا جاتا ہے کہ وہ بہت کچھ جاننے کے بعد

---

[۱۳] یہ سلسلۂ کلام کو بیچ میں چھوڑ کر مخاطبین کو جھنجھوڑنے کے لیے اصل مقصد کی طرف توجہ دلا دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’...مطلب یہ ہے کہ خدا انسان کو وجود میں لانے کے لیے اِن تمام مراحل اور سارے اہتمام کا محتاج نہیں تھا کہ پانی کی ایک بوند کسی مادہ کے رحم میں قرار پکڑے، پھر وہ خون اور جنین کی صورت اختیار کرے اور قدرت اپنے ڈیزائن کے مطابق اُس کی نقاشی و مصوری کر کے اُس کو حسین پیکر بنائے۔ اِس تمام اہتمام و انتظام کے بغیر اگر خدا چاہتا تو بنے بنائے آدمی کسی دریا یا پہاڑ سے جھنڈ کے جھنڈ اور ریوڑ کے ریوڑ برآمد ہو جایا کرتے، لیکن خدا نے یہ چاہا کہ انسان کی خود اپنی خلقت اُس کے لیے خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی ایک درس گاہ بن جائے جس میں وہ اپنے اور اِس کائنات کے احسن الخالقین کی معرفت حاصل کرے۔ اُس کا خود اپنا وجود اِس پر شہادت دے کہ جس نے اِس اہتمام و عنایت کے ساتھ اُس کو پیدا کیا ہے، اُس نے اُس کو محض ایک کھلونا نہیں بنایا ہے، بلکہ اُس کی خلقت کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے جو لازماً ظہور میں آ کے رہے گی۔ اُس کے اپنے ہر بن مو سے اُس کو یہ گواہی ملے کہ خالق نے اُس کو مٹی کے خلاصہ اور پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا اور اُس کو اِس میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی تو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا بھی اُس کے لیے نہایت آسان ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۵/ ۲۱۷)

[۱۴] یہ فقرہ اصل میں محذوف ہے جس پر ’لِتَبْلُغُوْا‘ کا لام دلالت کر رہا ہے۔

عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ
وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴿۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ
وَاَنَّهٗ يُـحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۶﴾ وَّاَنَّ السَّاعَةَ
اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا

پھر کچھ بھی نہیں جانتا[۱۶]۔ اِسی طرح زمین کو دیکھتے ہو کہ خشک پڑی ہے۔ پھر جب ہم اُس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر طرح کی خوش منظر چیزیں اگاتی ہے۔ یہ سب اِس لیے کہ اللہ ہی پروردگار حقیقی ہے اور اِس لیے کہ وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور اِس لیے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اِس لیے کہ قیامت آ کر رہے گی، اُس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور اِس لیے کہ اللہ اُن سب کو ضرور اٹھائے گا جو قبروں میں پڑے ہیں[۱۷]۔ ۵-۷

اِس کے باوجود لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُن میں ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی علم،

---

[۱۵] آیت میں آگے 'اَرْذَلِ الْعُمُرِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کے مقابل میں 'فی صباہ أو فی شبابہ' یا اِن کے ہم معنی الفاظ اصل میں محذوف ہیں۔ ترجمے میں یہ اضافہ اُنھی کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

[۱۶] آیت میں 'ل' 'غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے اور لفظ 'عِلْم' کی تنکیر تفخیم کے لیے ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'لِکَیْلَا یَعْلَمَ' کے مقابل میں آیا ہے۔ اِس سے انسان کے علم کی اصل حقیقت کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے جو علم کے بحر بے کراں میں ایک قطرہ ہی ہے۔

[۱۷] اوپر جن حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے، اُن کو دیکھنے کے بعد یہ بدیہی نتائج ہیں جن کا

كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۙ﴿۸﴾ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا
خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۹﴾ ذٰلِكَ بِمَا
قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۰﴾

بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے (تکبر سے) شانے جھٹکتے ہوئے[۱۸] اللہ کے بارے میں حجتیں کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں۔ اُن کے لیے دنیا میں رسوائی ہے[۱۹] اور قیامت کے دن ہم اُن کو جلتی آگ کا عذاب چکھائیں گے — یہ ہے تمھارے اعمال کا بدلہ جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجے تھے اور (تمھارے لیے خدا کا انصاف بھی)، اِس لیے کہ اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے[۲۰]۔ ۸-۱۰

انکار کوئی عقل کا اندھا ہی کر سکتا ہے۔

[۱۸] یہ رویہ انسان میں اُسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ علم و استدلال کے بجائے مجرد آبا و اجداد کی اندھی تقلید کو اپنے ایمان و عقیدہ کا ماخذ بنا لیتا ہے۔ یہ اِسی طرح کے لوگوں کا ذکر ہے جو قرآن کی دعوت یہ کہہ کر رد کر دیتے تھے کہ ہم تو اُسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

[۱۹] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ یہاں رسول کے مخاطبین زیر بحث ہیں جن کے بارے میں سنت الٰہی یہ ہے کہ اُن کے کبر و غرور کی سزا اُنھیں دنیا میں بھی لازماً ملتی ہے۔

[۲۰] مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمھارے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی ہے۔ یہ اُسی بس بھری فصل کا حاصل ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سے بوئی تھی۔ آیت میں یہ مضمون 'اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اِس میں مبالغہ پر نفی مبالغہ فی النفی کے لیے ہے۔ یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقامات میں 'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ'* (اللہ ذرے کے برابر بھی

الحج
۲۲

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ
اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ ۫ خَسِرَ
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو خدا کی بندگی کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں[۲۱]۔ پھر اگر اُن کو کوئی فائدہ پہنچا تو خدا پر مطمئن ہو گئے اور اگر اُن کو کوئی آزمایش پیش آ گئی تو اوندھے ہو جاتے ہیں[۲۲]۔ اُنھوں نے دنیا بھی کھو دی اور آخرت بھی[۲۳]۔ یہی

کسی پر ظلم نہیں کرتا) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا** (اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ اِس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید اور کلام عرب، دونوں میں موجود ہیں۔

۲۱ یعنی منافقانہ جس میں حق و باطل اور یزداں و اہرمن، دونوں کو راضی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ اُن متکبرین سے مختلف گروہ ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ آیت کا اسلوب اظہار تعجب اور اظہار نفرت و کراہت کا ہے اور بندگی سے مراد پرستش ہے جو اطاعت کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔ آگے اِسی کی وضاحت فرمائی ہے۔

۲۲ یعنی خدا کو چھوڑ کر دوسروں کے آستانے پر جبہ سائی شروع کر دیتے ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں، پھولوں کے طالب ہیں، لیکن کانٹوں کی خلش برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۲۳ دنیا اُس نقصان کی وجہ سے جو پیش آیا اور آخرت اِس لیے کہ خدا کی بارگاہ سے الٹے پھر گئے۔ ایسا نہ کرتے تو صرف دنیا کھوتے، مگر آخرت کا اجر اپنے لیے محفوظ کرا لیتے۔

---

* النساء ۴: ۴۰۔

** یونس ۱۰: ۴۴۔

اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنۡفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِيۡدُ ۚ ⑫ يَدۡعُوۡا
لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ مِنۡ نَّفۡعِهٖ ؕ لَبِئۡسَ الۡمَوۡلٰى وَلَبِئۡسَ الۡعَشِيۡرُ ⑬
اِنَّ اللّٰهَ يُدۡخِلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِيۡ

کھلا ہوا خسارہ ہے۔ یہ خدا کے سوا اُن چیزوں کو پکارتے ہیں[۲۴] جو نہ اِن کا برا کر سکتی ہیں، نہ اِن کا بھلا۔ یہی دور کی گم راہی ہے۔ یہ اُن کو پکارتے ہیں، وہی جن کا نقصان اُن کے نفع سے قریب تر ہے[۲۵]۔ کیا ہی برے ہیں یہ مولیٰ اور کیا ہی برے ہیں اُن کے یہ ساتھی (جو اُنھیں مولیٰ بنائے ہوئے ہیں[۲۶])! (اِس کے برخلاف) اللہ اُن کو جو پوری سچائی کے ساتھ ایمان لائے[۲۷] اور جنھوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ایسے

---

[۲۴] اصل میں لفظ 'یَدۡعُوۡا' استعمال ہوا ہے۔ یہ دعا، استغاثہ، فریاد، استرحام اور استمداد، سب معنوں کو شامل ہے۔ آگے اِسی کو حسرت و افسوس کے ساتھ دہرایا ہے۔

[۲۵] یہ جملہ 'یَدۡعُوۡا' کا براہ راست مفعول نہیں ہے، بلکہ اوپر والے مفعول 'مَا لَا یَضُرُّهٗ وَمَا لَا یَنۡفَعُهٗ' پر ایک قسم کا استدراک ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں، صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی ضر یا نفع نہیں پہنچا سکتے، بلکہ ستم بالائے ستم ہے کہ اُن کا ضر اُن کے نفع سے قریب تر ہے۔ اگر کسی ایسے کی پناہ ڈھونڈی جائے جو نہ نفع پہنچا سکے نہ ضر تو یہ حماقت ہے، لیکن حماقت در حماقت یہ ہے کہ ایسے کی پناہ ڈھونڈی جائے جس کا ضر تو ثابت و معلوم ہو، لیکن نفع بالکل موہوم۔ جنھوں نے خدا سے تعلق توڑ کر دوسروں کو اپنا ولی و کارساز مانا، انھوں نے اپنا حقیقی سہارا تو ختم کر دیا۔ رہے دوسرے مزعومہ سہارے تو وہ کام آتے ہیں یا نہیں، یہ بعد کی چیز ہے اور یہ بھی اُن کے سامنے آجائے گی۔" (تدبر قرآن ۵/ ۲۲۴)

[۲۶] یعنی مشرکین۔

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾
مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ
بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ بے شک، اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔[۲۸] ۱۱-۱۴

(اِنھیں بتاؤ کہ) جو یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں ہرگز اُس کی مدد نہ کرے گا،[۲۹] اُس کو چاہیے کہ (اپنے تصور میں ذرا) ایک رسی (اوپر چڑھنے کے لیے) آسمان کی طرف تانے، پھر (جب منزل کو بہت دور دیکھ کر رنجیدہ ہو تو) اُس کو کاٹ دے اور دیکھے کہ آیا اُس کی یہ تدبیر اُس کے رنج کو دور کرنے والی بنتی ہے؟[۳۰] ہم نے اِس قرآن کو اِسی طرح کھلی کھلی دلیلوں کی صورت میں اتارا ہے، مگر جو توفیق سے محروم ہیں، وہ کہاں ہدایت پائیں گے کہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے، (اپنے

---

[۲۷] اوپر فرمایا ہے: 'مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ'۔ یہ اُس کے مقابل میں ہے، اِس لیے فعل یہاں کمال فعل کے معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۲۸] یہ تسلی کا جملہ ہے کہ مسلمان حالات کی نامساعدت نہ دیکھیں۔ اُن کا پروردگار جو چاہے، کرسکتا ہے۔ اُس کے ارادوں میں کوئی چیز بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

[۲۹] یعنی خدا کی آزمایش میں اُس سے مایوس اور بدگمان ہو جاتا ہے کہ جس طرح دنیا میں اُس نے اُسے چھوڑ دیا ہے، آخرت میں بھی اِسی طرح بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔ چنانچہ خدا سے منہ موڑ کر دوسروں کو اپنا مولیٰ و مرجع بنا لیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕیْنَ وَالنَّصٰرٰی

قانون کے مطابق)[۳۱] ہدایت دیتا ہے۔ ۱۵-۱۶

(یہ خدا کے بارے میں حجتیں کرتے ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ) جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنھوں نے یہودیت اختیار کر رکھی ہے اور صابئ اور نصاریٰ اور

---

[۳۰] یعنی یہ تصور کرے کہ وہ آسمان کی طرف رسی تان کر اوپر چڑھ رہا ہے، لیکن جب دیکھتا ہے کہ منزل بہت دور ہے تو رنجیدہ ہو کر رسی کو کاٹ دیتا ہے۔ یہ اُنھی لوگوں کے رویے کی نہایت بلیغ تمثیل ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے کہ خدا کی بندگی کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں اور اگر کوئی آزمایش پیش آجائے تو اُس سے امیدیں توڑ کر دوسروں کے دروازے پر آ گرتے ہیں۔ اُنھیں بتایا ہے کہ خدا کی آزمایشوں میں اُس سے رحمت کی امید درحقیقت وہ رسی ہے جو انسان کو سہارا دیتی ہے اور اُسی کو پکڑ کر وہ اوپر کی طرف اٹھتا اور خدا سے قریب ہوتا ہے، لیکن دوری منزل سے گھبرا کر اگر وہ غصے میں آجائے اور رسی کو کاٹ دے تو اِس حماقت کا نتیجہ کیا ہوگا؟ آیا اُس کا رنج اور غصہ دور ہو جائے گا یا وہی صورت حال پیدا ہو جائے گی جس کو قرآن نے آگے اِسی سورہ کی آیت ۳۱ میں بیان کیا ہے کہ گویا آسمان سے گر پڑا ہے، اب یا پرندے اُس کو اچک لے جائیں گے یا ہوائیں اُس کو کسی گہرے کھڈ میں لے جا کر پھینک دیں گی؟ خدا سے مایوس ہو کر دوسروں کے آستانے پر ماتھا رگڑنے والے بالآخر اِسی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ اِس کے برخلاف جو خدا سے امید کی رسی تھامے رہتے ہیں، جلد یا بدیر اُن کے لیے خدا کا ہاتھ نمودار ہوتا ہے اور اوپر چڑھنے کی مشقت سے نجات دلا کر اُن کو اپنے دامن رحمت کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ آیت میں امید کی رسی کاٹ دینے کے اِس فعل کو لفظ 'کَیْد' سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ محض فریب نفس ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان یہ حماقت کرتا ہے۔

وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۱۷)

مجوس[۳۲] اور جو شرک اختیار کیے ہوئے ہیں،[۳۳] اللہ قیامت کے دن اِن سب کے درمیان (اِن کے اختلافات کا) فیصلہ کر دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔[۳۴] ۱۷

۳۱؎ یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق کہ ہدایت اُنھی کو نصیب ہوگی جو عقل و بصیرت سے کام لیں گے اور جو ہدایت اُن کے اندر ودیعت کی گئی ہے، اُس کی قدر کریں گے، اور جو اندھے بہرے بن جائیں گے، اُن کے دلوں پر مہر کر دی جائے گی، وہ کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔

اِس میں لفظ 'بَيِّنٰت' کے بعد اور 'وَاَنَّ اللّٰهَ' سے پہلے جملے کا ایک حصہ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۳۲؎ یہود و نصاریٰ اور صابئین کا تعارف سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۶۲ کے تحت ہو چکا ہے۔ یہاں مجوس کا اضافہ ہے۔ یہ دین زردتشت کے پیرو تھے۔ عام خیال یہی ہے کہ اِس دین کی بنیاد بھی اصلاً توحید خالص پر تھی، لیکن شرک کی گم راہیوں نے اِسے بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ بعثت نبوی کے زمانے میں یہ بھی ثنویت، آتش پرستی اور دوسری مشرکانہ بدعتوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔

۳۳؎ یعنی مشرکین عرب جو اصلاً دین ابراہیمی کے پیرو تھے۔

۳۴؎ یہ ایمان والوں کے لیے تسلی اور منکرین کے لیے تہدید و وعید ہے۔ اِس پوری آیت کو دیکھیے تو اِس میں جو اسالیب اختیار کیے گئے ہیں، وہ نہایت قابل توجہ ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اِس آیت میں آپ نے غور کیا ہوگا کہ سب سے پہلے اہل ایمان کا ذکر ہوا ہے اور آخر میں مشرکین کا اور بیچ میں دوسرے مختلف فرقوں کا۔ اِس کی وجہ... یہ ہے کہ اصل فریق کی

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سب اللہ ہی کے آگے سر بہ سجود ہیں، اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپایے اور بہت سے لوگ بھی؟[۳۵] اور بہت سے وہ بھی ہیں کہ جن پر خدا کا عذاب لازم ہو چکا ہے، (اِس لیے کہ اُنھوں نے یہ ذلت قبول کر لی کہ دوسروں کے آگے سر جھکا دیا)۔[۳۶]

حیثیت اِس مباحثہ و مناظرہ میں اِنھی دو کو حاصل تھی، باقی گروہوں کی حیثیت ضمنی تھی۔ چنانچہ آگے آیت ۱۹ میں تصریح بھی ہے کہ اصل فریق دو ہیں: اہل ایمان اور اہل کفر و شرک۔ جو اہل ایمان کے ساتھ نہیں ہے، وہ اہل کفر میں سے ہے، خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی دین کی پیروی کا مدعی ہو۔

آیت میں مختلف گروہوں کے ذکر کے لیے جو اسلوب بیان اختیار فرمایا گیا ہے، وہ بھی قابل توجہ ہے۔ مسلمانوں اور یہود و مشرکین کا ذکر تو فعل کی شکل میں ہوا ہے اور صابئین، نصاریٰ اور مجوس کا اسم کی شکل میں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ عملاً اِس میدان میں ایک طرف مسلمان تھے، دوسری طرف مشرکین اور یہود۔ یہود مشرکین کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں اپنے حسد و عناد کے باعث بہت سرگرم تھے۔ باقی فرقوں کی ہم دردیاں اگرچہ تھیں تو مشرکین ہی کے ساتھ، لیکن وہ کچھ زیادہ سرگرم نہ تھے۔ اِس وجہ سے معرکے کے اصلی حریفوں کو تو فعل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور دوسروں کا ذکر اسم کے ساتھ۔ زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ فعل کے اندر ایک قسم کی سرگرمی کا مفہوم پایا جاتا ہے، جب کہ اسم بالعموم صرف علامت امتیاز کا فائدہ دیتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۲۲۸)

۳۵ یعنی وہ لوگ بھی سر بہ سجود ہیں جن کی فطرت سلیم ہے اور جنھوں نے پورے شعور کے

ساتھ اپنے ارادہ و اختیار کو خدا کے امر و حکم کے تابع کر دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’یہ توحید کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جس کی شہادت اِس کائنات کی ہر چیز اپنے وجود سے دے رہی ہے۔ہم ... اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اِس کائنات کی ہر چیز اپنی تکوینی حیثیت میں ابراہیمی مزاج رکھتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور چوپایے، سب خدا کے امر و حکم کے تحت مسخر ہیں۔ اِن میں سے کوئی چیز بھی سر مو خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین سے انحراف نہیں اختیار کرتی۔ سورج، جس کو نادانوں نے معبود بنا کر سب سے زیادہ پوجا ہے، خود اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ وہ شب و روز اپنے رب کے آگے قیام، رکوع اور سجدے میں ہے۔ طلوع کے وقت وہ سجدے سے سر اٹھاتا ہے، دوپہر تک وہ قیام میں رہتا ہے، زوال کے بعد وہ رکوع میں جھک جاتا ہے اور غروب کے وقت وہ سجدے میں گر جاتا ہے اور رات بھر اِسی سجدے کی حالت میں رہتا ہے۔ اِسی حقیقت کا مظاہرہ چاند اپنے عروج و محاق سے اور ستارے اپنے طلوع و غروب سے کرتے ہیں۔ پہاڑوں، درختوں اور چوپایوں کا بھی یہی حال ہے۔ اِن میں سے ہر چیز کا سایہ ہر وقت قیام، رکوع اور سجود میں رہتا ہے۔ اور غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی نظر آئے گی کہ اِس سایے کی فطرت ایسی ابراہیمی ہے کہ یہ ہمیشہ آفتاب کی مخالف سمت میں رہتا ہے۔ اگر سورج مشرق کی سمت میں ہے تو سایہ مغرب کی جانب پھیلے گا اور اگر مغرب کی جانب ہے تو ہر چیز کا سایہ مشرق کی طرف پھیلے گا۔ گویا ہر چیز کا سایہ اپنے وجود سے ہمیں اِس بات کی تعلیم دے رہا ہے کہ سجدے کا اصل سزاوار آفتاب نہیں، بلکہ خالق آفتاب ہے۔

توحید کی یہ دلیل اشارات کی نوعیت کی ہے، اِس وجہ سے یہ منطق کی گرفت میں نہیں آتی، لیکن نظام کائنات میں تدبر کرنے والوں کی نظر میں اِن اشارات کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے:

آں کس است اہل بشارت کہ اشارت داند‘‘

(تدبر قرآن ۵/۲۲۹)

۳۶؎ یعنی اِس کے باوجود کہ خدا نے اپنی بہت سی مخلوقات پر اُن کو فضیلت بخشی تھی، لیکن

مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۩ ﴿١٨﴾
هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ز فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ
لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ج ﴿١٩﴾
يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ؕ ﴿٢٠﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾
كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ق وَذُوْقُوْا
عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾

حقیقت یہ ہے کہ جس کو اللہ ذلیل کر دے، اُسے پھر کوئی عزت دینے والا نہیں ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ (اپنے قانون کے مطابق) جو چاہے، کرتا ہے۔ ۱۸

یہ سب دو فریق ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ سو جنھوں نے (اُس کی توحید کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے، اُن کے لیے آگ کے کپڑے تراشے جائیں گے، اُن کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا۔ اُن کے پیٹ کے اندر جو کچھ ہے، سب اُس سے پگھل جائے گا اور (اوپر سے) اُن کی کھالیں بھی۔ اُن کی سرکوبی کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ وہ اُس سے، اُس کے کسی عذاب سے بھی جب جب نکلنا چاہیں گے، دوبارہ اُسی میں دھکیل دیے جائیں گے کہ اب اِسی میں رہو[۳۷] اور چکھو جلنے کی سزا کا مزہ۔ ۱۹-۲۲

اُنھوں نے یہ ذلت قبول کر لی کہ اپنے سے فروتر مخلوقات کو معبود مان کر اُن کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

[۳۷] یہ معطوف علیہ ہے جو عربیت کے اسلوب پر اصل میں حذف کر دیا گیا ہے، یعنی 'اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ'۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ
وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝۲۳ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ
وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝۲۴

اُن لوگوں کو، البتہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ اُن کو وہاں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔[۳۸] اُن کے لباس وہاں ریشم کے ہوں گے۔ اور مزید یہ کہ اُنھیں وہاں پاکیزہ بات کی ہدایت بخشی گئی[۳۹] اور اُنھیں خداے حمید (کی جنت) کا راستہ دکھا دیا گیا[۴۰]۔ ۲۳-۲۴

۳۸؎ اصل میں لفظ 'لُؤْلُؤًا' آیا ہے۔ یہ 'اَسَاوِرَ' کے محل پر عطف ہے۔ چنانچہ اِسی بنا پر منصوب ہو گیا ہے۔

۳۹؎ یہ حمد و شکر کے اُن کلمات کی طرف اشارہ ہے جو اہل جنت کی زبان پر اُس کی نعمتوں کو دیکھ کر بے تحاشا جاری ہو جائیں گے۔

۴۰؎ آیت میں صیغۂ مجہول تشریف و تکریم کے لیے ہے، یعنی فرشتوں کی معیت میں اُس شاہراہ پر ڈال دیا گیا جو سیدھی اُس دار المقامہ تک پہنچائے گی جو خداے حمید نے اُن کے قیام کے لیے پسند فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جنت و دوزخ وغیرہ کے احوال کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہے۔ اُن کو مخاطب کے ذہن سے قریب لانے کے لیے اِس کے سوا چارہ نہیں کہ اُن کی تعبیر کے لیے وہ اسلوب اختیار کیا جائے جس سے مخاطب مانوس ہوں۔ اہل عرب مصریوں اور ایرانیوں کے تمدن سے متاثر تھے، اِس وجہ سے تنعم و رفاہیت کی تعبیر کے لیے وہی اسلوب

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ

یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے (خدا کے پیغمبر کو) ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اب وہ خدا کی راہ سے روک رہے ہیں اور مسجد حرام سے بھی[۴۱] جسے ہم نے لوگوں کے لیے یکساں بنایا ہے، خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے،[۴۲] اُنھوں نے بڑے ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ (اِس لیے کہ اِس مسجد کا معاملہ تو یہ ہے کہ جو اِس

اختیار کیا جاتا ہے جس میں یا تو خود اُن کے اپنے تصورات تنعم کی جھلک ہوتی ہے یا پھر اُن تصورات کی جھلک ہوتی ہے جن سے فی الجملہ وہ آشنا تھے۔ اِن تصورات میں زمانے کے اختلاف سے بھی بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے، اِس وجہ سے الفاظ کے بجاے ہمیشہ حقیقت پر نظر رکھنی چاہیے۔ بس یہ ماننا چاہیے کہ اہل جنت کو یہ نعمتیں حاصل ہوں گی جو قرآن میں مذکور ہوئیں۔ رہی یہ بات کہ اُن کی اصل حقیقت کیا ہے تو اُن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ جس طرح بعض اوقات مشاہدۂ حق کے احوال و معاملات کے لیے بادہ و ساغر کی تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں، اُسی طرح احوال آخرت کی تعبیر اُن الفاظ و تمثیلات سے کی جاتی ہے جو مخاطب کے لیے قریب الفہم ہوں۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۲۳۴)

[۴۱] یعنی قریش مکہ جو اُس زمانے میں مسلمانوں کو جبر و زور کے ذریعے سے اللہ کے دین سے روک رہے تھے، یہاں تک کہ حرم کی حاضری سے بھی اُن کو محروم کر دینے کے درپے رہتے تھے۔

[۴۲] یہاں تک مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے۔ ہم نے آگے اُسے کھول دیا ہے۔ آیت میں حرم سے متعلق جو قانون بیان ہوا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اِس پر کسی خاندان، کسی قبیلے اور کسی قوم کا اجارہ نہیں ہے۔ ہر شخص جو اللہ کی عبادت اور حج و عمرہ کے لیے اِس گھر کا قصد کرے، وہ قریشی ہو یا غیر قریشی، عربی ہو یا عجمی، شرقی ہو یا غربی، اُس پر کسی کو کوئی پابندی

عائد کرنے کا حق نہیں ہے۔* مقیم اور آفاقی، سب کے حقوق اِس میں بالکل برابر ہیں۔ قریش کی حیثیت اِس کے حکمرانوں اور اجارہ داروں کی نہیں ہے، بلکہ اِس کے پاسبانوں اور خدمت گزاروں کی ہے۔ اُن کا فرض ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح وہ بھی اِسے تمام دنیا کے لیے عبادت کا مرکز بنائیں اور تمام انسانوں کو دعوت دیں کہ اِس کی برکتوں سے بہرہ یاب ہونے کے لیے اِس آستانۂ الٰہی پر حاضر ہوں۔ چنانچہ اُن کے لیے جو لفظ آیت میں استعمال کیا گیا ہے، وہ 'اَلْعَاکِف' ہے جس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ وہ درحقیقت اِس کے معتکفین ہیں اور اُن کو اپنی یہی حیثیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے۔

آیت میں جس برابری کا ذکر ہے، وہ جس طرح حقوق میں ہے، اُسی طرح فرائض میں بھی لازماً ہوگی۔ چنانچہ حرم کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داریوں میں بھی تمام مسلمان برابر کے شریک سمجھے جائیں گے اور اُس کے خدام اگر کسی وقت اُس کی حرمت برباد کریں یا باہر سے کوئی طاقت اِس کی جسارت کرے، دونوں صورتوں میں اُن کا فرض ہوگا کہ اُس کو روکنے کے لیے وہ اپنی تمام قوت صرف کر دیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس معاملے میں کسی قومی یا بین الاقوامی معاہدے اور مصلحت کا بھی کوئی لحاظ جائز نہیں ہوگا۔ اگر کسی ملک کی حکومت اِس جہاد میں شرکت سے روکے تو ہر چند وہ نام نہاد مسلمانوں ہی کی حکومت ہو۔ اُس کے خلاف بھی اہل ایمان پر فرض ہوگا کہ وہ جہاد کریں، اِس لیے کہ حرم کی حفاظت و مدافعت کی ذمہ داری صرف اہل مکہ یا اُن کی حکومت پر نہیں ہے، بلکہ ہر کلمہ گو پر ہے۔ اُس کو کسی صورت میں بھی پرایا جھگڑا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حرم کے حقوق اور ذمہ داریوں میں ہر مسلمان برابر کا شریک ہے۔ حرم امت مسلمہ کا دل ہے۔ اِس کی صلاح تمام امت کی صلاح اور اِس کا فساد پوری ملت کا فساد ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۲۴۰)

---

* سوائے اِس کے کہ خود اِس کی عبادت کے لیے جانے والوں کی کسی ضرورت یا سہولت کے لیے کوئی پابندی لگانا پڑے، جس طرح کہ اِس زمانے کی حکومتوں نے لگا رکھی ہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اُن میں سے بھی بعض پابندیاں بالکل ناروا ہیں جنھیں لازماً ختم کر دینا چاہیے۔

بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡهُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۲۵﴾
وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِيۡمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡـًٔا وَّطَهِّرۡ

میں کسی انحراف، کسی ظلم[۴۳] کے ارتکاب کا ارادہ کرے گا،[۴۴] اُس کو ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ۲۵

اِنھیں یاد دلاؤ، جب ہم نے ابراہیم کے لیے اِس گھر[۴۵] کی جگہ کو ٹھکانا بنایا تھا،[۴۶]

---

[۴۳] یعنی خواہ وہ ظلم خدا کی راہ سے اور مسجد حرام کی حاضری سے روکنے کا ہو یا خود مسجد کو شرک کی نجاست سے آلودہ کر دینے کا، جس کا ارتکاب قریش مکہ اُس زمانے میں کر رہے تھے۔ آیت میں یہ لفظ 'اِلْحَاد' کے بدل کے طور پر آیا ہے جس کے معنی انحراف اور کجی کے ہیں۔ قرآن نے اِس سے انحراف کی نوعیت واضح کر دی ہے۔

[۴۴] اصل میں 'مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ب' کا صلہ اِس بات کا قرینہ ہے کہ لفظ 'يُرِدْ' یہاں 'هم' کے مفہوم پر متضمن ہے جو کسی وقتی میلان سے بھی ظہور میں آجاتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ارادہ تو بڑی بات ہے، یہاں کوئی انحراف اگر نفس کے کسی وقتی میلان کی بنا پر بھی ہوتا ہے تو اُس کی سزا بھی، جیسا کہ آگے بیان ہوا ہے، قیامت میں نہایت سخت ہو گی۔

[۴۵] اصل میں لفظ 'الْبَيْت' آیا ہے۔ اِس میں لام عہد کا ہے۔ اِس سے مراد وہی مسجد حرام ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

[۴۶] یعنی ہجرت کے بعد اُن کو یہاں لا بسایا تھا۔ یہ اُس واقعے کا ذکر ہے، جب ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے اِس قدیم گھر کو تعمیر کیا اور اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو اُسی کے حکم پر اِس کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ چنانچہ وہ یہیں آباد ہو گئے۔ قریش مکہ اُنھی کی اولاد تھے اور اپنی اِس تاریخ کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔

بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْٓ

اِس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا[۴۷] اور حکم دیا تھا کہ لوگوں میں حج کی منادی کرو، وہ تمھارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور ہر طرح کی اونٹنیوں پر سوار ہو کر بھی کہ (سفر کی وجہ سے) دبلی ہو گئی ہوں گی۔ وہ (قافلوں کی آمد و رفت سے) گہرے ہو چکے ہر دور دراز پہاڑی راستے سے آئیں گی۔[۴۸] اِس لیے آئیں گے کہ اپنی منفعت کی جگہوں پر حاضر ہوں[۴۹] اور چند متعین

---

[۴۷] طواف نذر کے پھیرے ہیں جو اپنا جان و مال اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کر دینے کی علامت کے طور پر معبد کے ارد گرد لگائے جاتے ہیں۔ اِس کی ابتدا حجر اسود کے استلام سے ہوتی ہے۔ یہ عہد و میثاق کی علامت ہے۔ رکوع و سجود اور قیام نماز کی تعبیر ہے۔ قرآن کے اِس بیان سے واضح ہے کہ یہ دین ابراہیمی کی قدیم عبادات ہیں۔ مسلمان جس طرح اب اِن سے واقف ہیں، قرآن کے مخاطبین بھی اُسی طرح اِن سے واقف تھے۔ قرآن نے اِن کا ذکر جہاں بھی کیا ہے، کسی نئے حکم کے طور پر نہیں کیا، بلکہ پہلے سے معلوم و متعارف عبادات کی حیثیت سے کیا ہے۔ لہٰذا اِن کا نام ہی اُس کے مخاطبین کو اِن کا مصداق سمجھانے کے لیے کافی ہے۔ یہاں اِن عبادات کے لیے حرم کو پاک رکھنے کی ہدایت کا ذکر ہوا ہے۔ اِس سے قریش کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس اہتمام کے ساتھ ابتدا ہی میں اِس کو لہو و لعب، اصنام و اوثان اور تمام ظاہری اور باطنی نجاستوں سے پاک رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ اِس کے بعد وہ خود دیکھ لیں کہ اُنھوں نے اِس گھر کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے اور اب ستم بالاے ستم اُن

اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا

دنوں میں[۵۰] اُن مواشی جانوروں پر اللہ کا نام لیں[۵۱] جو اللہ نے اُنھیں بخشے ہیں۔[۵۲] (تم اُن کو ذبح کرو) تو اُن سے خود بھی کھاؤ اور برے حال فقیروں کو بھی کھلاؤ۔[۵۳] پھر

لوگوں کو اِس گھر میں عبادت سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں جو توحید کے عالمی مرکز کی حیثیت سے اِس کی اصل روایت کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

۴۸؎ یہ اُس ذوق و شوق اور وارفتگی کی تصویر ہے جس کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کو اُن کی منادی کے جواب میں حجاج کے قافلوں کی سرزمین حرم میں آنے کی بشارت دی گئی ہے۔ فرمایا کہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں اور ایسے دور دراز علاقوں سے اِس گھر کی طرف رجوع کریں گے کہ اُن کے اونٹ سفر کی طوالت سے لاغر اور راستے آمد و رفت کی کثرت سے گہرے ہو جائیں گے۔ یہ بشارت حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو ضمناً قریش کے رویے پر تعریض بھی ہے کہ جہاں اِس گھر کا مالک چاہتا ہے کہ لوگ اِس ذوق و شوق کے ساتھ آئیں، وہیں وہ لوگوں کو اِس سے روکنے کے درپے ہو رہے ہیں۔

۴۹؎ یعنی اُن جگہوں پر جو مناسک حج کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ لوگ جب حج و عمرہ کے لیے اِن جگہوں پر آتے ہیں تو اِن سے خدا کی سچی معرفت اور شیطان سے لڑتے رہنے کی قوت اور امت مسلمہ کی وحدت کا نقش دل و دماغ پر لے کر جاتے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنھیں آیت میں اِن جگہوں کی منفعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۵۰؎ اِن سے یوم النحر (۱۰/ ذوالحجہ) اور اُس کے بعد کے تین دن مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو وقت اور جگہ کسی کام کے لیے مقرر کر دی ہے، اُس کی تمام برکتیں اُسی وقت اور جگہ میں اُس کو کرنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ خدا کی دنیا میں جس طرح بہار کے لیے ایک موسم ہے، اُسی

نُذُوۡرَهُمۡ وَلۡيَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ ﴿۲۹﴾

چاہیے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور اِس قدیم گھر کا طواف کریں۔[۵۴] ۲۶-۲۹

طرح عبادات کے لیے بھی ہے اور اُن کے ثمرات اُسی موسم میں اُن کو ادا کرنے سے حاصل ہوتے ہیں جو اُن کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔

۵۱؎ یعنی اُس کا نام لے کر اُنھیں ذبح کریں۔ قرآن میں یہ تعبیر اِسی مفہوم کے لیے اختیار کی گئی ہے اور اِس بات کی دلیل ہے کہ خدا کے دین میں اُس کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کرنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ وضاحت کر دی ہے کہ جانور خدا کے نام پر ذبح نہ کیا گیا ہو تو اُس کا کھانا ممنوع ہے۔

۵۲؎ مطلب یہ ہے کہ خود بخود میسر نہیں ہو گئے اور نہ کسی اور نے بخشے ہیں۔ یہ اُن کو اللہ ہی نے عطا فرمائے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اِن کو اُسی کے نام پر ذبح کیا جائے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو وہ ہتک جان کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس پر سزا ہو سکتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... اِس اسلوب میں اللہ تعالیٰ کے شکر کی ترغیب و تشویق بھی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کو چوپایے اپنے فضل و رحمت سے عطا فرمائے ہیں۔ اُن کا حق یہ ہے کہ بندے اِس نعمت کے شکر کے طور پر اُن کا نذرانہ اپنے رب کے حضور میں پیش کریں۔“

(تدبر قرآن ۵/ ۲۴۴)

۵۳؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ خدا کے لیے قربانی کی ہے تو اب اِس کا گوشت بھی اُسی کے لیے خاص رہنا چاہیے۔ چنانچہ آگے وضاحت کر دی ہے کہ خدا کو اِس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کو تمھاری قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں، بلکہ دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔

ذٰلِكَ ق وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ
وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ

یہ باتیں ہیں (جو ابراہیم کو بتائی گئی تھیں۔ اِن کو اچھی طرح سمجھ لو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں[۵۵] کی تعظیم کرے گا تو اُس کے پروردگار کے نزدیک یہ اُس کے حق میں بہتر ہے۔ اور (یہ بھی کہ جانوروں کے بارے میں اِن مشرکین کے توہمات بالکل بے بنیاد ہیں)[۵۶]۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارے لیے چوپایے حلال ٹھیرائے گئے ہیں، سوائے اُن کے جو تمھیں (قرآن میں) بتائے جا رہے

---

[۵۴] حج ابلیس کے خلاف جس جنگ کی تمثیل ہے، اُس کا منتہاے کمال قربانی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ حج اگرچہ قربانی کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے، لیکن لوگوں کو چاہیے کہ منیٰ ہی سے گھروں کو روانہ نہ ہوں، بلکہ احرام کی پابندیوں سے نکل کر نہائیں دھوئیں، اگر کوئی نذر مانی ہو تو اُس کو پورا کریں اور بیت اللہ کا طواف کر کے گھروں کو جائیں۔ خدا کے اِس گھر کی تعظیم کا یہی تقاضا ہے۔ بیت اللہ کے لیے آیت میں 'الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ'، یعنی قدیم گھر کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ خدا کا اصل اور قدیم گھر یہی ہے نہ کہ بیت المقدس، جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے۔

[۵۵] یعنی اُن حرمتوں کی جو مسجد حرام اور حج اور عمرے اور ام القریٰ مکہ کے باب میں قائم کی گئی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ مشرکین قریش نے جو رویہ اِس معاملے میں اختیار کر رکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی قائم کردہ تمام مقدس روایات اِن ظالموں نے اپنے دنیوی مفادات کے لیے بدل ڈالی ہیں، اُس سے ہر حال میں احتراز کرو۔

[۵۶] یہ اُن توہمات کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۱۰۳ میں ہوا ہے، یعنی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ۔

مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ
بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ
الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾ ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ
يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ

ہیں۔ سو بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بھی (جو اُن کے حوالے سے کسی چیز کو حلال اور کسی کو حرام ٹھیرا کر اللہ پر باندھتے ہو)[۵۷] اور اُس کے شعائر کی تعظیم کرو، اللہ کی طرف یک سو ہو کر، کسی کو اُس کا شریک کر کے نہیں۔ اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کے شریک ٹھیراتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا ہے[۵۸]۔ اب پرندے اُس کو اچک لے جائیں گے یا ہوا اُس کو کسی دور دراز جگہ پر لے جا کر پھینک دے گی[۵۹]۔ یہ باتیں ہیں، (اِنھیں اچھی طرح سمجھ لو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر[۶۰] کی تعظیم کرے گا تو یہ دلوں کی پرہیزگاری میں داخل ہے۔ (یہ ہدی کے جانور بھی

---

[۵۷] یہ ظاہر ہے کہ 'إفتراء علی اللّٰہ' ہے۔ آیت میں اِسی کو 'قَوْلَ الزُّوْرِ' سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ بتوں کی گندگی سے بچو اور اِس جھوٹی بات سے بھی۔

[۵۸] یعنی ایک خدا کو مان کر وہ علم و نظر اور ایمان و عقیدہ کے جس آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر رہا تھا، اُس سے گر پڑا ہے۔

[۵۹] مطلب یہ ہے کہ اب ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس شیطان کے ہتھے چڑھ جائے گا یا ہوائے نفس اُس کو لے جا کر کس گہرے کھڈ میں ڈال دے گی۔

[۶۰] یہ شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی علامت کے ہیں۔ اصطلاح میں اِس سے مراد وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور رسول کی طرف سے کسی حقیقت کا شعور قائم رکھنے کے لیے بطور ایک نشان

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾

اللہ کے شعائر میں سے ہیں، لیکن اللہ کا حکم یہ ہے کہ) اِن میں تمھارے لیے ایک مقرر وقت تک طرح طرح کی منفعتیں ہیں،[۶۱] پھر اِن کو (قربانی کے لیے) خدا کے اُسی قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔[۶۲] ۳۰-۳۳

کے مقرر کیے گئے ہوں۔ اِن شعائر میں اصل مطمح نظر تو وہ حقیقتیں ہوا کرتی ہیں جن کی یہ علامت ہوتے ہیں، لیکن اِنھی حقیقتوں کے تعلق سے یہ شعائر بھی دین میں تقدس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ تاہم یہ بات اِن کے بارے میں ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ جو حقیقتیں اِن میں مضمر ہوتی ہیں، وہ اگر لوگوں کے دل و دماغ میں زندہ نہ رہیں تو اِن شعائر کی حیثیت روح کے بغیر ایک قالب سے زیادہ کی نہیں رہتی۔ اِسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ تمام شعائر اللہ اور رسول کے مقرر کردہ ہیں اور اِن کی تعظیم کے حدود بھی اللہ و رسول نے ہمیشہ کے لیے طے کر دیے ہیں۔ لہٰذا اب کوئی شخص نہ اپنی طرف سے اِن میں کوئی اضافہ کر سکتا ہے اور نہ اِن کی تعظیم کے حدود میں کسی نوعیت کی کوئی تبدیلی کر سکتا ہے۔ اِس طرح کی ہر چیز ایک بدعت ہوگی جس کے لیے دین میں ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہے۔

[۶۱] قربانی کے جانوروں سے کوئی فائدہ اٹھانا بالعموم ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ عرب کے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ چونکہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں، اِس لیے اِنھیں بالکل کوتل قربانی کے لیے لے جانا چاہیے۔ قرآن نے یہ اِسی خیال کی تردید فرمائی ہے کہ اِن شعائر کی تعظیم کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ قربانی کا وقت آ جانے تک اِن جانوروں سے ہر طرح کا فائدہ اٹھانا بالکل جائز ہے۔

[۶۲] یعنی کسی بت خانے یا استھان کی طرف نہیں، بلکہ خدا کے اُسی قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے جس کے لیے یہ شعائر مقرر کیے گئے ہیں۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى
مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ
اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۙ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ
وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِى
الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کی عبادت مشروع کی ہے[٦٣] تا کہ اللہ نے جو مواشی جانور اُن کو بخشے ہیں، اُن پر وہ اللہ کا نام لیں، (کسی اور کا نہیں)۔ سو تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کرو[٦٤] (اور اُسی کے آگے جھکے رہو)، اور اُنھیں خوش خبری دو، (اے پیغمبر)، جن کے دل اُس کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب اُن کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے تو اُن کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ اُن پر جو مصیبت آتی ہے، اُس پر صبر کرنے والے اور نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم

---

[٦٣] اِس سے واضح ہے کہ شرائع الٰہی میں قربانی ایک قدیم ترین عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی شکر گزاری کے لیے مشروع فرمائی ہے۔ یہ، اگر غور کیجیے تو پرستش کا منتہائے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے، 'بسم اللّٰه، واللّٰه أكبر' کہہ کر، ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔ یہی نذر اسلام کی حقیقت ہے۔ اِس لیے کہ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ سر اطاعت جھکا دیا جائے اور آدمی اپنی عزیز سے عزیز متاع، حتیٰ کہ اپنی جان بھی اللہ کے حوالے کر دے۔ قربانی اِسی حقیقت کا علامتی اظہار ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو یہ دراصل اپنا ذبیحہ ہے جو جانور کے ذبیحہ کی صورت میں ممثل ہوتا ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖق
فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا

نے اُن کو بخشا ہے، اُس میں سے وہ (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں[٦٥]۔ ٣٤-٣٥

(اونٹ کی قربانی میں بھی تم میں سے کسی کو تردد نہیں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ) قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر الٰہی میں شامل کیا ہے[٦٦]۔ اُن میں تمھارے لیے بڑے خیر ہیں[٦٧]۔ سو اُن کو صف بستہ کرکے[٦٨] اُن پر بھی اللہ کا نام لو[٦٩]۔ پھر

٦٤ یہی حوالگی قربانی کی اصل روح ہے۔

٦٥ یہ ترغیب و تسہیل کا اسلوب ہے، اِسے نگاہ میں رکھنا چاہیے اور نماز اور انفاق کے باہمی تعلق کو بھی کہ اِس کے بغیر دین کی حکمت واضح نہیں ہوتی۔

٦٦ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ عرب میں یہود بھی تھے اور ایک کمزور روایت کی بنا پر اُنھوں نے اونٹ کو حرام قرار دے رکھا تھا۔* چنانچہ اُنھوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ نیا دین حضرت ابراہیم کا دین کس طرح ہو سکتا ہے؟ اِس نے تو ایک ایسے جانور کی قربانی کو خدا کے تقرب کا ذریعہ بنا دیا ہے جو ہمیشہ سے حرام رہا ہے۔ سورۂ آل عمران (٣) کی آیت ٩٣ میں قرآن نے اِس کا جواب دیا ہے۔

٦٧ یعنی بڑی برکتیں اور فوائد ہیں۔ یہ اِس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اونٹ کی قربانی، خاص طور پر، اہل عرب کو کیوں کرنی چاہیے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...اونٹ عرب کے محبوب ترین جانوروں میں سے ہے۔ یہ اُن کے صحرا کا سفینہ، اُن کے تمام سفر و حضر کا رفیق اور اُن کی تمام تجارتی سرگرمیوں کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ اُس کے دودھ، گوشت اور کھال ہر چیز سے بیش از بیش فائدے اٹھاتے تھے۔ قرآن نے اُس کی

---

* استثنا ١٤: ٧۔

مِنۡهَا وَاَطۡعِمُوا الۡقَانِعَ وَالۡمُعۡتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرۡنٰهَا لَكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۝۳۶ لَنۡ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنۡ يَّنَالُهُ

جب (قربانی کے بعد) وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں[۷۰] تو اُن میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو (محتاج ہیں، مگر) قناعت کیے بیٹھے ہیں[۷۱] اور اُن کو بھی جو بے قرار ہو کر مانگنے کے لیے آ جائیں۔ اِن جانوروں کو ہم نے اِسی طرح تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے[۷۲] تاکہ تم شکر ادا کرو۔ اللہ کو نہ اِن کا گوشت پہنچتا ہے نہ اِن کا خون، بلکہ اُس کو

اِنھی منفعتوں اور برکتوں کے سبب سے اہل عرب کو اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی اِس نعمت کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز باعتبار دنیا اہل عرب کے لیے اتنی نفع بخش اور بابرکت ہو، اگر وہ اُس کو اپنے رب کی خوشنودی کے لیے قربان کریں تو یہ اُن کے لیے خدا کے تقرب کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہو سکتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۵/۲۵۰)

۶۸ یعنی اُسی طرح صفوں میں کھڑا کر کے، جس طرح خدا کے حضور نماز کے لیے قیام کیا جاتا ہے۔

۶۹ آگے کا جملہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ جانور پر اللہ کا نام لینا اُس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کے لیے قرآن کی خاص تعبیر ہے۔ اِس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کی شریعت میں جانور کے ذبح کرنے کا کوئی تصور اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کے سوا نہیں ہے۔

۷۰ یعنی سجدہ ریز ہو جائیں۔

۷۱ مانگنے والوں پر یہ قناعت پیشہ محتاجوں کی تقدیم بتا رہی ہے کہ غربا کے لیے اللہ تعالیٰ کو یہی رویہ پسند ہے۔

۷۲ یعنی اِس درجہ تابع فرمان بنا دیا ہے کہ اُن کو ذبح یا نحر کر کے اُن کی قربانی تک خدا

الَتَّقْوٰی مِنْکُمْ ؕ کَذٰلِکَ سَخَّرَهَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىکُمْ ؕ
وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ ۳۷
اِنَّ اللّٰهَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ
خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ۳۸ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ

صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔[۳] اِسی طرح اللہ نے اُن کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر تم اللہ کی بڑائی بیان کرو۔[۴] (یہی طریقہ ہے اُن کا جو خوبی کا رویہ اختیار کریں) اور (اے پیغمبر)، اُن لوگوں کو بشارت دو جو خوبی کا رویہ اختیار کرنے والے ہیں۔ ۳۶-۳۷

(اِس کے برخلاف جو لوگ اللہ کی راہ سے روک رہے ہیں، اُن کے بارے میں) اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ (اُن کے مقابلے میں اب) اُن لوگوں کی مدافعت کرے گا جو ایمان لے آئے ہیں۔[۵] حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی دغاباز ناشکرے کو

کے حضور میں پیش کر دیتے ہو۔

[۳] یہ قرآن نے اُن تمام تصورات کی تردید کر دی ہے جو مشرکین نے قربانی کی عبادت سے متعلق قائم کر رکھے تھے۔

[۴] قربانی کی حقیقت نذر اور اُس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔ قرآن نے یہ اِسی مقصد کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[۵] اِن آیتوں کے مضمون سے واضح ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد یہ مدینہ میں نازل ہوئی

عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۨ ۙ ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ

پسند نہیں کرتا[۶]۔ (چنانچہ) جن سے جنگ کی جائے، اُنھیں جنگ کی اجازت دے دی گئی ہے، اِس لیے کہ اُن پر ظلم ہوا ہے اور اللہ یقیناً اُن کی مدد پر قادر ہے۔ وہ جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، صرف اِس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے[۷]۔ (یہ اجازت اِس لیے دی گئی کہ) اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے

ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ اب جزا و سزا کا مرحلہ شروع ہو گیا ہے جس میں مسلمان اگر کوئی اقدام کریں گے تو اللہ یقیناً اُن کی مدد کرے گا۔ آیت ۴۱ تک اِسی مضمون کی وضاحت ہے۔

[۶] یہ قریش کی طرف اشارہ ہے جو اپنے آبا —— ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام —— سے کیا ہوا عہد بھلا چکے تھے اور بیت اللہ کے نام پر حقوق تو حاصل کرتے تھے، لیکن جس خدا نے یہ حیثیت اُن کو دی تھی، اُس کی شکر گزاری کا حق ادا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

[۷] یہ قرآن کی پہلی آیات ہیں جن میں مہاجرین صحابہ کو اِس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ اگر چاہیں تو جارحیت کے جواب میں جنگ کا اقدام کر سکتے ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنھیں بالکل بے قصور محض اِس جرم پر اُن کے گھروں سے نکلنے کے لیے مجبور کر دیا گیا کہ وہ اللہ ہی کو اپنا رب قرار دیتے تھے۔ قریش کے شدائد و مظالم کی پوری فرد قرارداد جرم، اگر غور کیجیے تو اِس ایک جملے میں سمٹ آئی ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے وطن اور گھر بار کو اُس وقت تک چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، جب تک اُس کے لیے وطن کی سرزمین بالکل تنگ نہ کر دی جائے۔ آیت میں 'بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا' کا اشارہ اِنھی مظالم کی طرف ہے اور قرآن نے اِنھی کی بنیاد پر مسلمانوں کو یہ حق دیا ہے کہ اب وہ جارحیت کے خلاف تلوار اٹھا سکتے ہیں، خواہ یہ جارحیت خدا کی راہ سے اُنھیں روکنے کے لیے کی جائے یا حرم کی راہ سے۔

الحج ۲۲

بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا ؕ وَلَيَنۡصُرَنَّ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ ؕ اِنَّ

ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں اور گرجے اور کنیسے[۸؎] اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب ڈھائے جا چکے ہوتے[۹؎]۔ اللہ ضرور اُن

یہ حق اُنھیں بحیثیت جماعت دیا گیا ہے، اِس لیے کہ اپنی انفرادی حیثیت میں وہ اِن آیتوں کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا اِس معاملے میں اقدام کا حق بھی اُن کے نظم اجتماعی کو حاصل ہے۔ اُن کے اندر کا کوئی فرد یا گروہ ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اُن کی طرف سے اِس طرح کے کسی اقدام کا فیصلہ کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ مسلمانوں کا حکمران اُن کی سپر ہے، قتال اُسی کے پیچھے رہ کر کیا جاتا ہے*۔

۸؎ اصل میں 'صَوَامِع'، 'بِيَع' اور 'صَلَوٰت' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'صَوَامِع' 'صومعة' کی جمع ہے۔ مسیحی راہب جن بلند پہاڑوں اور عمارتوں میں خلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے تھے، یہ لفظ اصلاً اُن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے اِسی رعایت سے اِس کا ترجمہ 'خانقاہیں' کیا ہے۔ 'بِيَع' 'بيعة' کی جمع ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ، دونوں کے عبادت خانوں کے لیے آتا ہے، لیکن یہود کے عبادت خانوں کے لیے الگ لفظ 'صَلَوٰت' آ گیا ہے، اِس لیے اِس کو یہاں مسیحی عبادت گاہوں کے لیے خاص سمجھنا چاہیے۔ 'صَلَوٰت' 'صلوة' کی جمع ہے۔ اِس سے مراد یہودیوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہودیوں کے ہاں اِس کا نام 'صلوتا' تھا جو آرامی زبان کا لفظ ہے۔

۹؎ مطلب یہ ہے کہ جنگ کوئی مطلوب چیز نہیں ہے، لیکن خدا کی طرف سے اِس کی اجازت ہمیشہ اِسی لیے دی گئی ہے کہ یہ اگر نہ دی جاتی تو قوموں کی سرکشی اِس انتہا کو پہنچ جاتی

---

* بخاری، رقم ۲۹۵۷۔

اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا

لوگوں کی مدد کرے گا جو اُس کی مدد کے لیے اُٹھیں گے۔[۸۰] اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ زبردست ہے، وہ سب پر غالب ہے۔[۸۱] وہی[۸۲] کہ جن کو اگر ہم اِس سرزمین میں

کہ تمدن کی بربادی کا تو کیا ذکر، معبد تک ویران کر دیے جاتے اور اُن جگہوں پر خاک اڑتی جہاں شب و روز اللہ پروردگار عالم کا نام لیا جاتا اور اُس کی عبادت کی جاتی ہے۔ اِس میں خاص طور پر یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں کا ذکر اِس لیے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے کسی اقدام پر مذہبی نقطۂ نظر سے وہی معترض ہو سکتے تھے۔ اُنھیں بتایا گیا ہے کہ تمھاری یہ عبادت گاہیں آج اگر قائم ہیں تو اِسی لیے قائم ہیں کہ خدا کے صالح بندے اُن لوگوں کے مقابلے میں اپنی جان دے کر اِن کی حفاظت کرتے رہے ہیں جو اِن کی ویرانی کے درپے ہوئے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی جنگ کی اجازت اِسی مقصد سے دی جا رہی ہے کہ وہ خدا اور اُس کے حرم کی راہ سے روکنے والوں کو اُن کے اِس ظلم سے باز رکھ سکیں۔

۸۰۔ اوپر جس وعدۂ نصرت کا ذکر ہے، یہ اُس کی تاکید مزید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا اور اُس کے حرم کی راہ سے روکنے والوں کے خلاف اٹھنا درحقیقت خدا کی مدد کے لیے اٹھنا ہے اور خدا کی سنت یہ ہے کہ جو اُس کی مدد کے لیے اٹھے، خدا ضرور اُس کی مدد کرتا ہے۔ اِس نصرت الٰہی کا ضابطہ سورۂ انفال (۸) کی آیات ۶۵-۶۶ میں بیان ہو چکا ہے۔

۸۱۔ اِس جملے میں کئی پہلو ملحوظ ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”خدا قوی و عزیز ہے، اِس وجہ سے وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ اُس کی مدد کرتے ہیں، وہ درحقیقت خود اپنے لیے خدا کی مدد کی راہ کھولتے ہیں۔
>
> مسلمان اپنی قلت تعداد اور دشمن کی بھاری جمعیت سے ہراساں نہ ہوں۔ جو خداوند

الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ

اقتدار بخشیں گے تو نماز کا اہتمام کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے[۸۳] اور بھلائی کی

ذوالجلال اُن کی پشت پناہی کا وعدہ کر رہا ہے، وہ قوی و عزیز ہے۔

کفار مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر اِس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ یہ چند چنے بھلا کیا بھاڑ پھوڑیں گے! یہی قطرے اب طوفان بنیں گے، اِس لیے کہ اِن کو خدا کی نصرت و حمایت حاصل ہے اور خدا قوی و عزیز ہے۔" (تدبر قرآن ۵/۲۵۷)

۸۲۔ یہاں سے آگے اب اللہ تعالیٰ نے وہ فرائض بیان فرمائے ہیں جو مسلمانوں کو اگر کسی جگہ اقتدار حاصل ہو تو اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر عائد ہوتے ہیں۔ آیت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جن لوگوں سے اقتدار چھین کر اُسے مسلمانوں کے سپرد کیا جائے گا، اُنھوں نے یہ فرائض پورے نہیں کیے، بلکہ اِنھیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ چنانچہ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد خدا کا قانون یہی ہے کہ اِس طرح کے غاصبوں کو اقتدار سے معزول کر دیا جائے۔

۸۳۔ حکومت کی سطح پر نماز قائم کرنے کے لیے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی ہے، اُس کی رو سے، اولاً مسلمانوں کے ارباب حل و عقد خود بھی نماز کا اہتمام کریں گے اور اپنے عمال کو بھی اِس کا پابند بنائیں گے، ثانیاً نماز جمعہ اور نماز عیدین کا خطاب اور اُن کی امامت ہر جگہ یہ ارباب حل و عقد اور اِن کے مقرر کردہ حکام ہی کریں گے یا اِن کی طرف سے اِن کا کوئی نمایندہ یہ خدمت انجام دے گا۔ اِسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں یہ سنت قائم فرمائی ہے کہ یہی تنہا ٹیکس ہے جو مسلمانوں پر عائد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ریاست کے مسلمان شہریوں میں سے ہر وہ شخص جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، اپنے مال، مواشی اور پیداوار میں مقررہ حصہ اپنے سرمایے سے الگ کر کے لازماً حکومت کے حوالے کر دے گا اور حکومت دوسرے مصارف کے ساتھ اُس سے اپنے حاجت مند شہریوں کی ضرورتیں، اُن کی فریاد سے پہلے، اُن کے دروازے پر پہنچ کر پوری کرنے کی کوشش کرے گی۔

الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۴۱)

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۙ (۴۲) وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۙ (۴۳) وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ

تلقین کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔[۸۴] (اللہ ضرور اُن کی مدد کرے گا) اور سب کاموں کا انجام تو اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔[۸۵] ۳۸-۴۱

(اے پیغمبر)، اگر یہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو اِس پر تعجب کیوں؟ اِن سے پہلے نوح کی قوم، عاد و ثمود، ابراہیم کی قوم، لوط کی قوم اور مدین کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں، اور موسیٰ کو بھی اِسی طرح جھٹلایا گیا تھا۔[۸۶] پھر اُن کے منکروں کو میں نے کچھ ڈھیل

---

[۸۴] بھلائی کے لیے اصل میں 'مَعْرُوْف' اور برائی کے لیے 'مُنْکَر' کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی وہ چیزیں جنھیں پوری انسانیت بھلائی یا برائی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ یہ ذمہ داری، ظاہر ہے کہ بعض معاملات میں تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اور بعض معاملات میں قانون کی طاقت سے پوری کی جائے گی۔ پہلی صورت کے لیے جمعہ کا منبر ہے جو اِسی مقصد سے ارباب حل و عقد کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ دوسری صورت کے لیے پولیس کا محکمہ ہے جو مسلمانوں کی حکومت میں اِسی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا جاتا اور اپنے لیے متعین کردہ حدود کے مطابق اِس کام کو انجام دیتا ہے۔

[۸۵] مطلب یہ ہے کہ اِس وقت حالات جیسے بھی ہوں، انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اُس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اب مسلمانوں کی مدد کرے گا۔ چنانچہ منکرین متنبہ ہو جائیں کہ اب اُن کا معاملہ اِن مظلوموں کے ساتھ نہیں، بلکہ زمین و آسمان کے خالق، اللہ پروردگار عالم کے ساتھ ہے۔

كَانَ نَكِيرِ ﴿۴۴﴾ فَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيدٍ ﴿۴۵﴾ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَّعْقِلُونَ بِهَا أَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُونَ بِهَا ۚ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿۴۶﴾

دی، پھر اُن کو دھر لیا تو دیکھو کہ کیسی ہوئی میری پھٹکار! سو کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کیا ہے اور وہ ظالم تھیں۔ اب وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں۔ اور کتنے کنویں بے کار[۸۷] اور کتنے پختہ محل ہیں جو ویران پڑے ہیں[۸۸]۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ (عبرت کی اِن جگہوں کو دیکھ کر) اِن کے دل ایسے ہو جاتے کہ یہ اُن سے سمجھتے اور کان ایسے ہو جاتے کہ اُن سے سنتے؟ سو بات یہ ہے کہ سروں کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں[۸۹]۔ ۴۲-۴۶

---

[۸۶] موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی قوم نے نہیں، بلکہ فرعون نے جھٹلایا تھا۔ اُن کی تکذیب کا ذکر غالباً اِسی بنا پر صیغۂ مجہول سے کیا ہے۔

[۸۷] اُس زمانے کے عرب میں پانی کی قلت کے باعث بستیاں کنووں ہی سے آباد ہوتی تھیں، اِس لیے اُن کی ویرانی گویا اِس بات کی تعبیر ہے کہ تمام چہل پہل اور رہا ہمی ختم ہو گئی ہے۔

[۸۸] آیت میں یہ الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف کر دیے گئے ہیں۔

[۸۹] دلوں کے ساتھ یہ قید اِس بات کا قرینہ ہے کہ آنکھوں کے ساتھ بھی ’فی الرؤوس‘

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ
وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ
قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾

یہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں، دراں حالیکہ (اللہ نے عذاب کی وعید سنائی ہے تو) اللہ ہرگز اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ (اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) تیرے پروردگار کے ہاں کا ایک دن تمھاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔[۹۰] (سو یہ بھی بے خوف نہ ہوں)۔ کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو میں نے اُن کے ظلم کے باوجود اِسی طرح ڈھیل دی، پھر اُن کو پکڑ لیا اور سب کو واپس تو میرے پاس ہی آنا ہے۔ ۴۷-۴۸

یا اِس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ یہ سائنس کی نہیں، بلکہ ادب کی زبان ہے اور ادبی زبان میں دماغ کے بیش تر افعال دل ہی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... چونکہ یہاں حال بے بصیرت لوگوں کا بیان ہو رہا ہے، اِس وجہ سے ضروری ہوا کہ دل کا پتا اُس کے مقام و محل کے تعین کے ساتھ دیا جائے کہ اصلی اندھا پن دل کا اندھا پن ہے اور یہ مکذبین رسول اِسی اندھے پن میں مبتلا ہیں۔ کوئی اِن کے سر کی آنکھیں کھلی دیکھ کر اِن کو بینا نہ سمجھے، اِس لیے کہ آنکھوں کے اندر بصیرت کی روشنی دل کی راہ سے آتی ہے اور اِن کے دل کی آنکھیں بالکل اندھی ہیں۔“ (تدبر قرآن ۵/۲۶۵)

[۹۰] مطلب یہ ہے کہ خدا کے معاملات کو اپنے محدود پیمانوں سے نہیں ناپنا چاہیے۔ تمھارے ہاں صدیاں گزر جاتی ہیں، لیکن خدا کی تقویم میں شاید چند لمحے بھی نہیں گزرے ہوتے۔ اِس کو اِس مثال سے سمجھ لو کہ تمھارے ہاں کے ایک ہزار سال بعض اوقات خدا کے ہاں ایک دن کی

قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمۡ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۚ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ﴿۵۰﴾
وَالَّذِيۡنَ سَعَوۡا فِىۡۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيۡنَ اُولٰۤٮِٕكَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ ﴿۵۱﴾
وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى

الحج
۲۲

اِن سے کہہ دو کہ لوگو، میں تمھارے لیے صرف ایک کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں۔[91] پھر جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے، اُن کے لیے مغفرت بھی ہے اور عزت کی روزی بھی۔ اور جن کی تگ و دو ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کے لیے ہے، وہی دوزخ کے لوگ ہیں۔ ۴۹-۵۱

ہم نے (اے پیغمبر)، تم سے پہلے جو رسول اور جو نبی بھی بھیجا ہے،[92] اُس کے

طرح ہوتے ہیں۔ اِس لیے عذاب کے لیے جلدی مچانے کے بجاے اُس مہلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو جو خدا نے اِس وقت تمھیں دے رکھی ہے۔

[91] اصل میں 'نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی ادب کے ذوق آشنا جانتے ہیں کہ اِس میں نذیر عریاں کی طرف تلمیح ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...عربوں میں یہ طریقہ تھا کہ قبیلہ یا قافلہ جہاں ڈیرا ڈالتا، وہاں کسی اونچی جگہ پر ایک نگران پہرا دیتا اور اگر وہ کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرتا تو اپنے کپڑے اتار کر ننگا ہو جاتا اور خطرے کا اعلان کرتا جس کے بعد قبیلے یا قافلے کے سارے مرد تلواریں سونت کر مدافعت کے لیے تیار ہو جاتے۔ اِس کو 'نذیر عریاں' کہتے تھے۔ یہ تعبیر چونکہ ناشایستہ تھی، نبی کے لیے اِس کا استعمال موزوں نہ تھا، اِس وجہ سے قرآن نے اِس کو 'نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ' کی شکل میں شایستہ بنا لیا ہے۔" (تدبر قرآن ۵/۲۶۷)

[92] یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ نبی اور رسول میں فرق ہے۔ یہ فرق کیا ہے؟ قرآن

اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ
ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۵۲) ۙ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي
الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ

ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ اُس نے جب بھی کوئی تمنا کی[۹۳]، شیطان اُس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا ہے[۹۴]۔ پھر شیطان کی اِس خلل اندازی کو اللہ مٹا دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیتوں کو قرار بخشتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے[۹۵]۔ یہ اِس لیے ہوتا ہے کہ اللہ شیطان کی اِس خلل اندازی کو اُن لوگوں کے لیے فتنہ بنا دے جن کے دلوں میں (نفاق

کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو خلق کی ہدایت کے لیے مبعوث فرماتا ہے اور اپنی طرف سے وحی و الہام کے ذریعے سے اُن کی رہنمائی کرتا ہے، اُنھیں نبی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہر نبی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ رسول بھی ہو۔ رسالت ایک خاص منصب ہے جو نبیوں میں سے چند ہی کو حاصل ہوا ہے۔ قرآن میں اِس کی تفصیلات کے مطابق رسول اپنے مخاطبین کے لیے خدا کی عدالت بن کر آتا اور اُن کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ اُس کے ماننے والوں کو غلبہ عطا فرماتا اور اُس کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتا ہے۔

[۹۳] نبی کی تمنا، ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتی ہے کہ اُس کی مساعی بارآور ہوں اور قوم کے ارباب حل و عقد اُس کی دعوت پر ایمان لے آئیں۔ چنانچہ وہ ہر صبح اِس آرزو کے ساتھ اٹھتا ہے کہ آج کسی عتبہ، کسی مغیرہ، کسی عمرو یا عمر کو اللہ ضرور یہ سعادت عطا فرمائے گا کہ وہ اُس کی دعوت کو قبول کر لے۔

[۹۴] یعنی اُس نے اِس تمنا کے بر آنے میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے قسم قسم کے شبہات، اعتراضات، طعن و تشنیع اور شگوفہ بازیوں کا ایک طوفان برپا کر دیا ہے۔

وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۝۵۳ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ
اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۴

کا) روگ ہے اور جن کے دل سخت ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم (اپنی) مخالفت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ اور اِس لیے بھی ہوتا ہے کہ جن کو خدا کی کتاب کا علم عطا ہوا ہے، وہ اچھی طرح جان لیں کہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق آیا ہے۔ سو اُن کے ایمان اُس پر پختہ ہوں اور اُن کے دل اُس کے آگے جھک جائیں[۹۶]۔ اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اُن لوگوں کو جو ایمان لے آئے ہیں، ضرور سیدھی راہ دکھائے گا[۹۷]۔ ۵۲-۵۴

---

۹۵ یعنی اُس کے پیدا کیے ہوئے شبہات و اعتراضات کی حقیقت لوگوں پر واضح کر دیتا ہے۔ چنانچہ اُس کے اٹھائے ہوئے سب فتنے بالآخر جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں اور خدا کی آیتیں اِس طرح محکم ہو کر سامنے آتی ہیں کہ کسی سلیم الطبع انسان کے دل میں اُن کے بارے میں کوئی تردد باقی نہیں رہتا۔ اللہ شیطان کو شبہات و اعتراضات پیدا کرنے کا یہ موقع اِس لیے دیتا ہے کہ وہ علیم و حکیم ہے اور خوب جانتا ہے کہ دنیا جس اسکیم کے مطابق بنائی گئی ہے، وہ اِسی طرح پوری ہو سکتی ہے۔ آگے اِسی بات کی وضاحت فرمائی ہے۔

۹۶ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، تطہیر و تمحیص کے لیے ہوتا ہے کہ باطل کی پرستش کرنے والے حق پرستوں سے بالکل الگ ہو جائیں اور حق پرستوں کے یقین میں اضافہ ہو۔ دنیا میں خدا کی اسکیم کا یہی تقاضا ہے۔ اِس کے بغیر اُن لوگوں کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا جو خدا کو اپنی جنت کے لیے مطلوب ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ اشیا کی اصل حقیقت اُن کے اضداد ہی سے واضح ہوتی ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ
السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ

اِس کے برخلاف جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے، وہ اِس علم کی طرف سے شک ہی میں رہیں گے، یہاں تک کہ اُن کے سر پر قیامت یکایک آ موجود ہو یا ایک منحوس دن[۹۸] کا عذاب اُن پر نازل ہو جائے۔ (وہ اِس بات کو یاد رکھیں کہ) اُس

> ایک بات کو آپ جانتے اور مانتے ہیں، لیکن اُس کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے، وہ اگر آپ کے سامنے نہیں آیا تو اِس بات کا بڑا امکان ہے کہ وہ جب سامنے آئے تو آپ کا علم و ایمان متزلزل ہو جائے۔ لیکن وہ سب کچھ اگر آپ کے سامنے آ چکا ہے اور اُس کے کھرے کھوٹے میں امتیاز کر کے آپ نے اُس حق کو قبول کیا ہے تو اُس کو علیٰ وجہ البصیرت آپ نے اختیار کیا ہے۔ پھر اِس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ کوئی بادِ مخالف آپ کے موقف سے آپ کو ہٹا سکے۔ دین میں یہی بصیرت پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اِس دنیا میں یہ انتظام فرمایا کہ حق کے مخالفین کو بھی یہ موقع دیا ہے کہ وہ حق کے خلاف جو زہر اگلنا چاہتے ہیں، وہ اگل لیں تاکہ جو لوگ حق کو قبول کریں، محض تقلیدی طور پر نہ اختیار کریں، بلکہ پوری معرفت کے ساتھ اختیار کریں۔“ (تدبر قرآن ۵/۲۷۲)

۹۷ اوپر فرمایا تھا کہ جن کے دلوں میں منافقت کا روگ ہے، وہ اپنی مخالفت میں اتنی دور جا چکے ہیں کہ اب اُن کی بازگشت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ اُسی کے بالمقابل اب اہل ایمان کو بشارت دی ہے کہ اللہ اِن آزمایشوں میں اُن کے ایمان کو ضائع نہیں ہونے دے گا، بلکہ جب وہ ہر طرح کے امتحانات اور آزمایشوں سے گزر کر اپنی وابستگی حق کے ساتھ ثابت کر دیں گے تو اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُنھیں اُس راہ پر لے جائے گا جو سیدھی منزل کی طرف جاتی ہے۔

۹۸ اصل میں لفظ ’عَقِیْم‘ استعمال ہوا ہے۔ یہ بانجھ کے معنی میں آتا ہے جس سے بے فیض اور منحوس کا مفہوم اِس میں پیدا ہو گیا ہے، یعنی ایک ایسا دن جس میں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو، ہر

لِلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ
جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ
لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾
وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ
اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾
لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾

دن سارا اختیار اللہ ہی کا ہوگا۔ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ پھر جو ایمان لائے ہوں گے اور اُنھوں نے اچھے عمل بھی کیے ہوں گے، وہ راحت کے باغوں میں ہوں گے اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا ہے تو وہی ہیں کہ جن کے لیے ذلت کا عذاب ہے[۹۹]۔ ۵۵-۵۷

(اِن کے ظلم سے عاجز ہو کر) جن لوگوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی، پھر مارے گئے یا اپنی موت سے مر گئے، اللہ اُن کو ضرور اچھا رزق عطا فرمائے گا۔ بے شک، اللہ ہی ہے جو بہترین رزق عطا فرمانے والا ہے[۱۰۰]۔ وہ اُن کو ضرور ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ راضی ہوں گے[۱۰۱]۔ بے شک، اللہ سب کے حال سے واقف ہے، وہ بڑا

کوشش الٹی پڑے اور ہر امید مایوسی میں تبدیل ہو جائے۔

[۹۹] اِس لیے کہ اُنھوں نے خدا و رسول کے مقابلے میں استکبار کیا اور استکبار کی سزا یہی ہونی چاہیے کہ اُس میں تعذیب کے ساتھ توہین و تذلیل کی پھٹکار بھی شامل کر دی جائے۔

[۱۰۰] لفظ 'رزق' کے معنی صرف روزی کے نہیں ہیں۔ یہ خدا کے بے پایاں انعامات کی ایک جامع تعبیر ہے۔ سورۂ آل عمران (۳) کی آیت ۱۶۹ میں صراحت ہے کہ جو لوگ اللہ کی

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰
ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي

ہی برباد ہے[۱۰۲]۔ ۵۸-۵۹

یہ اِسی طرح ہوگا اور (مزید یہ کہ) جو (کسی ظلم کا) ویسا ہی بدلہ لے، جیسا اُس کے ساتھ کیا گیا[۱۰۳]، پھر اُس پر زیادتی کی جائے تو اللہ اُس کی ضرور مدد فرمائے گا۔ (لیکن چندے درگذر کرے تو بہتر ہے)، اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ معاف کرنے والا، درگذر فرمانے والا ہے۔ ۶۰

(اللہ ضرور اُس کی مدد فرمائے گا)۔ یہ اِس لیے کہ اللہ ہی ہے جو رات کو دن

راہ میں مارے جائیں، اُنھیں مردہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ اپنے پروردگار کے حضور میں زندہ ہوتے ہیں اور برزخ کی زندگی میں بھی خاص اپنے پروردگار کے خوان نعمت سے رزق پاتے ہیں۔ یہاں مزید وضاحت فرمائی ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں نکلا ہو تو اُس کی طبعی موت بھی شہادت کے حکم میں ہے۔

[۱۰۱] یعنی نہال ہو جائیں گے، اِس لیے کہ جو کچھ اُن کو ملے گا، اُس کا وہ دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

[۱۰۲] یعنی پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا، بلکہ لوگوں کو اصلاح حال کا پورا موقع دیتا ہے۔ لہٰذا اُس کے بندے مطمئن رہیں۔ وہ اعداے حق کے ہاتھوں جو کچھ جھیل رہے ہیں، وہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ اُن کے تمام حالات سے واقف ہے۔

[۱۰۳] اصل الفاظ ہیں: 'وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ'۔ اِن میں 'عُوْقِبَ بِهٖ' مجانست کے اسلوب پر ہے، جیسے 'دناهم كما دانوا'۔

الَّيۡلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَ اَنَّ
مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ هُوَ الۡبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡعَلِىُّ الۡكَبِيۡرُ ﴿۶۲﴾
اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَتُصۡبِحُ الۡاَرۡضُ
مُخۡضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيۡفٌ خَبِيۡرٌ ﴿۶۳﴾ ۚ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ﴿۶۴﴾

میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور اِس لیے کہ اللہ سمیع و بصیر ہے۔ یہ اِس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور جن چیزوں کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ سب باطل ہیں اور اِس لیے کہ اللہ ہی برتر ہے، وہ سب سے بڑا ہے[104]۔ ۶۱-۶۲

(وہ ضرور مدد فرمائے گا، اگرچہ حالات کتنے ہی ناموافق ہوں)۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا تو اُس سے زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے[105]؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا ہی باریک بین ہے، (ہر چیز کی) خبر رکھنے والا ہے[106]۔ اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو بے نیاز ہے اور وہی ستودہ صفات بھی ہے[107]۔ ۶۳-۶۴

---

[104] یہ وعدۂ نصرت کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی یہ قدرت ہے کہ لیل و نہار کی گردش اُسی کے حکم سے ہے۔ پھر وہ سمیع و بصیر بھی ہے، جو کچھ جہاں اور جس طرح ہو رہا ہے، اُس کو دیکھ اور سن رہا ہے اور اُس کے سوا کوئی دوسرا معبود بھی نہیں ہے کہ اِن ظالموں کی مدد کر سکے، نہ اُس سے کوئی بڑا یا برتر ہے تو اُس کے بندے اُس کی مدد سے کیوں محروم رہیں گے، وہ ضرور اُن کی مدد فرمائے گا۔

[105] چنانچہ اِسی طرح وہ جب چاہے گا، اپنی رحمت و نصرت کی گھٹائیں اپنے بندوں کے

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ وَالۡفُلۡكَ تَجۡرِىۡ
فِى الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَيُمۡسِكُ السَّمَآءَ اَنۡ تَقَعَ عَلَى الۡاَرۡضِ
اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۶۵﴾ وَهُوَ الَّذِىۡۤ

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے زمین کی سب چیزوں کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور کشتی کو بھی؟[۱۰۸] وہ اُس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔ اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ مبادا زمین پر گر پڑے،[۱۰۹] الاّ یہ کہ وہی اِس کا اذن دے۔ یقیناً اللہ لوگوں پر بڑا ہی

لیے بھی بھیج دے گا اور وہ نہال ہو جائیں گے۔

۱۰۶۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا یہ حوالہ نہایت لطیف طریقے سے آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یعنی وہ اپنی تدبیروں کو اِس طرح بروے کار لاتا ہے کہ کسی کو اُن کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہ بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ لوگ صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں، لیکن وہ ماضی کے پردوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے، اُس سے بھی باخبر ہے اور مستقبل کے اوٹ میں جو کچھ ہے، اُس سے بھی باخبر ہے۔“ (تدبر قرآن ۲۸۱/۵)

۱۰۷۔ یعنی صرف بے نیاز ہی نہیں، اِس کے ساتھ ستودہ صفات بھی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اُس کے بندے اُس سے مایوس ہوں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بے ہمہ ہے، لیکن ہر لحظہ اُن کا نگران اور اُن کے ساتھ بھی ہے۔

۱۰۸۔ اُس زمانے میں انسان کی سب سے اہم ایجاد کشتی تھی۔ قرآن نے بتا دیا ہے کہ وہ بھی درحقیقت خدا کی ایجاد ہے اور اُسی کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔ اِس زمانے کی غیر معمولی ایجادات کو بھی اِسی پر قیاس کر لیجیے۔

۱۰۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'اَنۡ تَقَعَ عَلَى الۡاَرۡضِ'۔ اِن میں 'اَنۡ' سے پہلے ایک مضاف عربیت

اَحۡيَاكُمۡ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡكُمۡ ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَكَفُوۡرٌ (۶۶)
لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلۡنَا مَنۡسَكًا هُمۡ نَاسِكُوۡهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى
الۡاَمۡرِ وَادۡعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسۡتَقِيۡمٍ (۶۷) وَاِنۡ

مہربان ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۱۱۰]۔ وہی ہے جس نے تمھیں زندگی دی، پھر مارتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے[۱۱۱]۔ ۶۵-۶۶

(اِنھیں اعتراض ہے کہ یہ نئی شریعت مختلف کیوں ہے؟ اِنھیں بتاؤ کہ) ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقہ مقرر کیا ہے کہ وہ اُسی پر چلیں گے[۱۱۲]۔ (ہم نے اِس وقت بھی یہی کیا ہے)۔ سو اِس معاملے میں وہ تمھارے ساتھ ہرگز کوئی جھگڑا نہ کرنے پائیں[۱۱۳]۔ لہٰذا نظر انداز کرو اور اپنے پروردگار کی طرف بلاتے رہو۔ یقیناً تم سیدھے

کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے۔

[۱۱۰] مطلب یہ ہے کہ اُس کی مہربانی اور شفقت ہے کہ زمین و آسمان قائم ہیں اور اُن کی یہ سب چیزیں تمھاری خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔

[۱۱۱] مطلب یہ ہے کہ خدا کی رأفت و عنایت سے جو نعمتیں انسان کو حاصل ہیں، اُن سے خدا کی معرفت حاصل کرنے، اُس کا شکر ادا کرنے اور اُس کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بجاے یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ انسان ناشکرا ہو کر اُس حقیقت کا انکار کیے جاتا ہے جسے پیغمبر نے پیش کیا ہے۔

[۱۱۲] آیت میں اِس کے لیے لفظ 'مَنۡسَك' استعمال ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۴۸ میں یہی مفہوم 'شِرۡعَة' اور 'مِنۡهَاج' کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ فرمایا کہ ہر امت کو اُس کے لیے خاص ایک شریعت دی گئی جس میں دوسروں سے کچھ اختلاف تھا۔ مائدہ میں اِس کی یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ اِس سے لوگوں کی آزمایش مقصود تھی کہ اللہ تعالیٰ دیکھے کہ کون ظواہر و رسوم

جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷۰﴾

راستے پر ہو۔ اِس کے بعد بھی اگر وہ تم سے جھگڑنے کے درپے ہوں تو اِن سے کہہ دو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اللہ قیامت کے دن تمھارے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے؟ یہ سب ایک دفتر میں محفوظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے لیے یہ نہایت آسان ہے[۱۱۴]۔ ۶۷-۷۰

کے تعصب میں گرفتار ہو کر حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے اور کون حق کا سچا طالب بنتا ہے اور اُس کو ہر صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، اِس لیے کہ وہ اُس کے پروردگار کی طرف سے آیا ہے۔

[۱۱۳] یعنی اِنھیں اِس معاملے میں مناظرے یا مجادلے کی کوئی راہ نہ ملے کہ اِس طرح کی فروعات کو موضوع بحث بنا کر یہ اصل بات سے لوگوں کی توجہ ہٹا دیں۔

[۱۱۴] یعنی ہزاروں، لاکھوں، بلکہ اربوں انسانوں کے ہر قول و فعل کا ریکارڈ محفوظ رکھنا اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے، اِس لیے متنبہ ہو جاؤ، یہ سب ایک دن اِس طرح سامنے آئے گا کہ ہر شخص پکار اٹھے گا کہ یہ کیسا دفتر ہے کہ جس نے ہر چھوٹی بڑی چیز پوری جزئیات کے ساتھ اپنے اندر سمیٹ لی ہے۔ آیت کا خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اِس کے لفظ لفظ میں جو عتاب ہے، اُس کا رخ تمام تر اُنھی لوگوں کی طرف ہے جو سورہ کے

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا
وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿٧١﴾ وَاِذَا
تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ
يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ
بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٧٢﴾
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ

اللہ کے سوا یہ اُن کی پرستش کرتے ہیں جن کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے اور جن کے بارے میں اِن کو کوئی علم بھی نہیں ہے۔ (یہ احمق سمجھتے ہیں کہ آخرت میں وہ اِن کے مددگار ہوں گے)۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اِنھیں جب ہماری صاف صاف آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اِن منکروں کے چہروں پر تم ناگواری دیکھتے ہو[۱۱۵]۔ گویا یہ اُن لوگوں پر حملہ کر دیں گے جو اِن کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ اِن سے کہو، تو کیا میں اِس سے بڑھ کر تمھیں ایک ناگوار چیز بتاؤں؟ دوزخ کی آگ، اللہ نے منکروں کے حق میں اُس کا وعدہ کر رکھا ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۷۱-۷۲

لوگو، (تم اپنے اِن معبودوں کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہو تو) ایک مثال بیان کی

مخاطبین ہیں اور آپ کی دعوت کا انکار کیے جا رہے تھے۔

[۱۱۵] اِس لیے کہ اُن میں زیادہ تر توحید اور اُس کے دلائل کا بیان ہوتا ہے اور اپنے مزعومہ معبودوں کے لیے جو حمیت اِن کے اندر ہے، وہ اُسے گوارا نہیں کرتی۔

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ
وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ
الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾
اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ

جاتی ہے، سو اُس کو غور سے سنو۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا تم جن کو پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، اگرچہ وہ اِس کے لیے سب مل کر کوشش کریں۔ اور اگر وہ مکھی اُن سے کچھ چھین لے تو اُس سے وہ اُس کو چھڑا بھی نہیں سکتے۔ چاہنے والے بھی بودے اور جن کو چاہتے ہیں، وہ بھی بالکل بودے[۱۱۶]۔ اِنھوں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی، جیسا کہ اُس کے پہچاننے کا حق ہے[۱۱۷]۔ بے شک، اللہ قوی ہے، وہ سب پر غالب ہے۔ ۷۳-۷۴

(یہ اِسی ناقدری کا نتیجہ ہے کہ فرشتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہیں)۔ اللہ فرشتوں میں سے بھی (اپنے) پیغام بر چنتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ (اِس سے وہ خدائی

---

[۱۱۶] اِس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ معبود تو اُسی کو بنایا جاتا ہے جو انسان کے ضعف اور ناتوانی کا مداوا کر سکے، لیکن یہ ایسے نادان ہیں کہ جن کو معبود بنائے ہوئے ہیں، وہ اِن سے بھی زیادہ عاجز اور بے بس ہیں۔

[۱۱۷] یعنی اُنھوں نے خدا کو مانا ہے، مگر اُس کی عظمت و قدرت کے صحیح شعور کے ساتھ نہیں مانا، ورنہ ایسے مضحکہ خیز عقیدے نہ ایجاد کرتے، اِس لیے کہ اِس طرح کے تمام عقیدے درحقیقت خدائی کے کم تر اندازے پر مبنی عقیدے ہیں۔

اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۷۵﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ
وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ السجدة وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ

میں شریک کیوں ہو جائیں گے)؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ (خود) سمیع و بصیر ہے۔ اِن (فرشتوں) کے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے، وہ اُس سے واقف ہے اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔[118] ۷۵-۷۶

ایمان والو، (اِن کا عہد تمام ہوا، اب تمھارا دور شروع ہو رہا ہے تو) رکوع و سجود کرو[119] اور اپنے پروردگار کی بندگی کرو[120] اور نیکی کے کام کرو[121] تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور

---

[118] مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کو رسالت کا منصب ضرور دیا گیا ہے، لیکن اِس لیے نہیں کہ خدا کسی بھی لحاظ سے اُن کا محتاج ہے۔ وہ کائنات کا پروردگار ہے اور اُس کا علم اور اُس کی قدرت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... اِس وجہ سے نہ وہ خدا کے علم میں کوئی اضافہ کر سکتے، نہ اُن کا کوئی قول و فعل خدا کی نگرانی سے بالاتر ہو سکتا اور نہ وہ کسی کے باب میں خدا سے یہ کہنے کی پوزیشن میں ہیں کہ اُن کو اِس کے بارے میں علم ہے، خدا کو نہیں ہے۔ سارے امور خدا ہی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔ نہ اِن فرشتوں کے آگے پیش ہوتے ہیں نہ پیش ہوں گے۔ خود اِن فرشتوں کو جو امور تفویض ہوتے ہیں، اُن کی رپورٹ بھی خدا ہی کے حضور اُن کو پیش کرنی ہوتی ہے۔“
>
> (تدبر قرآن ۵/۲۸۶)

[119] یعنی گھٹنوں پر جھک جاؤ اور اپنا سر سجدے میں ڈال دو کہ خدا کی عظمت و جلالت کے اعتراف کی اِس سے بڑھ کر کوئی صورت نہیں ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ انسان اگر پورے

جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ

(مزید یہ کہ اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے) اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو، جیسا کہ جدوجہد کرنے کا حق ہے۔[۱۲۲] اُس نے تمھیں چن لیا ہے[۱۲۳] اور (جو) شریعت (تمھیں عطا فرمائی ہے، اُس) میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔[۱۲۴]

شعور کے ساتھ رکوع و سجود کرے اور اُس پر مداومت رکھے تو کبھی استکبار میں مبتلا نہیں ہوتا اور ہمیشہ تیار رہتا ہے کہ کوئی حق آئے تو بغیر کسی تردد کے اُس کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔

الحج ۲۲

۱۲۰؎ اصل میں ’عبادت‘ کا لفظ آیا ہے اور یہ جامع مفہوم میں ہے۔ رکوع و سجود کی ہدایت کے بعد، ظاہر ہے کہ یہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے۔ چنانچہ مدعا یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں خدا ہی کی بندگی اور اُسی کی اطاعت اختیار کرو۔

۱۲۱؎ یہ مزید عام ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اِس سے اُن نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جن کا درجہ اگرچہ فرائض و اوامر کا نہیں ہے، لیکن وہ فضائل و مکارم میں داخل ہیں اور زندگی کے سنوارنے میں اُن کو بڑا دخل ہے۔

۱۲۲؎ آیت میں مضاف محذوف ہے۔ چنانچہ ’فِی اللّٰہِ‘ کا لفظ ’فی سبیل اللّٰہ‘ کے معنی میں ہے۔ یہ ہدایت اُس منصب کے حوالے سے کی گئی ہے جس کے لیے انتخاب کا ذکر آگے ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اتمام حجت کے درجے میں خدا کا پیغام پوری انسانیت تک پہنچانے کی کوشش کرو اور اِس میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ نیز اِس راہ میں اگر کوئی مزاحمت پیش آئے تو اُس کو دور کرنے کے لیے اپنے دل و دماغ، جسم و جان اور مال و دولت کی ساری قوتیں صرف کر دو۔

۱۲۳؎ یعنی اُسی طرح منتخب کر لیا ہے، جس طرح بنی آدم میں سے وہ بعض ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ اِس سے پہلے بنی اسرائیل بھی اِسی طرح منتخب کیے گئے تھے، لیکن اپنی سرکشی اور بغاوت کیشی کی وجہ سے خدا کے غضب کے مستحق ہوئے اور اُن پر لعنت کر

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۵ۙ مِنْ قَبْلُ

تمھارے باپ ـــــ ابراہیم ـــــ کی ملت تمھارے لیے پسند فرمائی ہے[125]۔ اُسی نے

دی گئی۔

١٢٤؎ یہ اِس لیے فرمایا کہ اُس کے احکام میں وہ سختی نہیں ہے جو بنی اسرائیل کی شریعت میں تھی۔ اِس تخفیف کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ بنی اسرائیل براہ راست خدا کی حکومت میں رہے، مگر بنی اسمٰعیل کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ اُن کے بارے میں خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے ارباب حل وعقد کی قیادت میں یہ خدمت انجام دیں گے۔

١٢٥؎ یعنی اصل اسلام جس میں یہودیت یا نصرانیت کی کوئی آمیزش نہیں ہے اور وہ تمھارے باپ ـــــ ابراہیم ـــــ کی ملت ہے۔ ہم نے اُسی کو تجدید واصلاح اور اُس میں بعض اضافوں کے ساتھ تمھارا دین اور تمھاری شریعت بنا دیا ہے۔ باپ کی حیثیت سے ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ بنی اسمٰعیل کی تشویق کے لیے ہے کہ یہ تمھارے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں ہے، تمھارے باپ کا دین ہے اور باپ کے دین سے زیادہ اولاد کو اور کون سا دین اور کون سی ملت مطلوب و محبوب ہو سکتی ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی اِس سے واضح ہوتی ہے کہ اصلاً اِس ذمہ داری کے لیے بنی اسمٰعیل کو چنا گیا ہے۔ دوسرے سب لوگ جب اُن کی دعوت قبول کر کے اسلام میں داخل ہوتے ہیں تو تبعاً اُس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ سورۂ بقرہ (٢) میں اللہ تعالیٰ نے اِسی بنا پر بنی اسمٰعیل کو درمیان کی جماعت 'اُمَّةً وَّسَطًا' قرار دیا ہے جس کے ایک طرف خدا اور اُس کا رسول اور دوسری طرف 'النَّاس'، یعنی دنیا کی سب اقوام ہیں اور فرمایا ہے کہ جو شہادت رسول نے تم پر دی ہے، اب وہی شہادت باقی دنیا پر تمھیں دینا ہو گی۔ سورۂ آل عمران (٣) کی آیت ٣٣ میں اِسی کو آل ابراہیم کے اصطفا سے تعبیر کیا ہے۔ بنی اسرائیل یہ ذمہ داری پوری کر رہے تھے تو اُن کی دعوت کا مرکز بیت المقدس تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اُس کی یہ حیثیت ختم ہو گئی اور اُس کی امانت بھی بنی اسمٰعیل کے سپرد کر دی گئی۔ چنانچہ قیامت تک کے لیے

وَفِیْ هٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ
عَلَی النَّاسِ ۚ ۖ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ

تمھارا نام مسلم رکھا تھا[126]، اِس سے پہلے اور اِس قرآن میں بھی (تمھارا نام مسلم ہے)۔ اِس لیے چن لیا ہے کہ رسول تم پر (اِس دین کی) گواہی دے اور دنیا کے سب لوگوں پر تم (اِس کی) گواہی دینے والے بنو[127]۔ سو نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ

دعوت حق کا مرکز اب وہی قدیم گھر ہے جسے ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنے مقدس ہاتھوں سے ام القریٰ مکہ میں تعمیر کیا تھا اور جسے 'بَیْتُ اللّٰهِ'، 'الْبَیْت'، 'الْبَیْتُ الْعَتِیْق' اور 'الْمَسْجِدُ الْحَرَام' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۱۲۶؎ یہ ابراہیم علیہ السلام کی اُس دعا کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ بقرہ (۲) میں اِس طرح نقل ہوئی ہے: 'رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ'۔ اِس میں 'امت مسلمہ' کے الفاظ اُسی امت کے لیے آئے ہیں جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے۔

۱۲۷؎ اوپر جس انتخاب کا ذکر تھا، یہ اُس کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ دین حق کی شہادت کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ شہادت محض دعوت و تبلیغ نہیں ہے، بلکہ اِس کے ساتھ خدا کی دینونت کا ظہور بھی ہے جس کے تحت یہ اگر حق پر قائم ہوں اور اُسے بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتے رہیں تو اُن کے نہ ماننے کی صورت میں اللہ تعالیٰ اُن قوموں پر اِنھیں غلبہ عطا فرماتے ہیں اور اُس سے انحراف کریں تو اُنھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اِن کا وجود اُن حقائق کی گواہی بن جاتا ہے جو یہ زبان و قلم سے پیش کرتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے بجائے 'شہادت' کا لفظ اِسی رعایت سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت اتمام حجت ہے جو اگر ہو جائے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عالمی سطح پر اِس اتمام حجت

هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٧٨﴾

سورة المؤمنون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿١﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿٢﴾

ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔[۱۲۸] وہی تمھارا مولیٰ ہے۔ سو کیا ہی اچھا مولیٰ ہے اور کیا ہی اچھا مددگار! ۷۷-۷۸

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اپنی مراد کو پہنچ گئے ایمان والے[۱۲۹] جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں[۱۳۰]،

کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہی انتظام فرمایا ہے۔

[۱۲۸] یعنی اُس نے جو ہدایت تمھیں دی ہے، اُس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھو اور اُس کی مدد و نصرت پر ہر حال میں بھروسا کرو۔ یہ وہی بات ہے جو دوسری جگہ 'اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

[۱۲۹] یعنی اُن کے لیے فیصلہ ہو گیا کہ لازماً فائز المرام ہوں گے۔ یہ مستقبل میں کسی بات کے واقع ہونے کی قطعیت کے اظہار کا اسلوب ہے جو ہماری زبان میں بھی موجود ہے۔ اِس بشارت کا ظہور کب ہو گا؟ اِس کی وضاحت پیرے کے آخر میں کر دی ہے کہ ہمیشہ کے لیے فردوس کی میراث پا لیں گے۔

[۱۳۰] یعنی اپنے پروردگار کے آگے نیازمندی، تذلل اور عاجزی و فروتنی کا اظہار کرنے والے ہیں۔ یہی نماز کی اصل روح ہے جو اگر نماز میں موجود ہو تو آدمی محسوس کرتا ہے کہ اُس کی کمر اور اُس کا سر ہی نہیں، اُس کا دل بھی اپنے پروردگار کے آگے سرفگندہ ہو گیا ہے۔

المؤمنون
۲۳

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ

جو لغویات سے دور رہنے والے ہیں[۱۳۱] اور جو زکوٰۃ ادا کرنے والے[۱۳۲] اور اپنی شرم گاہوں

---

[۱۳۱] اصل میں لفظ 'اَللَّغْو' استعمال ہوا ہے۔ یہ ہر اُس بات اور کام کے لیے آتا ہے جو فضول، لایعنی اور لاحاصل ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بڑی برائیاں تو ایک طرف، وہ اُن چیزوں سے بھی احتراز کرتے ہیں جو اپنا کوئی مقصد نہ رکھتی ہوں اور جن سے انسان کی زندگی کے لیے کوئی نتیجہ نہ نکلتا ہو۔ اِس میں ضمناً اُن لغویات کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے جو اُس زمانے میں قرآن کے منکرین سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں صادر ہوتی تھیں۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ ایمان والے جب کوئی فضول بات سنتے ہیں تو اعراض کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ اِسی طرح فرمایا ہے کہ جب اُن کا گزر کسی بے ہودہ چیز پر ہوتا ہے تو وقار سے گزر جاتے ہیں۔ گویا نہ لغویات میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ اُن لوگوں سے الجھتے ہیں جو اُن میں مبتلا ہوں۔

[۱۳۲] زکوٰۃ سے مراد وہ مال ہے جو نظم اجتماعی کی ضرورتوں کے لیے خدا کے حکم پر اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ نماز کی طرح اِس کا حکم بھی انبیا علیہم السلام کے دین میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ چنانچہ قرآن کے مخاطبین جانتے تھے کہ اِس کا مصداق کیا ہے۔ یہ اُن کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں تھی کہ اِس کی شرح و نصاب بتا کر اِس کا ذکر کیا جاتا۔ اِن سب چیزوں سے وہ اُسی طرح واقف تھے، جس طرح نماز کے اعمال و اذکار سے واقف تھے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں اِس کی حیثیت نماز کے ثنیٰ کی ہے۔ نماز بندے کو خدا سے متعلق کرتی ہے اور یہ اُس کو بندوں سے جوڑتی ہے۔ مراد کو پہنچنے کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۶﴾ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۷﴾ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ

کی حفاظت کرنے والے ہیں —— اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے سوا[۱۳۳] کہ اُن کے بارے میں اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ ہاں، جو اِس کے علاوہ چاہیں تو وہی ہیں جو حد

۱۳۳؎ بیویوں کے ساتھ یہاں لونڈیوں کا ذکر اِس لیے ہوا ہے کہ اُس وقت تک غلامی ختم نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ سورۂ محمد میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی ممانعت کے باوجود جو غلام پہلے سے معاشرے میں موجود تھے، اُن کے لیے یہ استثنا باقی رکھنا ضروری تھا۔ بعد میں قرآن نے اُن کے ساتھ لوگوں کو مکاتبت کا حکم دے دیا۔ یہ اِس بات کا اعلان تھا کہ لوحِ تقدیر اب غلاموں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنی آزادی کی تحریر اُس پر، جب چاہے، رقم کر سکتے ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں غلامی کو معیشت اور معاشرت کے لیے اُسی طرح ناگزیر سمجھا جاتا تھا، جس طرح اب سود کو سمجھا جاتا ہے۔ نخاسوں پر ہر جگہ غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور کھاتے پیتے گھروں میں ہر سن و سال کی لونڈیاں اور غلام موجود تھے۔ اِس طرح کے حالات میں اگر یہ حکم دیا جاتا کہ تمام غلام اور لونڈیاں آزاد ہیں تو اُن کی ایک بڑی تعداد کے لیے جینے کی کوئی صورت اِس کے سوا باقی نہ رہتی کہ مرد بھیک مانگیں اور عورتیں جسم فروشی کے ذریعے سے اپنے پیٹ کا ایندھن فراہم کریں۔ یہ مصلحت تھی جس کی وجہ سے قرآن نے تدریج کا طریقہ اختیار کیا اور اِس سلسلہ کے کئی اقدامات کے بعد بالآخر سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۳۳ میں مکاتبت کا وہ قانون نازل فرمایا جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اِس کے بعد نیکی اور خیر کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھنے والے کسی شخص کو بھی غلام بنائے رکھنے کی گنجایش باقی نہیں رہی۔

رٰعُوْنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ

سے بڑھنے والے ہیں[۱۳۴] ـــــ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں[۱۳۵]

---

[۱۳۴] مطلب یہ ہے کہ رہبانیت مقصود نہیں ہے۔ بیویوں کے ساتھ شہوانی تعلق بالکل جائز ہے۔ لیکن اُن کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ، خواہ وہ زنا اور متعہ کی صورت میں ہو یا اغلام اور وطی بہائم کی صورت میں، یہ تعلق بالکل ممنوع ہے۔ کسی مسلمان سے اِس کی توقع نہیں کی جاتی۔ تاہم اتنی بات واضح رہے کہ آیت کے الفاظ میں اِس کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ اِس ممانعت کو دوسروں کے ساتھ جنسی تعلق سے آگے استمنا بالید اور اِس نوعیت کے دوسرے افعال تک بھی وسیع کر دیا جائے۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں 'عَلٰی' 'یُحَافِظُوْنَ' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا، اِس لیے یہاں لازماً تضمین ہے اور 'حٰفِظُوْنَ' کے بعد 'عن الوقوع علٰی أحد' یا اِس کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ مستثنیٰ منہ استمنا کے طریقے نہیں، بلکہ افراد ہیں جن سے کوئی شخص جنسی تعلق قائم کر سکتا ہے۔ آیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں سے مباشرت کے سوا قضاے شہوت کا کوئی طریقہ جائز نہیں ہے، بلکہ یہ ہیں کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا کسی سے قضاے شہوت کرنا جائز نہیں ہے۔

[۱۳۵] دین کے تمام اخلاقیات کے لیے یہ نہایت جامع تعبیر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”'اَمٰنٰت' سے مراد وہ تمام امانتیں بھی ہیں جو ہمارے رب نے قوتوں اور صلاحیتوں، فرائض اور ذمہ داریوں کی شکل میں یا انعامات و افضال اور اموال و اولاد کی صورت میں ہمارے حوالے کی ہیں ـــــ اور وہ امانتیں بھی اِس میں داخل ہیں جو کسی نے ہمارے پاس محفوظ کی ہوں یا از روے حقوق اُن کی ادائیگی کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہو۔ اِسی طرح عہد میں وہ تمام عہد و میثاق بھی داخل ہیں جو ہمارے رب نے ہماری فطرت سے عالم غیب میں لیے ہیں یا اپنے نبیوں کے واسطے سے، اپنی شریعت کی شکل میں، اِس دنیا میں لیے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس وہ تمام عہد و میثاق بھی اِس میں داخل ہیں جو ہم نے اپنی فطرت یا انبیا علیہم السلام کے واسطے

هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱

اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔[۱۳۶] وہی مالک ہونے والے ہیں[۱۳۷] جو فردوس[۱۳۸] کے مالک ہوں گے۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱-۱۱

سے اپنے رب سے کیے ہیں یا کسی جماعت یا فرد سے اِس دنیا میں کیے ہیں، خواہ وہ قولاً و تحریراً عمل میں آئے ہوں یا ہر شایستہ سوسائٹی میں بغیر کسی تحریر و اقرار کے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ فرمایا کہ ہمارے یہ بندے اِن تمام امانات اور اِن تمام عہود و مواثیق کا پاس و لحاظ رکھنے والے ہیں۔ نہ اپنے رب کے معاملے میں خائن اور غدار ہیں، نہ اُس کے بندوں کے ساتھ بے وفائی اور عہد شکنی کرنے والے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲۹۹/۵)

۱۳۶۔ اوپر نماز ہی سے اہل ایمان کی صفات کا ذکر شروع ہوا تھا اور یہ اُسی پر ختم ہوا ہے۔ اِس سے دین میں نماز کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ وہی درحقیقت اُن تمام مکارم اخلاق کی محافظ ہے جو دین میں مطلوب ہیں اور اِس لحاظ سے دین پر قائم رہنے کی ضمانت ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ شیطان کے حملے اُس کے بعد بھی جاری رہتے ہیں، لیکن نماز پر مداومت کے نتیجے میں اُس کے لیے مستقل طور پر انسان کے دل میں ڈیرے ڈال دینا ممکن نہیں ہوتا۔ نماز اُسے مسلسل دور بھگاتی اور ایک حصار کی طرح اُس کے حملوں سے انسان کے دل و دماغ کی حفاظت کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطرے کی حالت میں بھی تاکید کی گئی ہے کہ پیدل یا سواری پر، جس طرح ممکن ہو، اُسے لازماً ادا کیا جائے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...شروع میں نماز کا ذکر اُس کی روح، یعنی 'خشوع' کے پہلو سے ہوا اور آخر میں اُس کی محافظت، اُس کے رکھ رکھاؤ اور اُس کی دیکھ بھال کے پہلو سے ہوا، اِس لیے کہ وہ برکات جو نماز کی بیان ہوئی ہیں، اُسی صورت حال میں حاصل ہوتی ہیں، جب اُس کے اندر خشوع کی روح ہو اور اُس کی برابر رکھوالی بھی ہوتی رہے۔ یہ باغ جنت کا پودا ہے جو پوری نگہداشت کے بغیر پروان نہیں چڑھتا۔ ذرا غفلت اور ناقدری ہو جائے تو یہ بے ثمر ہو کے

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۱۲) ثُمَّ جَعَلْنٰهُ
نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (۱۳) ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا

(تمھارے منکرین اِس کو نہیں مانتے[۱۳۹] تو دیکھیں کہ) ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا تھا۔[۱۴۰] پھر اُس کو (آگے کے لیے) ہم نے پانی کی ایک (ٹپکی ہوئی)

رہ جاتا ہے، بلکہ اِس کے بالکل ہی سوکھ جانے کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اِس کی حقیقی برکات سے بہرہ مند ہونے کی آرزو ہے تو شیاطین کی تاخت سے اِس کو بچائیے اور وقت کی پوری پابندی کے ساتھ آنسوؤں سے اِس کو سینچتے رہیے۔ تب کچھ اندازہ ہوگا کہ رب نے اِس کے اندر آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی ہے!'' (تدبر قرآن ۵/۲۹۹)

۱۳۷ اصل میں لفظ 'الْوٰرِثُوْنَ' استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں اِس کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہا اِس میں تجرید ہو جاتی ہے اور یہ محض مالک ہو جانے کے مفہوم میں بھی آجاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں بھی یہی ہوا ہے۔

۱۳۸ یہ جنت کے لیے معروف ترین لفظ ہے اور قریب قریب تمام انسانی زبانوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ قرآن میں یہ دو جگہ استعمال ہوا ہے، ایک یہاں اور ایک سورۂ کہف (۱۸) کی آیت ۱۰۷ میں۔ وہاں یہ جس طریقے سے استعمال ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنت کے لیے علم ہو چکا ہے۔

۱۳۹ یعنی اِس بات کو نہیں مانتے کہ لوگ مرنے کے بعد جی اٹھیں گے اور وہاں ایمان والوں کے لیے کوئی جنت بھی ہوگی۔

۱۴۰ یعنی ابتدا میں، جب انسان زمین کے پیٹ میں اُنھی مراحل سے گزر کر پیدا ہوا جن سے وہ اب ماں کے پیٹ میں گزرتا ہے۔ دوسری جگہ اشارہ ہے کہ مٹی کا یہ جوہر، جس کا ذکر یہاں ہوا ہے، پانی کی آمیزش سے وجود میں آیا جس سے وہ سڑے ہوئے گارے کی صورت اختیار کر گئی۔ پھر یہ گارا انڈے کے خول کی طرح اوپر سے خشک ہو گیا تا کہ نشو و نما کے مختلف

الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ؕ ۝۱۴ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ؕ ۝۱۵ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝۱۶

بوند بنا کر ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھ دیا۔[141] پھر پانی کی اُس بوند کو ہم نے ایک لوتھڑے کی صورت دی اور لوتھڑے کو گوشت کی ایک بندھی ہوئی بوٹی بنایا اور اُس بوٹی کی ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اُس کو ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔[142] سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا۔[143] پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس کے بعد تم کو لازماً مرنا ہے۔ پھر یہ کہ قیامت کے دن تم لازماً

مراحل سے گزر کر جب انسان کا حیوانی وجود پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو یہ خول ٹوٹے اور نک سک سے درست پورا انسان اُسی طرح اُس سے باہر نکل آئے، جس طرح بعض جانوروں کے بچے اب بھی انڈوں سے نکلتے ہیں۔

[141] یہ دوسرے مرحلے کا ذکر ہے جس کے بعد انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا شروع ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں۔ اِس کی جو تفصیل آگے بیان ہوئی ہے، وہ معلوم و معروف ہے۔ دور جدید کا انسان اپنے مشینی مشاہدات کی بدولت اِس کی جزئیات تک سے واقف ہو گیا ہے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ اُس نے صدیوں پہلے جو کچھ کہا تھا، وہ حیرت انگیز طور پر اُس کے مشاہدات کے عین مطابق ثابت ہوا ہے۔

[142] یعنی اُس کے حیوانی وجود کی تکمیل کے بعد اُس میں روح پھونکی اور اُسے چیزے دیگر بنا دیا جسے اب انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہو۔

[143] یہ اُس تاثر کا بیان ہے جو انسان کی خلقت کے اِن تمام مراحل پر غور کرنے والوں کی زبان پر لازماً آنا چاہیے۔ آیت میں 'أفعل' کا صیغہ جمع کی طرف مضاف ہے، لہٰذا تفصیل و ترجیح

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ⑰ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي

اٹھائے بھی جاؤ گے۔[۱۴۴] ۱۲-۱۶

اور (یہی نہیں)، ہم نے تمھارے اوپر تہ بہ تہ سات آسمان[۱۴۵] بنائے ہیں اور ہم اپنی مخلوقات سے غافل نہیں ہوئے۔[۱۴۶] اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے

سے مجرد ہو کر محض کمال صفت کو بیان کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ 'أفعل' کا یہ استعمال عربی زبان میں معروف ہے۔ اِس میں قرآن کے کسی طالب علم کو کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔

[۱۴۴] یہ وہ اصل مدعا ہے جس کے لیے مخاطبین کو اُن کی پیدایش کے اِن تمام مراحل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے؟ کیا یہ ساری تدریج و تکمیل اور ساری تربیت و نگہداشت محض اندھے بہرے مادے کی کارفرمائی ہے؟ کیا یہ تمام قدرت و حکمت اور تمام ربوبیت و رأفت بالکل بے مقصد و غایت ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی نتیجہ اور انجام نہیں ہے؟ کیا جو پانی کی ایک بوند کو آدمی بنا سکتا ہے، وہ اُس آدمی کو مرنے کے بعد زندہ نہیں کر سکتا؟ یہی سوالات ہیں جن کے جواب میں نادانوں نے، اگرچہ وہ فلسفی اور سائنس دان کے معزز ناموں ہی سے موسوم ہوں، اختلاف کیا ہے۔ قرآن نے اِنھی سوالوں کے جواب کے لیے انسان کو خود اُس کے وجود کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اِن کے جواب کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، خود اپنے وجود کے مراحل پر غور کرو، ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۳۰۴)

[۱۴۵] اصل میں 'سَبْعَ طَرَآئِقَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'طَرَآئِق' 'طَرِيْقَة' کی جمع ہے۔ یہ طبقے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ قرآن نے یہاں صفت بول کر موصوف مراد لیا ہے۔ چنانچہ اِس کا مفہوم وہی ہے جو دوسری جگہ 'سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا' کے الفاظ سے ادا فرمایا ہے۔

[۱۴۶] یعنی اُس کو پیدا کر کے بھول نہیں گئے، بلکہ برابر اُس کی پرورش اور نگہداشت کا

الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ
جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا
تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ
وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ

ساتھ پانی برسایا[۱۴۷]، پھر اُس کو زمین میں ٹھیرا دیا[۱۴۸] اور ہم (اگر چاہتے تو) اُس کو واپس بھی لے جا سکتے تھے۔ پھر اِسی سے ہم نے تمھارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے ہیں۔ اِن میں تمھارے لیے بہت سے میوے ہیں جن سے تم لذت اندوز ہوتے ہو[۱۴۹] اور اِنھی سے اپنی غذا کا سامان بھی کرتے ہو۔ اِسی طرح وہ درخت[۱۵۰] بھی اگایا ہے جو طور سینا سے نکلتا ہے۔ وہ روغن لیے ہوئے اگتا ہے اور (روغن کی صورت میں) کھانے والوں کے لیے ایک اچھا سالن بھی[۱۵۱]۔ اور تمھارے لیے چوپایوں

اہتمام کر رہے ہیں۔

[۱۴۷] یہ اُس پانی کا ذکر ہے جس کو اللہ تعالیٰ سمندروں سے اٹھا کر فضا میں لے جاتے اور پھر بارش کی صورت میں برسا دیتے ہیں۔ یہ ہمیشہ ایک خاص اندازے اور مقدار کے ساتھ برسایا جاتا ہے، اِلّا یہ کہ خود اِس کا برسانے والا ہی اِس کو لوگوں کے لیے تنبیہ و تہدید یا عذاب بنا کر اِس کے دہانے کسی وقت کھول دے۔

[۱۴۸] اِس لیے کہ ذخیرہ ہو کر وہ تمام مخلوقات کے کام آتا رہے۔ یہ خدا ہی کی عنایت ہے، ورنہ اِس کی ایک بوند بھی زمین پر نہ ٹک سکتی۔

[۱۴۹] آیت میں یہ الفاظ تقابل کے اسلوب پر حذف کر دیے گئے ہیں۔

[۱۵۰] یعنی زیتون، طور سینا جس کی پیداوار کا خاص علاقہ تھا۔

مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ لا
وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

میں بھی یقیناً بڑا سبق ہے[۱۵۲]۔ ہم اُن چیزوں کے اندر سے جو اُن کے پیٹ میں ہیں[۱۵۳]، تمھیں (خوش ذائقہ دودھ[۱۵۴]) پلاتے ہیں اور تمھارے لیے اِن میں بہت سے دوسرے فائدے بھی ہیں[۱۵۵] اور تم اِنھی سے اپنی غذا حاصل کرتے ہو، اور اِن پر اور کشتیوں پر (جو سمندر میں چلتی ہیں)[۱۵۶]، سوار بھی کیے جاتے ہو[۱۵۷]۔ ۱۷-۲۲

---

۱۵۱ اصل میں لفظ ’صِبغ‘ آیا ہے۔ اِس کی تنکیر اِس کی خوبی پر دلالت کر رہی ہے۔ یعنی ’صبغ طیب للآکلین‘۔ اہل عرب میں یہ روغن بہت مقبول تھا اور وہ مکھن کی طرح اِسے ایک لذیذ اور مقوی سالن کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔ اہل کتاب کے بارے میں معلوم ہے کہ اُن کے ہاں اِس کو ایک قسم کے مذہبی تقدس کا درجہ بھی حاصل تھا۔

۱۵۲ آیت میں اِس کے لیے ’عِبرَة‘ کا لفظ ہے۔ اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔

۱۵۳ اِس اجمال کو دوسری جگہ کھول دیا ہے کہ اِس سے پیٹ کے اندر کا گوبر اور خون مراد ہے۔

۱۵۴ یہ ’نُسقِیکُم‘ کا دوسرا مفعول ہے۔ دوسری جگہ اِس کو ’لَبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ‘ کے الفاظ سے ظاہر فرما دیا ہے۔

۱۵۵ یہ دوسرے فوائد بھی معلوم و معروف ہیں۔ انسان اِن سے سواری اور بار برداری کا کام لیتا رہا ہے۔ یہ زراعت اور کاشت کاری میں اُس کی معاونت کرتے رہے ہیں۔ اِن کے گوشت، چمڑے اور اون، یہاں تک کہ اِن کے گوبر سے بھی وہ آج تک فائدہ اٹھا رہا ہے۔

۱۵۶ اونٹ کے لیے سفینۂ صحرا کا استعارہ بہت پرانا ہے۔ قرآن نے اِسی بنا پر اُس کا اور سفینۂ دریا کا ذکر یہاں ایک ساتھ کیا ہے۔

۱۵۷ اوپر انسان کی خلقت کا ذکر ہوا۔ اُس سے امکان معاد کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

(اور وہ کشتی بھی یاد ہے جس میں طوفان سے نکلے تھے)؟ ہم[۱۵۸] نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا تو اُس نے دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی

اُس کے بعد اُن چیزوں کو لیا ہے جن سے کائنات میں ربوبیت کا اہتمام و انتظام ظاہر ہوتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”یہاں اصل حقیقت پر نگاہ رہے کہ مقصود اِن چیزوں کے ذکر سے درس عبرت ہے کہ کیا جس رب نے ہماری ایک ایک ضرورت کا اِس جزرسی کے ساتھ اہتمام فرمایا ہے، اُس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہم کو پیدا کر کے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہے؟ کیا اُس کی یہ ربوبیت ہمارے اوپر کوئی حق اور ذمہ داری عائد نہیں کرتی؟ اور کیا اِس کا لازمی تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اِن ذمہ داریوں سے متعلق ہم سے پرسش ہو؟ جنھوں نے اِن کا حق ادا کیا ہو، وہ انعام پائیں، جنھوں نے اِس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر ساری زندگی بطالت میں گزاری ہو، وہ اُس کی سزا بھگتیں۔ ظاہر ہے کہ عقل و فطرت کی شہادت اِسی دوسرے پہلو کے حق میں ہے۔ جو لوگ کریم کے دروازے سے سب کچھ پا کر اُس کا حق نہیں پہچانتے یا اُس کے ماسوا دوسروں کے گن گاتے ہیں، وہ لئیم اور ناشکرے ہیں اور لازم ہے کہ وہ اپنی اِس ناشکری کا انجام دیکھیں۔“
>
> (تدبر قرآن ۵/ ۳۰۷)

۱۵۸؎ یہاں سے آگے اُسی مدعا کا اثبات تاریخ کے شواہد سے کیا ہے، جس پر پیچھے انفس و آفاق کے شواہد پیش فرمائے ہیں۔ لیکن اِس کے لیے ایک نہایت خوب صورت اور بلیغ تخلیص یا گریز کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ کشتی کے ذکر سے اُس واقعے کا ذکر جس میں لوگوں نے کشتی کے ذریعے سے نجات پائی تھی، بالکل اِس طرح آ گیا ہے گویا بات سے بات پیدا ہو گئی ہے۔

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ
قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ ج
اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا (اُس کے شریک ٹھیرا کر تم اُس کے غضب سے) ڈرتے نہیں ہو؟ اُس نے یہ دعوت دی تو اُس کی قوم کے سرداروں نے جو منکر تھے، کہا کہ یہ تو بس تمھارے جیسا ایک آدمی ہے۔ یہ تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے[۱۵۹]۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے اتارتا۔ ہم نے اِس طرح کی بات اپنے اگلے بزرگوں میں تو کبھی سنی نہیں[۱۶۰]۔ کچھ نہیں، یہ ایک آدمی ہے کہ جس کو جنون لاحق ہو گیا ہے۔ سو کچھ دن اِس کا انتظار کرو، (اِس کے یہ وساوس ختم ہو جائیں گے)[۱۶۱]۔ ۲۳-۲۵

---

[۱۵۹] یعنی تم پر اپنے خدائی فرستادہ ہونے کی دھونس جما کر تمھارا لیڈر بننا چاہتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... (اِس فقرے کی) بلاغت پر نگاہ رہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہماری لیڈری چھیننا چاہتا ہے، بلکہ یہ کہا کہ تم پر اپنی سیادت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اِس زہر آلود فقرے میں سادہ لوح عوام کو بھڑکانے کے لیے جو مواد موجود ہے، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۳۱۳)

[۱۶۰] مطلب یہ ہے کہ اول تو ہمارے جیسا ایک انسان ہماری کیا رہنمائی کرے گا۔ اِس کے لیے اگر کسی کو آنا تھا تو خدا کا کوئی فرشتہ آنا چاہیے تھا۔ پھر ستم بالاے ستم یہ ہے کہ جو کچھ یہ پیش کر رہا ہے، وہ بھی سراسر بدعت و ضلالت اور ہمارے باپ دادا کے طریقوں کے بالکل خلاف ہے۔

[۱۶۱] یہ اُنھوں نے اپنے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ عذاب و ثواب کے جو

المؤمنون
۲۳

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا کَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾ فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ
الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ
فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ

نوح نے دعا کی کہ میرے پروردگار، اب تو اُسی چیز سے[۱۶۲] میری مدد فرما جس میں اُنھوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ سو ہم نے اُس کی طرف وحی کی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق کشتی بناؤ[۱۶۳]۔ پھر جب ہمارا حکم آجائے اور طوفان ابل پڑے[۱۶۴] تو اُس میں ہر قسم کے (جانوروں[۱۶۵] کے) جوڑے رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے لوگوں کو بھی سوار کرا لو، اُن میں سے سوائے اُن کے جن کے

قصے سنائے جا رہے ہیں، اُنھیں اِس شخص کے وساوس سمجھ کر نظر انداز کر دیں اور اِس کے رعب میں نہ آئیں۔

[۱۶۲] یعنی اُسی عذاب سے جس کی میں اِنھیں وعید سنا رہا ہوں اور یہ اُس کا مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ سورۂ نوح میں اِس کی تفصیل فرما دی ہے۔

[۱۶۳] بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کشتی کا سارا نقشہ، اِس کی جزئیات کی تفصیل کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو خود بتایا تھا تاکہ جس صورت حال سے سابقہ پیش آنے والا ہے، یہ اُس کا مقابلہ کر سکے۔

[۱۶۴] اصل میں ’فَارَ التَّنُّوْرُ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اُسی طرح کا ایک محاورہ ہے، جس طرح ’حمی الوطیس‘ وغیرہ محاورات ہیں۔ اِن میں الفاظ کے معنی نہیں، بلکہ اِن کا وہ مفہوم پیش نظر ہوتا ہے جو اہل زبان اِن سے سمجھتے ہیں۔

[۱۶۵] یہ معہود ذہنی کے لحاظ سے ہے، یعنی ہر اُس جانور کے جوڑے جس کی طوفان کے بعد ضرورت ہو سکتی ہے۔

مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾
فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَی الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ
مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ
وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ﴿۳۰﴾

بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے اور مجھ سے اُن لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہنا[۱۶۶] جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، وہ لازماً غرق ہو کے رہیں گے۔ ۲۶-۲۷

پھر جب تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں سوار ہو لیں تو کہو کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے اِن ظالم لوگوں سے ہمیں نجات عطا فرمائی ہے اور دعا کرو کہ میرے پروردگار، تو مجھے برکت کا اتارنا اتار اور تو بہترین اتارنے والا ہے[۱۶۷]۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس سرگذشت میں بڑی نشانیاں ہیں[۱۶۸] اور آزمایش تو ہم کرتے ہی ہیں[۱۶۹]۔ ۲۸-۳۰

---

[۱۶۶] یعنی ہو سکتا ہے کہ اپنی قوم کو طوفان میں غرق ہوتے دیکھ کر رأفت و رحمت کا جذبہ ابھرے، اِس کے باوجود کچھ نہ کہنا۔ اِس لیے کہ خدا جب کسی قوم پر اتمام حجت کے بعد عذاب کا فیصلہ کر دیتا ہے تو پھر کسی کے لیے بھی دعا یا سفارش کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

[۱۶۷] یہ ہجرت کی دعا ہے جو محض دعا نہیں ہوتی، بلکہ دعا کے پیرایے میں ایک عظیم بشارت بھی ہوتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے رب نے تمھیں ناپاکوں اور ناہنجاروں کے ماحول سے نجات دی۔ اب وہ تمھیں بہترین میزبان کی طرح اتارے گا اور جہاں اتارے گا، اُس سرزمین کو تمھارے لیے مبارک بنائے گا، تم پھولو پھلو گے اور اِنھی چند افراد اور تھوڑے سے وسائل معاش سے یہ دنیا پھر آباد و معمور ہو گی۔“ (تدبر قرآن ۵/۳۱۷)

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ۚ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾
وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ

پھر اِن کے بعد ہم نے ایک دوسری قوم اٹھائی[۱۷۰] اور اُن میں بھی ایک رسول[۱۷۱] اُنھی کے اندر سے اِس دعوت کے ساتھ بھیجا[۱۷۲] کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا (اُس کے شریک ٹھیرا کر تم اُس کے غضب سے) ڈرتے نہیں ہو؟ اُس کی قوم کے سرداروں نے، جو منکر تھے، جنھوں نے آخرت کی ملاقات

---

۱۶۸ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ پیغمبر برحق تھے اور جس طرح یہ قیامت صغریٰ برپا ہوئی ہے، اُسی طرح وہ بڑی قیامت بھی لازماً برپا ہو جائے گی جس کی وہ منادی کرتے رہے ہیں۔

۱۶۹ مطلب یہ ہے کہ فوز و فلاح کے اِس مرحلے تک پہنچنے کے لیے نوح علیہ السلام اور اُن کے ساتھی جن امتحانوں سے گزرے، اُن سے بہرحال اُن کو گزرنا تھا، اِس لیے کہ یہی اُس اسکیم کا تقاضا ہے جس کے مطابق یہ دنیا بنائی گئی ہے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو نہایت بلیغ اسلوب میں مخاطبین کو توجہ دلا دی ہے کہ اِس وقت جو حالات پیغمبر اور اُن کے ساتھیوں کو درپیش ہیں، اُن سے بھی کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، وہ اِسی اسکیم کے مطابق درپیش ہیں۔ یہ ایک سنت الٰہی ہے اور یہ کسی کے لیے تبدیل نہیں ہوتی۔

۱۷۰ یہ اشارہ عاد و ثمود کی طرف ہے جن کی سرگذشتیں سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں گزر چکی ہیں۔

۱۷۱ یعنی عاد کی طرف ہود اور ثمود کی طرف صالح۔

۱۷۲ آیت میں 'اَنْ' ہے جس سے پہلے ایک مضاف عربیت کے اسلوب پر محذوف ہے۔ یہ اُسی کا ترجمہ ہے۔

وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۖ ﴿۳۳﴾ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۙ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۖ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۖ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۖ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾

کو جھٹلا دیا تھا اور دنیا کی زندگی میں جن کو ہم نے آسودہ کر رکھا تھا[۱۷۳]، کہا کہ یہ تو بس تمھارے جیسا ایک آدمی ہے۔ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی بات مان لی تو اُس وقت ضرور گھاٹے میں رہو گے۔ کیا یہ تمھیں ڈراتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو اپنی قبروں سے لازماً نکالے جاؤ گے؟ بعید، بالکل بعید ہے یہ ڈراوا جو تمھیں سنایا جا رہا ہے۔ زندگی تو یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ ہم (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو ہرگز اٹھنا نہیں ہے۔ کچھ نہیں، یہ ایک آدمی ہے جس نے خدا پر ایک جھوٹ گھڑا ہے اور ہم اِس کو ہرگز ماننے والے نہیں ہیں۔ ۳۱-۳۸

---

[۱۷۳] یہ صفات اِس طرح بیان ہوئی ہیں کہ اُن کی سرکشی اور رعونت کا اصل سبب نمایاں ہو گیا ہے، جس سے وہ پیغمبر کی معنوی عظمت کو دیکھنے سے قاصر رہے اور اُس کے ظاہر کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ ہم ایک ایسے شخص کی برتری کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں جس کے پاس نہ دولت ہے نہ اقتدار؟

المؤمنون
۲۳

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا کَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ
نٰدِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً
فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۱﴾

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ
اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا یَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا كُلَّمَا

(اِس پر) رسول نے دعا کی کہ میرے پروردگار، اب تو اُسی چیز سے میری مدد فرما جس میں اُنھوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ ارشاد ہوا: اب زیادہ دیر نہیں ہوگی کہ یہ پچھتاتے رہ جائیں گے۔ پھر اُن کو ہمارے وعدۂ حق کے مطابق ایک سخت ڈانٹ[۱۷۴] نے آلیا اور ہم نے اُن کو خس و خاشاک کر دیا۔ سو ایسے ظالم لوگوں پر خدا کی لعنت! ۳۹-۴۱

پھر اِن کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھائیں۔ (اُنھوں نے بھی اپنے رسولوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا، چنانچہ) کوئی قوم نہ اپنے لیے مقرر وقت سے آگے جاتی تھی، نہ پیچھے رہتی تھی۔[۱۷۵] پھر ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے۔ (لیکن ہوا یہی کہ)

---

[۱۷۴] یہ عذاب الٰہی کی تعبیر ہے جو قرآن میں اُس کی ہر صورت کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ اِس کو آواز کے عذاب کے ساتھ خاص کر دینا صحیح نہیں ہے۔

[۱۷۵] یہ مخاطبین کو تنبیہ ہے کہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ تم سے پہلے جن قوموں نے پیغمبروں کی تکذیب کی، اُن میں سے کوئی بھی اپنی اجل کو نہ پہلے بلا سکی، نہ آنے کے بعد ٹال سکی، لہٰذا تمھارا پیمانہ بھر جائے گا تو تم بھی اِسی طرح فنا کر دیے جاؤ گے۔ تمھارے لیے مہلت کی جتنی مدت ہے، وہ تمھارے جلدی مچانے سے کم نہیں ہوگی۔ خدا نے اُسے اپنی حکمت کے مطابق مقرر کیا ہے۔ وہ پوری ہو جائے گی تو ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں ہوگی۔ خدا کا فیصلہ ٹھیک اُسی وقت نافذ ہو جائے گا۔

جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾
ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ

جب بھی کسی قوم کے پاس اُس کا رسول آیا، اُنھوں نے اُس کو جھٹلا دیا تو ہم نے بھی اُن قوموں میں سے ایک کے پیچھے ایک کو لگایا اور اُن کو کہانیاں بنا دیا۔ سو اُن لوگوں پر لعنت جو (رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود) ایمان نہیں لاتے![۱۷۶] ۴۲-۴۴

پھر موسیٰ اور اُس کے بھائی ہارون کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کھلی حجت[۱۷۷] کے

---

[۱۷۶] اِس سے مترشح ہے کہ جو لوگ رسولوں کی طرف سے براہ راست اتمام حجت کے بعد بھی ایمان نہیں لائے، اُن پر خدا کا غضب بدستور باقی ہے۔ چنانچہ آج بھی اُن کا ذکر آئے تو خدا اُن پر لعنت کرتا ہے۔

[۱۷۷] نشانیوں سے مراد معجزات ہیں جو فرعونیوں کی تنبیہ کے لیے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو دیے گئے اور کھلی حجت عصا کے معجزے کو کہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’... یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ اِس معجزے کو درحقیقت ایک برہان اور حجت قاطع کی حیثیت حاصل تھی، اِس وجہ سے اِس کو ’سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ‘ سے تعبیر فرمایا۔ اِسی معجزے کے ذریعے سے فرعون اور اُس کے درباریوں نے اپنی قوم اور اپنے تمام ماہر جادوگروں کے سامنے نہایت رسوا کن شکست کھائی۔ قرآن میں بعض جگہ اِس کو ’بَيِّنَة‘ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی نہایت واضح حجت۔ لفظ ’سُلْطٰن‘ سورۂ رحمٰن کی آیت ’لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ‘ میں توقیع الٰہی اور سند خداوندی کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اِس اعتبار سے بھی معجزۂ عصا کے لیے یہ لفظ نہایت موزوں ہے، اِس لیے کہ اِس کی حیثیت حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں فی الواقع ایک خدائی سند ہی کی تھی۔‘‘ (تدبر قرآن ۵/۳۲۱)

مُّبِيْنٍ ۙ(۴۵) اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
عَالِيْنَ ۚ(۴۶) فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۚ(۴۷)
فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ (۴۸) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى
الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۴۹)
وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ
ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (۵۰)

ساتھ فرعون اور اُس کے درباریوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو اُنھوں نے بھی تکبر کیا اور وہ بڑے سرکش لوگ تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں، دراں حالیکہ اُن کی قوم ہماری غلامی کر رہی ہے[۱۷۸]؟ سو اُنھوں نے دونوں کو جھٹلا دیا اور بالآخر ہلاک ہو کر رہے۔ اور ہم نے موسیٰ کو (یہ انعام دیا کہ اُس کو) کتاب عطا کر دی تا کہ اُس کی قوم کے لوگ (اُس سے) رہنمائی حاصل کریں۔ ۴۵-۴۹

اور مریم کے بیٹے اور اُس کی ماں کو بھی ہم نے اِسی طرح ایک عظیم نشانی بنایا[۱۷۹] اور (ایک بڑی آزمایش کے وقت[۱۸۰]) دونوں کو ایک ٹیلے پر پناہ دی جو اطمینان کی

---

[۱۷۸] یہ اُن کے تکبر کی وضاحت ہے کہ اُنھوں نے اپنے آپ کو حق سے بالاتر سمجھا اور اُس کو محض اِس لیے جھٹلا دیا کہ وہ اُن کے غلاموں کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔

[۱۷۹] اصل میں لفظ 'اٰیَة' آیا ہے۔ اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ یعنی اپنے وجود، اپنی دینونت اور پورے عالم کے لیے ایک ایسے دن کی عظیم نشانی، جب زمین ایک نئی زمین میں اور آسمان ایک نئے آسمان میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

[۱۸۰] سیدنا مسیح کی ولادت کے وقت کی طرف اشارہ ہے، جب حضرت مریم ایک ایسے

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ؕ ﴿۵۱﴾ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً

جگہ تھی اور وہاں (اُن کے لیے) ایک چشمہ جاری تھا۔[181] ۵۰

(اِن پیغمبروں سے ہم نے یہی کہا کہ) اے پیغمبرو، (تم اِن لوگوں کے توہمات کی پروا نہ کرو[182] اور) پاکیزہ چیزیں (بغیر کسی تردد کے) کھاؤ اور اچھا عمل کرو۔ میں جانتا ہوں جو کچھ تم کرتے ہو۔[183] یہ تمھاری امت ہے، ایک ہی امت[184] اور

گوشۂ تنہائی کی تلاش میں تھیں، جہاں وہ لوگوں کی طعن و تشنیع سے محفوظ رہ کر بچے کو جنم دے سکیں۔

۱۸۱ یعنی ایسی جگہ تھی جو مرتفع اور پرسکون تھی اور اُس میں صاف اور شفاف پانی کا ایک شیریں چشمہ جاری تھا۔ سورۂ مریم میں مزید وضاحت ہے کہ اُن کے لیے وہاں کھجور کا ایک ثمردار درخت بھی تھا۔

۱۸۲ یعنی اُن مشرکانہ توہمات کی جن کے تحت اِنھوں نے بعض طیبات کو بھی حرام ٹھیرا لیا ہے۔

۱۸۳ یعنی نیک یا بد جو کچھ بھی کرتے ہو، اُس کو جانتا ہوں، اِس لیے نیکی کا صلہ بھی دوں گا اور برائی کا ارتکاب کرنے والوں کو اُس کی سزا بھی لازماً ملے گی۔

۱۸۴ مطلب یہ ہے کہ دین کے نام پر الگ الگ امتیں لوگوں نے قائم کر رکھی ہیں۔ خدا نے جو دین تمھیں دیا ہے، وہ ایک ہی ہے، لہٰذا امت بھی اصلاً ایک ہی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”قرآن اِس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دنیا میں خدا کے جو نبی اور رسول آئے، وہ الگ الگ دینوں کی دعوت لے کر آئے اور اُنھوں نے الگ الگ امتوں کی بنا ڈالی، بلکہ اُس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی نے ایک ہی امت —— امت مسلمہ —— کے قائم کرنے کی جدوجہد

وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾
فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ
فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾ اَيَحْسَبُوْنَ
اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي
الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

میں تمھارا پروردگار ہوں، سو مجھ سے ڈرتے رہو۔ ۵۱-۵۲

پھر لوگوں نے (اُن کے بعد) اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ اب ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے، وہ اُسی میں مگن ہے۔ سو اِنھیں کچھ دن اِن کی اِس سرمستی میں رہنے دو۔ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو مال اور بیٹے اِن کو دیے جا رہے ہیں تو گویا اِن کو بھلائیاں پہنچانے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، بلکہ اِن کو حقیقت کا شعور نہیں ہے۔[۱۸۵] ۵۳-۵۶

کی۔ جب قوموں نے اِس دین میں بگاڑ پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اِس بگاڑ کی اصلاح کے لیے دوسرے نبی اور رسول بھیجے۔ اِن نبیوں اور رسولوں نے اصل دین سے الگ کوئی چیز نہیں پیش کی، بلکہ صرف اصل دین کو قائم کرنے پر اپنا سارا زور صرف کیا اور اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوئی تو اُنھوں نے اِسی دین کے مزید مقتضیات نمایاں کیے۔ قرآن اِسی مبارک سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اُس نے اصل دین کو، جس کی دعوت آدم و نوح سے لے کر حضرت مسیح تک ہر نبی نے دی، بالکل نکھار کر، اُس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا ہے۔'' (تدبر قرآن ۵/۳۲۶)

[۱۸۵] یہ لوگوں کو اُن کی بلادت پر تنبیہ کی ہے کہ وہ اپنی رفاہیت، خوش حالی اور مال و اولاد کی ترقی سے یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اُنھی پر مہربان ہے اور یہ اُن کی کامیابی کی دلیل ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۙ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ
هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۵۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۙ﴿۵۹﴾
وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۙ﴿۶۰﴾
اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا
اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

البتہ، جو اپنے پروردگار کی ہیبت سے ڈرے رہتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہیں ٹھیراتے اور جو اُس کی راہ میں دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں، اِس طرح دیتے ہیں کہ اُن کے دل (اِس خیال سے) کانپتے ہیں کہ اُنھیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے، وہی ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ اُن کو پا کر رہیں گے —— حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے[۱۸۶] اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو بالکل ٹھیک بتا دے گی (کہ وہ دنیا میں کیا عمل کرتے رہے) اور اُن کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ ۵۷-۶۲

فرمایا کہ یہ اُن کی غلط فہمی ہے۔ وہ سمجھ نہیں رہے ہیں کہ یہ خدا کا استدراج ہے جو اُنھیں ہلاکت کے کھڈ میں گرا دے گا اور وہ اُس سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پا سکیں گے۔

[۱۸۶] یعنی اپنے بندوں سے جن صفات کا حامل بن کر جینے کا تقاضا کرتے ہیں، وہ اُن کی مقدرت سے باہر نہیں ہوتیں۔ ہم نے ہر انسان کو اِس کی طاقت دے کر پیدا کیا ہے کہ امتحان کی دنیا میں وہ اِن صفات کا حامل بن کر زندگی بسر کر سکے اور اِس کے نتیجے میں اپنے استحقاق کی بنیاد پر خدا کی ابدی جنت کا وارث بنے۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ
ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ
اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾
قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾
مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾

نہیں، (یہ منکرین اِس کو نہیں سمجھتے)، بلکہ اِن کے دل اِس سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور (یہی نہیں)، اِن کے مشاغل اِس کے سوا ہیں، یہ اُنھی میں پڑے رہیں گے، یہاں تک کہ جب اِن کے خوش حالوں کو ہم عذاب میں پکڑ لیں گے تو یہ فریاد کرنے لگیں گے[۱۸۷] ـــــ اب آہ و فریاد نہ کرو، ہماری طرف سے اب تمھاری کوئی مدد نہ ہو گی۔ میری آیتیں تمھیں سنائی جاتی تھیں تو تم پیغمبر کا مذاق اڑاتے ہوئے اُس سے تکبر کر کے[۱۸۸] اُلٹے پاؤں بھاگتے تھے، گویا کسی قصہ گو کو چھوڑ رہے ہو۔[۱۸۹] ۶۳-۶۷

---

[۱۸۷] اِس لیے کہ عذاب اصلاً اُن مترفین ہی کے لیے آتا ہے جو اپنی دولت اور اقتدار کے غرور میں پیغمبر کی تکذیب کرتے ہیں، لیکن اِس کی لپیٹ میں وہ لوگ بھی لازماً آ جاتے ہیں جو اُن کے اثر و رسوخ کی وجہ سے آخر وقت تک اُنھی کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔

[۱۸۸] اصل میں 'مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ضمیر کا مرجع پیغمبر ہے جس کی تلاوت آیات پیچھے مذکور ہے اور 'ب' اِس بات کا قرینہ ہے کہ اِس میں استہزا کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے۔ پیغمبر کے مقابلے میں یہی استہزا اور تکبر ہے جس کے عواقب پوری سورہ میں زیر بحث ہیں۔ اِس لیے یہ مرجع فحواے کلام سے صاف متبادر ہے۔

[۱۸۹] اصل میں 'سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'سٰمِرًا' ہمارے نزدیک 'تَهْجُرُوْنَ' کا مفعول ہے جو مقدم ہو گیا ہے۔ یعنی ایک ایسے شخص کو چھوڑ رہے ہو جس کی بات کسی

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾
اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ
جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾
وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ

پھر کیا اِن لوگوں نے اِس کلام پر غور نہیں کیا یا اِن کے پاس کوئی ایسی چیز آ گئی ہے جو اِن کے اگلے باپ دادا کے پاس نہیں آئی تھی؟ یا اِنھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں، اِس وجہ سے اُس کے منکر ہو رہے ہیں؟ یا کہتے ہیں کہ اُس پر کچھ جنون کا اثر ہے؟[۱۹۰] ہرگز نہیں، بلکہ وہ اِن کے پاس حق لے کر آیا ہے، لیکن اِن میں سے اکثر حق سے بے زار ہیں، (اِس لیے کہ وہ اِن کی خواہشوں کے خلاف ہے)۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر حق کہیں اِن کی خواہشوں کے (مطابق ہو کر اِن کے) پیچھے چلتا تو زمین اور آسمانوں اور جو اُن کے درمیان ہیں، سب تباہ ہو جاتے۔[۱۹۱] نہیں، (یہ کسی

توجہ کے لائق نہیں ہے۔ چنانچہ کئی جگہ مذکور ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ کچھ نہیں، یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں: 'اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ'۔

[۱۹۰] یہ زجر و ملامت کا اسلوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِن میں سے کوئی بات بھی ہوتی تو یہ معذور ٹھیرائے جا سکتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِنھوں نے کلام کو بھی خوب خوب سمجھا ہے، یہ اِس بات سے بھی واقف ہیں کہ یہ وہی ہدایت ہے جو اِن کے آبا ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام لے کر آئے تھے، اِنھوں نے رسول کو بھی اچھی طرح پہچان لیا ہے اور یہ دانش و حکمت اور جنون و سودا کا فرق بھی خوب جانتے ہیں، مگر اِس کے باوجود انکار کر رہے ہیں۔

[۱۹۱] اِس لیے کہ پھر خیر کی جگہ شر، عدل کی جگہ ظلم، نیکی کی جگہ بدی، امانت کی جگہ خیانت اور سب سے بڑھ کر توحید اور قیامت کے انکار کی منادی ہوتی اور دنیا کا سارا اخلاقی نظام

فِيهِنَّ ۚ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾
اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾
وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ
مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ

قصہ گو کی کہانی نہیں ہے)، بلکہ ہم تو اِن کے پاس اِنھی کے حصے کی یاد دہانی لائے ہیں[۱۹۲]، مگر یہ ہیں کہ اپنی ہی یاد دہانی سے منہ موڑ رہے ہیں۔ ۶۸-۷۱

کیا تم اِن سے کوئی معاوضہ مانگ رہے ہو (کہ جس کے بوجھ تلے یہ دبے جا رہے ہیں)؟ سو (اِنھیں بتا دو کہ) تمھارے پروردگار کا صلہ (تمھارے لیے) بہتر ہے اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ تم تو اِنھیں ایک سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہو، مگر جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے، وہ سیدھی راہ سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں۔ (یہ کسی طرح ماننے والے نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ) اگر (ہم اِن کو کسی آزمایش میں ڈالتے، پھر) ہم اِن پر رحم کرتے اور اِن کی تکلیف دور کر دیتے تو اپنی سرکشی میں لگے ہوئے یہ اِسی طرح بھٹکتے رہتے[۱۹۳]۔ ہم نے اُن کو

درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔

[۱۹۲] یعنی وہ یاد دہانی جو اِن کی زبان میں ہے اور اِنھی کے اندر کا ایک شخص اِن کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ ہم اِنھیں ایران و توران کے کسی پیغمبر اور کسی کتاب کی پیروی کے لیے نہیں کہہ رہے ہیں۔ اہل عرب پر امتنان اور اتمام حجت کا یہ مضمون قرآن کے دوسرے مقامات میں اِسی وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔

فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾ حَتّٰٓى اِذَا فَتَحْنَا
عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٧﴾
وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا

عذاب میں پکڑ لیا تھا[۱۹۴] (جو اگلوں میں اِنھی جیسے تھے)، لیکن نہ اُن کے دل اُن کے پروردگار کے سامنے جھکے اور نہ وہ کبھی گڑگڑاتے تھے[۱۹۵]۔ یہاں تک کہ جب اِس طرح کے لوگوں پر ہم سخت عذاب کا دروازہ کھول دیتے ہیں تو دیکھتے ہو کہ اُس میں بالکل مایوس ہو کر رہ گئے ہیں۔ ۷۶-۷۷

(لوگو، خدا کی بات سنو کہ) وہی ہے جس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں

---

[۱۹۳] مطلب یہ ہے کہ اصل خرابی اِن منکرین کے دلوں میں ہے جو مان کر نہیں دے رہے۔ اِس لیے اطمینان رکھو، تمھاری دعوت میں کوئی پیچ و خم نہیں ہے، وہ تو سیدھی راہ پر چلنے کی دعوت ہے۔

[۱۹۴] اصل میں 'وَلَقَدْ اَخَذْنٰھُمْ' کے الفاظ آئے ہیں، لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہ یہاں 'ولقد أخذنا أشياعهم' کے معنی میں ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...'ھُمْ' سے مراد یہاں قریش نہیں، بلکہ اُن کے وہ ہم مشرب ہیں جو پچھلی امتوں میں گزر چکے تھے۔ عربی میں غایت مجانست و مشابہت کے اظہار کے مواقع میں اِس طرح ضمیریں آتی ہیں۔ اِس کی مثالیں قرآن اور کلام عرب میں موجود ہیں۔ اِس میں یہ بلاغت ہے کہ اُن کو پکڑا تو گویا اِنھی کو پکڑا، اِس لیے کہ مرتکب دونوں ایک ہی جرم کے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۵/۳۳۷)

[۱۹۵] آیت میں مضارع سے پہلے ایک فعل ناقص محذوف ہے اور گڑگڑانے کے لیے 'تَضَرُّع' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ اُس فریاد اور زاری کے لیے آتا ہے جو دل کی خستگی کے نتیجے کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ آیت میں 'اِسْتِکَانَة' کا لفظ اِسی خستگی کو بیان کرتا ہے۔

مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٨﴾ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٧٩﴾
وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٨٠﴾

اور دل بنائے[۱۹۶]، (مگر تم پر افسوس)، تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔ اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلا رکھا ہے اور (ایک دن آئے گا کہ) اُسی کی طرف سمیٹے جاؤ گے[۱۹۷]۔ اور وہی ہے جو جِلاتا اور مارتا ہے اور رات اور دن کی گردش، سب اُسی کے اختیار میں ہے۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو[۱۹۸]؟ ۷۸-۸۰

---

[۱۹۶] یعنی کس لیے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... اِسی لیے تو کہ اِن سے نصیحت و حکمت کی وہ باتیں جو تمھیں سنائی جا رہی ہیں، سنو؛ اللہ کی وہ نشانیاں جو آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کی طرف تمھیں توجہ دلائی جا رہی ہے، اُن کو دیکھو؛ اور اُن سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں اور جو تمھارے سامنے نہایت واضح طور پر پیش کیے جا رہے ہیں، اُن پر غور کرو۔ کان، آنکھ اور دل و دماغ کا اصلی مصرف یہی ہے، لیکن تم عجیب شامت زدہ لوگ ہو کہ حق کو حق ماننے کے لیے دلیل کے بجائے تنبیہ کے ڈنڈے کا مطالبہ کر رہے ہو!'' (تدبر قرآن ۵/ ۳۳۸)

[۱۹۷] یہ ایک ہی جملے میں قرآن نے کمال بلاغت کے ساتھ معاد کے امکان اور اُس کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے اور توحید کی دلیل بھی واضح کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اُسی طرح زمین میں پھیلا دیے گئے ہو، جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں بیج بکھیرتا ہے تو اِسی لیے بکھیرتا ہے کہ ایک دن تمام فصل کو اکٹھا کر کے اپنے کھلیان میں جمع کرے گا اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا ابھی اُس کی بوئی ہوئی فصل میں اُس کا شریک ہو جائے۔

[۱۹۸] یعنی اِس بات کو سمجھتے نہیں ہو کہ جب یہ سارا نظام اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور ہر قسم کے اختلافات کے باوجود نہایت سازگاری کے ساتھ کام کر رہا ہے تو اُس کے شریک کہاں سے پیدا ہو گئے؟

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا
تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا
هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾
قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ
لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ
الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ
مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ

یہ نہیں سمجھتے، بلکہ اِنھوں نے بھی وہی بات کہی ہے جو اِن کے اگلوں نے کہی تھی۔ اُنھوں نے کہہ دیا کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اِسی کا وعدہ ہم سے اور اِس سے پہلے ہمارے بڑوں سے بھی ہوتا چلا آیا ہے۔ کچھ نہیں، یہ محض اگلوں کے افسانے ہیں۔ ۸۱-۸۳

اِن سے کہو، اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ یہ زمین اور جو اِس میں آباد ہیں، یہ کس کے ہیں؟ یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ کے ہیں۔ کہو، تو کیا تم (اِس سے) یاددہانی حاصل نہیں کرتے[۱۹۹]؟ اِن سے پوچھو، سات آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ بھی اللہ کے ہیں۔ کہو، تو اللہ (کے شریک ٹھیرا کر تم اُس) سے ڈرتے نہیں ہو؟ اِن سے پوچھو، اگر تم جانتے ہو[۲۰۰] تو بتاؤ کہ کون ہے جس کے ہاتھ

---

[۱۹۹] یعنی اِس بات کی یاددہانی کہ خدا کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں ہے اور اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں، وہ جب چاہے، تمام جن و انس کو مار کر دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔

[۲۰۰] یہ الفاظ اوپر بھی آئے ہیں۔ دونوں جگہ یہ مخاطبین کے تضاد فکر پر تعریض ہے۔ مطلب یہ

تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ فَاَنّٰى تُسۡحَرُوۡنَ ﴿۸۹﴾
بَلۡ اَتَيۡنٰهُمۡ بِالۡحَقِّ وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنۡ
وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنۡ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا
بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الۡغَيۡبِ

میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے، مگر اُس کے مقابل میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ سب اللہ ہی کا اختیار ہے۔ کہو کہ پھر تمھاری مت کہاں ماری جاتی ہے؟ ۸۴-۸۹

نہیں، کچھ نہیں، بلکہ ہم اِن کے پاس حق لے کر آئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ خدا نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور نہ اُس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔[۲۰۱] اللہ ایسی باتوں سے پاک ہے جو یہ

ہے کہ اِن مدعیان علم سے پوچھو کہ ایک طرف یہ سب باتیں مانتے ہو اور دوسری طرف خدا کے شریک ٹھیراتے اور آخرت کی یاددہانی کی جائے تو کہتے ہو کہ یہ سب اگلوں کے افسانے ہیں۔ آخر یہ کیا حماقت ہے؟ یہ، اگر غور کیجیے تو اُسی طرح کا تضادِ فکر ہے جس میں اِس زمانے کے مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ چنانچہ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ مشرکین عرب دنیا کی دوسری قوموں کی طرح زمین و آسمان کے الگ الگ دیوتاؤں کے قائل تھے یا اپنے معبودوں کے متعلق یہ تصور رکھتے تھے کہ وہ خدا کے مقابل میں کوئی حیثیت رکھتے ہیں یا زمین و آسمان اور اُن کے درمیان کی چیزوں کے بنانے میں اُن کا بھی کوئی حصہ ہے۔ وہ صرف یہ مانتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور خدا نے اُن کو اپنی خدائی میں شریک بنالیا ہے، اِس لیے اپنی پوجا پاٹ سے وہ اگر اُنھیں راضی رکھیں گے تو اُن کے طفیل میں خدا بھی اُن سے راضی رہے گا۔

[۲۰۱] یہ توحید کی ایسی فیصلہ کن دلیل ہے کہ کائنات کی عظمت اور اُس کے نظام کی حیرت انگیز

وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾
قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ۙ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾

بیان کرتے ہیں، کھلے اور چھپے کا جاننے والا[۲۰۲]۔ چنانچہ اُن سب چیزوں سے بالاتر ہے جنھیں یہ اُس کا شریک ٹھیراتے ہیں۔ ۹۰-۹۲

تم دعا کرو، (اے پیغمبر) کہ میرے پروردگار، اگر تو مجھے وہ عذاب دکھائے[۲۰۳] جس سے اِنھیں ڈرایا جا رہا ہے تو پروردگار، مجھے اِن ظالم لوگوں میں شامل نہ کرنا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم پوری قدرت رکھتے ہیں کہ جس عذاب سے ہم اِن کو ڈرا رہے ہیں، وہ (تمھاری آنکھوں کے سامنے لے آئیں اور) تمھیں دکھا دیں[۲۰۴]۔ ۹۳-۹۵

باقاعدگی اور اُس کے مختلف اجزا کی ہم آہنگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھ کر کوئی سلیم الطبع شخص ایک لمحے کے لیے بھی کسی مشرکانہ عقیدے کو قابل التفات نہیں سمجھ سکتا۔

[۲۰۲] یعنی جب خود ہر چیز کا جاننے والا ہے تو اُس کو کیا ضرورت ہے کہ کسی کو اپنا شریک بنائے۔

[۲۰۳] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ قوم سے پیغمبر کی ہجرت اگر وفات کی صورت میں ہو تو یہ عذاب اُس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد آتا ہے، جیسا کہ مسیح علیہ السلام کے معاملے میں ہوا۔

[۲۰۴] یہ آخری انذار ہے جس پر سورہ ختم ہو رہی ہے۔ انتہائی نامساعد حالات میں اِس دعا کی تلقین صاف بتا رہی ہے کہ پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کے لیے غلبہ و نصرت کا ظہور اب ہونے ہی والا ہے اور یہ آپ کی حیات مبارک میں ہو گا جس کے نتیجے میں آپ کے منکرین لازماً ہلاک کر دیے جائیں گے۔ اِس موقع پر ظالموں سے الگ کر دینے کی درخواست کی تلقین

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا
یَصِفُوۡنَ ۹۶ وَقُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ ۙ ۹۷
وَاَعُوۡذُ بِكَ رَبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ ۹۸
حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ ۙ ۹۹
لَعَلِّیۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَكۡتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ

تم اِن کی برائی کے جواب میں اچھائی کی بات کرو۔ یہ جو کچھ ہرزہ سرائی کر رہے ہیں، ہم اُس سے خوب واقف ہیں۔ اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار، میں شیاطین[۲۰۵] کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میرے پروردگار، اِس بات سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں[۲۰۶]۔ ۹۶-۹۸

(یہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں گے)، یہاں تک کہ جب اِن میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہو گی تو کہے گا کہ پروردگار، آپ لوگ مجھے واپس بھیج دیں[۲۰۷] کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں، اُس میں کچھ نیکی کما لوں۔ ہرگز نہیں، یہ محض ایک بات

کی گئی ہے۔ یہ نہایت لطیف طریقے پر ہجرت کا اشارہ ہے جو عذاب سے پہلے پیغمبرانہ دعوت کا ایک لازمی مرحلہ ہے۔

[۲۰۵] اِس سے مراد شیاطین جن بھی ہیں جو دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں اور شیاطین انس بھی جن کا رویہ یہاں زیر بحث ہے۔

[۲۰۶] یعنی وسوسہ اندازی کے لیے یا اگر شیاطین انس ہوں تو بحث و جدال اور شر و فساد کے لیے میرے پاس آئیں۔

[۲۰۷] اصل میں 'رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو خطاب کر کے جمع کے صیغے

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (١٠٠) فَاِذَا نُفِخَ فِي
الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (١٠١) فَمَنْ
ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (١٠٢) وَمَنْ خَفَّتْ
مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۚ (١٠٣)
تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ (١٠٤) اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ
تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (١٠٥) قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا

ہے جو یہ کہہ رہا ہے[۲۰۸]۔ اِن کے آگے اب اُس دن تک ایک پردہ ہوگا، جب یہ اٹھائے جائیں گے۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اُس دن اِن کے درمیان نہ کوئی رشتہ رہے گا اور نہ یہ ایک دوسرے سے مدد مانگ سکیں گے۔ اُس وقت جن کے پلڑے بھاری ہوں گے، وہی ہیں جو فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے، سو وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال لیا۔ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اُن کے چہروں کو آگ جھلس دے گی اور اُن کے منہ اُس میں بگڑے ہوئے ہوں گے[۲۰۹] ـــــ کیا میری آیتیں تم کو پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں، پھر تم اُنھیں جھٹلا دیتے تھے؟ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہماری بدبختی ہم پر چھا گئی تھی اور ہم

میں یہ درخواست اِس لیے کی گئی ہے کہ اُس وقت اللہ سامنے نہیں ہوگا، بلکہ اُس کے فرشتے ہی اُس کو گرفتار کرنے کے لیے اُس کے گردوپیش کھڑے ہوں گے۔

[۲۰۸] یعنی اپنی حسرت کا اظہار کر رہا ہے، ورنہ یہ بات کہاں ہونے والی ہے، اِس کا وقت تو ہمیشہ کے لیے گزر چکا ہے۔

[۲۰۹] مطلب یہ ہے کہ بدشکل ہو رہے ہوں گے۔

شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا
فَإِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ إِنَّهٗ كَانَ
فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا
وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰى
أَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ إِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ
بِمَا صَبَرُوْٓا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا

واقعی گم راہ لوگ تھے۔ اے ہمارے رب، ہمیں یہاں سے (ایک مرتبہ) نکال دے، اِس کے بعد اگر ہم دوبارہ ایسا کریں گے تو یقیناً ہم ہی ظالم ہوں گے۔ حکم ہوگا: دور ہو، اِسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ میرے بندوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے[۲۱۰] جو دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار، ہم ایمان لے آئے ہیں، سو تو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے تو تم نے اُن کا مذاق بنایا، یہاں تک کہ اُنھوں نے (گویا) ہماری یاد بھی تمھیں بھلا دی[۲۱۱] اور تم اُن کی ہنسی اڑاتے رہے۔ آج اُن کے صبر کا میں نے اُن کو صلہ دیا ہے کہ وہی کامیاب ہیں۔ ۹۹-۱۱۱

(اُس وقت) ایک کہنے والا کہے گا[۲۱۲]: برسوں کے شمار سے تم کتنی مدت زمین میں

---

[۲۱۰] اصل میں ’فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں لفظ ’فَرِيْق‘ سے مراد خاص طور پر غربائے مسلمین ہیں جو بالعموم مذاق اور استہزا کا ہدف بنائے جاتے تھے۔

[۲۱۱] یعنی اُن کا مذاق اڑانے میں ایسے مشغول ہوئے کہ تمھیں یاد ہی نہیں رہا کہ تمھارا کوئی خدا بھی ہے اور وہ تمھاری اِن حرکتوں کو دیکھ رہا ہے۔

اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ (۱۱۳) قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱۴)

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (۱۱۵)

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ (۱۱۶)

رہے ہو گے؟ وہ جواب دیں گے: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، مگر یہ بات تم اُن سے پوچھو جو شمار کرنے والے ہوں[۲۱۳]۔ کہنے والا کہے گا: تم تھوڑی ہی مدت رہے۔ اے کاش، تم جانتے ہوتے[۲۱۴]۔ ۱۱۲-۱۱۴

(لوگو، تم اِس دن سے بے پروا بیٹھے ہو) تو کیا تم نے خیال کیا ہے کہ ہم نے تمھیں بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ سو بہت برتر ہے[۲۱۵] اللہ، بادشاہ حقیقی[۲۱۶]، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے[۲۱۷]، عرش کریم کا مالک[۲۱۸]۔ اور

---

[۲۱۲] اصل میں 'قٰلَ' کا لفظ ہے۔ اِس کا فاعل اللہ تعالیٰ یا اُس کا کوئی فرشتہ نہیں ہے، بلکہ یہ یہاں 'قَالَ قَائِلٌ' کے مفہوم میں ہے۔ سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیات ۱۰۲-۱۰۴ میں اِس کی وضاحت ہو گئی ہے کہ یہ مکالمہ اِنھی لوگوں کے درمیان آپس میں ہو گا۔

[۲۱۳] یہ جواب دینے والوں کی طرف سے بے زاری کا اظہار ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، گویا جس زندگی کے طول اور اُس کے عیش پر ریجھے ہوئے تھے، آج اُس کے متعلق کوئی سوال بھی طبیعت پر گراں گزر رہا ہے۔

[۲۱۴] یعنی اِس بات کو جانتے کہ یہی تھوڑی سی مدت ہے جو خدا نے ابدی نعمت یا نقمت کو پانے کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔

[۲۱۵] یعنی اِس بات سے برتر کہ وہ کوئی کام عبث کرے اور محض کھیل تماشے کے طور پر یہ عظیم کائنات پیدا کر ڈالے۔

[۲۱۶] اِس لیے لازماً انصاف کا ایک دن لائے گا اور ظالم و مظلوم، دونوں کے لیے جزا و

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۱۱۷ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۱۱۸

جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکاریں جس کے لیے اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اُن کا حساب اُن کے پروردگار کے ہاں ہوگا۔ (وہ منکرین ہیں اور) اِس میں شبہ نہیں کہ منکرین ہرگز فلاح نہ پائیں گے۔[۲۱۹] (تم اِن کو اب اِن کے حال پر چھوڑو، اے پیغمبر)، اور دعا کرو کہ میرے پروردگار مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما، تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔[۲۲۰] ۱۱۵-۱۱۸

سزا کا فیصلہ کرے گا۔

۲۱۷ لہٰذا اُس کے فیصلے پر اُس دن کوئی اثر انداز بھی نہ ہو سکے گا۔

۲۱۸ چنانچہ اُس کی بارگاہ سے وہی فیصلے صادر ہوں گے جو کسی کریم کے تخت سے صادر ہو سکتے ہیں۔

۲۱۹ سورہ کی ابتدا 'قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ' سے ہوئی تھی۔ اُس کے بعد انذار کا مضمون شروع ہوا اور دیکھیے کہ اب یہ 'لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ' پر ختم ہو رہی ہے۔

۲۲۰ یہ وہی دعا ہے جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ متکبرین اِس کا مذاق اڑاتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس دعا کی تلقین سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اپنے اِسی موقف پر ڈٹے رہو اور یہی دعا کرتے رہو۔ یہی تمھارے لیے مغفرت و رحمت کے دروازے کی کلید ہے۔ یہ دعا کے اسلوب میں اہل ایمان کے لیے فتح و نصرت کی بشارت ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۳۵۰)

کوالالمپور

۱۵/ جون ۲۰۱۳ء

النور

٢٤

النور

یہ ایک منفرد سورہ ہے جس پر قرآن کے اِس تیسرے باب کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ پیچھے اشارات تھے کہ حق و باطل کی جو کشمکش اِس وقت برپا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی فتح مندی اور قریش کی ہزیمت پر منتج ہونے والی ہے۔ اِس سورہ میں صاف اعلان کر دیا ہے کہ اہل ایمان سے خدا کا وعدہ ہے کہ سرزمین عرب کا اقتدار اب اُنھیں منتقل ہو جائے گا۔ چنانچہ اِسی مناسبت سے سورہ کا موضوع اُن کا تزکیہ بھی ہے جس کے لیے ضروری احکام دیے گئے ہیں اور اُن کی جماعت کی تطہیر بھی جس کے لیے منافقین کو تنبیہ و تہدید کی گئی ہے۔ اِس لحاظ سے یہ سورہ اِس باب کی پچھلی تمام سورتوں کا تکملہ و تتمہ ہے۔

اِس کے مخاطب اہل ایمان ہیں اور اِس کے مضمون سے واضح ہے کہ ہجرت کے بعد یہ مدینہ طیبہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہے، جب مسلمانوں کی ایک باقاعدہ ریاست وہاں قائم ہو چکی تھی اور منکرین کے خلاف آخری اقدام سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ماننے والوں کا تزکیہ و تطہیر کر رہے تھے۔

النور
۲۴

سورة النور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَفَرَضۡنٰہَا وَاَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ①

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ ایک عظیم سورہ ہے[1] جس کو ہم نے اتارا ہے[2] اور اِس کے احکام (تم پر) فرض ٹھیرائے ہیں[3] اور اِس میں نہایت واضح تنبیہات[4] بھی اتاری ہیں تاکہ تم یاد رکھو۔ ۱

زانی عورت ہو یا زانی مرد، سو (اِن کا جرم ثابت ہو جائے تو) دونوں میں سے ہر ایک

---

[1] آیت میں مبتدا محذوف ہے۔ اِس نے ساری توجہ خبر پر مرکوز کرا دی ہے جس سے سورہ کی عظمت و اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[2] یعنی اِس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ یہ ہمارا اتارا ہوا کلام ہے، لہٰذا ہر مسلمان کے لیے واجب الاذعان ہے۔ اِس کے احکام کی تعمیل اِسی حیثیت سے ہونی چاہیے۔

[3] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اِسی نوعیت کے احکام تھے جو پچھلی امتوں کے لیے مزلۂ قدم ثابت ہوئے اور اُنھوں نے اُن سے گریز و فرار کے راستے تلاش کرنا چاہے۔ چنانچہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ سفارشات نہیں ہیں، بلکہ خدا کے عائد کردہ فرائض اور اُس کے قطعی احکام ہیں جن کی ہر جگہ اور ہر زمانے میں بے چون و چرا تعمیل ہونی چاہیے۔ اِن میں کسی کے لیے بے پروائی یا سہل انگاری کی گنجایش نہیں ہے۔

[4] یہ اُن تنبیہات کی طرف اشارہ ہے جو بیان احکام کے ساتھ ساتھ سورہ میں بار بار وارد ہوئی ہیں۔

وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

کو سو کوڑے مارو۵ اور اللہ کے اِس قانون (کو نافذ کرنے) میں اُن کے ساتھ کسی نرمی کا جذبہ تمھیں دامن گیر نہ ہونے پائے، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر فی الواقع ایمان

۵ زنا قرآن کی رو سے شرک اور قتل نفس کے بعد تیسرا بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو شرائع انبیا علیہم السلام پر نازل کیے ہیں، اُن میں اِسے جرم مستلزم سزا قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی مخصوص حیثیت اور اُن پر خدا کی براہ راست حکومت کی وجہ سے زنا بہ زن غیر (adultery) کو اُن کی شریعت میں حرابہ قرار دے دیا گیا تھا۔ عورت کنواری ہو تو البتہ، رعایت کی ہدایت کی گئی تھی اور مرد پر مالی تاوان عائد کر کے اُسے پابند کر دیا گیا تھا کہ باقی عمر کے لیے وہ اُسے بیوی بنا کر رکھے گا۔* نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کے بعد یہ صورت حال چونکہ تبدیل ہونے والی تھی، اِس لیے قانون میں بھی تبدیلی کر دی گئی۔ چنانچہ پہلے بغیر کسی تعیین کے ایذا کا حکم دیا گیا۔ یہ حکم سورۂ نساء (۴) کی آیت ۱۶ میں بیان ہوا ہے۔ اِس کے بعد سو کوڑے کی یہ سزا مقرر کی گئی جو اب ہمیشہ کے لیے خدا کا قانون ہے۔ یہ اِس جرم کی انتہائی سزا ہے۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید نے اِس کے بیان میں صفت کے صیغے اختیار کیے ہیں جو وقوع فعل میں اہتمام پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ سزا صرف اُنھی مجرموں کو دی جائے گی جن سے جرم بالکل آخری صورت میں سرزد ہو جائے اور اپنے حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں۔ چنانچہ سزا کے تحمل سے معذور، مجبور اور جرم سے بچنے کے لیے ضروری ماحول، حالات اور حفاظت سے محروم سب لوگ اِس سے یقیناً مستثنیٰ ہیں۔ قرآن مجید نے اُن عورتوں کے بارے میں جن کے مالک اُنھیں پیشہ کرنے پر مجبور کرتے تھے، پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِس جبر کے بعد اللہ اُن کے لیے غفور و رحیم ہے۔** اِسی طرح زمانۂ رسالت کی لونڈیوں کے بارے میں بھی اُس کا

---

* استثنا ۲۲: ۲۳-۲۹۔

** النور ۲۴: ۳۳۔

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ②

رکھتے ہو۔[۶] اور اُن کو سزا دیتے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ بھی وہاں موجود ہونا چاہیے۔[۷] ۲

ارشاد ہے کہ خاندان کی حفاظت سے محرومی اور ناقص اخلاقی تربیت کی وجہ سے اُنھیں بھی یہ سزا نہیں دی جا سکتی، یہاں تک کہ اُس صورت میں بھی جب اُن کے مالکوں اور شوہروں نے اُنھیں پاک دامن رکھنے کا پورا اہتمام کیا ہو، اُنھیں اِس سزا کی نسبت سے آدھی سزا دی جائے گی۔ یعنی سو کے بجاے پچاس کوڑے ہی مارے جائیں گے۔*

[۶] یہ سختی اِس لیے ضروری ہے کہ معاشرے کا استحکام رحمی رشتوں کی پاکیزگی اور اُس کے ہر اختلال و فساد سے محفوظ رہنے پر منحصر ہے اور زنا، اگر غور کیجیے تو اِس چیز کو ہدم کر کے پورے معاشرے کو ڈھوروں اور ڈنگروں کے گلے میں تبدیل کرتا اور اِس طرح صالح تمدن کو اُس کی بنیاد ہی سے محروم کر دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یعنی اِس کی تنفیذ کے معاملے میں کسی نرمی یا مداہنت یا چشم پوشی کو راہ نہ دی جائے۔ نہ عورت کے ساتھ کوئی نرمی برتی جائے، نہ مرد کے ساتھ، نہ امیر کے ساتھ نہ غریب کے ساتھ۔ خدا کے مقرر کردہ حدود کی بے لاگ اور بے رو رعایت تنفیذ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا لازمی تقاضا ہے۔ جو لوگ اِس معاملے میں مداہنت اور نرمی برتیں، اُن کا اللہ اور آخرت پر ایمان معتبر نہیں ہے۔ یہاں یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ سزا کے بیان میں عورت کا ذکر مرد کے ذکر پر مقدم ہے۔ اِس کی وجہ جہاں یہ ہے کہ زنا عورت کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا، وہاں یہ بھی ہے کہ صنف ضعیف ہونے کے سبب سے اِس کے معاملے میں جذبۂ ہم دردی کے ابھرنے کا زیادہ امکان ہے۔ اِس وجہ سے قرآن نے یہاں اِس کے ذکر کو مقدم کر دیا تاکہ اسلوب بیان ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۳۶۲)

[۷] اِس لیے کہ مجرموں کے لیے یہ فضیحت اور دیکھنے والوں کے لیے باعث عبرت و موعظت ہو اور مسلمانوں کا معاشرہ اِس کے نتیجے میں اُس اختلال سے محفوظ رہے جو زنا اُس میں پیدا کر سکتا ہے۔

---

* النساء ۴: ۲۵۔

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۢ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ
اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۳
وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ

(اِس سزا کے بعد) یہ زانی[۸] کسی زانیہ یا مشرکہ ہی سے نکاح کرے گا اور اِس زانیہ کو بھی کوئی زانی یا مشرک ہی اپنے نکاح میں لائے گا۔ ایمان والوں پر اِسے حرام کر دیا گیا ہے[۹]۔ ۳

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگائیں[۱۰]، پھر (اُس کے ثبوت

---

[۸] یعنی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ پہلے 'اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ' کے بعد اعادۂ معرف باللام کا قاعدہ اِسی پر دلالت کرتا ہے۔ کسی زانی یا زانیہ کی شادی پر، ظاہر ہے کہ قانوناً پابندی اُسی صورت میں لگائی جا سکتی ہے، جب اُس کا جرم ثابت ہو جائے۔

[۹] نکاح کے لیے اسلامی قانون میں یہ شرط ہے کہ وہ صرف اُنھی لوگوں کے مابین ہو سکتا ہے جو پاک دامن ہوں یا توبہ و اصلاح کے بعد پاک دامنی اختیار کر لیں۔ قرآن کا یہ ارشاد اُسی کی فرع ہے۔ آیت سے واضح ہے کہ زانی اگر ثبوت جرم کے بعد سزا کا مستحق قرار پا جائے تو اُسے کسی عفیفہ سے نکاح کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہی معاملہ زانیہ کے ساتھ ہو گا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اِس کے بعد وہ اگر نکاح کرنا چاہیں تو اُنھیں نکاح کے لیے کوئی زانی یا مشرک اور زانیہ یا مشرکہ ہی ملے۔ کسی مومنہ کے لیے وہ ہرگز اِس بات کو جائز نہیں رکھتا کہ اپنے آپ کو کسی زانی کے حبالۂ عقد میں دینے کے لیے راضی ہو اور نہ کسی مومن کے لیے یہ جائز رکھتا ہے کہ وہ اِس نجاست کو اپنے گھر میں لانے کے لیے تیار ہو جائے۔ اِس طرح کا ہر نکاح باطل ہے۔

[۱۰] یہاں اور اِس سے آگے بھی اگرچہ عورتوں ہی پر تہمت کا ذکر ہوا ہے، لیکن عربی زبان میں

فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ ④ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ

میں) چار گواہ نہ لا سکیں، اُن کو اسی کوڑے مارو اور اُن کی گواہی پھر کبھی قبول نہ کرو[۱۱]، اور یہی لوگ فاسق ہیں۔ ہاں جو اِس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں، وہ خدا کے نزدیک فاسق نہ رہیں گے، اِس لیے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ لیکن جو اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور اپنی ذات کے سوا اُن کے پاس

یہ علی سبیل التغلیب کا اسلوب ہے جو صرف اِس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اِس طرح کے الزامات کا ہدف بالعموم عورتیں ہی بنتی ہیں اور معاشرہ اِس معاملے میں اُنھی کے بارے میں زیادہ حساس بھی ہوتا ہے، لہٰذا اشتراک علت کی بنا پر یہ حکم مرد و عورت، دونوں کے لیے عام ہے، اِسے صرف عورتوں کے ساتھ خاص قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی معاملہ آگے لعان کا بھی ہے۔

[۱۱] مطلب یہ ہے کہ تہمت لگانے والے کو ہر حال میں چار عینی گواہ پیش کرنا ہوں گے۔ اِس سے کم کسی صورت میں بھی اُس کا الزام ثابت قرار نہ پائے گا۔ قرائن، حالات، طبی معاینہ، یہ سب اِس معاملے میں بالکل بے معنی ہیں۔ آدمی آبرو باختہ اور بدچلن ہے تو ثبوت جرم کے لیے اِن میں سے ہر چیز بڑی اہمیت کی حامل ہے، لیکن اُس کی شہرت اگر ایک شریف اور پاک دامن شخص کی ہے تو قرآن یہی چاہتا ہے کہ اُس سے اگر کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اُس پر پردہ ڈال دیا جائے اور اُسے معاشرے میں رسوا نہ کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر وہ گواہ پیش کرنے سے قاصر رہے تو اُسے اسی کوڑے مارے جائیں اور ہمیشہ کے لیے ساقط الشہادت قرار دے دیا جائے۔ یعنی اُس کی گواہی پھر کسی معاملے میں بھی قبول نہ کی جائے اور اِس طرح معاشرے میں اُس کی حیثیت عرفی بالکل ختم کر دی جائے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ
شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۶ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ
اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۷ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ
اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ ۝۸
وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۹
وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰

کوئی گواہ نہ ہوں تو اُن میں سے ہر ایک کی گواہی یہ ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ وہ سچا ہے اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اُس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ جھوٹا ہو۔ (اِس کے بعد) عورت سے سزا[۱۲] اُسی صورت میں ٹل سکتی ہے کہ (اِس کے جواب میں) وہ بھی چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اِس بندی پر اللہ کا غضب ہو، اگر یہ (اپنے الزام میں) سچا ہو۔ (ایمان والو)، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور صاحب حکمت ہے تو جو رویہ تم نے اختیار کیا تھا، اِن

---

[۱۲] یعنی سو کوڑے کی سزا جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'اَلْعَذَاب' کا لفظ آیا ہے۔ اِسی مفہوم کے لیے اوپر 'عَذَابَهُمَا' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ عربی زبان کے علما جانتے ہیں کہ اُس میں یہ قاعدہ بالکل مسلم ہے کہ معرفہ کا اعادہ اگر معرفہ کی صورت میں کیا جائے اور کوئی قرینہ مانع نہ ہو تو دوسرا بعینہٖ پہلا ہوگا۔ لہٰذا سو کوڑے کے سوا کوئی دوسری سزا اِس سے کسی طرح مراد نہیں لی جا سکتی۔ چنانچہ یہ بالکل قطعی ہے کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی سزا میں اگر علی الاطلاق کوئی فرق کیا جائے گا تو یہ قرآن کے بالکل خلاف ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ط لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا

احکام کے بجاے اُس پر اللہ کا عذاب نازل ہو جاتا۔[13] ۴-۱۰

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں،[14] وہ تمھارے ہی اندر کا ایک

---

[13] یہ جواب شرط ہے جو عربیت کے قاعدے سے آیت میں محذوف ہے۔ آگے آیت ۱۴ میں اِس کو کھول دیا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی رعایت سے کیا ہے۔

[14] یہ کس پر بہتان کا ذکر ہے؟ قرآن نے وضاحت نہیں کی، مگر روایتوں میں تصریح ہے کہ یہ اُس فتنے کی طرف اشارہ ہے جو غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر منافقین نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو متہم کرنے کے لیے برپا کیا تھا۔ اِس کی جو تفصیلات روایتوں میں بیان ہوئی ہیں، وہ تو بیش تر محل نظر ہیں، لیکن قرآن نے جس سیاق میں اور جس انداز سے اِس کا ذکر کیا ہے اور اِس کے مختلف کرداروں کی طرف جو اشارے کیے ہیں، اُن سے واضح ہے کہ معاملہ ایسی ہی کسی شخصیت پر تہمت کا ہے۔ چنانچہ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”تاریخ و سیرت کی کتابوں سے واقعے کی نوعیت صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی مصطلق (واقع ۶ ہجری) سے مدینہ منورہ واپس ہو رہے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ ایک الگ اونٹ پر ہم سفر تھیں۔ راستے میں فوج نے شب میں کہیں پڑاو ڈالا۔ فوج کے کوچ سے پہلے ام المومنین ضرورت سے باہر نکلیں۔ اتنے میں فوج کے کوچ کا حکم ہو گیا۔ قافلہ روانہ ہو گیا اور ساتھ ہی ام المومنین کا ساربان بھی یہ سمجھ کر روانہ ہو گیا کہ آپ اپنے ہودج میں سوار ہیں۔ ام المومنین جب جگہ پر واپس آئیں اور دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو گیا تو شب میں اِس کے سوا اُنھیں کوئی اور تدبیر نظر نہیں آئی کہ وہیں ٹھہر جائیں تاآں کہ اللہ تعالیٰ کوئی راہ پیدا کرے۔ حضرت صفوان صحابی اِس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلے کے پیچھے پیچھے چلیں تاکہ بھولی بسری چیزوں کا جائزہ لے سکیں۔ جب صبح کو وہ پڑاو کی جگہ پر پہنچے اور دیکھا کہ ام المومنین پیچھے رہ گئیں تو اُنھوں نے 'اِنَّا لِلّٰهِ' پڑھا۔ بالآخر اپنا اونٹ بٹھایا۔ ام المومنین اُس پر سوار ہو گئیں اور اُنھوں نے مہار پکڑ کر اونٹ کو قافلے سے جا ملایا۔

لَكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ

گروہ ہیں[۱۵]۔ تم اِس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمھارے لیے بہتر ہے[۱۶]۔ اِن میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا ہے، وہ اُس کے حساب میں پڑے گا اور (اِس

فوج کے کوچ و مقام کے دوران میں اِس قسم کے واقعے کا پیش آجانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، لیکن منافقین نے اِسی ذرا سی بات کو ایک افسانہ بنا ڈالا۔“ (تدبر قرآن ۵/۳۸۲)

قرآن نے لفظ 'اِفْك' ہی سے اِس کی تردید کر دی ہے، اِس لیے کہ 'اِفْك' کے معنی قطعی جھوٹ اور افترا کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا کہ واقعے کی نوعیت اور اُس کے مختلف کرداروں کا ذکر کیا جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت کے مخاطبین ہر چیز سے واقف تھے اور بعد والوں کے لیے اِس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اُنھیں ایک بے ہودہ الزام کی تفصیلات سے واقف کرایا جائے۔

[۱۵] یعنی بظاہر مسلمان اور تمھاری جماعت کے افراد ہیں، مگر حقیقت میں منافقین ہیں جو ہر وقت تاک میں رہتے ہیں کہ تمھیں نقصان پہنچانے کے لیے اِس طرح کا کوئی موقع ہاتھ آئے۔

[۱۶] اِس میں بہتری کے کیا پہلو تھے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”خیر کا ایک نمایاں پہلو تو اِس کے اندر یہی تھا کہ اِس کے ذریعے سے مسلمانوں کو اپنے اندر کے ایک مارِ آستین گروہ کو اچھی طرح پہچان لینے کا موقع مل گیا۔ اگر یہ موقع نہ پیدا ہوتا تو معلوم نہیں، اندر ہی اندر یہ سرطانی پھوڑا کیا شکل اختیار کرتا اور اِس سے کیا مفاسد ظہور میں آتے۔
>
> دوسرا خیر کا پہلو اِس کے اندر یہ نکلا کہ مسلمانوں کے اندر جو بعض کمزوریاں دبی ہوئی تھیں، وہ اِس امتحان سے ابھر کر سامنے آگئیں اور بروقت اُن کی اصلاح و تدبیر ہو گئی۔ معاشرے کے تزکیے کے نقطۂ نظر سے اِس کی جو اہمیت ہے، وہ بالکل واضح ہے۔
>
> تیسرا پہلو اِس میں خیر کا یہ ہے کہ اِس واقعے نے معاشرے کی اصلاح و تنظیم سے متعلق

النور
۲۴

وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱﴾
لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ
بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۲﴾
لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ

فتنے کا بانی)، جس نے اُن میں سے اِس کا سب سے بڑا حصہ لیا ہے[۱۷]، اُس کے لیے تو عذاب عظیم ہے۔ ۱۱

تم لوگوں نے جب یہ بات سنی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنے لوگوں کے حق میں نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ ایک کھلا ہوا بہتان ہے[۱۸]؟ ۱۲

یہ (الزام لگانے والے) اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ کیوں نہ لائے[۱۹]؟ پھر

بہت سے احکام و ہدایات کے نزول کے لیے ایک نہایت سازگار فضا پیدا کر دی۔ اگر اِس فضا کے پیدا ہوئے بغیر یہ احکام اترتے تو بہت سے لوگوں پر اِن کی حقیقی قدر و قیمت واضح نہ ہو سکتی۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۳۸۲)

[۱۷] روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشارہ عبد اللہ بن ابی کی طرف ہے جو اِس سے پہلے بھی اِس طرح کے فتنے برپا کر چکا تھا۔

[۱۸] یہ ہر مسلمان مرد و عورت کا حق ہے اور ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اُن کے اِس حق کا احترام کرے۔ چنانچہ جب تک دلیل سے ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اِس حسن ظن کا حق دار نہیں ہے، اُس وقت تک اُسے یہی کہنا چاہیے۔

[۱۹] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۱۵ میں زنا کی عادی عورتوں تک کے بارے میں یہی ہدایت کی گئی ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾
وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۚ ﴿۱۴﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ
بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ
هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ
مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾

جب گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک[۲۰] یہی جھوٹے ہیں۔ ۱۳

تم (مسلمانوں) پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو جس راستے پر تم چل نکلے تھے، اُس میں تم پر کوئی بڑا عذاب آ جاتا۔ ذرا خیال کرو، جب تم اِس کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے[۲۱] اور اپنے مونھوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کا تمھیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اُس کو معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالاں کہ اللہ کے نزدیک وہ بہت بڑی بات تھی۔ تم نے اُس کو سنتے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں؟ معاذ اللہ، یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔ ۱۴-۱۶

---

[۲۰] یعنی اللہ کے قانون کے مطابق، ورنہ، ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں تو یہ الزام بجائے خود جھوٹا تھا اور قرائن صاف بتا رہے تھے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، اُس کی سرے سے کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔

[۲۱] یعنی نقد و درایت کے بغیر نقل در نقل کیے جا رہے تھے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ درایت کے بغیر روایت بعض اوقات کیسی سنگین غلطیوں کا باعث بن جاتی ہے۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾
وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾
وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو پھر کبھی ایسا نہ کرنا[۲۲]۔ اللہ تمھارے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے[۲۳]۔ ۱۷-۱۸

اِس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بدکاری کا چرچا ہو[۲۴]، اُن کے لیے دنیا میں بھی دردناک سزا ہے[۲۵] اور آخرت میں بھی۔ اِن سب لوگوں کو اللہ جانتا ہے، مگر تم نہیں جانتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تم پر نہ ہوتی اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ رؤف و رحیم ہے تو اِس گناہ کی پاداش

---

[۲۲] اصل الفاظ ہیں: 'اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا'۔ یہ اگرچہ نہی ہے، لیکن 'اَنْ' کے بعد 'لا' نہیں آیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ 'وَعْظ' اپنے مفہوم کے لحاظ سے اِس پر دلالت کرتا ہے۔

[۲۳] اِس لیے وہی بہتر سمجھتا ہے کہ تمھاری اِس غلطی پر تمھیں کیا بتائے اور سکھائے۔

[۲۴] یعنی عورتیں اور مرد، سب وہی کچھ کریں جس کی یہ تہمتیں گھڑ رہے ہیں تاکہ جو اخلاقی برتری اِس وقت مسلمانوں کو حاصل ہے، وہ جلد سے جلد ختم ہو جائے۔

[۲۵] دنیا میں اِس لیے کہ وہ اِس جرم کا ارتکاب اللہ و رسول کی براہ راست حکومت میں کر رہے تھے اور قرآن کی رو سے یہ حرابہ ہے جس کی سزائیں اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ (۵) کی آیات ۳۳-۳۴ میں بیان کر دی ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ
يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ
اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

میں تم لوگوں پر بڑی آفت آجاتی[۲۶]۔ ۱۹-۲۰

ایمان والو، شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو[۲۷] اور (یاد رکھو کہ) جو شیطان کے نقش قدم پر چلے گا، وہ اپنے ہی کو برباد کرے گا، اِس لیے کہ وہ تو بے حیائی اور برائی ہی کا راستہ سجھاتا ہے۔ (تم دوسروں پر الزام لگاتے اور اپنے آپ کو بہت پاکیزہ سمجھتے ہو)؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی کبھی پاک نہ ہو سکتا۔ لیکن اللہ ہی جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) پاک کر دیتا ہے[۲۸] اور اللہ سمیع و علیم ہے[۲۹]۔ ۲۱

---

۲۶ یعنی خدا گرفت کرتا اور توبہ و اصلاح کی جو مہلت اِس وقت تمھیں دی جا رہی ہے، اُس کے بجائے اُس کا عذاب تم پر نازل ہو جاتا۔

۲۷ یہ اُس رویے کی طرف اشارہ ہے جو ایک صریح بہتان کی نقل و روایت کے معاملے میں اُن لوگوں نے اختیار کیا جو منافقین کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے تھے۔

۲۸ یہ نہایت لطیف تنبیہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...جو لوگ دوسروں کے عزت و ناموس کے معاملے میں ہر قسم کی رطب و یابس باتیں بے پروائی سے قبول کر لیتے اور اُن کی بنا پر اُن سے بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اُن کا یہ رویہ غمازی کرتا ہے کہ وہ اپنے باب میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن، بلکہ ایک قسم کے ادعاے تزکیہ میں مبتلا ہیں، خواہ اُن کو اپنے اِس باطن کا شعور ہو یا نہ ہو۔ اِسی مخفی چور سے یہاں اُن لوگوں کو آگاہ کیا ہے جنھوں نے ام المومنین کے باب میں دشمنوں کی اڑائی ہوئی افواہ کو بغیر کسی نکیر کے قبول کر لیا۔ فرمایا کہ ہر شخص

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۪ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل ہیں اور جن کو وسعت عطا ہوئی ہے[۳۰]، وہ (اِس معاملے میں کسی کو ملوث دیکھ کر) اِس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اب وہ قرابت مندوں اور مسکینوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہ کریں گے[۳۱]۔ (نہیں، بلکہ) اُن کو چاہیے کہ بخش دیں اور درگذر سے کام لیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو بخش

یاد رکھے کہ جس کو بھی کوئی پاکی و پاکیزگی حاصل ہوتی ہے، محض اللہ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر اُس کی توفیق شامل حال نہ ہو تو کوئی پاک نہیں ہو سکتا تو کسی کو اپنے تقویٰ و تزکیہ کا اتنا غرہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ دوسروں کے معاملے میں ہر قسم کی باتیں بے تحقیق قبول کر لے۔" (تدبر قرآن ۵/ ۳۸۷)

۲۹ مدعا یہ ہے کہ اِس طرح کا کوئی ادعا ہے تو متنبہ ہو جاؤ۔ تم میں سے کون پاکیزہ ہے اور کون آلودہ، خدا ہر ایک سے واقف ہے۔ اِس لیے کہ وہ تمھاری مخفی سے مخفی باتوں کو بھی سنتا اور جانتا ہے۔

۳۰ یہ الفاظ حق اور ذمہ داری کی یاددہانی کے لیے ہیں کہ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں، مگر جب تمھاری غلطیوں کے باوجود خدا نے تمھیں فضل و رزق سے نوازا ہے تو تمھارا رویہ بھی اِس سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔

۳۱ یہ استحقاق کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ضرورت مند اپنی ضرورت کی بنیاد پر مدد کے مستحق ہیں۔ اُنھیں محض اِس لیے اُن کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دانستہ یا نادانستہ کسی غلطی کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ روایتوں میں مذکور ہے کہ سیدہ عائشہ کے خلاف طوفان اٹھانے والوں میں ایک نادار صحابی مسطح بن اثاثہ بھی تھے۔ یہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عزیز تھے۔ حضرت ابوبکر اِن کی سرپرستی فرماتے تھے۔ آپ کو قدرتی طور پر مسطح بن اثاثہ کے رویے سے صدمہ ہوا اور آپ نے قسم کھالی کہ آیندہ مسطح کی کوئی مدد نہ کریں گے۔ اِسی قسم کے رویے کا اندیشہ دوسرے غیرت مند مسلمانوں سے بھی تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے توجہ دلا دی۔

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا
فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ ۙ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ

دے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۳۲]۔ ۲۲

جو لوگ پاک دامن، بھولی بھالی[۳۳]، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں[۳۴]، اُن پر دنیا اور آخرت، دونوں میں لعنت کی گئی[۳۵] اور اُن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اُس دن،

---

[۳۲] یہ بھی اُسی لطیف حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...جس طرح کسی کے باب میں محض افواہوں کی بنا پر بدگمانی میں مبتلا ہو جانا خود اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن، بلکہ ادعاے تزکیہ کی دلیل ہے، اُسی طرح کسی کی غلطی پر اُس سے درگذر نہ کرنا اور اُس کو اپنی سرپرستی سے محروم کر دینا اپنے آپ کو غلطیوں سے مبرا سمجھنے کے ہم معنی ہے، اگرچہ آدمی کو اپنے اِس مخفی خیال کا شعور نہ ہو۔ اِس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حکمت دین کے پہلو سے یہ دونوں غلطیاں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ اِسی وجہ سے اِن دونوں کا ذکر ایک ساتھ موزوں ہوا۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۳۸۸)

[۳۳] یعنی سیدھی سادھی شریف عورتیں جو دنیا کے چھل فریب نہیں جانتیں۔ اِس میں ایک لطیف اشارہ اُس طیبہ و طاہرہ کی طرف بھی ہے جس پر بہتان کا ذکر پیچھے ہوا ہے۔

[۳۴] اصل میں ’یَرْمُوْنَ‘ کا لفظ آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہاں ’غٰفِلٰت‘ پر تہمت لگانے کے لیے اِس لفظ کے استعمال میں ایک خاص بلاغت ہے۔ اِس کے اندر یہ کنایہ ہے کہ جو لوگ بھولی بھالی پاک دامن بیبیوں پر تہمت لگاتے ہیں، وہ گویا سوتے میں اُن کو اپنی تیر اندازی کا ہدف بناتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۳۸۹)

[۳۵] یہ اِسی لعنت کا نتیجہ تھا کہ آخرت سے پہلے یہ اِسی دنیا میں رسوا ہو کر رہ گئے اور

أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۴﴾ يَوْمَئِذٍ
يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿۲۵﴾
الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ ۚ وَالطَّيِّبَاتُ
لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا
يَقُولُونَ ؕ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۲۶﴾

جب اُن کی زبانیں اور اُن کے ہاتھ پاؤں اُن کے مقابلے میں اُن کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ وہ جس بدلے کے مستحق ہیں، اُس دن اللہ اُنھیں پورا دے دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق ہے، وہ تمام حقائق کو کھول دینے والا ہے۔ ۲۳-۲۵

اُس دن خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہوں گی اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ اِسی طرح پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہوں گی اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے[۳۶]۔ وہ اُن باتوں سے بری ہوں گے جو یہ لوگ (اُن کے بارے میں) کہتے ہیں۔ اُن کے لیے وہاں مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے[۳۷]۔ ۲۶

سرزمین عرب سے اِن کا یک قلم خاتمہ ہو گیا۔ قرآن نے جگہ جگہ بتایا ہے کہ رسولوں کی طرف سے براہ راست اتمام حجت کے بعد اُن کے منکرین کے لیے یہی سنت الٰہی ہے۔

[۳۶] یہ وہی بات ہے جو سورۂ تکویر (۸۱) کی آیت ۷ میں 'اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ لوگوں کے جوڑ اُس دن ایمان و اخلاق کے لحاظ سے بندھیں گے۔

[۳۷] یہ ایک جامع تعبیر ہے جو قرآن میں آخرت کی تمام نعمتوں کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى
تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى

ایمان والو، (اِسی پاکیزگی کے لیے ضروری ہے کہ) تم اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، جب تک کہ تعارف نہ پیدا کر لو اور گھر والوں کو سلام نہ کر لو۔[۳۸] یہی طریقہ تمھارے لیے بہتر ہے تاکہ تمھیں یاد دہانی حاصل رہے۔[۳۹] پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو اُن میں داخل نہ ہو، جب تک کہ تمھیں

---

[۳۸] مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کے گھروں میں جانے کی ضرورت پیش آ جائے تو بے دھڑک اور بے پوچھے اندر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ اِس طرح کے موقعوں پر ضروری ہے کہ آدمی پہلے گھر والوں کو اپنا تعارف کرائے، جس کا شایستہ اور مہذب طریقہ یہ ہے کہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کیا جائے۔ اِس سے گھر والے معلوم کر لیں گے کہ آنے والا کون ہے، کیا چاہتا ہے اور اُس کا گھر میں داخل ہونا مناسب ہے یا نہیں؟ اِس کے بعد اگر وہ سلام کا جواب دیں اور اجازت ملے تو گھر میں داخل ہو، ورنہ واپس ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس حکم کی وضاحت میں فرمایا ہے کہ اجازت کے لیے تین مرتبہ پکارو، اگر تیسری مرتبہ پکارنے پر بھی جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ۔* اِسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ اجازت عین گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر جھانکتے ہوئے نہیں مانگنی چاہیے، اِس لیے کہ اجازت مانگنے کا حکم تو دیا ہی اِس لیے گیا ہے کہ گھر والوں پر نگاہ نہ پڑے۔**

[۳۹] یعنی اِس بات کی یاد دہانی کہ تم دوسروں کے حرم میں قدم رکھ رہے ہو، جہاں کچھ اخلاقی آداب کا لحاظ ضروری ہے اور گھر والے بھی آگاہ رہیں کہ اُن کے اندر ایک ایسا شخص موجود ہے جس کے معاملے میں کچھ حدود و قیود ملحوظ رہنے چاہییں۔

---

* بخاری، رقم ۶۲۴۵۔ مسلم، رقم ۵۶۳۳۔

** بخاری، رقم ۶۲۴۱۔ مسلم، رقم ۵۶۳۸۔

النور
۲۴

يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۲۸﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا
بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

اجازت نہ دے دی جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جاؤ[۴۰]۔ یہی طریقہ تمھارے لیے پاکیزہ ہے اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے[۴۱]۔ اِس میں، البتہ تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جن میں تمھارے لیے کوئی منفعت ہے اور وہ رہنے کے گھر نہیں ہیں[۴۲]۔ اللہ جانتا ہے جو

---

[۴۰] مطلب یہ ہے کہ اجازت دینے کے لیے کوئی گھر میں موجود نہ ہو یا موجود ہو اور اُس کی طرف سے کہہ دیا جائے کہ اِس وقت ملنا ممکن نہیں ہے تو دل میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر واپس چلے جاؤ۔

[۴۱] اللہ تعالیٰ کی صفت علم کے حوالے سے یہ تنبیہ آگے بھی دو مرتبہ کی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ بار بار یاددہانی اِس وجہ سے کی جارہی ہے کہ جن چیزوں سے یہاں روکا جارہا ہے، اُن کے لیے نفس کے اندر چور دروازے بہت سے ہیں۔ جب تک خدا کے علیم و خبیر ہونے کا صحیح طور پر استحضار نہ ہو، مجرد احکام و ہدایات سے اِن رخنوں کو بند کرنا ممکن نہیں ہے۔ شیطان کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا ہے اور آدمی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ البتہ اگر اِس تصور کا دل پر ہر وقت غلبہ رہے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے تو یہ چیز شیطان کی مخفی سے مخفی چالوں سے بھی انسان کو محفوظ رکھتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/۳۹۵)

[۴۲] آیت میں اِس کے لیے 'بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْکُوْنَةٍ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی ہوٹل، سرائے، مہمان خانے، دکانیں، دفاتر، مردانہ نشست گاہیں وغیرہ۔ اِن میں اگر کسی منفعت اور ضرورت کا تقاضا ہو تو آدمی اجازت کے بغیر بھی جا سکتا ہے۔ اجازت لینے کی جو پابندی اوپر عائد کی گئی ہے، وہ اِن جگہوں سے متعلق نہیں ہے۔

مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۲۹﴾
قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ ؕ
ذٰلِكَ اَزۡكٰى لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَقُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ

کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو۔ ۲۷-۲۹

(اے پیغمبر)، اپنے ماننے والوں کو ہدایت کرو کہ (اِن گھروں میں عورتیں ہوں تو) اپنی نگاہیں بچا کر رکھیں[۴۳] اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں[۴۴]۔ یہ اُن کے لیے

---

[۴۳] یہ ہدایت آگے عورتوں کو بھی کی گئی ہے۔ اِس کے لیے اصل میں ’يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ نگاہوں میں حیا ہو اور مرد و عورت ایک دوسرے کے حسن و جمال سے آنکھیں سینکنے، خط و خال کا جائزہ لینے اور ایک دوسرے کو گھورنے سے پرہیز کریں تو اِس حکم کا منشا یقیناً پورا ہو جاتا ہے، اِس لیے کہ اِس سے مقصود نہ دیکھنا یا ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے، بلکہ نگاہ بھر کر نہ دیکھنا اور نگاہوں کو دیکھنے کے لیے بالکل آزاد نہ چھوڑ دینا ہے۔ اِس طرح کا پہرا اگر نگاہوں پر نہ بٹھایا جائے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں یہ آنکھوں کی زنا ہے۔ اِس سے ابتدا ہو جائے تو شرم گاہ اِسے پورا کر دیتی ہے یا پورا کرنے سے رہ جاتی ہے*۔ چنانچہ یہی نگاہ ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ اِسے فوراً پھیر لینا چاہیے**۔

[۴۴] یعنی اُن پر پہرا بٹھا دیں۔ چنانچہ اُن کو نہ دوسروں کے سامنے کھولیں، نہ اُن کے اندر دوسروں کے لیے کوئی میلان پیدا ہونے دیں۔ عورتیں اور مرد ایک جگہ موجود ہوں تو چھپانے کی اِن جگہوں کو اور بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ چھپائیں اور ہمیشہ ایسا لباس پہنیں جو زینت کے ساتھ صنفی اعضا کو بھی اچھی طرح چھپانے والا ہو۔

---

* بخاری، رقم ۶۲۴۳۔ مسلم، رقم ۶۷۵۴۔

** بخاری، رقم ۱۸۵۵۔ مسلم، رقم ۵۶۴۴، ۳۲۵۱۔

يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ
اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ص وَلَا يُبْدِيْنَ
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ

زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ اور ماننے والی عورتوں کو ہدایت کرو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزیں[۴۵] نہ کھولیں، سوائے اُن کے جو اُن میں سے کھلی ہوتی ہیں[۴۶] اور اِس کے لیے اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں[۴۷]۔ اور اپنی زینت کی چیزیں نہ کھولیں،[۴۸] مگر اپنے شوہروں

۴۵؎ یعنی زیورات، بناؤ سنگھار اور ملبوسات جو عورتیں خاص آرایش کے موقعوں پر پہنتی ہیں۔

۴۶؎ اِس کے لیے اصل میں 'اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا صحیح مفہوم عربیت کی رو سے وہی ہے جسے زمخشری نے 'إلّا ما جرت العادة والجبلة على ظهوره والأصل فيه الظهور'* کے الفاظ میں بیان کر دیا ہے، یعنی اُن اعضا کی زینتیں جنھیں انسان عادتاً اور جبلی طور پر چھپایا نہیں کرتے اور وہ اصلاً کھلی ہی ہوتی ہیں، جیسے ہاتھ، پاؤں اور چہرہ وغیرہ۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی تالیف کے لحاظ سے یہ 'الظاهر منها' ہے، اِسے 'أن يظهر منها شيء' کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا، جس طرح کہ بعض اہل علم نے لیا ہے۔

۴۷؎ یہ مقصد اگر دوپٹے کے سوا کسی اور طریقے سے حاصل ہو جائے تو اِس میں بھی مضایقہ نہیں ہے۔ مدعا یہی ہے کہ عورتوں نے زینت کی ہو تو اُنھیں اپنا سینہ اور گریبان مردوں کے سامنے کھولنا نہیں چاہیے، بلکہ اِس طرح ڈھانپ کر رکھنا چاہیے کہ اُس کی زینت کسی پہلو سے نمایاں نہ ہونے پائے۔

---

* الکشاف ۳/۲۳۶۔

اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ
اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ
مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَلَا

کے سامنے یا اپنے باپ، اپنے شوہروں کے باپ[۴۹]، اپنے بیٹوں، اپنے شوہروں کے بیٹوں، اپنے بھائیوں، اپنے بھائیوں کے بیٹوں، اپنی بہنوں کے بیٹوں[۵۰]، اپنے میل جول کی عورتوں[۵۱] اور اپنے غلاموں[۵۲] کے سامنے یا اُن زیردست مردوں کے سامنے جو

---

۴۸ پہلا استثنا 'اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا' کا تھا۔ اب یہ دوسرا استثنا بیان فرمایا ہے کہ زینت کی چیزوں کو چھپا کر رکھنے کی پابندی کن اعزہ اور متعلقین کے سامنے نہیں ہے۔

۴۹ اپنے اور شوہر کے باپ کے لیے اصل میں لفظ 'آباء' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے مفہوم میں صرف باپ ہی نہیں، بلکہ اجداد و اعمام، سب شامل ہیں۔ لہٰذا ایک عورت اپنی ددھیال اور ننھیال، اور اپنے شوہر کی ددھیال اور ننھیال کے اِن سب بزرگوں کے سامنے زینت کی چیزیں اُسی طرح ظاہر کر سکتی ہے، جس طرح اپنے والد اور خسر کے سامنے کر سکتی ہے۔

۵۰ بیٹوں میں پوتے، پرپوتے اور نواسے، پرنواسے، سب شامل ہیں اور اِس معاملے میں سگے اور سوتیلے کا بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی حکم بھائیوں اور بھائی بہنوں کی اولاد کا ہے۔ اِن میں بھی سگے، سوتیلے اور رضاعی، تینوں قسم کے بھائی اور بھائی بہنوں کی اولاد شامل سمجھی جائے گی۔

۵۱ اِس سے واضح ہے کہ اجنبی عورتوں کو بھی مردوں کے حکم میں سمجھنا چاہیے اور اُن کے سامنے بھی مسلمان عورتوں کو اپنی چھپی ہوئی زینت کے معاملے میں محتاط رہنا چاہیے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کے صنفی جذبات بھی بعض اوقات عورتوں سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ اُن کے محاسن سے متاثر ہو کر وہ مردوں کو اُن کی طرف اور اُنھیں

يَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِيُعۡلَمَ مَا يُخۡفِيۡنَ مِنۡ زِيۡنَتِهِنَّ ؕ وَتُوۡبُوۡۤا اِلَى
اللّٰهِ جَمِيۡعًا اَيُّهَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۱﴾
وَاَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَالصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَاِمَآئِكُمۡ ؕ

عورتوں کی خواہش نہیں رکھتے[۵۳] یا اُن بچوں کے سامنے جو عورتوں کی پردے کی چیزوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے۔ اور اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ اُن کی چھپی ہوئی زینت معلوم ہو جائے۔ ایمان والو، (اب تک کی غلطیوں پر) سب مل کر اللہ سے رجوع کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۳۰-۳۱

(اِسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ) تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں[۵۴]، اُن کے نکاح

مردوں کی طرف مائل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

[۵۲] یہ اُس زمانے میں موجود تھے۔ 'مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ' کے جو الفاظ اِن کے لیے اصل میں آئے ہیں، اُن سے بعض فقہا نے صرف لونڈیاں مراد لی ہیں، لیکن اِس کا کوئی قرینہ الفاظ میں موجود نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اگر صرف لونڈیاں ہی مراد ہوتیں تو صحیح اور واضح تعبیر 'اَوۡ اِمَآئِهِنَّ' کی ہوتی، ایک عام لفظ جو لونڈیوں اور غلاموں، دونوں پر مشتمل ہے، اِس کے لیے استعمال نہ ہوتا۔ پھر یہاں اِس سے پہلے 'نِسَآئِهِنَّ' کا لفظ آچکا ہے جو اُن تمام عورتوں پر، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، مشتمل ہے جو میل جول اور خدمت کی نوعیت کی وابستگی رکھتی ہیں۔ اِس کے بعد لونڈیوں کے علیحدہ ذکر کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔'' (تدبر قرآن ۵/۳۹۸)

[۵۳] یعنی وہ لوگ جو گھر والوں کی سرپرستی میں رہتے ہوں اور زیردستی کے باعث یا کسی اور وجہ سے اُنھیں عورتوں کی طرف رغبت نہ ہو سکتی ہو۔

[۵۴] یعنی بیوی یا شوہر سے محروم ہوں۔

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۳۲
وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ

کر دو[۵۵] اور اپنے اُن غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو اِس کی صلاحیت رکھتے ہوں[۵۶]۔ اگر وہ تنگ دست ہوں گے تو اللہ اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا[۵۷]۔ اللہ بڑی وسعت والا ہے، وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں[۵۸]، اُنھیں

---

[۵۵] بیوی یا شوہر سے محرومی بسا اوقات اخلاقی مفاسد اور شیطان کی دراندازیوں کا دروازہ کھول دینے کا باعث بن جاتی ہے۔ پھر اِسی سے شریروں کو تہمتیں پھیلانے کے مواقع بھی ہاتھ آتے ہیں۔ چنانچہ تزکیہ و تطہیر کے لیے یہ ہدایت بھی ضروری تھی۔

[۵۶] یعنی اِس کی ذمہ داری سنبھال سکتے اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حقوق و فرائض ادا کر سکتے ہوں۔

[۵۷] یہ بشارت غریبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...جو آدمی اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے نکاح کرتا ہے، اُس پر اللہ تعالیٰ کی نظر کرم ہوتی ہے اور وہ اُس کی دست گیری فرماتا ہے۔ آدمی جب تک بیوی سے محروم رہتا ہے، وہ کچھ خانہ بدوش سا بنا رہتا ہے اور اُس کی بہت سی صلاحیتیں سکڑی اور دبی ہوئی رہتی ہیں۔ اِسی طرح عورت جب تک شوہر سے محروم رہتی ہے، اُس کی حیثیت بھی اُس بیل کی ہوتی ہے جو سہارا نہ ملنے کے باعث پھیلنے اور پھولنے پھلنے سے محروم ہو۔ لیکن جب عورت کو شوہر مل جاتا ہے اور مرد کو بیوی کی رفاقت حاصل ہو جاتی ہے تو دونوں کی صلاحیتیں ابھرتی ہیں اور زندگی کے میدان میں جب وہ دونوں مل کر جدوجہد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کی جدوجہد میں برکت دیتا ہے اور اُن کے حالات بالکل بدل جاتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۵/۴۰۰)

[۵۸] یعنی نکاح کرنا چاہیں، مگر اُن کی غربت کی وجہ سے کوئی عورت بھی اپنے آپ کو اُن کے حبالۂ عقد میں دینے پر راضی نہ ہو۔

فَضۡلِهٖ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَبۡتَغُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ فَكَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا ۖ وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ

چاہیے کہ اپنے آپ کو ضبط میں رکھیں[۵۹]، یہاں تک کہ اللہ اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے[۶۰]۔ اور تمھارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت[۶۱] چاہیں، اُن سے مکاتبت کرلو، اگر تم اُن میں بہتری پاؤ (تاکہ وہ بھی پاکیزگی میں آگے بڑھیں[۶۲])۔ اور (اِس کے لیے اگر ضرورت ہو تو مسلمانو)، اُنھیں اُس مال میں سے دو جو اللہ نے تمھیں عطا

---

[۵۹] اِس لیے کہ نکاح نہ ہو سکے تو خدا کی شریعت میں یہ چیز بدکاری کے لیے وجہ جواز نہیں بن جاتی۔

[۶۰] اِس میں بھی یہ بشارت مضمر ہے کہ جو شخص اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے ضبط نفس سے کام لے گا، اُسے توقع رکھنی چاہیے کہ اُس کا پروردگار ضرور اُس کے لیے کوئی راہ کھولے گا۔

[۶۱] یہ ایک اصطلاح ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی غلام اپنے مالک سے یہ معاہدہ کر لے کہ فلاں مدت میں وہ اُس کو اتنی رقم ادا کرے گا یا اُس کی کوئی متعین خدمت انجام دے گا اور اُس کے بعد آزاد ہو جائے گا۔

[۶۲] یعنی اگر وہ معاہدہ کرنا چاہتا ہے اور نیکی اور خیر کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے تو لازم ہے کہ اُس کو مکاتب بنا لو، اِس لیے کہ غلامی بجائے خود ذہنی آلودگی اور اخلاقی پستی کا باعث بن جاتی ہے۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں غلامی کو معیشت اور معاشرت کے لیے اِسی طرح ناگزیر سمجھا جاتا تھا، جس طرح اب سود کو سمجھا جاتا ہے۔ نخاسوں پر ہر جگہ غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور کھاتے پیتے گھروں میں ہر سن و سال کی لونڈیاں اور غلام موجود تھے۔ اِس طرح کے حالات میں اگر یہ حکم دیا جاتا کہ تمام لونڈیاں اور غلام آزاد ہیں تو اُن کی ایک بڑی تعداد کے لیے جینے کی اِس کے سوا کوئی صورت باقی نہ رہتی کہ

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ

فرمایا ہے[۶۳]۔ اور محض اِس لیے کہ دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ تمھیں حاصل ہو جائے، اپنی لونڈیوں[۶۴] کو پیشہ پر مجبور نہ کرو، جب کہ وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہوں۔ اور جو اُنھیں مجبور

مرد بھیک مانگیں اور عورتیں جسم فروشی کے ذریعے سے اپنے پیٹ کا ایندھن فراہم کریں۔ یہ مصلحت تھی جس کی وجہ سے قرآن نے تدریج کا طریقہ اختیار کیا اور اِس سلسلہ کے کئی اقدامات کے بعد بالآخر یہ حکم نازل فرمایا۔ یہ اِس بات کا اعلان تھا کہ لوح تقدیر اب غلاموں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنی آزادی کی تحریر، جب چاہیں، اُس پر رقم کر سکتے ہیں۔ اِس آخری حکم سے پہلے غلامی کے رواج کو ختم کرنے کے لیے جو اقدامات وقتاً فوقتاً کیے گئے، اُن کی تفصیلات ہماری کتاب ''میزان'' کے باب ''قانون معاشرت'' میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔ اِس سلسلہ کا سب سے اہم حکم سورۂ محمد (۴۷) کی آیت ۴ میں بیان ہوا ہے، جہاں قرآن نے واضح کر دیا کہ آیندہ جو لوگ جنگ میں پکڑے جائیں گے، مسلمان اُنھیں غلام نہیں، بلکہ قیدی بنا کر رکھیں گے اور اِس کے بعد بھی دو ہی صورتیں ہوں گی: اُنھیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے گا یا بغیر کسی معاوضے کے احسان کے طور پر رہا کیا جائے گا۔

۶۳۔ یہ ہدایت معاشرے کو فرمائی ہے اور آیت میں 'مِنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ' کے الفاظ لوگوں کے اندر جذبۂ شکر کو ابھارنے کے لیے آئے ہیں کہ جو چیز خدا کی دی ہوئی ہے، اُس کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہ کرو۔ یہی حکم، ظاہر ہے کہ ارباب حل و عقد کے لیے بھی ہو گا کہ وہ بیت المال سے بھی ایسے غلاموں کی مدد کریں۔ چنانچہ مصارف زکوٰۃ میں 'فِي الرِّقَابِ' کی مد اِسی مقصد سے رکھی گئی تھی۔

۶۴۔ اصل میں لفظ 'فَتَيٰت' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'فتاۃ' کی جمع ہے جس کے معنی لڑکی اور چھوکری کے ہیں۔ 'أمة' کے بجائے یہ لفظ قرآن نے اِس لیے استعمال کیا ہے کہ لونڈیوں اور

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ
الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾

کرے گا تو اِس کا گناہ اُسی پر ہے، اِس لیے کہ اُن پر اِس جبر کے بعد اللہ (اُن کے لیے) غفور و رحیم ہے[۶۵]۔ ہم نے تمھاری طرف، (اے پیغمبر، یہ) کھول کر بتانے والی آیتیں اتار دی ہیں اور اُن لوگوں کی تمثیل بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں[۶۶] اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے موعظت بھی۔ ۳۲-۳۴

غلاموں کے بارے میں لوگوں کی نفسیات بدلے اور صدیوں سے جو تصورات قائم کر لیے گئے ہیں، وہ تبدیل ہوں۔ قرآن کا یہی مدعا ہے جس کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ کوئی شخص اپنے غلام کو 'عبد' اور لونڈی کو 'أمة' نہ کہے، بلکہ 'فتٰی' (جوان) اور 'فتاۃ' (لڑکی) کہہ کر بلائے۔* غلاموں کے معاشرتی درجے کو اونچا کرنے کے لیے یہ بھی ایک اہم اصلاح تھی جو غلامی کے بتدریج خاتمے کے لیے کی گئی۔

[۶۵] لونڈیوں کے اندر یہ احساس کہ وہ پاک دامنی کی زندگی بسر کریں، اسلام کی تعلیمات اور اُن اصلاحات کی وجہ سے پیدا ہوا جو اوپر مذکور ہیں۔ چنانچہ باندازِ تنبیہ فرمایا ہے کہ اب کوئی شخص اِن لڑکیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرے، ورنہ یاد رکھے کہ جبر کی صورت میں اللہ اُنھیں تو معاف کر دے گا، لیکن اُن سے پیشہ کرانے والے اپنا انجام سوچ لیں، وہ اُس کی گرفت سے نہیں بچ سکیں گے۔ اِس تنبیہ کی ضرورت اِس لیے پیش آئی کہ اُس زمانے کے عرب میں لونڈیاں ہی زیادہ تر چکلوں میں بٹھائی جاتی تھیں اور اُن کے مالک جو کچھ اُن کے ذریعے سے کماتے تھے، اُس سے آسانی کے ساتھ دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے تمام ہتھکنڈے اُن کو پاک دامنی کی زندگی بسر کرنے سے روکنے کے لیے استعمال کریں گے۔

[۶۶] یہ اُس تمثیل کی طرف اشارہ ہے جو آگے آ رہی ہے۔

---

* مسلم، رقم ۵۸۷۵، ۵۸۷۷۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا

(تمثیل یہ ہے کہ) اللہ زمین اور آسمانوں کی روشنی ہے[۶۷]۔ (انسان کے دل میں)

[۶۷] یعنی اُس کی معرفت اور اُس پر ایمان ہی اِس کائنات کی روشنی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...یہ آسمان و زمین، بلکہ یہ پوری کائنات اُس شخص کے لیے ایک عالم ظلمات اور اندھیر نگری ہے جو خدا کو نہیں مانتا یا مانتا ہے، لیکن خدا کی صفات اور اُن کے مقتضیات کو نہیں تسلیم کرتا۔ ایسا شخص نہ یہ جان سکتا کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے اور نہ یہ جان سکتا کہ اِس کے وجود میں آنے کی غایت اور مقصد کیا ہے؟ وہ خود اپنے متعلق بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اُس کا مقصد وجود کیا ہے؟ وہ اِس دنیا میں مطلق العنان اور شتر بے مہار ہے یا پابند و محکوم؟ وہ مسئول ہے یا غیر مسئول؟ اُس کے لیے کیا خیر ہے اور کیا شر؟ اُسے ظلم کی روش اختیار کرنی چاہیے یا عدل کی؟ اُسے مجرد اپنے مفاد اور خواہشوں کی پیروی کرنی چاہیے یا اُن سے کسی بالاتر نصب العین کی؟ اِن سوالوں کے صحیح جواب ہی پر صحیح اور کامیاب زندگی کا انحصار ہے۔ لیکن جو شخص خدا کو نہیں مانتا، وہ اِن سوالوں کا صحیح حل نہیں پا سکتا۔ وہ اندھیرے میں اندھے بھینسے کی طرح بھٹکتا پھرتا ہے اور بالآخر ایک دن قعر ہلاکت میں گر کر اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے۔ البتہ جو شخص خدا کو اُس کی صحیح صفات کے ساتھ مانتا ہے، وہ اِس کائنات کا سرا بھی پا جاتا ہے اور اِس کا انجام بھی اُس پر واضح ہو جاتا ہے۔ اُس پر اُن تمام سوالوں کے جواب بھی روشن ہو جاتے ہیں جن کو خدا کا نہ ماننے والا کبھی حل نہیں کر سکتا۔ اِس وجہ سے یہ دنیا اُس کے لیے اندھیر نگری نہیں رہتی، بلکہ ایمان کے نور سے اُس کے لیے اِس کی ہر چیز جگمگا اٹھتی ہے اور اِس کا ہر پہلو اُس پر روشن ہو جاتا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے، پورے دن کی روشنی میں اٹھاتا ہے اور جس سمت میں بھی چلتا ہے، خدا کے ایمان کا نور اُس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی حقیقت اِس ٹکڑے میں واضح فرمائی گئی ہے کہ اِس آسمان و زمین کا نور اللہ ہے۔ جس کے پاس یہ نور ہے، وہ روشنی میں اور صراط مستقیم پر ہے۔ اور جو اِس نور سے محروم ہے، وہ ایک عالم ظلمات میں بھٹک رہا ہے اور کوئی دوسرا اُس کو روشنی نہیں دے سکتا۔ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔‘‘ (تدبر قرآن ۴۰۹/۵)

مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ
يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ

اُس کی اِس روشنی کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک طاق جس میں ایک چراغ ہے[۶۸]۔ چراغ شیشے کے اندر ہے۔ شیشہ ایسا ہے، جیسے ایک چمکتا ہوا تارا[۶۹]۔ وہ زیتون کے ایسے شاداب درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی[۷۰]۔ اُس کا

---

[۶۸] یہ ایک مرکب تمثیل ہے۔ اِس میں طاق سے مراد انسان کا دل ہے جو گویا ایک چراغ دان ہے، جس میں خدا کے نور ایمان کا چراغ جلا کر رکھ دیا جائے تو انسان کا ظاہر و باطن اِس طرح روشن ہو جاتا ہے، جس طرح اگر کوئی چراغ گھر میں کسی اونچی جگہ پر رکھ دیا جائے تو اُس سے پورا گھر روشن ہو جاتا ہے۔

[۶۹] یعنی خارجی اثرات سے پوری طرح محفوظ ہے۔ نہ اُس کی لو کسی فلسفے کے زیغ و ضلال یا خواہشات نفس کی ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہونے پاتی ہے اور نہ شیشے پر انحرافات کی کوئی گرد ہے کہ اُسے میلا کر دے اور اُس کی روشنی کے لیے حجاب بن جائے۔ وہ چمکتے ہوئے تارے کے مانند صاف اور شفاف ہے۔

[۷۰] یعنی ایمان کا یہ چراغ جس فطری طلب و استعداد کے تیل سے روشن ہوتا ہے، وہ وسط باغ کے درختوں کا تیل ہے جو زیادہ شاداب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُن کا تیل بھی زیادہ لطیف ہوتا ہے اور زیادہ تیز روشنی دیتا ہے۔ اِس کے برعکس باغ کے مشرق و مغرب میں کناروں کے درخت ہمیشہ دھوپ اور ہوا کی زد میں رہتے ہیں، اِس لیے زیادہ اچھے پھل بھی نہیں دیتے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو طلب و استعداد کے عین نقطۂ اعتدال پر قائم ہونے کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے۔

يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ
يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۙ﴿۳۵﴾ فِىْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ

تیل (ایسا شفاف ہے کہ) گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا[۱ے]۔ روشنی کے اوپر روشنی[۲ے]! اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی اِس روشنی کی ہدایت بخشتا ہے[۳ے]۔ اللہ یہ تمثیلیں لوگوں کی رہنمائی کے لیے بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے[۴ے] —— (یہ طاق) اُن گھروں میں ہیں جن کی نسبت اللہ نے حکم دیا کہ تعمیر کیے جائیں[۵ے] اور اُن

[۱ے] مدعا یہ ہے کہ قبول حق کی یہ استعداد اِس قدر قوی ہے کہ گویا بے تاب ہو رہی ہے کہ حق کب اُس کے سامنے آئے اور وہ بغیر کسی تردد اور تاخیر کے اُس کو قبول کر لے۔

[۲ے] یعنی فطرت کی روشنی پر ایمان کی روشنی جو انسان کے پورے وجود کو 'نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ' بنا دیتی ہے۔

[۳ے] آیت میں 'ھدٰی یھدی' کا صلہ 'ل' کے ساتھ آیا ہے جس سے یہ توفیق بخشی کے مفہوم پر متضمن ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا جب قبول حق کی یہ استعداد کسی شخص میں دیکھتا ہے تو اُسے توفیق دیتا ہے کہ وہ دعوت حق پر لبیک کہے اور ایمان کی روشنی سے اپنا سینہ منور کر لے۔ یہ توفیق جس قانون کے مطابق ملتی ہے، وہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے کہ خدا اپنی توفیق مزید سے اُنھی کو نوازتا ہے جو پہلے سے بخشی ہوئی توفیق کی قدر کرتے ہیں۔

[۴ے] چنانچہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔

[۵ے] یہ اُن معابد کی طرف اشارہ ہے جو براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہوئے، یعنی بیت الحرام اور بیت المقدس۔ اِن کے لیے 'رَفع' کا لفظ اُسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جس میں یہ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت 'اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ' میں استعمال کیا گیا ہے۔

فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ ﴿٣٦﴾ رِجَالٌ ۙ
لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ
الزَّكٰوةِ ۖ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿٣٧﴾
لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ

میں اُس کے نام کا ذکر کیا جائے۔[۷۶] اُن میں وہ مردان حق صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کے ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی۔[۷۷] وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹیں گے اور آنکھیں پھری کی پھری رہ جائیں گی کہ اللہ اُن کے عمل کا بہترین بدلہ

---

[۷۶] لفظ 'ذِکر' یہاں یاد کرنے اور دوسروں کو یاددہانی کرنے کی تمام صورتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

[۷۷] اوپر جس نور ایمان کا ذکر ہے، یہ اب اُس کے حاملین کو نمایاں کر دیا ہے۔ آیت ۳۴ میں 'الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ' کے الفاظ اِنھی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ ایمان کا چراغ جن دلوں کے طاق میں رکھا جاتا ہے، وہ بت خانوں اور مے کدوں کے طاق نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے معابد کے طاق ہیں۔ چنانچہ جن کے یہ دل ہیں، وہ بھی ہر جگہ نہیں ملتے۔ اُن کے ملنے کی جگہ بھی خدا کی مسجدیں اور اُس کے معابد ہیں۔ یہ موثر کی وضاحت کے بعد گویا اثر کا بیان ہے کہ نور ایمان سے جب دل روشن ہو جاتے ہیں تو صرف علم ہی نہیں، انسان کا عمل بھی اُسی نور کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور خدا کے قائم کیے ہوئے یہ معابد اُس کے اُن بندوں سے آباد ہو جاتے ہیں جن کو چشم فلک صدیوں سے یہاں رکوع و سجود کرتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ مخاطبین کے لیے یہ موعظت ہے کہ وہ بھی علم و عمل کی یہی پاکیزگی حاصل کرنے کی سعی کریں۔ اُن کے صالحین اسلاف کی یہ تمثیل اِسی مقصد سے بیان

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءًۭ ط

اُنھیں دے[۸] اور اُن کو اپنے فضل سے مزید نوازے۔ اللہ جس کو چاہے گا، بے حساب عطا فرمائے گا۔ ۳۵-۳۸

اِس کے برخلاف جو لوگ اِس روشنی کے منکر ہیں[۹]، اُن کے اعمال کی تمثیل یہ ہے کہ جیسے چٹیل صحرا میں سراب جس کو پیاسا پانی گمان کرے، یہاں تک کہ

کی گئی ہے۔

[۸] اصل میں 'لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ل' لام علت نہیں ہے، بلکہ وہ لام ہے جو کسی فعل کے ثمرہ اور نتیجہ کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔

[۹] اِس سے مزید واضح ہوا کہ اوپر کی تمثیل میں روشنی سے ایمان کی روشنی ہی مراد ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اہل ایمان کی تمثیل میں پہلے موثر، یعنی ایمان کو نمایاں فرمایا تھا، اُس کے بعد اثر، یعنی عمل کو اور اہل کفر کی تمثیل میں پہلے اثر کو نمایاں فرمایا ہے، اُس کے بعد موثر کو۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان ایک گہری حقیقت ہے جس کی جڑیں انسانی فطرت کے اعماق کے اندر اتری ہوئی ہوتی ہیں اور درحقیقت اُسی کے بابرکت اثرات وثمرات ہوتے ہیں جو زندگی کے اعمال واخلاق میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اِس کے برعکس کفر گھورے پر اُگے ہوئے ایک درخت کی مانند ہوتا ہے جس کے زہریلے پھل تو اعمال وکردار کی صورت میں سامنے ہوتے ہیں، لیکن فطرت کے اندر اُس کی کوئی جڑ نہیں ہوتی جس کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہو۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۴۱۳)

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَہٗ لَمۡ یَجِدۡہُ شَیۡئًا وَّ وَجَدَ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ ؕ
وَ اللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿ۙ۳۹﴾ اَوۡ کَظُلُمٰتٍ فِیۡ بَحۡرٍ لُّجِّیٍّ یَّغۡشٰہُ مَوۡجٌ
مِّنۡ فَوۡقِہٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُہَا فَوۡقَ
بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ یَدَہٗ لَمۡ یَکَدۡ یَرٰىہَا ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ

جب اُس کے پاس آئے تو اُسے کچھ نہ پائے۔ البتہ وہاں اللہ کو پائے،[۸۰] پھر وہ اُس کا حساب پورا پورا چکا دے اور اللہ کو حساب چکاتے کبھی دیر نہیں لگتی۔ یا جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرے کہ جس کو موج کے اوپر موج ڈھانک رہی ہو، اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ (غرض یہ کہ) اوپر تلے اندھیرے ہی اندھیرے ہوں۔ جب کوئی اپنا ہاتھ نکالے تو اُس کو بھی نہ دیکھ پائے۔[۸۱] حقیقت یہ ہے کہ جسے اللہ

---

۸۰ یہاں سے تمثیل کا رخ قرآن نے اپنے خاص اسلوب کے مطابق اُس حقیقت کی طرف موڑ دیا ہے جس کی یہ تمثیل ہے۔ چنانچہ 'حَتّٰۤی اِذَا جَآءَہٗ' گویا 'حتی إذا جاء الکافر أعماله یوم القیٰمة' کے معنی میں ہے اور ضمیر مفعول میں مشبہ بہ، یعنی سراب کی رعایت ملحوظ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منکرین قیامت کے دن، جب اپنے اعمال کے پاس پہنچیں گے تو اُن کا حال بھی وہی ہوگا جو پیاسے کا سراب کے پاس پہنچنے کے بعد ہوتا ہے۔ وہ دیکھیں گے کہ کفر و شرک نے اُن کے ہر عمل کو 'هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا' کر دیا ہے۔ اور بظاہر جن چیزوں کو وہ نیکی سمجھتے تھے، وہ بھی بالکل بے وزن ہو چکی ہیں۔ اُن کے اعمال کی جگہ اُن کے سامنے وہاں اُن کا پروردگار ہو گا جو پلک جھپکتے میں اُن کا سب حساب چکا دے گا۔

۸۱ یہ اُس ذہنی تاریکی کا بیان ہے جو ایمان کی روشنی سے محروم ہو جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّيۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِيۡحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۱﴾

روشنی نہ دے، اُس کے لیے پھر کوئی روشنی نہیں ہے۔ ۳۹-۴۰

تم نے دیکھا نہیں کہ جو زمین اور آسمانوں میں ہیں، سب اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں اور پرندے بھی، پروں کو پھیلائے ہوئے؟[۸۲] ہر ایک نے اپنی نماز اور اپنی تسبیح خوب جان رکھی ہے۔ (تم نہیں جانتے تو کیا ہوا، مگر) اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ

---

[۸۲] یہ خدا کے آگے پرندوں کے افتراش کی تصویر ہے۔ انسان بصیرت کی نگاہ رکھتا ہو تو یہی سرافگندگی اور افتراش وہ ہر چیز کے ظاہر میں دیکھ سکتا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اپنے باطن میں بھی زمین و آسمان کی ہر چیز اِسی طرح سر بہ سجود ہے اور اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کر رہی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ ساری چیزیں اپنی زبان حال سے انسان کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ بھی اس حمد و تسبیح میں اُن کے ساتھ شامل ہو اور اُنھی کی طرح صرف اپنے رب ہی کی بندگی کرے۔ اگر وہ اِس سے کوئی الگ راہ اختیار کرتا ہے تو گویا وہ ساری دنیا سے بالکل جدا راہ اختیار کرتا ہے اور ایک ایسی راگنی چھیڑتا ہے جو اِس کائنات کے مجموعی نغمے سے بالکل بے جوڑ ہے۔ اِس میں خدا کی راہ اختیار کرنے والوں کی ہمت افزائی بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو تنہا یا اقلیت میں نہ سمجھیں۔ اِس راہ کا مسافر کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ یہ راہ قافلوں سے بھری ہوئی ہے۔ اِس میں ساری کائنات اُس کی ہم سفر ہے۔ اگر تھوڑے سے ناشکرے انسان اُس سے الگ ہوں تو اُن کی علیحدگی سے وہ کیوں بددل اور مایوس ہو، جب کہ خدا کے آسمان و زمین، اُس کے شمس و قمر، اُس کے دریا اور پہاڑ اور اُس کے سارے چرند و پرند ہر وقت اُس کے ہم رکاب ہیں؟“ (تدبر قرآن ۵/۴۱۹)

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ
رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ
مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ
عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ يُقَلِّبُ

کرتے ہیں۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ ہی کی طرف (سب کو) پلٹنا ہے[۸۳]۔ ۴۱-۴۲

تم[۸۴] نے دیکھا نہیں کہ اللہ بادلوں کو ہانک لاتا ہے، پھر اُن (کے الگ الگ ٹکڑوں) کو آپس میں ملاتا ہے، پھر اُن کو تہ بر تہ کر دیتا ہے؟ پھر تم دیکھتے ہو کہ اُس کے بیچ سے (تمھارے لیے رحمت کی) بارش نکلتی ہے اور (اِسی طرح جب وہ تنبیہ کا ارادہ کرتا ہے تو) آسمان سے ـــــ اُس کے اندر (اولوں) کے پہاڑوں سے[۸۵] ـــــ اولے برساتا ہے۔ پھر جس پر چاہتا ہے، اُنھیں گراتا ہے اور جس سے چاہتا ہے، اُنھیں ہٹا دیتا ہے[۸۶]۔ اُس کی بجلی کی چمک ہے کہ گویا نگاہوں کو اچکے لیے چلی

---

[۸۳] یہ اِس بات کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ کیوں ہر چیز اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہے اور کیوں سب کو اُسی کی تسبیح و تحمید کرنی چاہیے؟

[۸۴] اوپر فرمایا ہے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔ یہاں سے آگے اب اِس کی دلیل بیان فرمائی ہے۔

[۸۵] یعنی سردی سے جمے ہوئے بادلوں سے جنھیں اوپر سے دیکھیے تو بالکل پہاڑوں کی طرح نظر آتے ہیں اور جب اولوں کی صورت میں برستے ہیں تو گویا پہاڑوں کے پہاڑ زمین پر آ گرتے ہیں۔

اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾
وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَاۗبَّةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي
بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓي
اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾

جاتی ہے۔ رات اور دن کا الٹ پھیر بھی اللہ ہی کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھ والوں کے لیے اِس میں بڑی عبرت کا سامان ہے[۸۷]۔ ۴۳-۴۴

ہر جان دار کو اللہ ہی نے پانی سے پیدا کیا ہے۔ پھر (تم دیکھتے ہو کہ) اِن میں سے کوئی اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے تو اِن میں سے کوئی دو پاؤں پر چلتا ہے اور اِن میں سے کوئی چار پاؤں پر[۸۸]۔ اللہ جو چاہے، پیدا کر دیتا ہے۔ بے شک، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۴۵

---

[۸۶] یہ عذاب کی تمثیل ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس میں اشارہ سرما کے اُن بادلوں کی طرف ہے جو تند ہواؤں، شدید کڑک دمک اور اولوں کے ساتھ نمودار ہوتے اور اُن سے ایسی بے پناہ ژالہ باری ہوتی کہ بستیاں کی بستیاں اُن کے نیچے ڈھک جاتیں۔ گویا اُن کے اندر اولوں کے پہاڑ ہیں۔ قرآن نے عذاب الٰہی سے جن قوموں کی تباہی کا ذکر کیا ہے، اُن میں سے بعض قومیں اِسی آفت سے تباہ ہوئیں۔“ (تدبر قرآن ۵/۴۲۱)

[۸۷] یعنی اِس بات کا سامان ہے کہ نگاہ، اگر چاہے تو اِس ظاہر کو عبور کر کے اُس کے اِس باطن تک پہنچ سکتی ہے کہ یہ کائنات ایک خدائے حکیم و خبیر کی تخلیق ہے اور اِس کا نظم بھی تنہا وہی چلا رہا ہے۔ چنانچہ وہی حق دار ہے کہ انسان اُس کے سامنے سرنگوں رہے اور اُسی کی عبادت کرے۔

[۸۸] یعنی ایسی عظیم قدرت و حکمت کا مالک ہے کہ ایک ہی پانی سے ہر نوع و جنس کے جان دار پیدا کر دیتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾
وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا دُعُوْٓا
اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾
وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ

ہم نے یہ کھول کر بتانے والی آیتیں نازل کر دی ہیں۔ (اِس لیے کہ لوگ سمجھیں۔ آگے) اللہ ہی جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔ ۴۶

(یہ نہیں سمجھتے)، یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے۔ پھر اِن میں سے ایک گروہ اِس کے بعد پھر جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اِنھیں جب اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ رسول اِن کے درمیان (اِن کے باہمی جھگڑوں کا) فیصلہ کر دے تو اِن میں سے ایک گروہ اُسی وقت پہلو تہی کر جاتا ہے[۸۹]۔ البتہ اگر حق اِن کو ملنے والا ہو تو رسول کے پاس بڑے فرماں دار بن کر آ جاتے ہیں۔ کیا اِن کے دلوں میں (منافقت کی) بیماری ہے یا ابھی شک میں پڑے ہوئے ہیں[۹۰] یا اِنھیں اندیشہ ہے کہ اللہ اور اُس کا رسول اِن کے ساتھ ظلم کریں گے؟

---

[۸۹] یہ اُس نفاق اور عدم ایمان کی دلیل بیان فرمائی ہے جس کا ذکر پیچھے ہوا ہے۔

[۹۰] یہ شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے اور اسلام کے

أُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٥٠﴾ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا
اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥١﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ
اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿٥٢﴾
وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ
قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٣﴾

ہر گز نہیں، بلکہ یہ خود ہی ظالم ہیں[91]۔ ایمان والوں کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ رسول اُن کے درمیان فیصلہ کرے تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (یاد رکھو)، جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کریں گے اور اللہ سے ڈریں گے اور اُس کے حدود کی پاس داری کریں گے[92] تو وہی ہیں جو مراد کو پہنچیں گے۔ ۴۷-۵۲

(یہ منافقین وہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے اللہ کی کڑی کڑی قسمیں کھائیں کہ اگر تم اِنھیں (جہاد کا) حکم دو گے تو یہ ضرور نکلیں گے۔ کہہ دو کہ قسمیں نہ کھاؤ۔ تم سے دستور

مستقبل کے بارے میں بھی۔

[91] لفظ 'ظُلم' یہاں 'ظُلم لنفسہ' کے معنی میں ہے، یعنی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے۔

[92] اصل میں لفظ 'یَتَّقْهِ' استعمال ہوا ہے۔ اِس کی صورت تخفیف کی وجہ سے کچھ بدل گئی ہے، لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ عربی زبان میں اِس قسم کی تخفیف معروف ہے۔ اِس کے ساتھ لفظ 'خَشْيَة' استعمال کیا گیا ہے۔ یہ دونوں لفظ، یعنی 'خَشْيَة' اور 'تَقْوٰى' ایک ساتھ استعمال کیے جائیں تو اِن میں پہلا بالعموم باطن اور دوسرا ظاہر کے لیے خاص ہو جاتا ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ
وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ
اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ
فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ

کے مطابق اطاعت چاہیے[۹۳]۔ اللہ یقیناً جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اِن سے کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو۔ لیکن اگر روگردانی کرو گے تو (یاد رکھو کہ) رسول پر وہی ذمہ داری ہے جو اُس پر ڈالی گئی ہے اور تم پر وہی جو تم پر ڈالی گئی ہے[۹۴]۔ تم اُس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ ۵۳-۵۴

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں، اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ اُن کو وہ اِس سر زمین میں[۹۵] ضرور اُسی طرح اقتدار عطا فرمائے گا،

---

[۹۳] اصل الفاظ ہیں: ’طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ‘۔ یہ خبر محذوف کا مبتدا بھی ہو سکتا ہے اور مبتدائے محذوف کی خبر بھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... دونوں ہی صورتوں میں مفہوم میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوگا، اِس لیے کہ اِس قسم کے حذف سے اصل مقصود مخاطب کی پوری توجہ کو مذکور پر مرتکز کرنا ہوتا ہے اور یہ چیز دونوں ہی صورتوں میں یہاں حاصل ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/۴۲۵)

[۹۴] یعنی ایمان و ہدایت اور اطاعت و فرماں برداری کی ذمہ داری جس کا مطالبہ یہاں کیا جا رہا ہے۔

[۹۵] یعنی سر زمین عرب میں۔

دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ
يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾
وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ

جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو اُس نے عطا فرمایا تھا[۹۶] اور اُن کے لیے اُن کے دین کو پوری طرح قائم کر دے گا جسے اُس نے اُن کے لیے پسند فرمایا ہے اور اُن کے اِس خوف کی حالت کے بعد اِسے ضرور امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھیرائیں گے۔ اور جو اِس کے بعد بھی منکر ہوں تو وہی نافرمان ہیں[۹۷]۔ ۵۵

(تم اپنے شبہات سے نجات چاہتے ہو تو) نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور

---

[۹۶] یہ اُن لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے رسولوں کی بعثت کے بعد اُن کی دعوت قبول کی اور سنت الٰہی کے مطابق اُن کے منکرین پر اللہ تعالیٰ نے اُنھیں غلبہ عطا فرمایا۔ روے سخن، اگر غور کیجیے تو منافقین کی طرف ہے جن کے بارے میں اوپر ذکر ہوا ہے کہ اسلام کے مستقبل سے متعلق شکوک میں مبتلا تھے۔ فرمایا کہ خدا کی جو سنت رسولوں کے باب میں ہمیشہ رہی ہے، اُسی کے مطابق اُس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے بھی وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ اُنھیں سرزمین عرب کا اقتدار عطا فرمائے گا۔ آگے تفصیل فرمائی ہے کہ اِس کے نتیجے میں یہاں دین حق کی حکومت قائم ہوگی، اہل ایمان کے لیے کوئی خطرہ باقی نہ رہے گا اور عبادت صرف اللہ کے لیے خاص ہو جائے گی۔ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اِس شان کے ساتھ پورا ہوا کہ اِسے اب کوئی شخص جھٹلا نہیں سکتا۔

[۹۷] اِس سے مقصود اِس کا لازم ہے، یعنی نافرمان ہیں تو بہت جلد اپنا انجام بھی دیکھ لیں گے۔

تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ
وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ
الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ
الْعِشَآءِ ۗ قف ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ

رسول کے فرماں بردار بن کر رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اِن منکروں کے بارے میں ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ اِس سرزمین میں یہ خدا کو عاجز کر دیں گے۔ (ہرگز نہیں، یہ خود عاجز ہوں گے) اور اِن کا ٹھکانا (آگے بھی) دوزخ ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ ۵۶-۵۷

ایمان والو، (تمھارے قلب و نظر کی پاکیزگی کے لیے جو ہدایات ہم نے دی ہیں، تم اُن کی مزید وضاحت چاہتے ہو تو سنو)، تمھارے غلام اور لونڈیاں اور تم میں جو بلوغ کو نہیں پہنچے، تین وقتوں میں تم سے اجازت لے کر تمھارے پاس آیا کریں: نماز فجر سے پہلے؛ جب دوپہر کو تم کپڑے اتارتے ہو اور نماز عشا کے بعد[۹۸]۔ یہ تین وقت تمھارے لیے پردے کے وقت ہیں[۹۹]۔ اِن کے علاوہ (وہ بلا اجازت آ جائیں تو) نہ تم پر کوئی گناہ

---

[۹۸] پیچھے ہدایت کی گئی ہے کہ گھروں میں داخل ہونے کے لیے اجازت لی جائے۔ یہ اُس کی وضاحت فرمائی ہے کہ گھروں میں آمدورفت رکھنے والے غلاموں اور نابالغ بچوں کے لیے ہر موقع پر اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔ اُن کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ تین اوقات میں اجازت لے لیا کریں۔

[۹۹] یہ دلیل بیان فرمائی ہے کہ اِن اوقات میں اگر کوئی اچانک آ جائے گا تو ممکن ہے کہ گھر والوں کو ایسی حالت میں دیکھ لے، جس میں دیکھنا پسندیدہ نہ ہو۔

بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۵۸ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ
فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۵۹ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ
لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ
مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ

ہے نہ اُن پر، اِس لیے کہ تم ایک دوسرے کے پاس آنے جانے والے ہی ہو[۱۰۰]۔ اللہ تمھارے لیے اِسی طرح اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ تم میں جو بچے ہیں، وہ جب بلوغ کو پہنچ جائیں تو اُسی طرح اجازت لے کر آئیں، جس طرح اُن کے اگلے اجازت لیتے رہے ہیں[۱۰۱]۔ اللہ تمھارے لیے اِسی طرح اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور بڑی بوڑھی عورتیں جو اب نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، وہ اگر اپنے دوپٹے گریبانوں سے اتار دیں تو اُن پر کوئی گناہ نہیں[۱۰۲]، بشرطیکہ زینت کی نمایش کرنے والی

---

[۱۰۰] غلام اور بچے کیوں مستثنیٰ ہوں گے؟ یہ اُس کی حکمت کا بیان ہے۔

[۱۰۱] یعنی اِس دلیل کی بنا پر کہ یہ بچپن سے گھر میں آتے جاتے رہے ہیں، اِنھیں ہمیشہ کے لیے مستثنیٰ نہیں سمجھا جائے گا۔ بلوغ کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد اِن کے لیے بھی ضروری ہوگا کہ عام قانون کے مطابق اجازت لے کر گھروں میں داخل ہوں۔

[۱۰۲] پیچھے ہدایت کی گئی ہے کہ عورتوں نے زینت کی ہو تو غیر محرموں کی موجودگی میں وہ اپنا سینہ اور گریبان اوڑھنیوں کے آنچل سے ڈھانپ لیا کریں۔ یہ اُس کی وضاحت میں فرمایا ہے کہ سینہ اور گریبان ڈھانپ کر رکھنے کا یہ حکم اُن بوڑھی عورتوں کے لیے نہیں ہے جن کی خواہشات مر چکی ہیں اور انھیں دیکھ کر مردوں میں بھی کوئی صنفی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر چاہیں تو اپنی اوڑھنیاں مردوں کے

سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۶۰﴾
لَیۡسَ عَلَی الۡاَعۡمٰی حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا
عَلَی الۡمَرِیۡضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا مِنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ
اٰبَآئِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اُمَّہٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اِخۡوَانِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَخَوٰتِکُمۡ
اَوۡ بُیُوۡتِ اَعۡمَامِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ عَمّٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَخۡوَالِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ
خٰلٰتِکُمۡ اَوۡ مَا مَلَکۡتُمۡ مَّفَاتِحَہٗۤ اَوۡ صَدِیۡقِکُمۡ ؕ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ

نہ ہوں[۱۰۳]۔ تاہم وہ بھی احتیاط کریں تو اُن کے لیے بہتر ہے اور اللہ سمیع و علیم ہے[۱۰۴]۔ ۵۸-۶۰

(اللہ اِن ہدایات سے تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا، اِس لیے) نہ اندھے کے لیے کوئی حرج ہے، نہ لنگڑے کے لیے اور نہ مریض کے لیے اور نہ خود تمھارے لیے کہ تم اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اپنے زیر تولیت کے

سامنے اتار سکتی ہیں۔ اِس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

[۱۰۳] یعنی بن ٹھن کر رہنے اور دوسروں کو دکھانے کا شوق باقی نہ رہا ہو۔

[۱۰۴] یعنی پسندیدہ بات اُن کے لیے بھی یہی ہے کہ مردوں کی موجودگی میں دوپٹے نہ اتاریں اور اِن ہدایات پر اِن کی روح کے مطابق عمل کریں، اِس لیے کہ جس ہستی کی طرف سے یہ دی جا رہی ہیں، وہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ اُس سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی۔

اَنۡ تَاۡكُلُوۡا جَمِيۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُيُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ تَحِيَّةً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۱﴾

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاِذَا كَانُوۡا مَعَهٗ

گھروں سے[۱۰۵] یا اپنے دوستوں کے گھروں سے کھاؤ پیو۔ تم پر کوئی گناہ نہیں، چاہے (مرد و عورت) اکٹھے بیٹھ کر کھاؤ یا الگ الگ[۱۰۶]۔ البتہ، جب گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو، اللہ کی طرف سے مقرر کی ہوئی ایک بابرکت اور پاکیزہ دعا۔ اللہ تمھارے لیے اِسی طرح اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ ۶۱

(یہی پاکیزگی تمھارے طرزِ عمل میں بھی چاہیے۔ اِس لیے کہ) مومن تو درحقیقت وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر سچا ایمان رکھتے ہیں[۱۰۷] اور جب کسی اجتماعی کام

---

[۱۰۵] یہ اُن گھروں کی تعبیر ہے جو کسی شخص کی سرپرستی میں ہوں، جیسے یتیموں کا گھر اُن کے اولیا کے لیے۔

[۱۰۶] مطلب یہ ہے کہ اِن میں سے کسی چیز کو بھی ممنوع قرار دینا پیشِ نظر نہیں ہے۔ اِس سے مختلف کوئی بات اگر لوگوں نے سمجھی ہے تو غلط سمجھی ہے۔ ملنے جلنے کے جو آداب بتائے جا رہے ہیں، اُن سے ربط و تعلق کے لوگوں کو سہارے سے محروم کرنا یا لوگوں کی سوشل آزادیوں پر پابندی لگانا مقصود نہیں ہے۔ وہ اگر سمجھ بوجھ سے کام لیں تو یہ سارے تعلقات اِن آداب کی رعایت کے ساتھ بھی قائم رکھ سکتے ہیں۔

[۱۰۷] اصل میں فعل 'اٰمَنُوْا' استعمال ہوا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہ یہاں اپنے کامل مفہوم میں ہے۔

عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ
يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا
اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ
لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٢﴾
لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ
قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ

کے لیے رسول کے ساتھ ہوتے ہیں تو جب تک اُس سے اجازت نہ لے لیں، وہاں سے نہیں جاتے۔ جو لوگ تم سے اجازت لے کر جاتے ہیں، وہی، (اے پیغمبر)، اللہ اور اُس کے رسول کے ماننے والے ہیں۔ سو جب وہ اپنے کسی کام کے لیے تم سے اجازت مانگیں تو اُن میں سے جس کو چاہو، اجازت دے دیا کرو اور اُن کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرتے رہو[۱۰۸]۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۶۲

تم لوگ اپنے درمیان رسول کے بلانے کو اُس طرح کا بلانا نہ سمجھو، جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اللہ اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں

---

[۱۰۸] اِس سے معلوم ہوا کہ خدا کے رسول سے اِس طرح کی اجازت کسی ناگزیر ضرورت ہی کے لیے مانگنی چاہیے، اِس لیے کہ یہ بھی کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس لیے کہ رسول کی معیت و نصرت سے بڑھ کر، بالخصوص جب کہ کوئی اجتماعی ضرورت درپیش ہو، کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا۔ لیکن انسانی کمزوریوں کو پیش نظر رکھ کر رسول کو یہ اجازت دے دی گئی کہ اگر وہ کسی کو اجازت دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں اور اُس کی اِس کمزوری کے لیے اللہ سے استغفار کریں۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۴۳۴)

يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ
عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے چلے جاتے رہے ہیں[۱۰۹]۔ سو اُن لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو رسول کے حکم سے گریز کر کے اُس کی مخالفت کرتے رہے ہیں[۱۱۰] کہ اُن پر کوئی آزمایش آ جائے یا اُن کو دردناک عذاب آ پکڑے۔ سنو، زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ تم جس حال پر ہو، اللہ اُس کو جان چکا ہے۔ جس دن یہ اُس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ اِنھیں بتا دے گا جو کچھ یہ کر کے آئے ہیں۔ اور (یاد رکھو کہ) اللہ ہر چیز سے واقف ہے[۱۱۱]۔ ۶۳-۶۴

---

[۱۰۹] اصل الفاظ ہیں: 'قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا'۔ 'يَتَسَلَّلُوْنَ' سے پہلے فعل ناقص اِس جملے میں محذوف ہے۔ ہر صاحب ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ اِس کے اسلوب بیان میں کس درجہ غصہ اور عتاب مضمر ہے۔

[۱۱۰] یہاں جس مخالفت کا ذکر ہے، اُس کی نوعیت درحقیقت گریز و فرار ہی کی تھی۔ چنانچہ 'يُخَالِفُوْنَ' کا صلہ 'عَنْ' کے ساتھ آیا ہے جس سے یہ گریز و فرار کے مفہوم پر متضمن ہو گیا ہے۔

[۱۱۱] اسلوب کی تبدیلی سے واضح ہے کہ یہ بات مخاطبین سے منہ پھیر کر فرمائی گئی ہے۔

کوالالمپور

۱۰/ اگست ۲۰۱۳ء

باب چہارم

الفرقان ۔ الاحزاب

رسالت کا اثبات
اُس کے حوالے سے قریش کو انذار و بشارت
اور مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر

باب چہارم

الفرقان ـ الاحزاب

۲۵ —— ۳۳

یہ قرآن مجید کا چوتھا باب ہے۔ اِس میں ’الفرقان‘ (۲۵) سے ’الاحزاب‘ (۳۳) تک نو سورتیں ہیں۔ اِن سورتوں کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے پہلی آٹھ سورتیں ام القریٰ مکہ میں اور آخری سورہ ’الاحزاب‘ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

قرآن مجید کے دوسرے ابواب کی طرح یہ چیز اِس باب میں بھی ملحوظ ہے کہ یہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا اور ایک مدنی سورہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

اِس کے مخاطب اصلاً قریش مکہ ہیں۔ اہل کتاب کو پچھلے باب کی طرح اُنھی کے ضمن میں بعض موقعوں پر تنبیہ کی گئی ہے، اِس لیے کہ اِن سورتوں کے زمانۂ نزول میں وہ بھی قریش کی حمایت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے میدان میں آ چکے تھے۔ تزکیہ و تطہیر کے مضامین میں، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والے مخاطب ہیں۔ چنانچہ باب کا خاتمہ اُنھی کے ساتھ خطاب پر ہوا ہے۔

اِس کا موضوع رسالت کا اثبات، اُس کے حوالے سے قریش کو انذار و بشارت اور مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا مقام و مرتبہ اُسی کے ضمن میں آپ کے ماننے والوں پر واضح کیا گیا ہے۔

الفرقان - الشعراء

٢٥ ـــــ ٢٦

الفرقان - الشعراء

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع اثبات رسالت اور اُس کے حوالے سے انذار و بشارت ہے۔ دوسری سورہ میں، البتہ اُن سرگذشتوں کی تفصیل کر دی گئی ہے جن کی طرف پہلی سورہ میں بالاجمال اشارہ فرمایا ہے۔ نیز کاہن اور شاعر ہونے کا جو الزام قریش مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے تھے، اُس کی اِس سورہ میں خاص طور پر تردید کی گئی ہے۔ دونوں میں خطاب قریش سے ہے جو آپ کی صداقت کے ثبوت کے لیے اُس زمانے میں آپ سے بار بار عذاب کی کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ دوسری سورہ میں آیت ترجیع اِسی حوالے سے وارد ہوئی ہے۔

دونوں سورتوں کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

سورة الفرقان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

بہت بزرگ، بہت فیض رساں ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر یہ فرقان[1]

---

[1] یعنی ایک ایسی کتاب جو حق و باطل میں امتیاز کے لیے ایک کسوٹی، ایک معیار فیصلہ اور حجت قاطع ہے۔ دوسری جگہ یہی حقیقت لفظ 'میزان' سے واضح فرمائی ہے، یعنی ایک ترازو تاکہ ہر شخص اُس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق اور کیا باطل ہے۔ چنانچہ اپنے دعاوی اور اپنے پیش کرنے والے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے بھی یہ کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے، بلکہ بجاے خود دلیل و حجت ہے۔ قرآن کی یہی حیثیت ہے جس کی بنا پر ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' کے مقدمہ ''اصول و مبادی'' میں لکھا ہے کہ خدا کی اِس کتاب کے بارے میں یہ دو باتیں بطور اصول ماننی چاہییں:

> ''پہلی یہ کہ قرآن کے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اِس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اِس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔ دین میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اِس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اِس سے شروع ہوگی اور اِسی پر ختم کر دی جائے گی۔ ہر وحی، ہر الہام، ہر القا، ہر تحقیق اور ہر راے کو اِس کے تابع قرار دیا جائے گا اور اِس کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے گی کہ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اِس کی حکومت قائم ہے اور اِس کے خلاف اِن میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔
>
> دوسری یہ کہ اِس کے الفاظ کی دلالت اِس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے،

نَذِيْرَا ۙ ① الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا

اتارا ہے، اِس لیے کہ وہ اہل عالم کے لیے خبردار کرنے والا ہو۔[2] وہی جس کے لیے زمین اور آسمانوں کی بادشاہی ہے،[3] اُس نے اپنی کوئی اولاد نہیں بنائی ہے،[4]

پوری قطعیت کے ساتھ کہتا ہے اور کسی معاملے میں بھی اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا۔ اِس کا مفہوم وہی ہے جو اِس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں، وہ نہ اُس سے مختلف ہے نہ متبائن۔ اِس کے شہرستان معانی تک پہنچنے کا ایک ہی دروازہ ہے اور وہ اِس کے الفاظ ہیں۔ وہ اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتے ہیں، اُس میں کسی ریب و گمان کے لیے ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔‘‘ (۲۵)

۲ یعنی صرف ام القریٰ مکہ اور اُس کے گرد و پیش کے لوگوں کے لیے نہیں، بلکہ پورے عالم کے لیے۔ سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۹ میں مزید وضاحت فرمائی ہے کہ قرآن کی دعوت آنے والے تمام زمانوں کے لیے بھی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: ’اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ‘ (یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے کہ اِس کے ذریعے سے میں تمھیں انذار کروں اور اُن کو بھی جنھیں یہ پہنچے)۔ قرآن کی یہ حیثیت لازماً تقاضا کرتی ہے کہ بعد میں آنے والوں کے لیے بھی یہ اپنے ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے اُسی طرح قطعی رہے، جس طرح اپنے اولین مخاطبین کے لیے تھا۔ خدا کی عنایت ہے کہ ایسا ہی ہے اور اُس کی یہ کتاب اِسی قطعیت کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آیت میں ’عَلٰى عَبْدِهٖ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ التفات خاص کا اسلوب ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’... اِس التفات کا یہاں ایک خاص محل ہے۔ آگے کفار کے وہ اعتراضات نقل ہوئے ہیں جو وہ نہایت تحقیر آمیز انداز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ یہ اعتراضات زیادہ تر مکہ اور طائف کے دولت مندوں کے اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی مالی برتری کے گھمنڈ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی اسباب و وسائل سے بے تعلقی پر چوٹیں کرتے اور اِس چیز کو آپ کی رسالت

وَّلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ شَرِيۡكٌ فِى الۡمُلۡكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا ②
وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ

اُس کی بادشاہی میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہے، اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اُس کا ایک خاص اندازہ ٹھیرایا ہے[۵]۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُنھوں نے اُس کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے، وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں اور

کی تردید کی ایک بہت بڑی دلیل کی حیثیت سے پیش کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں متکبرین کی اِسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندۂ خاص پر 'فرقان' کی شکل میں جو نعمت عظمیٰ اتاری ہے، اُس کے بعد وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ خلق کے انذار کے وہ جس مشن پر مامور ہے، اُس کی تکمیل کے لیے وہ جس زاد وراحلہ کا محتاج ہے، وہ سب بدرجۂ کمال اُس کے پاس موجود ہے۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۴۴۳)

۳ مطلب یہ ہے کہ کوئی اِس کتاب کو سائل کی درخواست نہ سمجھے۔ یہ اِس کائنات کے بادشاہ حقیقی کا فرمان واجب الاذعان ہے۔ اِسے جھٹلایا گیا تو اُس کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

۴ خدا کے لیے جن لوگوں نے بیٹے اور بیٹیاں فرض کر رکھی ہیں، اُن کے بارے میں وہ لازماً اِس زعم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اُنھیں وہ خدا کی پکڑ سے بچا لیں گی۔ قرآن نے یہ اِسی زعم باطل کی نفی کی ہے۔

۵ یہ خدا کی توحید اور یکتائی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ جب وہ ہر چیز کا خالق ہے اور اُسی نے ہر چیز کے لیے صورت، جسامت، قوت واستعداد، اوصاف وخصائص، عروج وارتقا اور بقا وزوال کے حدود وقیود متعین کیے ہیں تو کوئی دوسرا اُس کی خدائی میں کہاں سے شریک ہوگا؟ کیا کسی شخص کے لیے ممکن ہے کہ اُس کی بنائی ہوئی کسی چیز کو اُس کے ٹھیرائے ہوئے اندازے سے سر مو کم وبیش یا آگے پیچھے کر سکے؟

وَلَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا وَّلَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوۡرًا ③

وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکُ ۣ افۡتَرٰىہُ وَاَعَانَہٗ عَلَیۡہِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ ۚۛ فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّزُوۡرًا ④ وَقَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ

اپنے لیے بھی کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔ وہ نہ موت پر کوئی اختیار رکھتے ہیں نہ زندگی پر اور نہ مرے ہوؤں کو اٹھانا اُن کے اختیار میں ہے[۶]۔ ۱-۳

(اِس کے) منکرین کہتے ہیں کہ یہ قرآن محض جھوٹ ہے جس کو اِس شخص نے گھڑ لیا ہے[۷] اور کچھ دوسرے لوگوں نے اِس کام میں اِس کی مدد کی ہے[۸]۔ یہ کہہ کر

---

[۶] مطلب یہ ہے کہ اِس سے بڑھ کر خرد باختگی کیا ہوگی کہ ایسے بے بس معبودوں کے سہارے پر قرآن کے پیش کردہ حقائق کو جھٹلا دیا جائے؟

[۷] یعنی وحی الٰہی نہیں ہے، جس طرح کہ دعویٰ کیا جا رہا ہے، بلکہ اپنے ذہن کا گھڑا ہوا کلام ہے جسے خدا کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

[۸] اُنھوں نے یہ بات کسی نام کی تصریح کے ساتھ اِس لیے نہیں کی کہ الزام جھوٹا ہو تو ابہام ہی کا اسلوب موزوں ہوتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اگر اُس کے لیے تصریح کا اسلوب اختیار کر لیا جائے تو بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ قرآن کو (معاذ اللہ) جھوٹ قرار دے کر اُس کے ساتھ یہ بات اُنھیں اِس لیے کہنا پڑی کہ قرآن میں پچھلے انبیا علیہم السلام کی سرگذشتوں کے حوالے بھی تھے۔ اُن کے بارے میں یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں پیدا ہو سکتا تھا کہ اگر یہ وحی الٰہی نہیں ہے تو آخر یہ سب باتیں اُنھی کے اندر کے ایک شخص کو اِس صحت اور تفصیل کے ساتھ کس طرح معلوم ہو گئی ہیں۔ اِس کے جواب میں اُنھوں نے اُن لوگوں کی طرف اشارہ کر دیا جو اہل کتاب میں سے آپ پر ایمان لے آئے تھے کہ یہ اُن کی سکھائی ہوئی ہیں۔ اپنی بات کو موکد کرنے کی یہ ایسی کوشش ہے جس سے

الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ⑤ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ⑥

اُنھوں نے بڑے ظلم اور جھوٹ کا ارتکاب کیا ہے[۹]۔ کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں جو اِس نے (کسی سے) لکھوا لیے ہیں۔ سو وہی اب صبح و شام اِس کتاب میں لکھنے کے لیے اِس کو سنائے جاتے ہیں[۱۰]۔ اُن سے کہو کہ (یہ کتاب تو اپنے لفظ لفظ سے شہادت دے رہی ہے کہ) اِسے اُس (پروردگار) نے اتارا ہے جو زمین اور آسمانوں کے بھید جانتا ہے[۱۱]۔ (تم جیسے سرکشوں کے لیے وہ اِس کی جگہ عذاب بھی اتار سکتا تھا، مگر) حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۴-۶

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حق کی دشمنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے تھے اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پر اتر آئے تھے۔

[۹] قرآن جس عظیم علم و حکمت کا حامل اور زبان و بیان کے لحاظ سے جس پایے کا شہ پارۂ ادب ہے اور اُس میں انبیا علیہم السلام کی سرگذشتیں جس طریقے سے اور جن مضامین پر استدلال کے لیے سنائی گئی ہیں، اُن کو دیکھ کر ہر سلیم الطبع انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ جس الزام کا ذکر ہوا ہے، وہ کس قدر پوچ، کیسا لغو اور مہمل اور کتنا بے وزن ہے۔ چنانچہ یہی بات کافی تھی جو قرآن نے اُس کے جواب میں کہہ دی ہے۔ جو لوگ ایسی بالبداہت مہمل باتیں اِس ڈھٹائی کے ساتھ کہیں، اُن کی تردید میں اِس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

[۱۰] یہ اُسی الزام کی مزید وضاحت ہے جو اوپر نقل ہوا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'تُمْلٰى عَلَيْهِ' کے الفاظ اِس لیے آ گئے ہیں کہ جو چیز سنائی جا رہی تھی، اُسے یاد کرنے والے یاد کر رہے اور لکھنے والے ساتھ ساتھ لکھ بھی رہے تھے۔

[۱۱] مطلب یہ ہے کہ جو علم و حکمت اور ماضی، حال اور مستقبل کے جو حقائق اِس کتاب میں بیان

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي
الْاَسْوَاقِ ط لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۷ اَوْ يُلْقٰٓى
اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ط وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ
تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۸ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ
فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۹

کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے؟ یہ تو (ہماری طرح) کھانا کھاتا ہے اور (اپنی ضرورتوں کے لیے) بازاروں میں پھرتا ہے! اِس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ اِس کے ساتھ ہو کر وہ (نہ ماننے والوں کو) خبردار کرتا[12]؟ یا اِس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا یا (زیادہ نہیں تو) اِس کے لیے کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ کھاتا پیتا[13] ــــ یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو ایک سحرزدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔ دیکھو، (اے پیغمبر)، یہ تمھاری نسبت کیسی کیسی باتیں بنا رہے ہیں۔ سو بالکل کھوئے گئے

کیے جا رہے ہیں، وہ نہ کسی عربی کے لیے جاننا ممکن ہیں، نہ کسی عجمی کے لیے۔ اُن کا ماخذ علم اور منبع الہام تو وہی ذات ہو سکتی ہے جو زمین و آسمان کے سارے بھیدوں اور تمام اسرار و رموز سے واقف ہو۔ یہ بات اِس کتاب کی سطر سطر سے واضح ہے۔ اِس کے بعد خود سمجھ سکتے ہو کہ تمھارا الزام کس قدر پوچ اور مہمل ہے۔

[12] یعنی اِن کے ساتھ ساتھ پھرتا اور منادی کرتا کہ لوگو، یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ جس چیز سے ڈرا رہے ہیں، اُس سے ڈرو، ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔

[13] مطلب یہ ہے کہ اُسی سے اپنی معاش حاصل کر لیتا اور اِسے کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ عام آدمیوں کی طرح بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝۱۰ بَلْ
كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ قف وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝۱۱ ۚ
اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ۝۱۲ وَاِذَآ
اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝۱۳ ؕ لَا

ہیں، اب کوئی راستہ نہیں پا رہے ہیں[۱۴]۔ ۷-۹

بہت بزرگ، بہت فیض رساں ہے وہ ذات جو اگر چاہے تو تمھیں اِس سے کہیں بہتر چیزیں بخش دے — (ایک نہیں)، بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں اور اُن میں تمھارے لیے محل بنوا دے[۱۵]۔ نہیں، یہ بات نہیں ہے[۱۶]، بلکہ انھوں نے قیامت کو جھٹلا دیا ہے اور جو قیامت کو جھٹلا دیں، اُن کے لیے ہم نے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ وہ جب اِن کو دور ہی سے دیکھے گی تو (دیکھتے ہی بپھر جائے گی اور) یہ اُس کا بپھرنا اور دھاڑنا سنیں گے اور جب اُس کی کسی تنگ جگہ میں باندھ کر ڈال دیے جائیں گے تو اُس وقت موت کو پکاریں گے[۱۷] — آج ایک ہی

---

[۱۴] یعنی حقیقت اتنی واضح ہے کہ اُس کی تردید کے لیے کوئی راستہ نہیں پا رہے ہیں۔ چنانچہ عناد اور تعصب میں اندھے ہو کر ایسی لچر اور پوچ باتیں کر رہے ہیں جن کے بارے میں خود بھی جانتے ہیں کہ اُن کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔

[۱۵] یعنی جو کچھ قیامت میں دینے والا ہے، وہ اِسی دنیا میں تمھیں دے دے۔ یہ اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

[۱۶] یعنی اصل بات یہ نہیں ہے جو یہ زبان سے کہہ رہے ہیں۔

[۱۷] اِس لیے کہ جس طرح کا عذاب وہاں ہوگا، اُس سے رہائی کی ایک ہی صورت اُن کو نظر

تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ⑭ قُلْ اَذٰلِكَ
خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً
وَّمَصِيْرًا ⑮ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي
رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْــُٔـوْلًا ⑯

موت کو نہیں، بہت سی موتوں کو پکارو[18]۔ اِن سے پوچھو، کیا یہ بہتر ہے یا ہمیشہ کی جنت جس کا وعدہ خدا سے ڈرنے والوں سے کیا گیا ہے؟ وہ اُن کے عمل کی جزا اور اُن کا ٹھکانا ہوگی۔ اُس میں جو چیز بھی چاہیں گے، اُن کے لیے موجود ہوگی۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تیرے پروردگار کے ذمے ایک وعدہ ہے جس کو اُسے ہر حال میں پورا کرنا ہے[19]۔ ۱۰-۱۶

آئے گی کہ کسی طرح موت آجائے۔

۱۸ یہ بات قولاً بھی ہو سکتی ہے اور اُس صورت حال کی تعبیر بھی جس سے وہ دوچار ہوں گے۔

۱۹ اُن کی جو تجویزیں اوپر نقل ہوئی ہیں، اُنھی کو سامنے رکھ کر یہ دوزخ اور جنت، دونوں کے احوال بیان کر دیے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اگر تم دیکھ سکتے کہ تمھارے لیے وہاں کیا عذاب تیار ہے اور ایمان والوں کے لیے کس ابدی بادشاہی کا اہتمام کیا گیا ہے تو کبھی وہ باتیں نہ کرتے جو پیغمبر کی دعوت کے جواب میں کر رہے ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”اِس جنت سے متعلق یہاں چار باتیں فرمائی گئی ہیں:
>
> ایک یہ کہ یہ اہل ایمان کو اُن کے اعمال کے صلے اور بدلے کے طور پر ملے گی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو یہ اطمینان دلا دے گا کہ یہ تم نے اپنی سعی و عمل سے حاصل کی ہے اور تم اِس کے پوری طرح حق دار ہو۔
>
> دوسری یہ کہ یہ اُن کی ابدی قیام گاہ ہوگی۔ اِس سے محروم ہونے کا اُن کو کبھی کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔
>
> تیسری یہ کہ اِس میں وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمیشہ کے لیے ملے گا۔
>
> چوتھی یہ کہ اِس جنت کا اہل ایمان سے اللہ تعالیٰ نے حتمی وعدہ فرمایا ہے اور از خود اپنے اوپر

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ
ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ؕ (۱۷)
قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ
اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا
قَوْمًۢا بُوْرًا (۱۸) فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ

یہ اُس دن کا دھیان کریں، جس دن وہ اِنھیں اکٹھا کرے گا اور اُن کو بھی جنھیں یہ خدا کے سوا پوجتے ہیں[۲۰]، پھر اُن سے پوچھے گا: کیا تم نے میرے اِن بندوں کو گم راہ کیا تھا یا یہ خود ہی راہ راست سے بھٹک گئے تھے؟ وہ جواب دیں گے کہ پاک ہے تیری ذات، ہمیں یہ حق بھی کہاں تھا کہ ہم تیرے سوا دوسروں کو کارساز بنائیں! مگر ہوا یہ کہ تو نے اِن کو اور اِن کے باپ دادا کو خوب سامان زندگی دیا، یہاں تک کہ وہ تیری یاددہانی بھلا بیٹھے اور ایسے لوگ بن گئے جو برباد ہو کر رہے[۲۱] ـــــ یہ لو، اِنھوں نے تو جو تم کہتے تھے، اُس میں تمھیں جھوٹا ٹھیرا دیا۔ سو اب نہ اپنی شامت کو ٹال سکو

اِس کا ایفا واجب اور اپنے بندوں کے آگے اُس کے لیے اپنے کو ذمہ دار و مسؤل ٹھیرایا ہے۔" (تدبر قرآن ۵/۴۵۵)

[۲۰] اِن معبودوں کا ذکر اوپر آیت ۳ میں گزر چکا ہے۔

[۲۱] دولت اور اقتدار کے ساتھ دو تین پشتیں گزر جائیں تو اکثر لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ اب اُن کا پیدایشی حق ہے، اور آخرت اول تو ہو گی نہیں، اور اگر بالفرض ہوئی بھی تو جس طرح دنیا میں اُنھیں دوسروں سے کہیں بڑھ کر ملا ہے، آخرت میں بھی لازماً مل جائے گا۔ یہ اِسی ذہنیت کا بیان ہے اور صاف واضح ہے کہ یہ اصنام و اوثان نہیں، بلکہ اُن انبیا و صلحا اور ملائکہ کا جواب ہو گا جن کی یہ لوگ پرستش کرتے رہے۔

صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾
وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ
الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ
فِتْنَةً ۗ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾

گے نہ اپنی کوئی مدد کر سکو گے اور تم میں سے جو بھی ظلم[۲۲] کے مرتکب ہوں گے، اُنھیں ہم ایک بڑا عذاب چکھائیں گے۔ ۱۷-۱۹

تم سے پہلے بھی جتنے رسول ہم نے بھیجے ہیں، وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے[۲۳]۔ (ایمان والو)، ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمایش بنا دیا ہے[۲۴] تو بولو، اِن سب باتوں پر صبر کرتے ہو[۲۵]؟ (تم مطمئن رہو،

---

[۲۲] یعنی شرک و کفر جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اِس کی سزا کے لیے اصل میں 'عَذَابًا كَبِيْرًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں اِسے 'ظُلْمٌ عَظِيْمٌ' قرار دیا گیا ہے۔

[۲۳] اوپر قریش مکہ کا اعتراض نقل ہوا ہے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ قرآن نے یہ اِسی اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اِس سے پہلے جن رسولوں کو مانتے ہو، اُن میں سے کون سا رسول ایسا تھا جو نہ کھانا کھاتا ہو اور نہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہو؟ نوح، ابراہیم، اسمٰعیل، اور موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام، جن کی رسالت کے تم قائل ہو، وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نرالا اعتراض کیوں اٹھایا جا رہا ہے؟

[۲۴] یعنی اُن کی طرف سے تحقیر و تضحیک کے رویے کو تمھارے لیے اور تمھاری غربت کو اُن کے لیے آزمایش بنا دیا ہے کہ اِسی کے باعث وہ یہ کہہ کر حق کا انکار کر رہے ہیں کہ یہ اگر خدا کا دین ہوتا تو اِس سے مکہ اور طائف کے رؤسا و اکابر بہرہ یاب کیے جاتے، یہ اِن قلاش مسلمانوں کو نہ ملتا۔

[۲۵] مطلب یہ ہے کہ وہ تو اپنے شکر کے امتحان میں بالکل ناکام ہو گئے ہیں۔ اب بتاؤ، کہ اُن

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ
اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾
يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ

اے پیغمبر، یہ جو کچھ کر رہے ہیں)، تیرا پروردگار سب دیکھ رہا ہے[۲۶]۔ ۲۰

اور (اِن میں) جو ہمارے حضور پیشی کا اندیشہ نہیں رکھتے[۲۷]، وہ کہتے ہیں کہ (تمھاری جگہ) ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے؟ یا ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہم براہ راست اپنے پروردگار ہی کو دیکھتے[۲۸]؟ یہ اپنے جی میں بڑا گھمنڈ لیے بیٹھے ہیں اور اپنی سرکشی میں بہت بڑھ گئے ہیں[۲۹]۔ جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے، اُس دن اِن مجرموں کے

کے استکبار اور طنز و استہزا کے مقابلے میں تم کیا رویہ اختیار کرو گے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ مسلمانوں کو اِس بات پر ابھارا گیا ہے کہ اگر تمھارے مخالفین اپنے امتحان میں ناکام رہے تو اُن کو اُن کی قسمت کے حوالے کرو۔ تمھارے سامنے صبر کے امتحان کا جو مرحلہ ہے، اُس میں کامیابی کے لیے عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھو۔“ (تدبر قرآن ۵/۴۵۸)

[۲۶] یعنی جب دیکھ رہا ہے تو مطمئن رہو، ان تمام مخالفتوں کے علی الرغم وہ تمھیں فائز المرام بھی کرے گا۔

[۲۷] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ آگے جو بات نقل ہوئی ہے، وہ ایسے سرپھرے اور مغرور لوگ ہی کہہ سکتے ہیں جو آخرت سے بالکل نچنت اور بے خوف ہو گئے ہوں۔ چنانچہ 'الذین کفروا' کے بجائے اُن کا ذکر ایک ایسی صفت سے کیا ہے جو اُن کے جہل و غرور کو پوری طرح بے نقاب کر دے۔

[۲۸] خدا کو بے حجاب دیکھنے کا یہ مطالبہ بھی نہایت مغرورانہ ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کسی کو پیغام بر بنا کر بھیجنے کے بجائے، اُسے خود سامنے آکر ہمارے ساتھ بات کرنی چاہیے تھی کہ وہ صورت حال پیدا ہی نہ ہوتی جو اِس وقت پیدا کر دی گئی ہے۔

[۲۹] اُن کے مطالبات میں جو گھمنڈ چھپا ہوا تھا، یہ قرآن نے اُس پر ضرب لگائی ہے۔

حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمۡنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰهُ
هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا ﴿۲۳﴾ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ يَوۡمَئِذٍ خَيۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا
وَّاَحۡسَنُ مَقِيۡلًا ﴿۲۴﴾

وَيَوۡمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالۡغَمَامِ وَنُزِّلَ الۡمَلٰٓئِكَةُ تَنۡزِيۡلًا ﴿۲۵﴾
اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذِ ِالۡحَقُّ لِلرَّحۡمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوۡمًا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ

لیے کوئی خوش خبری نہ ہو گی۔ یہ (اُن کو دیکھ کر) چیخ اُٹھیں گے کہ پناہ، پناہ[۳۰]۔ اور اِنھوں نے جو عمل بھی کیے ہوں گے، ہم اُن کی طرف بڑھیں گے اور اُنھیں (لے کر) اڑتی ہوئی خاک بنا دیں گے۔ اُس دن جنت کے لوگ بہترین ٹھکانے اور نہایت اچھی آرام گاہ میں ہوں گے[۳۱]۔ ۲۱-۲۴

جس دن آسمان ایک بدلی کے اوپر سے پھٹ جائے گا۔ (وہ نمودار ہو گی) اور فرشتوں کے پرے کے پرے (اُس کے اندر سے) اتار دیے جائیں گے۔ اُس دن حقیقی بادشاہی صرف خداے رحمٰن کی ہو گی[۳۲]۔ وہ دن منکروں کے لیے بڑا سخت

---

[۳۰] اصل میں ’حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا‘ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عربی زبان میں ’حِجۡرًا‘ استعاذہ کے لیے بھی آتا ہے، جیسے معاذ اللہ۔ اِس صورت میں یہ فعل محذوف سے منصوب ہوتا ہے اور اِس کے ساتھ ’مَحۡجُوۡرًا‘ بالکل اُسی طرح آ جاتا ہے، جیسے لفظ ’ذیل‘ کے ساتھ ’ذائل‘ اور ’موت‘ کے ساتھ ’مائت‘۔

[۳۱] اصل میں لفظ ’مَقِیۡل‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی قیلولہ کی جگہ کے ہیں، لیکن اپنے عام استعمال میں یہ اِس سے مجرد ہو کر محض آرام گاہ کے معنی میں بھی آ جاتا ہے۔ یہی معاملہ ’أفعل‘ کا ہے۔ یہ بھی آیت میں دونوں جگہ تقابل کے مفہوم سے مجرد ہو کر آ گیا ہے۔

[۳۲] یعنی تمام پردے اٹھ جائیں گے اور جو لوگ یہاں اپنی بادشاہی کے زعم میں ہیں، اُن پر

عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي
اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا
خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ
الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ
قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ

دن ہو گا۔ جس دن ظالم[۳۳] اپنے ہاتھ حسرت سے کاٹے گا اور کہے گا کہ کاش، میں نے رسول کے ساتھ راہ (حق) اختیار کی ہوتی! ہاے میری بدبختی، کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا! اُسی نے گم راہ کر کے مجھے خدا کی یاددہانی سے بہکا دیا تھا[۳۴]، اِس کے بعد کہ وہ میرے پاس آچکی تھی۔ ارشاد ہو گا: شیطان انسان کے ساتھ بڑا ہی بے وفائی کرنے والا ہے! اور رسول کہے گا کہ پروردگار، میری قوم کے لوگوں نے اِس قرآن کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا[۳۵] ـــــــ (یہ جس طرح تمھارے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اے پیغمبر)، ہم نے اِسی طرح مجرموں میں سے

بھی واضح ہو جائے گا کہ کائنات کا حقیقی بادشاہ اللہ ہی ہے۔

[۳۳] لفظ 'ظَالِم' یہاں 'ظالم لنفسه' کے معنی میں ہے۔ یعنی اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا۔

[۳۴] اصل الفاظ ہیں: 'اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ'۔ اِن میں 'عَنْ' اِس بات کا قرینہ ہے کہ فعل 'اَضَلَّ' یہاں 'صرف' کے مفہوم پر بھی متضمن ہے۔ یعنی اُس نے مجھے گم راہ کر کے خدا کی یاددہانی سے برگشتہ کر دیا۔

[۳۵] آیت میں رسول سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب قرآن کو جھٹلانے والے قیامت میں اپنی بدبختی کا ماتم کر رہے ہوں گے، اُس وقت آپ بھی اپنا شکوہ خدا کے سامنے پیش

نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۛۚ
كَذٰلِكَ ۛۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ

ہر نبی کے دشمن بنائے ہیں۔[۳۶] (تم مطمئن رہو)، تمھارا پروردگار رہنمائی اور مدد کے لیے کافی ہے۔ ۲۵-۳۱

یہ منکرین کہتے ہیں کہ قرآن سارے کا سارا اِس کے اوپر ایک ہی وقت میں کیوں نہیں اتار دیا گیا؟[۳۷] ہم نے ایسا ہی کیا ہے، اِس لیے کہ اِس کے ذریعے سے ہم تمھارے دل کو مضبوط کریں[۳۸] اور یہی سبب ہے کہ ہم نے اِس کو ٹھیر ٹھیر کر اتارا

کر دیں گے جس کے بعد اِن بدبختوں میں سے کسی کے لیے کچھ کہنے کی گنجایش باقی نہ رہے گی۔

[۳۶] یعنی اُن کو مہلت دی کہ وہ پیغمبر کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ مہلت چونکہ خدا کی سنت ابتلا کے تحت ملتی ہے، اِس لیے اِسے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

[۳۷] یہ اعتراض اِس پہلو سے کیا جاتا تھا کہ قرآن کی صورت میں یہ جو سوچ سوچ کر کبھی کچھ مضمون لاتے ہیں اور کبھی کچھ، یہ اِس بات کی صریح علامت ہے کہ اِسے خود ہی گھڑ گھڑ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اِس لیے کہ خدا کو تو اِس طرح سوچنے اور تھوڑا تھوڑا کر کے لکھنے یا بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

[۳۸] یعنی حق و باطل کی جس کشمکش میں اِس کتاب نے تمھیں ڈال دیا ہے، اُس میں تمھاری ہمت بندھائیں تاکہ تمھیں اطمینان رہے کہ تمھارا پروردگار تمھاری طرف متوجہ ہے، اِس راہ کی مشکلات میں ہر موقع پر تمھاری رہنمائی کر رہا ہے اور ہر ضرورت میں تمھارے ساتھ ہوتا ہے۔ اِن میں سے کوئی چیز بھی تمھیں حاصل نہیں ہو سکتی تھی، اگر یہ کتاب ایک ہی دفعہ تمھارے ہاتھ میں پکڑا کر تمام مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تمھیں یوں ہی چھوڑ دیا جاتا اور تم محسوس کرتے کہ گویا ایک تختے پر بٹھا کر سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیے گئے ہو۔

بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ؕ﴿۳۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ
عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ
وَزِيْرًا ۖۚ ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ
تَدْمِيْرًا ؕ﴿۳۶﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ

ہے۔ یہ لوگ جو اعتراض بھی تمھارے پاس لے کر آئیں گے، اُس کا ٹھیک جواب اور اُس کی بہترین توجیہ ہم تمھیں بتا دیں گے۔ (اِن کے لیے اب دوزخ ہی ہے اور) جو لوگ اپنے مونہوں کے بل دوزخ کی طرف گھسیٹے جائیں گے،[۳۹] اُنھی کا ٹھکانا بہت برا ہے اور وہی سب سے بڑھ کر گم کردہ راہ ہیں۔[۴۰] ۳۲-۳۴

ہم نے موسیٰ کو بھی اِسی طرح کتاب عطا فرمائی تھی اور اُس کے ساتھ اُس کے بھائی ہارون کو اُس کا مددگار بنا دیا تھا۔[۴۱] پھر دونوں کو حکم دیا تھا کہ اُن لوگوں کے پاس جاؤ جنھوں نے (اُن دونوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی بالآخر) ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا، پھر ہم نے بھی اُنھیں پامال کر کے رکھ دیا۔ اِسی طرح

---

[۳۹] آیت میں 'یُحْشَرُوْنَ' کے بعد 'عَلٰی' تضمین پر دلالت کرتا ہے، یعنی 'یحشرون ویسبحون علی وجوھھم'۔

[۴۰] اِس لیے کہ جس راہ پر چلے تھے، اُس کی منزل دوزخ کی شکل میں سامنے آ گئی ہے۔

[۴۱] یہ اِس لیے کیا گیا کہ حضرت موسیٰ اپنے زمانے کے ایک باجبروت بادشاہ کی طرف بھیجے جا رہے تھے اور اُن کا احساس تھا کہ اُن کے بھائی ہارون فصاحت و بلاغت اور زبان آوری میں اُن سے بڑھ کر ہیں، لہٰذا ساتھ ہوں گے تو وہ اپنا فرض بہتر طریقے پر ادا کر سکیں گے۔

لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِـيْمًا ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟
وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا
لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ
اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ

جب نوح کی قوم نے رسولوں[۴۲] کو جھٹلایا تو اُن کو بھی ہم نے غرق کر دیا اور لوگوں کے لیے اُنھیں عبرت کی ایک نشانی بنا دیا۔ اِس طرح کے ظالموں کے لیے (آگے بھی) ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ عاد، ثمود، اصحاب الرس[۴۳] اور اُن کے درمیان بہت سی قوموں کو بھی ہم نے اِسی طرح ہلاک کیا[۴۴]۔ اِن میں سے ہر ایک کو ہم نے (پچھلی قوموں کی) مثالیں دے کر سمجھایا، اور (نہیں سمجھے تو بالآخر) ہر ایک کو ہم نے نیست و نابود کر دیا۔ یہ (قریش کے لوگ) تو اُس بستی پر سے گزرے بھی ہیں جس پر بری طرح پتھر برسائے گئے تھے[۴۵]۔ پھر کیا اُس کو دیکھتے نہیں رہے؟ نہیں، یہ بات

---

[۴۲] اُن کی طرف اگرچہ ایک ہی رسول کی بعثت ہوئی تھی، مگر کوئی رسول بھی یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کرتا تو اُس کے ساتھ وہ یہی کرتے۔ اِس لیے ایک رسول کی نافرمانی کو تمام رسولوں کی نافرمانی قرار دیا ہے۔

[۴۳] اِن کے بارے میں، افسوس ہے کہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی کہ یہ کون لوگ تھے۔ قرآن کے مفسرین نے مختلف روایات بیان کی ہیں، لیکن اِن میں سے کوئی چیز بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ شعراے جاہلیت میں سے زہیر نے اپنے ایک شعر میں کسی وادی رس کا ذکر کیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً عرب کی اقوام بائدہ میں سے کسی قوم کا حوالہ ہے جس کی طرف رسول کی بعثت ہوئی اور اُنھوں نے اُس کا انکار کر دیا۔

[۴۴] آیت میں فعل 'أهلكنا' بربناے قرینہ محذوف ہے۔ یہ اُسی کا ترجمہ ہے۔

[۴۵] یہ اشارہ قوم لوط کی بستی کی طرف ہے جس پر سے قریش آئے دن اپنے تجارتی سفروں

نُشُوْرًا (۴۰)
وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ
بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا (۴۱) اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ
صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ
مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۴۲) اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ
تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (۴۳) لا اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ

نہیں، بلکہ یہ دوبارہ اٹھائے جانے کی امید نہیں رکھتے ہیں۔ ۳۵-۴۰

(چنانچہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ) یہ جب بھی تمھیں دیکھتے ہیں، تمھارا مذاق ہی بناتے ہیں کہ اچھا، یہی ہے جس کو خدا نے (اپنا) رسول بنا کر بھیجا ہے! اِس نے تو ہمارے معبودوں سے ہمیں برگشتہ ہی کر دیا تھا، اگر ہم اُن (کی پرستش) پر جمے نہ رہتے۔ (اِنھیں اِس بات پر اصرار ہے، دراں حالیکہ) وہ وقت اب زیادہ دور نہیں، جب یہ عذاب دیکھیں گے تو خود جان لیں گے کہ کون بہت زیادہ راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔ تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے، (اے پیغمبر)، جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ پھر کیا تم اُس کا ذمہ لے سکتے ہو[۴۶]؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اِن میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟

میں گزرتے رہتے تھے۔

[۴۶] یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ اِن کی ہدایت کے لیے پریشان نہ ہوں، اِس لیے کہ جو لوگ اپنی باگ خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دیں، اُنھیں کوئی راہ راست پر نہیں لا سکتا۔ استاذ امام کے الفاظ میں، انسان کے اندر رہنمائی کا چراغ عقل ہے نہ کہ نفس کی خواہشیں تو جو لوگ اِس چراغ کو گل کر کے اپنی خواہشوں کے پرستار بن جائیں گے، آخر اُن کو رستہ دکھانا کس کے بس میں ہے!

اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾
اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ
سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ
اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾
وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا
وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾

یہ تو محض جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ بے راہ ہیں[۴۷]۔ ۴۱-۴۴

(لوگو، کس ہستی کو چھوڑ کر اِن بتوں کی پرستش پر جمے ہوئے ہو)؟ تم نے دیکھا نہیں اپنے پروردگار کو کہ کس طرح رات کا سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اُس کو (اِسی طرح) ٹھیرا دیتا[۴۸]۔ پھر (دیکھتے نہیں ہو کہ) ہم نے سورج کو اُس پر دلیل[۴۹] بنایا ہے۔ پھر (اِسی سے) آہستہ آہستہ ہم اُس کو اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ ۴۵-۴۶

وہی ہے جس نے رات کو تمھارے لیے پردہ اور اُس میں نیند کو باعث راحت بنایا[۵۰] اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنا دیا[۵۱]۔ ۴۷

---

[۴۷] اِس لیے کہ وہ اپنی جبلت سے کبھی انحراف نہیں کرتے، مگر انسان جب خواہشوں کا غلام بن جاتا ہے تو اپنی جبلت اور فطرت کے حدود بھی توڑ دیتا ہے۔

[۴۸] یہ امتنان کے لیے فرمایا ہے کہ اگر ٹھیرا دیتا تو اندازہ کر سکتے ہو کہ زمین پر زندگی گزارنا تمھارے لیے کس قدر دشوار ہو جاتا۔

[۴۹] اِس لیے کہ وہی رات کی عالم گیر تاریکی سے دنیا کو نکالنے کا باعث بنتا ہے، اُسی طرح جیسے کوئی دلیل راہ بن کر راہ کی تمام منازل کو واضح کر دے۔

[۵۰] آیت میں لفظ 'سُبَاتًا' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں۔ نیند کو 'سُبَات'

وَهُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۙ ﴿۴۸﴾ لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾

اور وہی ہے جو اپنی رحمت (کی بارش) سے پہلے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ (لوگو، دیکھتے نہیں ہو کہ) ہم آسمان سے پاکیزہ پانی اتارتے ہیں کہ اُس سے شہر کی مردہ زمین میں جان ڈال دیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو اُس سے سیراب کر دیں[۵۲]۔ ۴۸-۴۹

اِس لیے کہا ہے کہ یہ عمل کو منقطع کرتی ہے اور اِس طرح انسان کو راحت اور سکون حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے نیند کو دافع کلفت بنا کر تمھارے لیے یہ اہتمام کیا ہے کہ رات کی راحت بخش چادر اوڑھ کر سو جاؤ تاکہ از سر نو زندگی کی سرگرمیوں کے لیے تازہ دم ہو سکو۔

۵۱؎ یہ نہایت لطیف اسلوب میں اشارہ کر دیا ہے کہ ہر صبح گویا ایک روز قیامت ہے جس میں تم اُسی طرح اٹھتے ہو، جیسے صبح قیامت کو یک بہ یک موت کی نیند سے جاگ پڑو گے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ محض ایک لفظ 'نُشُوْر' کے استعمال سے اُس نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

۵۲؎ یہ آیتیں جن حقائق کی طرف توجہ دلا رہی ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مطلب یہ ہے کہ غور کرو، کیا یہ دنیا جس کے ہر گوشے میں اتنی حکمتیں اور قدرتیں نمایاں ہیں، بغیر کسی خالق کے وجود میں آ گئی ہے؟ یہ سب کچھ محض کسی اندھی بہری علت العلل کا کرشمہ ہے؟ آسمان سے لے کر زمین تک ابر، ہوا، بارش اور انسان و حیوانات کی مایحتاج میں یہ ربط آپ سے آپ پیدا ہو گیا ہے؟ کیا اضداد کی اِس باہمی ہم آہنگی کے مشاہدے کے بعد یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اُس کے اندر مختلف ارادے کار فرما ہیں؟ کیا رحمت و ربوبیت کا یہ اہتمام انسان پر رب رحمٰن و رحیم کی طرف سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتا؟ کیا ہر بارش کے بعد زمین کی از سر نو

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا
كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۖ ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ
الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾

ہم نے اِس قرآن کو اِن کے درمیان طرح طرح سے بیان کیا ہے[۵۳]، (اے پیغمبر)، تاکہ یہ یاددہانی حاصل کریں، مگر اکثر لوگ ناشکری کیے بغیر نہیں رہتے۔ اگر ہم چاہتے تو (اِن کی) ہر بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیج دیتے، (مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ پھر بھی نہ مانتے[۵۴])، اِس لیے تم اِن منکروں کی بات کا دھیان نہ کرو[۵۵] اور اِسی قرآن کے ذریعے سے اِن کے ساتھ جہادِ کبیر کرتے رہو[۵۶]۔ ۵۰-۵۲

زندگی اِس حقیقت کی یاددہانی نہیں کر رہی ہے کہ جو حکیم وقدیر اپنی قدرت وحکمت کا یہ مشاہدہ برابر کرا رہا ہے، اُس کے لیے لوگوں کے مرنے اور مٹی میں مل جانے کے بعد اُن کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے؟'' (تدبر قرآن ۵/۴۷۶)

[۵۳] یعنی اِن کے ہر گروہ اور ہر طبقے کے درمیان گوناگوں اسلوبوں سے حقائق کو بیان کرتے ہوئے سنا دیا ہے تاکہ اِن میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اُس پر حجت پوری نہیں ہوئی۔

[۵۴] مطلب یہ ہے کہ جس طرح قرآن میں بات اتنے مختلف پہلووں سے واضح کی گئی ہے کہ ہر گروہ اور ہر طبقے کی رعایت ملحوظ رہی ہے، اُسی طرح ہم اِن کی ہر بستی میں الگ الگ پیغمبر بھی بھیج سکتے تھے، لیکن اِس سے کیا ہوتا؟ اِس کے بعد بھی یہ اِسی ہٹ دھرمی سے انکار کر دیتے۔ اِس لیے مطمئن رہو، یہ اگر نہیں مان رہے اور الٹا تمھارا مذاق بنا رہے ہیں تو اِس میں تمھاری کوئی خامی نہیں ہے، اِنھی کے فسادِ مزاج کا قصور ہے۔ یہ تمھاری قدر پہچانتے تو کبھی ایسی باتیں نہ کرتے، بلکہ خدا کا شکر ادا کرتے کہ اِن کی سرزمین پر کیسا آفتابِ ہدایت طلوع ہوا ہے۔

[۵۵] یہ اُس بات کی طرف اشارہ ہے جو اوپر نقل ہوئی ہے کہ اچھا، یہی ہے جس کو خدا نے

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

اور (اِنھیں بتاؤ کہ) وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا کر چھوڑ دیا۔ ایک کا پانی میٹھا ہے، پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھاری ہے، نہایت کڑوا۔ اور دونوں کے درمیان اُس نے ایک پردہ حائل کر دیا اور ایک اٹل رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔[۵۷] ۵۳

اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ آیت میں لفظ 'اِطَاعَة' استعمال ہوا ہے۔ یہ کسی کی بات ماننے اور اُس کا لحاظ کرنے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ یہاں اِسی مفہوم میں ہے اور ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۵۶؎ یعنی وہی کٹھن جدوجہد جو اِس وقت تم کر رہے ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جن حالات میں اور جیسی جاں گسل جدوجہد اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے کر رہے تھے، یہ لفظ اُس کی رعایت سے استعمال ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی بڑی تحسین ہے۔ اِس سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہوئی کہ آپ جس جہاد کے لیے اصلاً مبعوث ہوئے تھے، وہ تلوار سے نہیں، بلکہ قرآن مجید ہی کے ذریعے سے کیا گیا۔

۵۷؎ توحید پر استدلال کے لیے یہ اُس عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا مشاہدہ ہر اُس جگہ کیا جا سکتا ہے، جہاں دو دریا ملتے ہوں یا کوئی بڑا دریا سمندر میں آ کر گر رہا ہو۔ دونوں کی موجیں آپس میں ٹکراتی ہیں، لیکن دونوں کا پانی الگ الگ رہتا ہے۔ ایک غیر مرئی دیوار گویا دونوں کے بیچ میں کھڑی ہو جاتی ہے جسے نہ کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ وہ موجوں کے ٹکرانے سے ٹوٹتی ہے۔ یہ واقعہ جس قانون کے تحت ہوتا ہے، اُسے سائنس کی زبان میں سطحی تناؤ (surface tension) کا قانون کہا جاتا ہے۔ سمندروں کے بیچ میں میٹھے پانی کے ذخیرے بھی اِسی قانون کے تحت اپنی مٹھاس پر قائم رہتے ہیں۔ یہ اِس بات کی صاف شہادت ہے کہ

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَکَانَ رَبُّکَ قَدِیْرًا ﴿۵۴﴾

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَا یَضُرُّهُمْ ؕ وَکَانَ الْکَافِرُ عَلٰی رَبِّهٖ ظَهِیْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۵۶﴾

اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اُس کے نسب اور سسرال ٹھیرائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب بڑی قدرت والا ہے۔[۵۸] ۵۴

لیکن اِن کا حال یہ ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر یہ اُن چیزوں کی بندگی کر رہے ہیں جو اِن کو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں، نہ نقصان اور (یہی نہیں)، یہ منکر (تو اب اِس سے آگے) اپنے رب کے حریف بنے ہوئے ہیں۔[۵۹] ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو بس ایک بشارت دینے

ایک ہی بالاتر قوت ہے جو دونوں پانیوں کو اِس طرح تھامے رکھتی ہے۔

۵۸؎ یعنی ایسی قدرت والا ہے کہ اُس نے پانی سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق بنائی، پھر اُس کے جوڑے بنائے اور اب اُنھی کو ملا کر ایک طرف بیٹے اور پوتے پیدا کرتا ہے جو دوسرے گھروں سے بہوئیں لاتے ہیں اور دوسری طرف بیٹیاں اور نواسیاں پیدا کرتا ہے جو بہوئیں بن کر دوسرے گھروں میں چلی جاتی ہیں جس سے خاندان اور خاندانوں سے قومیں وجود میں آتی چلی جاتی ہیں۔ یہ انسانی جوڑے بظاہر اضداد ہیں، لیکن اِنھی اضداد کے اندر وابستگی اور پیوستگی اور اُس سے نسبی اور صہری رشتوں کا ظہور اِس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ ایک ہی حکیم وقدیر ہے جس کا ارادہ اِس پوری کائنات میں کارفرما ہے اور اُس کے مقابل میں کوئی نہیں جو اِن اضداد کو وابستہ ہونے سے روک دے۔

۵۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَکَانَ الْکَافِرُ عَلٰی رَبِّهٖ ظَهِیْرًا'۔ اِن میں 'کَافِر' اسم جنس کے مفہوم میں ہے اور 'ظَهِیْر' کے بعد 'عَلٰی' نے اُس کے اندر حریف اور مدمقابل کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ
سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ
وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۚڒ ﴿۵۸﴾ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ

والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ میں اِس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگ رہا ہوں، مگر یہی کہ جو چاہے، وہ اپنے پروردگار تک پہنچنے کی راہ اختیار کر لے۔ تم اُس جیتے پر بھروسا رکھو جو مرنے والا نہیں ہے[۶۰] اور اُس کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے رہو۔ (وہ اِن سے خود سمجھ لے گا)، اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے کے لیے وہ کافی ہے۔ (وہی) جس نے زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا[۶۱]، پھر اپنے عرش پر متمکن ہوا[۶۲]۔ وہ رحمٰن ہے[۶۳]، سو تم (اُس

---

[۶۰] اِس میں، اگر غور کیجیے تو ایک لطیف تعریض اُن مردہ خداؤں پر بھی ہے جن کے بارے میں فرمایا ہے کہ نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان۔

[۶۱] چھ دنوں سے خدائی ایام مراد ہیں جن کے طول و عرض کو وہی جانتا ہے۔ ہم اپنی زبان میں اُنھیں چھ ادوار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ کائنات کا وجود کوئی وقتی حادثہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہے، لہٰذا کبھی عبث نہیں ہو سکتی۔

[۶۲] یہ خدا کے اقتدار کی تعبیر ہے اور آیت میں ’اِسْتَوٰی‘ کے ساتھ ’عَلٰی‘ نے اِس میں تمکن کے معنی پیدا کر دیے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ کائنات کو پیدا کر کے اُس کا خالق بے تعلق نہیں ہو گیا، بلکہ اُس کے تختِ حکومت پر متمکن ہے اور اُس کے تمام معاملات اُس کی نگرانی میں انجام پا رہے ہیں۔

فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿٥٩﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا
وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿٦٠﴾ السجدة
تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا

کی شان) اُسی سے پوچھو جو اُس کو جاننے والا ہے[٦٤]۔ جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے[٦٥]؟ کیا ہم اُس کو سجدہ کریں جسے تم سجدہ کرنے کے لیے ہمیں کہہ دو؟ اور اِن کی نفرت کو یہ چیز اور بڑھا دیتی ہے۔ ۵۵-٦٠

(لوگو، کس سے انحراف کر رہے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ) بہت بزرگ، بہت فیض رساں ہے وہ ذات جس نے آسمان میں مضبوط قلعے بنائے[٦٦] اور اُس میں ایک جلتا

---

[٦٣] آیت میں 'اَلرَّحْمٰنُ' تالیف کے لحاظ سے خبر ہے جس کا مبتدا محذوف ہے۔ اِس صفت کی تذکیر سے یہاں جس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اُس نے اِس کائنات کو اپنی رحمت سے وجود بخشا ہے اور اِسی رحمت کے تقاضے سے ایک دن وہ اِس کو اِس کے حقیقی انجام تک بھی پہنچا دے گا۔ اِس لیے کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل یا کسی رام کی لیلا ہے۔ ہرگز نہیں، یہ ایک متعین مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے اور اپنے مقصد تک پہنچ کر رہے گی۔

[٦٤] یعنی خود خدا سے پوچھو، اِس لیے کہ اپنی ذات و صفات کو در حقیقت وہی جانتا ہے۔ لفظ 'خَبِيْر' اِس آیت میں بالکل اُسی طرح آیا ہے، جس طرح سورۂ فاطر (٣٥) کی آیت 'وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ' (١٤) میں ہے۔ اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے اور 'بِهٖ' اِسی سے متعلق ہے۔

[٦٥] اسم رحمٰن چونکہ اہل کتاب کے ہاں زیادہ معروف تھا، اِس لیے قریش کے لیڈروں نے یہ نکتہ پیدا کر لیا کہ قرآن میں جگہ جگہ اِسی نام سے خدا کا ذکر اِس لیے کیا جاتا ہے کہ اِس سے اہل کتاب کی مذہبی روایات کو ہم پر مسلط کرنا مقصود ہے۔ یہ جملہ اِسی پس منظر میں کہا گیا ہے۔

[٦٦] اِس سے آسمان کے وہ قلعے اور گڑھیاں مراد ہیں جن میں خدا کے ملائکہ اور کروبیوں کی

وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ
اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾
وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ

چراغ اور ایک چمکتا چاند بنایا اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے بعد آنے والا بنایا، اُن کے لیے جو یاددہانی حاصل کرنا چاہیں یا شکرگزار بننا چاہیں[٦٧]۔ ٦١-٦٢

(وہی[٦٨] رحمٰن ہے) اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں[٦٩]

فوجیں اُن سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت مامور رہتی ہیں جن سے آگے کسی جن یا انسان کو بڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

[٦٧] مطلب یہ ہے کہ عقل و دل کو بیدار کرنے والی نشانیوں سے تو اِس کائنات کا چپہ چپہ معمور ہے، لیکن اِس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ارادہ چاہیے۔ تم اِسی ارادے کے امتحان کے لیے پیدا کیے گئے ہو، لیکن افسوس کہ ناکام ہو جاتے ہو اور نہ تمھاری عقل اِن نشانیوں سے یاددہانی حاصل کرتی ہے اور نہ دل شکرگزاری کے جذبات سے معمور ہوتا ہے۔

[٦٨] یہاں سے آگے اب بڑے ہی دل نواز اسلوب میں مخاطبین کو دعوت دی ہے کہ رحمٰن کی سچی معرفت ہو تو اُس کے بندے کن صفات کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اِس میں قریش کے متمردین کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ وہ اِس آئینے میں اپنی سیرت و کردار کو دیکھیں اور ایمان لانے والوں کے لیے بھی ترغیب و دعوت ہے کہ اُن کا پروردگار اُن کو کس طرح کے محاسن سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔

[٦٩] یعنی اُن کی چال مغروروں اور متکبروں کی چال نہیں ہوتی۔ اِس طرح کی چال آدمی کے باطن کی ترجمان ہوتی ہے۔ دولت، اقتدار، علم و فن، حسن اور طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں آدمی کے اندر غرور پیدا کرتی ہیں، اُن میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اُس کی چال کے ایک مخصوص ٹائپ

الفرقان
۲۵

الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ
غَرَامًا ﴿۶۵﴾ ۖ إِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾

اور جاہل اُن سے الجھنے کی کوشش کریں تو اُن کو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں[۰ے]۔ جو راتیں اپنے پروردگار کے آگے سجدے اور قیام میں گزارتے ہیں[۱ے]۔ جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، ہم سے دوزخ کا عذاب ہٹا لے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بسنے اور ٹھیرنے کی بہت ہی بری جگہ ہے[۲ے]۔ ۶۳-۶۶

میں نمایاں ہوتا ہے اور اِس بات پر دلیل بن جاتا ہے کہ اُس کا دل بندگی کے شعور سے خالی ہے اور اُس میں خدا کی عظمت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جس دل میں بندگی کا شعور اور خدا کی عظمت کا تصور ہو، وہ اُنھی لوگوں کے سینے میں دھڑکتا ہے جن پر تواضع اور فروتنی کی حالت طاری رہتی ہے۔ وہ اکڑنے اور اترانے کے بجائے سر جھکا کر چلتے ہیں۔

[۰ے] سلام جس طرح خیر مقدم کے لیے ہوتا ہے، اُسی طرح کسی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا ایک شایستہ اور خوب صورت طریقہ بھی ہے۔ اِسی طرح 'مخاطبت' کا لفظ ہے۔ یہ کئی پہلوؤں سے ہو سکتی ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یہ الجھنے کے مفہوم میں ہے۔

[۱ے] استاذ امام کے الفاظ میں، یہ تہجد کے سجود و قیام کی شب بیداریوں اور بے قراریوں کی تعبیر ہے اور اِس کے اسلوب بیان سے جو شوق و اضطراب نمایاں ہو رہا ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

[۲ے] آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: ایک مستقر اور دوسرا مقام۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مُسْتَقَرّ“ اور ’مُقَام‘ یوں تو ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتے ہیں، لیکن جب یہ دونوں ایک ساتھ استعمال ہوں تو اِن کے درمیان کچھ فرق ہو جاتا ہے۔ میں اِن کے مواقع استعمال پر غور کرنے سے جس نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ ’مُسْتَقَرّ‘ میں مستقل قیام گاہ

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ
بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾
وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ
حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾
يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ

اور (وہ ہیں) جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اڑاتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، اُن کا خرچ اِس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے[۷۳]۔ ۶۷

اور (وہ ہیں) جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں[۷۴] ـــــ یہ گناہ جو شخص بھی کرے گا، اِن کا نتیجہ بھگتے گا۔ قیامت کے دن اُس کا عذاب بڑھتا ہی جائے گا اور وہ

کا مفہوم پایا جاتا ہے اور ’مُقام‘ عارضی جاے قیام کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہنم ایک ایسی ہول ناک جگہ ہے کہ مستقل مستقر کی حیثیت سے تو درکنار، ایک عارضی منزل کی حیثیت سے بھی وہ گوارا کیے جانے کے قابل نہیں ہے، حالاں کہ کوئی بری سے بری جگہ بھی ایسی ہوسکتی ہے کہ کسی پہلو سے وہ وقتی طور پر گوارا کی جاسکے۔‘‘ (تدبر قرآن ۵/ ۴۸۷)

[۷۳]۔ اِس کا تعین ہر آدمی اپنے حالات کے لحاظ سے کرسکتا ہے اور ایسا کرنا ضروری ہے، اِس لیے کہ اخراجات میں اعتدال نہ ہو تو آدمی خدا کی راہ میں انفاق کی سعادت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

[۷۴]۔ خدا کی شریعت میں یہی تینوں سب سے بڑے گناہ ہیں جن سے بندۂ مومن کو ہر حال میں بچنا چاہیے، اِس لیے کہ اِن کا نتیجہ آگے ہمیشہ کی جہنم بیان کیا گیا ہے۔

تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ
حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۷۰) وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ
صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا (۷۱)

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا
كِرَامًا (۷۲) وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا

اُس میں ذلیل ہو کر ہمیشہ رہے گا۔ مگر یہ کہ جس نے توبہ کر لی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کیے تو اِسی طرح کے لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا۔[۵] حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے اور جو توبہ کرے اور اچھے عمل کرے، اُس کو مطمئن ہونا چاہیے، اِس لیے کہ وہ پوری سرخ روئی کے ساتھ اللہ ہی کی طرف لوٹتا ہے۔[۶] ۶۸-۷۱

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو کسی باطل میں شریک نہیں ہوتے اور جب کسی بے ہودہ چیز[۷] پر اُن کا گزر ہوتا ہے تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ اور ایسے ہیں کہ اُنھیں جب اُن کے پروردگار کی آیتوں کے ذریعے سے یاددہانی کی جاتی ہے

---

[۵] یعنی برائیاں نامۂ اعمال سے محو ہو جائیں گی اور اُن کی جگہ نیکیاں رکھ دی جائیں گی جو اُن کے گناہوں کو ڈھانک لیں گی۔

[۶] اصل الفاظ ہیں: 'يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا'۔ اِن میں 'مَتَابًا' کی تاکید تفخیم شان کے لیے ہے۔ ترجمے میں ہم نے اِس مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آیت میں توبہ کرنے والوں کے لیے دنیا اور آخرت، دونوں میں بڑی بشارت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُنھیں ہر جگہ خدا کی معیت اور سرپرستی حاصل ہوگی، اِس لیے کہ وہ درحقیقت اُسی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

[۷] اصل میں لفظ 'لَغْو' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد وہ کام ہیں جنھیں دیکھتے ہی ہر سلیم الطبع

وَّعُمْيَانًا (۷۳) وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا
قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۷۴)
اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً
وَّسَلٰمًا ۙ (۷۵) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۷۶)

تو اُن پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے[۷۸]۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما[۷۹] اور (ہمارے اِن اہل وعیال میں) ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا[۸۰]۔ ۷۲-۷۴

یہی ہیں جن کو اُن کی ثابت قدمی کے صلے میں بہشت کے بالاخانے ملیں گے[۸۱] اور وہاں آداب وتسلیمات کے ساتھ اُن کا استقبال کیا جائے گا۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں

آدمی یہ محسوس کرے کہ یہ شایستہ اور مہذب لوگوں کے کرنے کے کام نہیں ہیں، جیسے گالی گلوچ، ثقاہت سے گری ہوئی باتیں، اخلاقی حدود سے متجاوز ٹھٹا مخول اور لطیفے بازی وغیرہ۔

[۷۸] بلکہ اُن پر غور کرتے اور اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اِس میں قرآن کے اندھے بہرے مخالفین پر تعریض بھی ہے جو اُس کی آیتیں سن کر اعتراض اور نکتہ چینی کے لیے اُس پر اسی طرح پل پڑتے تھے۔

[۷۹] یعنی اپنی عاقبت کے ساتھ اُنھیں اپنے اہل وعیال کی عاقبت کی بھی فکر رہتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے اعمال واخلاق بھی خدا کی پسند کے مطابق ہوں تاکہ اپنے پیاروں کو وہ دنیا میں دوزخ کا ایندھن بننے کے لیے تیار ہوتے نہ دیکھیں، بلکہ اُن کے حسن عمل سے اُن کی آنکھیں ہر وقت ٹھنڈی رہیں۔

[۸۰] مطلب یہ ہے کہ جس کنبے کے وہ سربراہ ہیں، وہ پرہیزگاروں اور خدا سے ڈرنے والوں کا کنبہ ہو، خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کا کنبہ نہ ہو۔

[۸۱] اِس لیے کہ دنیا میں حق کی خاطر اُنھوں نے اپنے آپ کو نیچا کر لیا تھا اور تواضع اور فروتنی کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ سیدنا مسیح نے فرمایا ہے: ”مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾

سورة الشعراء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② لَعَلَّكَ بَاخِعٌ

گے۔ بسنے اور ٹھیرنے کی کیا ہی اچھی جگہ ہے[۸۲]! ۷۵-۷۶

اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ اگر یہ پیش نظر نہ ہوتا کہ تمھیں (اِس مقام کی) دعوت دی جائے تو میرے پروردگار کو تمھاری کیا پروا ہے[۸۳]! سو تم نے جھٹلا دیا ہے تو (جس کی وعید تمھیں سنائی گئی ہے)، وہ چیز اب عنقریب ہو کے رہے گی کہ جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی[۸۴]۔ ۷۷

—۲—

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'طٰسٓمٓ' ہے[۸۵]۔ یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنا مدعا وضاحت کے ساتھ

آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے۔''

[۸۲] اوپر دوزخ کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یہ اُنھی کے مقابل میں جنت کی تعریف ہے۔

[۸۳] مطلب یہ ہے کہ اپنی جنت کی طرف بلانے کے لیے خدا اگر نبی بھیجتا اور کتابیں اتارتا ہے تو سرتاسر تمھارے ہی فائدے کے لیے اتارتا ہے، ورنہ اُس کی کوئی حاجت تم سے اٹکی ہوئی نہیں ہے کہ وہ اُس کے لیے یہ سارا اہتمام کرے۔

نَفۡسَكَ اَلَّا يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ۝۳ اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُهُمۡ لَهَا خٰضِعِيۡنَ ۝۴ وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهُ مُعۡرِضِيۡنَ ۝۵ فَقَدۡ كَذَّبُوۡا فَسَيَاۡتِيۡهِمۡ

بیان کرتی ہے[۸۶]۔ شاید تم اِس غم میں اپنی جان کھودو گے کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔ اگر ہم چاہیں تو اِن پر آسمان سے کوئی نشانی اتار دیں کہ اِن کی گردنیں اُس کے سامنے جھک کر رہ جائیں[۸۷]۔ (لیکن ہم سمجھا رہے ہیں اور) اِن کا حال یہ ہے کہ خداے رحمٰن کی طرف سے اِن کے پاس جو تازہ یاددہانی بھی آتی ہے، یہ اُس سے اعراض ہی کیے رہتے ہیں۔ سو اِنھوں نے جھٹلا دیا ہے تو اُس چیز کی خبریں عنقریب (اپنی حقیقت کے ساتھ)

---

[۸۴] یہ اُس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کے مکذبین پر اِسی دنیا میں آتا ہے۔

[۸۵] یہ سورہ کا نام ہے۔ اِس کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق ہم نے اپنا نقطۂ نظر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

[۸۶] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کا جو مضمون آگے آ رہا ہے، یہ اُس کی تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کی بات ایسی واضح اور مبرہن ہے کہ اُس کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آپ ہی اپنی دلیل ہے۔ لہٰذا جو نشانیاں اور معجزات یہ مانگ رہے ہیں، اُن کے لیے آپ اِن کی کوئی پروا نہ کریں۔

[۸۷] مطلب یہ ہے کہ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں، لیکن جب ارادہ و اختیار کا امتحان مقصود ہے تو اِس کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سمجھا رہے ہیں تو آپ کو بھی اِن کے مطالبات سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

آیت میں 'خاضعة' کی جگہ 'خٰضِعِيۡنَ' مضاف الیہ کی رعایت سے آ گیا ہے۔ یہ عربیت کا معروف اسلوب ہے۔

اَنۡۢبٰٓؤُا مَا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ⑥
اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الۡاَرۡضِ كَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍ كَرِيۡمٍ ⑦
اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ⑧ وَاِنَّ
رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ⑨
وَاِذۡ نَادٰى رَبُّكَ مُوۡسٰٓى اَنِ ائۡتِ الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ⑩ ۙ

اِن کے آگے ظاہر ہو جائیں گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔[88] ۱-۶

(یہ نشانیوں کے منتظر ہیں)۔ کیا اِنھوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اُس میں ہر طرح کی کتنی نفع بخش چیزیں اگائی ہیں؟ اِس میں، یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، لیکن اِن میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور تیرا پروردگار، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ زبردست بھی ہے اور نہایت مہربان بھی۔[89] ۷-۹

اِنھیں اُس وقت کا قصہ سناؤ، جب تیرے رب نے موسیٰ کو پکارا[90] کہ تم ظالم قوم

---

[88] یعنی قرآن جو اِنھیں خبردار کرتا رہا ہے کہ اُس کی تکذیب کے نتیجے میں اِنھیں کیا نتائج بھگتنا ہوں گے۔

[89] اوپر جو بات بیان ہوئی ہے، یہ اُسی کو اپنی صفات کی روشنی میں واضح فرمایا ہے کہ خدا زبردست ہے، وہ چاہے تو اِن پر اپنا عذاب نازل کر دے، لیکن وہ رحیم و کریم بھی ہے، اِس لیے عذاب میں جلدی نہیں کرتا اور اپنے بندوں کو اُن کی سرکشی کے باوجود مہلت دیتا ہے کہ سمجھانے ہی سے سمجھ جائیں اور اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آئیں۔

[90] دوسری جگہ وضاحت ہے کہ یہ واقعہ وادی مقدس طویٰ میں اُس وقت پیش آیا، جب موسیٰ علیہ السلام کئی برس کی جلاوطنی کے بعد مدین سے واپس آ رہے تھے۔

قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ⑪ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۭ ⑫
وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ⑬

کے پاس جاؤ، قوم فرعون کے پاس —— کیا وہ ڈریں گے نہیں؟[۹۱] اُس نے عرض کیا: پروردگار، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا حال یہ ہے کہ (اِس ذمہ داری کے احساس سے) میرا سینہ گھٹتا ہے[۹۲] اور میری زبان بھی رواں نہیں ہے[۹۳] تو آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں (کہ وہ اِس کام میں میری مدد کرے[۹۴])۔ اور

---

[۹۱] یعنی اپنے طغیان اور سرکشی میں بڑھتے ہی جائیں گے اور خدا کے قہر و غضب سے ڈریں گے نہیں؟ استاذ امام کے الفاظ میں، اِس اسلوب خطاب میں حسرت، غصہ، زجر و ملامت اور عذاب الٰہی کے قرب کی جو وعید ہے، وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔

[۹۲] یہ اُس اضطراب و تردد کی تعبیر ہے جو وہ ایک فرض شناس آدمی کی حیثیت سے اُس عظیم منصب کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اپنے دل میں محسوس کر رہے تھے جو اُنھیں دیا جا رہا تھا۔

[۹۳] یعنی میں کوئی زبان آور خطیب بھی نہیں ہوں کہ اپنی بات موثر طریقے سے مخاطبین تک پہنچا سکوں۔ یہ نہایت خاکسارانہ انداز اپنی عاجزی کا اظہار ہے۔ اِس کا کسی جسمانی نقص سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۹۴] یہودی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون علیہ السلام نہایت فصیح اللسان آدمی تھے۔ حضرت موسیٰ نے جس اعتماد کے ساتھ اُن کا نام لیا ہے، اُس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اپنے بھائی کو اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی وہ اِس منصب کا اہل سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے یہ غیر معمولی درخواست پیش کر دی۔ اُن سے پہلے کسی نبی کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ ایک دوسرے نبی کو اِس طرح اُس کا ساتھی بنا دیا گیا ہو۔

الشعراء
۲۶

وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۚ ⑭
قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ⑮ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ
فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ⑯ لا اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ⑰ ط

اُن کا ایک جرم بھی میرے اوپر ہے[۹۵]، اِس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ ۱۰-۱۴

فرمایا: ہرگز نہیں، (وہ تمھیں قتل نہیں کر سکتے) تو اب دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ، ہم تمھارے ساتھ سب سنتے رہیں گے[۹۶]۔ سو دونوں (بغیر کسی تردد کے) فرعون کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہم خداوند عالم کے رسول ہیں اور اِس لیے آئے ہیں کہ تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو[۹۷]۔ (اُنھوں نے یہ بات فرعون

---

[۹۵] اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے جس میں ایک قبطی اُن کے ہاتھ سے نادانستہ قتل ہو گیا تھا اور اُس کے انتقام سے بچنے کے لیے وہ ملک چھوڑ کر مدین چلے گئے تھے۔ آگے سورۂ قصص (۲۸) میں اِس کی تفصیل ہے۔

[۹۶] یعنی سنتے اور دیکھتے رہیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اطمینان دلانے کے لیے یہ نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ اِس کے اجمال میں جو تفصیل مضمر ہے اور اِس سے جس سطوت و جلالت اور تحفظ و ضمانت کا اظہار ہوتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

[۹۷] اصل الفاظ ہیں: 'اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ'۔ 'اَنْ' سے پہلے 'ب' عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئی ہے۔ دعوت و انذار کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو یہ مطالبہ اِس لیے کرنے کی ہدایت فرمائی تھی کہ اِس سے اُس اسکیم کو بروے کار لانا مقصود تھا جس کے تحت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو عالمی سطح پر ابلاغ دعوت اور اتمام حجت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اِس اسکیم کے مطابق یہ ضروری تھا کہ اُنھیں ایک خاص علاقے میں آباد کر کے وہاں دعوت حق کا مرکز قائم کیا جائے۔ بائیبل کی کتاب خروج کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ

قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا وَّلَبِثۡتَ فِيۡنَا مِنۡ عُمُرِكَ سِنِيۡنَ ۙ﴿١٨﴾
وَفَعَلۡتَ فَعۡلَتَكَ الَّتِىۡ فَعَلۡتَ وَاَنۡتَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿١٩﴾
قَالَ فَعَلۡتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ ؕ﴿٢٠﴾ فَفَرَرۡتُ مِنۡكُمۡ
لَمَّا خِفۡتُكُمۡ فَوَهَبَ لِىۡ رَبِّىۡ حُكۡمًا وَّجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿٢١﴾

سے آ کر کہی تو) اُس نے کہا: کیا ہم نے تمھیں بچپن میں اپنے ہاں رکھ کر پالا نہیں تھا اور (تم وہی نہیں ہو کہ) اپنی عمر کے کئی سال تم نے ہمارے اندر بسر کیے اور پھر اپنی وہ حرکت کی جو کی[۹۸] (اور بھاگ گئے)؟ تم بڑے ہی ناشکرے ہو[۹۹]۔ ۱۵-۱۹

موسیٰ نے جواب دیا: میں نے یہ کیا تھا اور (مجھے اعتراف ہے کہ) اُس وقت میں چوک گیا تھا[۱۰۰]۔ پھر مجھے تم لوگوں سے اندیشہ ہوا (کہ اِس کی پاداش میں تم مجھے قتل کر دو گے) تو میں تم سے بھاگ گیا۔ پھر میرے پروردگار نے مجھے حکمت و دانش سے نوازا اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں سے (ایک پیغمبر) بنا دیا۔ اور یہ

پوری اسکیم فرعون اور اُس کے درباریوں کے سامنے واضح نہیں فرمائی، بلکہ صرف اتنا کہا کہ وہ قربانی کی عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانا چاہتے ہیں، اِس لیے کہ جس چیز کی قربانی کرنا پیش نظر ہے، اُس کی قربانی اگر مصر میں کی گئی تو وہاں کے لوگ اُنھیں سنگ سار کر دیں گے۔

[۹۸] یہ اُسی واقعۂ قتل کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

[۹۹] مطلب یہ ہے کہ تمھاری یہ حیثیت کہ ہمارے سامنے آ کر اِس طرح کے مطالبات کرو۔ یہ انتہائی ناشکرا پن ہے۔ تم ہمارے پروردہ بھی ہو اور مجرم بھی، اِس لیے ایاز قدر خود بہ شناس۔ تمھیں تو شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم تمھارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہے ہیں۔

[۱۰۰] آیت میں لفظ 'ضَآلّ' ٹھیک اُس مفہوم میں آیا ہے، جس میں یہ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۸۲ میں ہے۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝۲۲
قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۳ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝۲۴ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ

احسان ہے جو تم مجھے جتا رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے[۱۰۱]! ۲۰-۲۲

فرعون نے کہا: اور یہ رب العٰلمین کیا ہے[۱۰۲]؟ موسیٰ نے جواب دیا: زمین اور آسمانوں کا اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، سب کا پروردگار، اگر تم لوگ یقین کرنے والے

---

[۱۰۱] حضرت موسیٰ نے یہ فرعون کو نہایت بلیغ جواب دیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جی ہاں، کیا کہنے ہیں اِس احسان کے، اِسی کے نتیجے میں تو آپ بنی اسرائیل سے بیگار لیتے، اُن کی پیٹھ پر تازیانے برساتے اور اُن کے بیٹوں کو قتل کرنے کے درپے رہتے ہیں تاکہ مائیں اُن کی جان بچانے کے لیے اُن کو ٹوکریوں میں رکھ کر دریا میں بہاتی رہیں اور آپ اُن کی پرورش کر کے اُن پر احسان فرمایا کریں۔

[۱۰۲] فرعون کے طعنے کا جواب حضرت موسیٰ نے ایسا مسکت دیا ہے کہ اُس کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجایش نہیں رہی۔ چنانچہ اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اُس نے موسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے کہ تم اپنے آپ کو رب العٰلمین کا رسول کہہ کر پیش کر رہے ہو تو ذرا بتاؤ کہ یہ رب العٰلمین کیا چیز ہے؟ یہ سوال جس ذہنی پس منظر کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ قرآن نے دوسری جگہ بیان کر دیا ہے۔ اُس کی روشنی میں اِس جملے کو سمجھا جائے تو گویا مدعا یہ ہے کہ پورا مصر تو سورج دیوتا کے مظہر کی حیثیت سے مجھے اپنا رب مانتا ہے، پھر یہ تم دونوں کس رب العٰلمین کے رسول بن کر آ گئے ہو؟ اِس سے پہلے تو میں نے کسی ایسے پروردگار کا ذکر تم لوگوں سے نہیں سنا جو میری بادشاہی میں مداخلت کرے اور مجھ سے کہے کہ میں بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دوں۔ زمین و آسمان کا کوئی خالق ہے تو ہوا کرے، اِس سرزمین کے لوگوں کا رب اور معبود تو میں ہی ہوں۔

اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿٢٥﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٦﴾ قَالَ
اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿٢٧﴾ قَالَ رَبُّ
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالَ
لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالَ
اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾ ۚ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ

بنو۔ فرعون نے اپنے گردوپیش کے لوگوں سے کہا: سنتے نہیں ہو[١٠٣]؟ موسیٰ نے (اِس پر اپنی دعوت کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا اور) کہا: تمھارا بھی پروردگار اور تمھارے اگلے بزرگوں کا بھی پروردگار[١٠٤]۔ فرعون نے کہا: تمھارا یہ رسول، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، بالکل ہی خبطی ہے۔ موسیٰ نے کہا: (اور مزید یہ کہ) مشرق و مغرب اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، سب کا پروردگار، اگر تم عقل رکھتے ہو[١٠٥]! فرعون (یہ سن کر) چلا اٹھا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمھیں قید کر کے رہوں گا۔ موسیٰ نے پوچھا: کیا اُس صورت میں بھی کہ میں تمھارے پاس ایک واضح نشانی لے کر آیا ہوں؟ فرعون نے

---

[١٠٣] یعنی سنتے نہیں ہو کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ فرعون کا یہ سوال بتا رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جواب سے وہ فی الواقع تلملا اٹھا ہے۔

[١٠٤] یعنی اُن کا بھی پروردگار جن کی روایات پر بھروسا کر کے تم سورج دیوتا کے اوتار بنے بیٹھے ہو۔ یہ ضرب نہایت شدید تھی۔ چنانچہ ردعمل بھی نہایت شدید ہوا اور فرعون نے وہ بات کہی جو اگلے جملے میں نقل ہوئی ہے۔

[١٠٥] مطلب یہ ہے کہ اگر تم عقل سے کام لو تو اپنی اِس حماقت پر متنبہ ہو سکتے ہو کہ مصر کی فرماں روائی کے بل بوتے پر خدائی کا دعویٰ کر رہے ہو۔ میں جس رب العٰلمین کی بات کر رہا

الصّٰدِقِيْنَ (۳۱) فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۚ (۳۲) وَّنَزَعَ
يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (۳۳) قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ
هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ (۳۴) يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ
بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ (۳۵)

کہا: پھر اُسے پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ اِس پر موسیٰ نے اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دی تو یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدہا تھا[۱۰۶] اور اُس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو دیکھنے والوں کے لیے دفعتاً وہ چمکتا ہوا نکلا[۱۰۷]۔ فرعون نے (یہ دیکھا تو) اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے کہا: یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمھارے ملک سے نکال دے[۱۰۸]۔ سو کیا مشورہ دیتے ہو[۱۰۹]؟ ۲۳-۳۵

ہوں، وہ مشرق و مغرب اور اُن کے درمیان کی ہر چیز کا پروردگار ہے۔

[۱۰۶] یعنی ایسا کھلا اژدہا کہ جس میں ذرا کسی شبہے کی گنجایش نہ ہو۔ آیت میں 'ثُعْبَانٌ' کے ساتھ 'مُبِيْنٌ' کی صفت اِسی مفہوم کے لیے لائی گئی ہے۔

[۱۰۷] اصل الفاظ ہیں: 'بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ'۔ 'نَظَر' کا لفظ عربی زبان میں اصلاً غور و تامل کے ساتھ دیکھنے کے لیے آتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوئی، وہ محض فریب نظر کی نوعیت کی نہ تھی، بلکہ غور و تامل سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا تھا کہ اُس کی تابانی بالکل اصلی اور حقیقی ہے۔

[۱۰۸] یعنی کچھ ایسا ویسا جادوگر نہیں ہے، بلکہ بڑا ماہر جادوگر ہے اور لوگوں کو متاثر کر کے اپنے پیچھے لگانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ اِسی لیے کر رہا ہے کہ اُنھیں منظّم کر کے اپنی فوج بنائے اور تم پر حملہ کر کے تمھیں اِس ملک سے نکال دے اور یہاں اپنی حکومت قائم کر لے۔ فرعون نے یہ بات اِس لیے کہی کہ ایک تو موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا اثر مٹانے کی کوشش کی جائے، دوسرے اُنھیں سیاسی خطرہ قرار دے کر اپنے اعیان و

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ (٣٦)
يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ (٣٧) فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ
مَّعْلُوْمٍ ۙ (٣٨) وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۙ (٣٩) لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ
السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ (٤٠) فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا

اُنھوں نے کہا: اِسے اور اِس کے بھائی کو ابھی ٹال لیے[١١٠] اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے جو سب بڑے بڑے ماہر جادوگروں کو آپ کے پاس لے آئیں۔ چنانچہ ایک مقرر دن[١١١] کے طے کیے ہوئے وقت پر جادوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں میں منادی کر دی گئی کہ کیا تم لوگ جمع ہوتے ہو؟ اِس لیے کہ ہم جادوگروں کا ساتھ دیں، اگر وہی غالب رہتے

اکابر اور اپنی قوم کے لوگوں کو ایسا مشتعل کر دیا جائے کہ وہ اُن کی دعوت کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں۔ یہاں صرف فرعون کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ تصریح ہے کہ اِس میں فرعون کے بعض درباری بھی اُس کے ہم زبان تھے۔ حضرت موسیٰ کی غیر معمولی شخصیت اور بنی اسرائیل کی کثیر تعداد کے پیش نظر یہ بات بالکل قرین قیاس تھی اور لوگ آسانی کے ساتھ اِسے باور کر سکتے تھے۔ تاہم اِس کا بھی امکان ہے کہ فرعون اور اُس کے درباریوں نے فی الواقع یہی سمجھا ہو۔

[١٠٩] یہ فقرہ بتا رہا ہے کہ اب وہ طنطنہ باقی نہیں رہا جو ابتدا میں تھا۔ چنانچہ درباریوں سے مشورہ مانگا جا رہا ہے کہ میری عقل تو کام نہیں کرتی کہ اِس خطرے کا مقابلہ کس طرح کروں، اب تمھی کچھ رائے دو۔

[١١٠] اصل میں 'اَرْجِهْ وَاَخَاهُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَرْجِهْ' درحقیقت 'اَرْجِئْهُ' ہے۔ لفظ کو ہلکا کرنے کے لیے اِس طرح کے تصرفات عربی زبان میں عام ہو جاتے ہیں۔

[١١١] دوسری جگہ تصریح ہے کہ یہ کسی میلے یا قومی تہوار کا دن تھا اور مقابلے کے لیے چاشت کا وقت مقرر کیا گیا تھا تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہو سکیں۔

لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ
وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾
قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا
حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

ہیں[۱۱۲]۔ پھر جب جادوگر (میدان میں) آئے تو اُنھوں نے فرعون سے کہا: ہمارے لیے صلہ تو ہوگا، اگر ہم ہی غالب رہے[۱۱۳]؟ فرعون نے جواب دیا: ہاں، اور اُس وقت تو تم ہمارے مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔ ۳۶-۴۲

(چنانچہ مقابلہ شروع ہوا تو) موسیٰ نے جادوگروں سے کہا: پھینکو جو تمھیں پھینکنا ہے[۱۱۴]۔ اِس پر اُنھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے: فرعون کے اقبال

---

[۱۱۲] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو جمع ہونے کے لیے خوب ابھارا بھی گیا کہ ہمارے ساحر اِس وقت قومی وقار کی حفاظت کے لیے میدان میں اتر رہے ہیں، اِس لیے ہر شخص کی خواہش ہونی چاہیے کہ وہ فتح مند ہوں اور اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے اِس موقع پر ہر شخص کو موجود بھی ہونا چاہیے۔ اِس کے لیے 'هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ' کا استفہامیہ اسلوب بھی قابل توجہ ہے۔ عربی زبان کے ذوق آشنا محسوس کر سکتے ہیں کہ اِس میں کس طرح کی ترغیب وتشویق ہے۔

[۱۱۳] قرآن نے یہ جملہ جادوگروں کی اخلاقی پستی اور دناءت کو ظاہر کرنے کے لیے نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیشہ وروں کے عام طریقے کے مطابق اُنھوں نے اِس خوشامدانہ انداز میں انعام کی توقع کا اظہار کیا۔

[۱۱۴] جادوگر جب اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو جوے کے تیروں کی طرح کوئی چیز دیکھنے والوں کے سامنے پھینکتے اور اُس پر اپنا جادو دکھاتے ہیں۔ آیت میں 'اِلْقَاء' یعنی پھینکنے کا لفظ اِسی مناسبت سے آیا ہے۔

فَاَلۡقٰی مُوۡسٰی عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلۡقَفُ مَا یَاۡفِکُوۡنَ ۚ﴿۴۵﴾ فَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیۡنَ ﴿۴۶﴾ۙ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾ۙ رَبِّ

کی قسم،[۱۱۵] ہم ہی غالب رہیں گے۔ پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو یکایک وہ اُن کے اُس طلسم کو نگلتا چلا جا رہا تھا جو وہ بنا لائے تھے۔[۱۱۶] سو (خدا کی اِس نشانی کو دیکھ کر) جادوگر سجدے میں گر پڑے۔[۱۱۷] اُنھوں نے (بے اختیار) کہا: ہم جہانوں کے پروردگار پر

---

[۱۱۵] اصل میں 'بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ' کے الفاظ ہیں۔ اِن میں 'ب' قسم کے لیے ہے۔ بائیبل میں اِس کے شواہد موجود ہیں کہ مصر کے لوگ دیوتا کی حیثیت سے فرعون کے عزت و اقبال کی قسم کھاتے تھے۔

[۱۱۶] دوسری جگہ وضاحت ہے کہ جب جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو وہ بہت سے سانپوں کی شکل میں لہراتی اور لپکتی ہوئی نظر آئیں۔ اُن کے جواب میں حضرت موسیٰ نے اپنا عصا پھینک دیا جو سانپ بن کر اُن رسیوں اور لاٹھیوں کو نگلنے لگا اور ہر رسی اور لاٹھی کو اُس نے اُسی طرح رسی اور لاٹھی بنا دیا، جس طرح وہ حقیقت میں تھی۔ چنانچہ سارا طلسم نابود ہو گیا۔ اِس کے لیے آیت میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کے ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”...'مَا یَاْفِکُوْنَ' کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ صرف یہی نہیں ہوا کہ اِس موقع پر ساحروں نے جو کرتب دکھایا، عصاے موسیٰ نے اُس کا بھرم کھول دیا، بلکہ اُس نے اُن کے اب تک کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ اِس لیے کہ یہی ہنر کا شاہ کار تھا، جب اِس کا یہ حشر ہوا تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ عصاے موسیٰ نے سحر و ساحری کے سارے طلسم ہی کو باطل کر دیا۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۵۱۳)

[۱۱۷] اصل الفاظ ہیں: 'فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ'۔ 'اُلْقِیَ' مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ جادوگروں کے جذبۂ تعظیم و اکرام کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ سحر و ساحری اور اِس طرح کے دوسرے

مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾
قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ
عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ۗ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ
مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى

ایمان لے آئے ہیں، موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر۔[۱۱۸] ۴۳-۴۸

فرعون نے کہا: تم نے اُس کو مان لیا، اِس سے پہلے کہ میں تمھیں اجازت دوں! یقیناً وہی تمھارا گرو ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا ہے۔ سو ابھی جان لو گے کہ اِس کا نتیجہ کیا ہے۔ میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی چڑھا کر رہوں گا۔[۱۱۹] جادوگروں نے جواب دیا: کوئی ڈر نہیں، ہم اپنے پروردگار

علوم وفنون کو اُن کے ماہرین ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اِن میں اور معجزے میں فرق کے لیے یہ نہایت واضح معیار ہے کہ اِن علوم وفنون کے ماہرین بھی اُس کے سامنے اعتراف عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

[۱۱۸] فرعون جس رب العٰلمین کا مذاق اڑا رہا تھا، جادوگروں نے اُسی پر اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اور وہ بھی اِس تصریح کے ساتھ کہ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔ یہ صاف فرعون کی خدائی اور بادشاہی، دونوں کا انکار تھا جسے، ظاہر ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

[۱۱۹] اوپر جادوگروں کے جس اعتراف حق کا بیان ہے، اُس سے مجمع پر جو اثر پڑا اور فرعون اور اُس کے درباری جس طرح رسوا ہو کر رہ گئے، اُس کی خفت مٹانے اور بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالنے کے لیے یہ اُس نے کائیاں سیاسیوں کی طرح فوراً اُن پر سازش کا الزام رکھ کر سزا سنا دی ہے کہ سب تمھاری اور تمھارے گرو موسیٰ کی ملی بھگت ہے۔ اُس نے ڈرا دھمکا کر تمھیں اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور اب تم لوگ ہمارے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہو۔ تم نے یہ سب اِسی لیے کیا ہے کہ کھلے میدان میں اپنے گرو سے شکست مان لو گے تو اُس کی دھاک عام لوگوں پر بیٹھ جائے گی اور ہماری حکومت کے

رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۚ (۵۰) اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ اَنْ كُنَّاۤ
اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ (۵۱)
وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (۵۲)
فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِى الْمَدَاۤئِنِ حٰشِرِيْنَ ۚ (۵۳) اِنَّ هٰۤؤُلَاۤءِ لَشِرْذِمَةٌ

ہی کی طرف لوٹیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا رب ہماری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا، اِس لیے کہ ہم سب سے پہلے ایمان لے آئے ہیں۔[۱۲۰] ۴۹-۵۱

(اِس کے بعد کئی سال گزرے، یہاں تک کہ حجت پوری ہوگئی، تب) ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ میرے بندوں کو لے کر رات میں نکل جاؤ، اِس لیے کہ تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔[۱۲۱] اِس پر فرعون نے (فوجیں جمع کرنے کے لیے) شہروں میں ہرکارے

خلاف تمھاری سازش کامیاب ہوجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے میری اجازت کا انتظار بھی نہیں کیا اور موسیٰ پر ایمان کا اعلان کردیا ہے۔ اب میں تمھیں وہی سزا دوں گا جو سلطنت کے باغیوں کو دی جاتی ہے۔

[۱۲۰] آیت میں 'اَنْ' سے پہلے 'ل' عربیت کے اسلوب پر محذوف ہے۔ جادوگروں کے جواب سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سچا ایمان آن کی آن میں انسان کو کس بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ وہی جادوگر ہیں کہ جب مقابلے کے لیے میدان میں اترے تھے تو بڑی لجاجت کے ساتھ فرعون سے اپنی کامیابی کی صورت میں انعام کی درخواست کر رہے تھے یا اب یہ حال ہے کہ ایمان کے نور نے اِن کے دلوں کو ایسا منور کردیا ہے کہ خدا اور آخرت کے سوا اِس دنیا کی کسی چیز کی اِن کی نگاہوں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی، یہاں تک کہ اپنے ایمان کی حفاظت کی راہ میں اپنی زندگی کو بھی قربان کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

[۱۲۱] اللہ تعالیٰ کی طرف سے پے درپے تنبیہات کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کو مصر سے جانے کی اجازت دے دی تھی، لیکن بعد میں اُس کی رائے تبدیل ہوگئی اور اُس نے اُن کے

قَلِيْلُوْنَ ۙ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ۙ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ؕ﴿۵۶﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴿۵۹﴾

دوڑا دیے کہ یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں اور کچھ شک نہیں کہ (اپنی حرکتوں سے) یہ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں اور ہم ایک ایسی جمعیت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنا رہنا ہے، (لہٰذا ہم اِنھیں کسی فساد کا موقع نہیں دیں گے)۔[۱۲۲] ۵۲-۵۶

اِس طرح فرعونیوں کو ہم (اُن کے) باغوں اور چشموں اور خزانوں سے اور رہنے کی باعزت جگہ سے نکال لائے۔ ہم اِسی طرح کرتے ہیں[۱۲۳] اور ہم نے بنی اسرائیل کو (سرزمین فلسطین میں) اِنھی سب چیزوں کا وارث بنا دیا۔[۱۲۴] ۵۷-۵۹

تعاقب کا فیصلہ کر لیا۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اِس تبدیلی سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا اور اِسی بنا پر ہدایت فرمائی تھی کہ وہ اپنی قوم کو رات میں لے کر نکلیں۔

[۱۲۲] حضرت موسیٰ کی شخصیت اور اُن کے معجزات سے قبطی پوری طرح مرعوب ہو چکے تھے۔ چنانچہ فوجیں بلاتے وقت فرعون کی طرف سے یہ تمام باتیں اِسی مرعوبیت کو دور کرنے کے لیے کہی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی حیثیت تو کچھ نہیں، مگر جہاں پناہ نہیں چاہتے کہ سلطنت میں کوئی ذرا بھی سر اٹھانے کی جرأت کرے، اِس لیے اِن کی سرکوبی ضروری ہو گئی ہے۔

[۱۲۳] یعنی ایسے مجرم لوگوں کے ساتھ یہی کرتے ہیں۔ آیت میں 'كَذٰلِكَ' کے بعد 'نفعل بالمجرمین' یا اِس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ اہل ذوق اندازہ کر سکتے ہیں کہ اِس سے کلام میں کس قدر زور پیدا ہو گیا ہے۔

[۱۲۴] آیت میں 'اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ھا' کی ضمیر بالکل اُسی طرح آ گئی ہے، جس طرح سورۂ مائدہ (۵) کی آیت 'قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ' (۱۰۲)

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۝٦٠ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى
اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝٦١ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝٦٢

(یہ اِس طرح ہوا کہ موسیٰ نکلے) تو صبح ہوتے ہی وہ لوگ اُن کے تعاقب میں چل پڑے۔ پھر جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو موسیٰ کے ساتھی چیخ اٹھے کہ ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰ نے کہا: ہرگز نہیں، اِس لیے کہ میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔[١٢٥] ٦٠-٦٢

میں بنی اسرائیل کے سوالات کے لیے آئی ہے۔ قرآن کے طالب علموں کو متنبہ رہنا چاہیے کہ اُس کی عربی معلیٰ میں ضمیریں اِس طرح بھی آتی ہیں۔

[١٢٥] بائیبل کی کتاب خروج میں یہ ماجرا اِس طرح بیان ہوا ہے:

”جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اُس کے خادموں کا دل اُن لوگوں کی طرف سے پھر گیا۔ اور وہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر اُن کو جانے دیا۔ تب اُس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا... اور مصری فوج نے فرعون کے سب گھوڑوں اور رتھوں سمیت اُن کا پیچھا کیا... اور جب فرعون نزدیک آ گیا، تب بنی اسرائیل نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ مصری اُن کا پیچھا کیے چلے آتے ہیں اور وہ نہایت خوف زدہ ہو گئے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہنے لگے: کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو وہاں سے مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا ہے؟ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؟ کیونکہ ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔ تب موسیٰ نے لوگوں سے کہا: ڈرو مت۔ چپ چاپ کھڑے ہو کر خداوند کی نجات کے کام کو دیکھو جو وہ آج تمھارے لیے کرے گا، کیونکہ جن مصریوں کو تم آج دیکھتے ہو، اُن کو پھر کبھی ابد تک نہ دیکھو گے۔ خداوند تمھاری طرف سے جنگ کرے گا اور تم خاموش رہو گے۔“ (١٤: ٥-١٤)

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾ ۚ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٤﴾ ۚ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿٦٥﴾ ۚ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٦٦﴾ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٦٧﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٦٨﴾

اِس پر ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا دریا پر مارو۔ اُس نے مارا تو وہ پھٹ گیا اور ہر حصہ ایسے ہو گیا، جیسے ایک بڑا پہاڑ۔ ہم نے دوسرے گروہ کو بھی (اِسی اثنا میں) اُسی جگہ قریب پہنچا دیا اور موسیٰ کو اور اُن سب لوگوں کو بچا لیا جو اُس کے ساتھ تھے، پھر اُن دوسروں کو ہم نے وہیں غرق کر دیا۔[۱۲۶] ۶۳-۶۶

اِس میں، یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، لیکن اِن میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔[۱۲۷] اور تیرا پروردگار، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ زبردست بھی ہے اور نہایت

---

[۱۲۶] یہ ایک عظیم معجزہ تھا۔ بائیبل کی کتاب خروج میں اِس کی تفصیل ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

> ”پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اُسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور اُن کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔ اور مصریوں نے تعاقب کیا اور فرعون کے سب گھوڑے اور رتھ اور سوار اُن کے پیچھے پیچھے سمندر کے بیچ میں چلے گئے ... اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور اُن کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آ گیا اور مصری الٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا۔“ (۱۴: ۲۱-۲۷)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ (٦٩) اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ
مَا تَعْبُدُوْنَ (٧٠) قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ (٧١)
قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۙ(٧٢) اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ (٧٣)
قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (٧٤)
قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ(٧٥) اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۖ(٧٦)

مہربان بھی۔[128] ۶۷-۶۸

اور اِنھیں ابراہیم کی سرگذشت سناؤ، جب اُس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم (کے لوگوں) سے پوچھا تھا کہ یہ تم کیا پوجتے ہو؟[129] اُنھوں نے جواب دیا: ہم بتوں کو پوجتے ہیں، سو (تم جو چاہے، کہتے رہو)، ہم اِن کی پوجا پر برابر جمے رہیں گے۔ ۶۹-۷۱

ابراہیم نے کہا: کیا یہ تمھاری سنتے ہیں، جب تم اِنھیں پکارتے ہو؟ یا تمھیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا: نہیں، (ہم یہ سب نہیں جانتے)، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔ ۷۲-۷۴

ابراہیم نے کہا: پھر کیا تم نے اِن پر غور بھی کیا ہے جنھیں تم پوجتے رہے ہو؟ تم بھی

---

[127] یعنی قریش مکہ جو سورہ کے مخاطبین ہیں۔

[128] یہ وہی آیت ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر حاشیہ ۸۹ میں ہو چکی ہے۔

[129] یہ سوال استخفاف کی نوعیت کا ہے، اِس لیے اُن کی قوم نے اِس کا جواب بھی جاہلی حمیت کے پورے جوش کے ساتھ دیا ہے۔

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾ ۙ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾ ۙ
وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ ۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾ ۖ ۙ
وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾ ۙ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ

اور تمھارے اگلے باپ دادا بھی۔ سو میرے تو یہ سب دشمن ہیں[۱۳۰]، اللہ رب العٰلمین کے سوا جس نے مجھے پیدا کیا ہے، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے[۱۳۱]۔ اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے[۱۳۲] اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے[۱۳۳] اور جو مجھے موت

---

[۱۳۰] اِس لیے کہ شیطان اِنھی کے ذریعے سے اپنا انتقام اولادِ آدم سے لیتا ہے اور اُنھیں گم راہ کر کے جہنم تک پہنچا دیتا ہے۔ اپنی قوم کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو صاف بتا رہی ہے کہ وہ اُس پر ہر لحاظ سے اتمام حجت کر چکے تھے اور ہجرت سے پہلے اب آخری گفتگو فرما رہے تھے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ لب و لہجہ وہ نہیں ہو سکتا جو ابتداے دعوت میں ہوتا ہے۔

[۱۳۱] یعنی پہلے عقل و فطرت اور اُس کے بعد نبوت و رسالت کے ذریعے سے میری عقلی اور روحانی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام بھی اُسی نے کر رکھا ہے۔

[۱۳۲] یعنی میری تمام مادی ضروریات بھی پوری کرتا ہے۔

[۱۳۳] اِس میں غور کیجیے، شفا کی نسبت تو اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی ہے، لیکن بیماری کی نسبت اُس کی طرف نہیں کی گئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس کی وجہ سوءِ ادب سے احتراز بھی ہے اور اِس حقیقت کا اظہار بھی کہ نعمتیں جس قدر بھی بندے کو ملتی ہیں، وہ سب خدا کے فضل و جود سے ملتی ہیں۔ لیکن اُس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بسا اوقات اُس کے کسی عمل پر مترتب ہوتی ہے۔ ہر چند وہ پہنچتی تو خدا کے اذن و حکم ہی سے ہے، لیکن اُس میں انسان کی اپنی غفلت کو بھی دخل ہوتا ہے، اِس وجہ سے وہ بندے کی طرف منسوب ہوتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/۵۲۵)

خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۭ﴿۸۲﴾

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ۙ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ۙ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ

دے گا، پھر مجھ کو زندہ کرے گا[۱۳۴] اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ جزا کے دن وہ میرے گناہ معاف فرما دے گا[۱۳۵]۔ ۷۵-۸۲

(ابراہیم یہ سب کہہ چکا تو اُس نے دعا کی کہ) میرے پروردگار، مجھے قوت فیصلہ عطا فرما[۱۳۶] اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا[۱۳۷] اور بعد کے آنے والوں میں میرا ذکر خیر[۱۳۸] جاری

---

[۱۳۴] انسان جیسی مخلوق کے لیے جو اپنی ذات کے شعور کے ساتھ پیدا کی گئی ہے، یہ سب سے بڑی نعمت ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

[۱۳۵] اِس بدیہی حقیقت کو لفظوں میں ظاہر کیے بغیر کہ پھر وہ ایک روز جزا برپا کرے گا، ابراہیم علیہ السلام نے یہ اپنے پروردگار کے فضل و عنایت کی طرف توجہ دلا دی ہے کہ بندہ سرکشی چھوڑ کر اُسی کا ہو جائے تو وہ آخری درجے میں اُس کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگذر بھی فرماتا ہے:

عصیان ما و رحمت پروردگار ما
ایں را نہایتے ست نہ آں را نہایتے

[۱۳۶] یہ دعا چونکہ ہجرت کے موقع پر کی گئی ہے جو انبیا علیہم السلام کی دعوت میں نہایت اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ اِس لیے دعا کی ابتدا اِس درخواست سے ہوئی ہے کہ آگے کے مراحل میں ہر موقع پر اُنھیں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق حاصل رہے۔

[۱۳۷] یعنی دنیا اور آخرت، دونوں میں اُن کی معیت و رفاقت عطا فرما۔

[۱۳۸] اصل میں 'لِسَانَ صِدْقٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی ذکر جمیل جس میں پایداری اور دوام و استمرار بھی ہو۔ ابراہیم علیہ السلام کی اِس دعا کو جو قبولیت حاصل ہوئی، اُس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ سے پیش نہیں کی جا سکتی۔

النَّعِيمِ ﴿٨٥﴾ وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ﴿٨٦﴾
وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿٨٧﴾
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٩﴾
وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٩٠﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغٰوِينَ ﴿٩١﴾

رکھ اور باغ راحت کے وارثوں میں مجھے بھی ایک وارث بنا اور میرے باپ کو معاف کر دے، بے شک وہ گم راہوں میں سے ہے۔ اور جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے، اُس دن، (اے پروردگار)، مجھے رسوا نہ کر۔[١٣٩] ٨٣-٨٧

(فرمایا[١٤٠]): جس دن نہ مال کام آئے گا، نہ اولاد[١٤١]، صرف وہی کامیاب ہوں گے جو قلب سلیم[١٤٢] لے کر خدا کے پاس آئیں گے۔ (اُس دن) جنت خدا سے ڈرنے

---

[١٣٩] مطلب یہ ہے کہ باپ کو جہنم میں ڈالا گیا تو بیٹے کی حیثیت سے یہ چیز میرے لیے باعث رسوائی ہوگی، اِس لیے درخواست کر رہا ہوں کہ اگرچہ میرا باپ گم راہ ہے، لیکن مجھ پر عنایت کے لیے آپ اُس کو معاف فرما دیں۔ دوسری جگہ وضاحت ہے کہ یہ دعا چونکہ خدا کے بے لاگ عدل کے خلاف تھی، اِس لیے قبول نہیں ہوئی۔

[١٤٠] یہاں سے آگے اب پیرے کے آخر تک شان کلام صاف بتا رہی ہے کہ پوری عبارت حضرت ابراہیم کی دعا کا جز نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے۔

[١٤١] ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے مغفرت چاہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہایت لطیف اسلوب میں بتا دیا ہے کہ نہیں، تمھارے جیسا فرزند بھی وہاں اپنے باپ کے کام نہ آ سکے گا۔

[١٤٢] اِس سے مراد وہ دل ہے جو اپنی اصل فطرت پر قائم اور شرک و نفاق کی ہر آلایش سے پاک ہو۔

وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿٩٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ
اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ؕ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ۙ﴿٩٤﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ
اَجْمَعُوْنَ ؕ﴿٩٥﴾
قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۙ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿٩٧﴾
اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا

الشعراء ٢٦

والوں کے قریب لائی جائے گی[۱۴۳] اور جہنم گم راہوں کے لیے بے نقاب کر دی جائے گی اور اُن سے پوچھا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے تھے۔ کیا وہ تمھاری کچھ مدد کریں گے یا (آج) خود اپنا بچاؤ کر لیں گے؟ پھر وہ بھی اور یہ بھٹکے ہوئے لوگ بھی اور ابلیس کے لشکر بھی، سب کے سب اُس میں اوندھے منہ جھونک دیے جائیں گے۔[۱۴۴] ۸۸-۹۵

وہاں وہ آپس میں جھگڑتے ہوئے (اپنے لیڈروں سے) کہیں گے: خدا کی قسم، ہم کھلی ہوئی گم راہی میں تھے، جب کہ تمھیں خداوند عالم کے برابر ٹھیراتے تھے۔[۱۴۵] (پھر اپنی بدبختی پر ماتم کریں گے کہ) ہمیں تو اِن مجرموں ہی نے گم راہ کیا۔ سو اب نہ ہمارے

---

[۱۴۳] یعنی جس طرح مہمانوں کی تشریف و تکریم کے لیے کوئی چیز اُن کے سامنے پیش کی جاتی ہے، اُسی طرح پیش کر دی جائے گی۔

[۱۴۴] اصل میں لفظ 'کُبْکِبُوْا' آیا ہے۔ یہ 'کب' کی تکریر ہے جس سے مبالغہ اور تکرار کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔

[۱۴۵] یعنی تمھاری بات اُسی طرح مانتے تھے، جس طرح رب العٰلمین کی بات ماننی چاہیے۔

لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۙ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً
فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾
كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۚۖ﴿۱۰۵﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ

لیے کوئی سفارش کرنے والا ہے، نہ کوئی گرم جوشی سے محبت کرنے والا دوست۔ اب تو اے کاش، ایک دفعہ پلٹنا نصیب ہو کہ ہم ایمان والے بن جائیں۔ ۹۶-۱۰۲

اِس میں، یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، لیکن اِن میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور تیرا پروردگار، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ زبردست بھی ہے اور نہایت مہربان بھی[۱۴۶]۔ ۱۰۳-۱۰۴

نوح کی قوم نے بھی اِسی طرح رسولوں کو جھٹلا دیا[۱۴۷]، جب اُن کے بھائی[۱۴۸] نوح نے

---

[۱۴۶] یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔

[۱۴۷] اُنھوں نے ایک ہی رسول کو جھٹلایا تھا، مگر کوئی رسول بھی یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کرتا تو وہ اُس کے ساتھ وہی معاملہ کرتے جو اُنھوں نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کیا۔ آیت میں ’مُرْسَلِیْن‘ کا لفظ اِسی بنا پر جمع استعمال ہوا ہے۔ اِس سے جرم کی سنگینی اور شدت ظاہر ہوتی ہے کہ اُنھوں نے جب ایک رسول کو جھٹلایا تو گویا سب کو جھٹلا دیا۔

[۱۴۸] نوح علیہ السلام اُن کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں تھے کہ وہ اُن کی زندگی اور احوال سے واقف نہ ہوں اور اُنھیں جھوٹا اور مفتری قرار دے کر اُن کی دعوت کو رد کر دیں۔ وہ اُن کی قوم کے ایک فرد اور اُن کے بھائی تھے۔ یہ حوالہ اِسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے دیا گیا ہے۔

نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۚ ﴿١٠٦﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۙ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُونِ ۚ ﴿١٠٨﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ
رَبِّ الْعَالَمِينَ ۚ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۗ ﴿١١٠﴾ قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ
وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ ۗ ﴿١١١﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۚ ﴿١١٢﴾

اُن سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں ہو[۱۴۹]؟ میں تمھارے لیے ایک رسول امین ہوں[۱۵۰]، اِس لیے اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اِس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو رب العٰلمین کے ذمے ہے، سو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اُنھوں نے جواب دیا: کیا ہم تمھیں مان لیں، دراں حالیکہ تمھاری پیروی تو رذیلوں نے اختیار کر رکھی ہے[۱۵۱]؟ نوح نے کہا: مجھے کیا معلوم جو وہ کرتے رہے ہیں؟ اُن کا حساب میرے رب

---

[۱۴۹] یعنی اُس انجام سے ڈرتے نہیں ہو جو خدا سے سرکشی کے نتیجے میں تمھارا منتظر ہے؟

[۱۵۰] لفظ 'اَمِیْن' سے اِس بات کا اظہار مقصود ہے کہ میں کوئی مفتری نہیں ہوں، بلکہ خدا کا رسول ہوں اور جو امانت میرے سپرد کی گئی ہے، اُسے پوری دیانت داری کے ساتھ تمھیں پہنچا رہا ہوں۔

[۱۵۱] یہ معارضہ اِس بات کی دلیل ہے کہ نوح علیہ السلام کی دعوت کی تردید میں اُن کی قوم کے متمردین کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ اپنی رعونت کی تسکین کے لیے اُنھوں نے یہ بہانہ ڈھونڈ لیا۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخلاقی لحاظ سے وہ کس پستی میں گر چکے تھے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنھیں یہ ماجرا سنایا جا رہا ہے، اُن کا حال بھی یہی تھا اور وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں یہی کہتے تھے کہ ہم اشراف مکہ اِن اراذل و انفار کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں جو ایمان لا کر تمھارے ساتھی بن گئے ہیں؟

اِنۡ حِسَابُهُمۡ اِلَّا عَلٰی رَبِّیۡ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ ۚ ﴿۱۱۳﴾ وَمَاۤ اَنَا
بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ ﴿۱۱۴﴾ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ؕ ﴿۱۱۵﴾
قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ یٰنُوۡحُ لَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمَرۡجُوۡمِیۡنَ ؕ ﴿۱۱۶﴾

کے ذمے ہے، اگر تم سمجھنا چاہو[۱۵۲]۔ (اِس وقت تو وہ آگے بڑھ کر مجھ پر ایمان لے آئے ہیں) اور میں اِن اہل ایمان کو، (تمھاری خوشنودی کے لیے)، دھتکارنے والا نہیں ہوں۔ میں تو صرف ایک کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں[۱۵۳]۔ ۱۰۵-۱۱۵

اِس پر وہ بولے: اے نوح، اگر تم باز نہ آئے تو ضرور سنگ سار کر دیے جاؤ گے[۱۵۴]۔ ۱۱۶

---

[۱۵۲] یہ نہایت بلیغ جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس سے پہلے اُن کے کام رذیلوں کے تھے یا شریفوں کے، مجھے اِس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ اُن کا ماضی ہے اور اِس کا حساب اُن کے پروردگار کے ذمے ہے۔ میں تو اُن کے حاضر کو دیکھ رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، جب کہ تم اُس کا انکار کر رہے ہو، اور آدمی کی شرافت اور رذالت کا انحصار تو اُس کے رویے اور عمل و کردار ہی پر ہوتا ہے۔

[۱۵۳] یعنی میرا کام انذار ہے اور میں نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔ مجھے ایمان و اسلام کے لیے تمھاری شرائط سننے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ لہٰذا نہیں مانتے ہو تو اِس کی ذمہ داری تمھی پر ہے۔ میں اِس کے لیے مسئول نہیں ہوں۔

[۱۵۴] یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ اِس طرح کی دھمکی وہ پہلے بھی دیتے رہے تھے، لیکن حضرت نوح نے اِس کی کوئی پروا نہیں کی۔ چنانچہ اُنھوں نے پورے زور کے ساتھ کہا کہ اِسے محض دھمکی نہ سمجھو، اب ہم یہ لازماً کر گزریں گے۔

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ۖ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا
وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ
فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿١١٩﴾ ۚ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ؕ ﴿١٢٠﴾
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ وَاِنَّ
رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٢﴾
كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۖ ﴿١٢٣﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ

(بالآخر) نوح نے دعا کی کہ میرے پروردگار، میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے، اِس لیے تو اب میرے اور اُن کے درمیان قطعی فیصلہ فرما دے[١٥٥] اور مجھے اور میرے ساتھ جو اہل ایمان ہیں، اُنھیں نجات عطا فرما۔ چنانچہ اُس کو اور اُس کے ساتھیوں کو ہم نے بھری ہوئی کشتی میں[١٥٦] بچا لیا اور باقی سب لوگوں کو اُس کے بعد ہم نے غرق کر دیا۔ ١١٧-١٢٠

اِس میں، یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، لیکن اِن میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور تیرا پروردگار، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ زبردست بھی ہے اور نہایت مہربان بھی۔[١٥٧] ١٢١-١٢٢

اِسی طرح عاد[١٥٨] نے رسولوں کو جھٹلا دیا[١٥٩]، جب اُن کے بھائی ہود نے اُن سے کہا:

---

[١٥٥] یہ اُسی فیصلے کا ذکر ہے جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قوموں کے لیے صادر ہوتا ہے اور جس کے نتیجے میں حق کو واضح فتح حاصل ہو جاتی ہے۔

[١٥٦] اِسے بھری ہوئی اِس لیے کہا ہے کہ اِس میں وہ سب چیزیں رکھ لی گئی تھیں جنھیں بچانا مقصود تھا۔

[١٥٧] یہ وہی ترجیع ہے جو اِس سے پہلے گزر چکی ہے۔

[١٥٨] عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کا مسکن احقاف

أَلَا تَتَّقُوْنَ ج (۱۲۴) إِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ أَمِیْنٌ لا (۱۲۵) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِیْعُوْنِ ج (۱۲۶)
وَمَآ أَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ أَجْرٍ ج إِنْ أَجْرِیَ إِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط (۱۲۷)
أَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ لا (۱۲۸) وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ
لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ ج (۱۲۹) وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ج (۱۳۰)
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِیْعُوْنِ ج (۱۳۱) وَاتَّقُوا الَّذِیْٓ أَمَدَّکُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ج (۱۳۲)

کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمھارے لیے ایک رسول امین ہوں۔ اِس لیے اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اِس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو اللہ رب العٰلمین کے ذمے ہے[۱۶۰]۔ ۱۲۳-۱۲۷

(یہ تمھارا کیا حال ہے)؟ کیا ہر اونچی زمین پر تم اِسی طرح لاحاصل یادگاریں بناتے رہو گے؟ اور اِسی طرح بڑے بڑے محل تعمیر کرتے رہو گے گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے[۱۶۱]؟ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالو گے تو جبار بن کر ڈالو گے[۱۶۲]؟ سو اللہ سے ڈرو اور

کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنی قوت و شوکت کے لیے بھی۔ حضرت ہود اِنھی کے ایک فرد تھے جنھیں رسول کی حیثیت سے اِن کی طرف مبعوث کیا گیا۔

[۱۵۹] ایک رسول کے جھٹلانے کو تمام رسولوں کے جھٹلانے سے تعبیر کرنے کی وجہ اوپر آیت ۱۰۵ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔

[۱۶۰] مطلب یہ ہے کہ خدا کے بندو، میری بات تو سنو۔ میں جو کچھ تمھیں دے رہا ہوں، بالکل مفت دے رہا ہوں۔ میں نے اِس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگ لیا ہے جو تم پر گراں گزرا ہے اور تم اُس سے گریز و فرار کے راستے تلاش کر رہے ہو۔

[۱۶۱] اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ'۔ اِن میں 'لَعَلَّکُمْ' 'گویا کہ' کے مفہوم میں ہے

اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۙ ﴿١٣٣﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۚ ﴿١٣٤﴾ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ؕ ﴿١٣٥﴾

میری بات مانو۔ اُس سے ڈرو، جس نے تمھیں وہ چیزیں عطا فرمائی ہیں جنھیں تم خوب جانتے ہو۔ اُس نے تمھیں جانور، بیٹے، باغ اور چشمے عطا فرمائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (تمھارے کرتوتوں کی وجہ سے) میں تم پر ایک ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں[۱۶۳]۔ ۱۲۸-۱۳۵

اور فصیح عربی میں یہ اِس مفہوم میں بھی آتا ہے۔ آیت میں جس رویے کی مذمت کی گئی ہے، وہ اِن الفاظ سے اور اوپر 'تَعْبَثُوْنَ' کے لفظ سے واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا اور آخرت پر ایمان کے تقاضوں کو بھول کر اور کسی تمدنی، سماجی، معاشی اور معاشرتی ضرورت کے بغیر عمارتیں تعمیر کرنا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غریبوں کے پاس سر چھپانے کے لیے جھونپڑے بھی نہیں ہوتے اور خشت و آہن کے فلک بوس منار شب و روز خدا کی زمین پر بلند ہوتے رہتے ہیں، جن میں نمایش اور تفاخر کے سوا کوئی چیز پیش نظر نہیں ہوتی۔ یہ رویہ انفرادی زندگی میں ہو یا اجتماعی زندگی میں، بہر حال قابل مذمت اور اِس بات کی علامت ہے کہ تمدن کا مزاج بالکل فاسد ہو چکا ہے۔ کسی صالح تمدن میں حاجیات و ضروریات ہمیشہ کمالیات و تعیّشات پر مقدم ہوتی ہیں اور معاشرے کے تمام طبقات نہایت متوازن طریقے پر تعمیر و ترقی کے کاموں سے مستفید ہوتے ہیں۔

[۱۶۲] یعنی جنگ کرو گے تو کسی شر و فساد اور ظلم و عدوان کے استیصال کے لیے نہیں، بلکہ اپنی قوت و صولت کے مظاہرے اور دوسروں کو مغلوب و محکوم بنانے کے لیے کرو گے۔ یہ، ظاہر ہے کہ صریح فساد فی الارض ہے جس کا ارتکاب خدا سے ڈرنے والے کبھی نہیں کر سکتے۔

[۱۶۳] نہایت دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ تذکیر و نصیحت اور خدا کے بے پایاں افضال و عنایات کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ آخر میں ہود علیہ السلام نے متنبہ کیا ہے کہ میں تمھارے

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ۙ﴿١٣٦﴾
اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿١٣٧﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۚ﴿١٣٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَاَهْلَكْنٰهُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٤٠﴾

اُنھوں نے جواب دیا: ہمارے لیے یکساں ہے، خواہ تم نصیحت کرو یا نصیحت کرنے والے نہ بنو۔ کچھ نہیں، (تم جو باتیں کر رہے ہو)، یہی عادت اگلوں کی بھی رہی ہے۔ (یہ محض تمھارے ڈراوے ہیں)، ہم پر ہرگز کوئی عذاب آنے والا نہیں ہے[١٦٤]۔ بالآخر اُنھوں نے اُس کو جھٹلا دیا، پھر ہم نے بھی اُنھیں ہلاک کر ڈالا۔ اِس میں یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، لیکن اِن میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور تیرا پروردگار، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ زبردست بھی ہے اور نہایت مہربان بھی[١٦٥]۔ ١٣٦-١٤٠

سروں پر ایک ہول ناک عذاب کو منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، اِس لیے کہ اتمام حجت کے بعد یہ عذاب لازماً آجاتا ہے۔

[١٦٤] ہود علیہ السلام کی دردمندانہ اپیل کے جواب میں آخری درجے کی قساوت ہے جس کا اظہار اِن استہزائیہ جملوں میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر بیٹھو، ہمیں تمھاری نصیحتوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مذہب و اخلاق کے علم بردار اِس سے پہلے بھی اِسی طرح عذاب کی دھمکیاں دیتے رہے ہیں، لیکن یہ دھمکیاں نہ پہلے کبھی پوری ہوئی ہیں، نہ اب پوری ہوں گی۔

[١٦٥] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور آپ کے مخاطبین کی تہدید و وعید کے لیے یہ سلسلۂ کلام بھی حسب سابق ترجیع پر ختم ہوا ہے۔

كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۖۚ ﴿۱۴۱﴾ اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ صٰلِحٌ اَلَا
تَتَّقُوۡنَ ۚ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّیۡ لَكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ۙ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ۚ ﴿۱۴۴﴾
وَمَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ؕ ﴿۱۴۵﴾
اَتُتۡرَكُوۡنَ فِیۡ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيۡنَ ۙ ﴿۱۴۶﴾ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ۙ ﴿۱۴۷﴾
وَّزُرُوۡعٍ وَّنَخۡلٍ طَلۡعُهَا هَضِيۡمٌ ۚ ﴿۱۴۸﴾ وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ

ثمود[۱۶۶] نے بھی رسولوں کو جھٹلا دیا، جب اُن کے بھائی صالح نے اُن سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمھارے لیے ایک رسول امین ہوں، اِس لیے اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اِس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو اللہ رب العٰلمین کے ذمے ہے۔ ۱۴۱-۱۴۵

(تمھارا کیا خیال ہے)، کیا تم اِنھی نعمتوں میں اطمینان کے ساتھ رہنے دیے جاؤ گے جو یہاں (تم کو میسر) ہیں؟ باغوں اور چشموں اور کھیتوں میں، اور کھجوروں میں جن کے خوشے آپس میں گتھے ہوئے ہوتے ہیں[۱۶۷]؟ اور پہاڑوں کو کھود کر (اِسی

---

[۱۶۶] یہ عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ اِسی بنا پر اِنھیں عاد ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ عرب کی قدیم اقوام میں سے یہ دوسری قوم ہے جس نے عاد کے بعد غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اِن کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ ہے جسے الحجر کہا جاتا ہے۔

[۱۶۷] یہ اُس خوش حالی اور رفاہیت کا بیان ہے جو خدا نے اِس قوم کو عطا کر رکھی تھی اور دنیا کی اکثر قوموں کی طرح یہی خوش حالی اور رفاہیت اِس کی غفلت، سرکشی اور خدا سے بے نیازی کا باعث بن گئی تھی۔ اِس کے لیے باغ کے اجزا مستعار لیے گئے ہیں اور یہ وہی باغ ہے جسے عرب پسند کرتے تھے کہ اُس میں انار اور انگور ہوں، اُس کے نیچے نہر بہتی ہو، بیچ میں کھیتی کی چیزیں اگائی

بُيُوۡتًا فٰرِهِيۡنَ ۚ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ۚ﴿۱۵۰﴾ وَلَا تُطِيۡعُوۡۤا اَمۡرَ

طرح) فخر جتاتے، خوش خوش گھر بناتے رہو گے؟[۱۶۸] سو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو

گئی ہوں اور کنارے کنارے کھجور کے بلند و بالا درخت باڑ کی صورت میں لگے ہوئے ہوں۔ صالح علیہ السلام نے اِسی باغ و بہار کی طرف توجہ دلا کر فرمایا ہے کہ کیا یہ خیال کرتے ہو کہ تمھارا یہ عیش دائمی اور ابدی ہے، اِس پر کبھی زوال نہ آئے گا، تم اِسی طرح چھوڑ دیے جاؤ گے اور جس پروردگار نے یہ سب تمھیں عطا فرمایا ہے، وہ کبھی اِس کا حساب تم سے نہ مانگے گا؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... ہر نعمت منعم کی شکر گزاری کا حق واجب کرتی ہے اور اِس شکر گزاری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ برابر چوکنا رہے کہ مبادا کسی نعمت کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہو جائے۔ نعمت کسی کا حق نہیں، بلکہ منعم کی طرف سے ایک امانت ہے۔ اِس وجہ سے جس کی تحویل میں جتنی ہی زیادہ امانت ہو، اُس کو اتنا ہی زیادہ فکر مند اور بیدار رہنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص نعمت پا کر نچنت ہو کر سو رہے کہ یہ نعمت اُس کا حق ہے اور وہ اِس میں عیش کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے تو وہ نہایت احمق ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/۵۴۲)

۱۶۸۔ پہاڑوں کو تراش کر گھر بنانے کے فن میں یہ لوگ جس کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اُس کے آثار آج بھی مدائن صالح میں موجود ہیں۔ یہ آثار ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں اور کم و بیش ویسے ہی ہیں، جیسے ہندوستان میں ایلورا، اجنٹا اور بعض دوسرے مقامات میں پائے جاتے ہیں۔

آیت میں ’فٰرِهِيۡنَ‘ کا لفظ بھی قابل توجہ ہے۔ یہ اُسی ذہنیت کے ایک دوسرے پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو اوپر لفظ ’اٰمِنِيۡنَ‘ سے واضح ہوتی ہے۔ یعنی احساس تفاخر سے مگن اور اپنے طرز عمل کے نتائج و عواقب سے بالکل بے پروا۔ درحقیقت یہی وہ چیز ہے جو تعمیر و ترقی کو معاشرے اور تمدن کے لیے ناسور بنا دیتی ہے۔ ورنہ مادی ترقی کوئی جرم نہیں ہے اور نہ فلک بوس عمارتیں بنانا لازماً کسی فساد کی نشانی ہے۔ یہ صحیح وقت پر بنائی جائیں تو سیدنا سلیمان علیہ السلام کے ’صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِيۡرَ‘ کی طرح حق و باطل میں امتیاز اور معرفت الٰہی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

الْمُسْرِفِيْنَ ۙ (۱۵۱) الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۱۵۲)
قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۚ (۱۵۳) مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚۖ
فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۵۴)
قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵۵) وَلَا تَمَسُّوْهَا

اور اُن حد سے گزر جانے والوں کی بات نہ مانو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں،[۱۶۹] اُس کی اصلاح نہیں کرتے۔[۱۷۰] ۱۴۶-۱۵۲

وہ بولے: کچھ نہیں، تم پر تو کسی نے بری طرح جادو کر دیا ہے (جس سے تمھاری عقل ماری گئی ہے)۔ تم ہماری طرح کے ایک آدمی ہی ہو، اِس لیے کوئی نشانی لاؤ، اگر تم سچے ہو۔ ۱۵۳-۱۵۴

صالح نے کہا: یہ ایک اونٹنی ہے۔[۱۷۱] ایک دن پانی پینے کی باری اِس کی ہے اور ایک مقرر دن کی باری تمھارے لیے ہے۔[۱۷۲] اور (سنو)، اِس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ

---

[۱۶۹] اِس سے مراد وہی رویہ ہے جو پیچھے 'اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

[۱۷۰] یعنی اُس میں لوگوں کو بھلائی کی تلقین نہیں کرتے اور نہ دوسروں کی حق تلفی اور اُن پر تعدی سے اُنھیں روکتے ہیں۔ یہ وہی تقاضا ہے جسے قرآن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے۔

[۱۷۱] یعنی ایک اونٹنی ہے جسے میں نے نامزد کر دیا ہے۔ دوسری جگہ وضاحت ہے کہ اُسے خدا کی نذر کر کے نامزد کیا گیا تھا۔

[۱۷۲] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کو پانی پلانے کا گھاٹ ایک ہی تھا۔ چنانچہ اِس پابندی سے قوم کے لیے نہایت سخت آزمایش پیدا ہو گئی۔

بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۵۶) فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ (۱۵۷) لا
فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ط وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۵۸)
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۱۵۹)
كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ (۱۶۰) صلے ج اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا

نہ لگانا، ورنہ ایک ہول ناک دن کا عذاب تمھیں آ پکڑے گا[۱۷۳]۔ اِس پر بھی اُنھوں نے اُس کی کوچیں کاٹ دیں[۱۷۴]، سو پچھتاتے رہ گئے اور بالآخر اُنھیں عذاب نے آلیا[۱۷۵]۔ اِس میں، یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، لیکن اِن میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور تیرا پروردگار، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ زبردست بھی ہے اور نہایت مہربان بھی[۱۷۶]۔ ۱۵۵-۱۵۹

لوط[۱۷۷] کی قوم نے بھی رسولوں کو جھٹلا دیا، جب کہ اُن کے بھائی لوط نے اُن سے کہا:

---

[۱۷۳] مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے یہ خدا کے عذاب کی نشانی ہے۔ اِس کو گزند پہنچاؤ گے تو سمجھ لو کہ امان کی دیوار گر گئی۔ اِس کے بعد قہر الٰہی کے سیلاب کو کوئی چیز تمھاری بستیوں میں داخل ہونے سے روک نہ سکے گی۔

[۱۷۴] اونٹنی کو مارنے کا جرم اگرچہ اُن کے ایک سرکش سردار نے کیا تھا، مگر قرآن نے اِسے پوری قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ باقی متمردین بھی اِس پر راضی تھے۔

[۱۷۵] یہ اونٹنی قوم کی سرکشی کو جانچنے کا ایک پیمانہ تھی۔ اِس کو مارنے سے واضح ہو گیا کہ یہ لوگ اب مزید کسی مہلت کے مستحق نہیں رہے۔ چنانچہ عذاب کا حکم صادر ہو گیا اور قوم عاد کی طرح یہ بھی زمین سے مٹا دیے گئے۔

[۱۷۶] یہ وہی آیت ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اِس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

[۱۷۷] حضرت لوط سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔

تَتَّقُوْنَ ۚ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۙ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۚ ﴿۱۶۳﴾
وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۗ ﴿۱۶۴﴾
اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ ۙ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ
رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمھارے لیے ایک رسول امین ہوں، اِس لیے اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اِس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو اللہ رب العٰلمین کے ذمے ہے۔ ۱۶۰-۱۶۴

(خدا کے بندو)، کیا تم (شہوت رانی کے لیے) دنیا کے لوگوں میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمھارے پروردگار نے تمھارے لیے جو تمھاری بیویاں پیدا کی ہیں، اُنھیں چھوڑ دیتے ہو؟[۱۷۸] نہیں، (یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے)، بلکہ تم ایسے لوگ ہو

بائیبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ لوط علیہ السلام کا تعلق اُس قوم کے ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ اُن کی بیوی کا ذکر آگے جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر ہوئی تھی اور اِس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔

۱۷۸ یہ استفہام اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے اِس مقصد کے لیے زن و مرد کے جوڑے پیدا کیے تھے۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر کس اوندھی فطرت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ پھر لڑکے تو لڑکے، تمھارے مرد تک اِسی لعنت میں گرفتار ہیں۔ یہ کیسا فساد طبیعت ہے جس نے تمھیں اِس مرض خبیث میں مبتلا کر دیا ہے؟ اِس نفرت و کراہت اور اظہار تعجب کی وجہ یہ ہے کہ زنا اپنے تمام مفاسد کے باوجود نفس انسانی کی بنیادی ترکیب میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا، لیکن یہ بیماری لاحق ہو جائے تو اِس ترکیب میں خلل عظیم پیدا کر دیتی ہے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ (١٦٧)
قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ؕ (١٦٨) رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا
يَعْمَلُوْنَ (١٦٩) فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ (١٧٠) لا اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ج (١٧١)

جو حد سے گزر گئے ہو۔ ۱۶۵-۱۶۶

وہ بولے کہ اے لوط، اگر تم (ایسی باتوں سے) باز نہ آئے تو یہاں سے لازماً نکال باہر کیے جاؤ گے۔[۱۷۹] ۱۶۷

لوط نے جواب دیا: (کوئی پروا نہیں)، میں تمھارے اِس عمل سے سخت بے زار لوگوں میں سے ہوں۔[۱۸۰] (تب اُس نے دعا کی): میرے پروردگار، تو مجھے اور میرے گھر والوں کو اُس عمل کے انجام[۱۸۱] سے نجات عطا فرما جو یہ کر رہے ہیں۔[۱۸۲] سو ہم نے اُسے اور اُس کے سب گھر والوں کو نجات دی، ایک بڑھیا کے سوا[۱۸۳] جو پیچھے رہنے

---

[۱۷۹] یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ اِس طرح کی دھمکی وہ پہلے بھی دیتے رہے تھے، لیکن اب اُنھوں نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ اپنی زبان بند رکھو، ورنہ ہم جو کچھ کہتے رہے ہیں، وہ کر گزریں گے۔

[۱۸۰] یعنی اُن لوگوں میں سے ہوں جن کی فطرت سلیم اور عقل مستقیم ہے اور جو ایسی چیزوں سے بے زار ہی ہوا کرتے ہیں۔

[۱۸۱] اِس جملے میں ایک مضاف عربیت کے قاعدے سے محذوف ہے، یعنی 'من عقوبة ما يعملون'۔ یہ اُسی کا ترجمہ ہے۔

[۱۸۲] اِس طرح کی دعا اُسی وقت پیغمبر کی زبان پر آتی ہے، جب سنت الٰہی کے مطابق اُس کی قوم پر عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

[۱۸۳] یہ تحقیر کا اسلوب ہے اور اِس سے حضرت لوط کی بیوی مراد ہے جو اُن پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔

ثُمَّ دَمَّرۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ﴿۱۷۲﴾ ۚ وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ
مَطَرُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿۱۷۳﴾
اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۷۴﴾ وَ اِنَّ
رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۷۵﴾
کَذَّبَ اَصۡحٰبُ لۡئَیۡکَۃِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۷۶﴾ ۚۖ اِذۡ قَالَ لَہُمۡ شُعَیۡبٌ

والوں میں رہ گئی۔ پھر (اُس کو اور) باقی سب لوگوں کو ہم نے ہلاک کر مارا اور اُن پر (پتھروں کی) ہول ناک بارش برسا دی۔[184] تو کیا ہی بری بارش تھی جو اُن پر برسائی گئی جنھیں خبردار کر دیا گیا تھا۔ ۱۶۸-۱۷۳

اِس میں، یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، لیکن اِن میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور تیرا پروردگار، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ زبردست بھی ہے اور نہایت مہربان بھی۔[185] ۱۷۴-۱۷۵

اِسی طرح بن والوں[186] نے بھی رسولوں کو جھٹلا دیا، جب شعیب نے اُن سے

---

[184] سورۂ ہود میں تصریح ہے کہ یہ پتھروں کی بارش تھی۔ اِس تباہی کے آثار اِن کے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، بحر لوط (بحیرۂ مردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خاص اِس کے جنوبی علاقے کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں اِس درجہ ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔

[185] یہ آیت ترجیع ہے۔

[186] پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکا ہے کہ شعیب علیہ السلام مدین والوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ یہ بستی ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مدیان کے نام پر مدین یا مدیان کہلاتی

أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٧٨﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٧٩﴾
وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٨٠﴾
أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ﴿١٨١﴾ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِيمِ ﴿١٨٢﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ

کہا: کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمھارے لیے ایک رسول امین ہوں، اِس لیے اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اِس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو اللہ، رب العٰلمین کے ذمے ہے۔ ۱۷۶-۱۸۰

(میں تم سے کہتا ہوں کہ) پیمانہ پورا بھرو اور کسی کو نقصان دینے والے نہ بنو اور سیدھی ترازو سے تولو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں گھٹا کر نہ دو[۱۸۷]۔ اور زمین میں فساد نہ

تھی، جو اُن کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ اِس کے قریب ایک بہت بڑا بن تھا۔ عربی زبان میں جھاڑی اور بن کے لیے 'أیکة' کا لفظ آتا ہے۔ آیت میں اِسی بنا پر اِن کا ذکر 'اَصۡحٰبُ لۡـَٔیۡکَةِ'، یعنی بن والوں کے الفاظ سے ہوا ہے۔

[۱۸۷] اُس زمانے کی دو بڑی تجارتی شاہراہیں مدین کے قریب سے گزرتی تھیں، اِس وجہ سے مدین کے لوگوں نے بھی تجارت میں بہت ترقی کر لی تھی۔ چنانچہ اِن کے باطنی فساد کا ظہور ناپ تول میں خیانت اور اشیا میں ملاوٹ کی صورت میں بھی ہوا۔ یہ اِس بات کی علامت تھی کہ پوری قوم کے اندر عدل و قسط کا تصور مختل ہو چکا اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کا عقیدہ باقی نہیں رہا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک میزان کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اِسی میزان پر یہ آسمان و زمین قائم ہیں۔ اگر یہ درہم برہم ہو جائے تو یہ آسمان و زمین درہم برہم ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ نظام انسانوں کو یہ رہنمائی دیتا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر ہر شعبۂ زندگی میں صحیح

مُفْسِدِیْنَ ۝۱۸۳ۚ وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالْجِبِلَّۃَ الْاَوَّلِیْنَ ۝۱۸۴ؕ
قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ۝۱۸۵ۙ وَمَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا
وَاِنْ نَّظُنُّکَ لَمِنَ الْکٰذِبِیْنَ ۝۱۸۶ۚ
فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۱۸۷ؕ
قَالَ رَبِّیْۤ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۸۸ فَکَذَّبُوْہُ فَاَخَذَھُمْ عَذَابُ یَوْمِ

پھیلاتے پھرو اور اُس (خدا) سے ڈرو جس نے تمھیں پیدا کیا ہے اور تم سے پہلی نسلوں کو بھی۔ ۱۸۱-۱۸۴

اُنھوں نے جواب دیا: کچھ نہیں، تم پر تو کسی نے بری طرح جادو کر دیا ہے (جس سے تمھاری عقل ماری گئی ہے) اور یہ بھی کہ تم ہماری طرح کے ایک آدمی ہی ہو اور ہم تو تمھیں بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔ ۱۸۵-۱۸۶

سو اگر تم سچے ہو تو آسمان سے ہم پر کوئی ٹکڑا گرا دو۔[۱۸۸] شعیب نے کہا: میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔[۱۸۹] بالآخر اُنھوں نے اُسے جھٹلا دیا تو سائبان والے

میزان کے قیام کا پورا پورا اہتمام رکھیں، ورنہ اُن کا سارا معاشی و معاشرتی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔“ (تدبر قرآن ۵/۵۵۲)

[۱۸۸] یعنی جس آسمانی عذاب کی دھمکی دیتے رہے ہو، وہ لے آؤ۔ قرآن میں دوسری جگہ مذکور ہے کہ یہی بات قریش مکہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھی۔

[۱۸۹] یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... مطلب یہ ہے کہ آسمان سے ٹکڑے گرانا میرے اختیار میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ تمھاری کارستانیوں سے اچھی طرح باخبر ہے تو میں اِس معاملے کو اُسی کے حوالے کرتا ہوں۔ اُس کی حکمت کا جو تقاضا ہوگا، وہ ظہور میں آئے گا اور بالکل ٹھیک وقت پر ظہور میں

الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۸۹)
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۹۰) وَاِنَّ
رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۱۹۱)
وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۹۲) ؕ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (۱۹۳) ۙ

دن کے عذاب نے اُنھیں آپکڑا[۱۹۰] اور اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ ایک ہول ناک دن کا عذاب تھا۔ ۱۸۷-۱۸۹

اِس میں، یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، لیکن اِن میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور تیرا پروردگار، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ زبردست بھی ہے اور نہایت مہربان بھی[۱۹۱]۔ ۱۹۰-۱۹۱

(یہ پہلوں کی سرگذشتیں ہیں۔ اِس کتاب کے منکرین بھی یہی کر رہے ہیں، اِس لیے مطمئن رہو)، اِس میں کچھ شک نہیں کہ یہ نہایت اہتمام سے خداوند عالم کا اتارا

آئے گا۔" (تدبر قرآن ۵/ ۵۵۳)

[۱۹۰] یعنی اُس دن کا عذاب جس میں غبار اٹھا، بادل اٹڈ کر آئے اور حاصب کے طوفان نے ایک سائبان کی طرح اُنھیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ اِس طرح کے عذاب میں چونکہ آندھی، طوفان، رعد و برق اور چیخنے چنگھاڑنے کی آوازیں، سب اکٹھی ہو جاتی ہیں، اِس لیے دوسرے مقامات میں اِس کو 'رَجْفَة' اور 'صَيْحَة' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں اِس کا وہ منظر نگاہوں کے سامنے لانا مقصود ہے، جب یہ دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ چنانچہ 'عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ' کی تعبیر اِسی رعایت سے اختیار فرمائی ہے۔

[۱۹۱] یہ آیت ترجیع ہے جو ہر سرگذشت کے بعد اِسی طرح آئی ہے۔

عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۙ(١٩٤) بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۗ(١٩٥)
وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (١٩٦) اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ

ہوا کلام ہے۔[١٩٢] اِس کو تمھارے دل پر روح الامین[١٩٣] لے کر اترا ہے،[١٩٤] اِس لیے کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح تم بھی خبردار کرنے والے بنو، نہایت صاف عربی زبان میں —— اور یہ اگلے صحیفوں میں بھی مذکور ہے۔[١٩٥] کیا اِن لوگوں کے لیے یہ کوئی نشانی نہیں ہے

---

١٩٢ یعنی قرآن مجید۔ اِس کے لیے ضمیر مرجع کے بغیر اِس لیے آ گئی ہے کہ سیاق کلام اِسے واضح کر رہا ہے۔

١٩٣ یہ جبریل علیہ السلام کا لقب ہے جس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ جو کچھ اُن کے حوالے کیا جاتا ہے، اُسے وہ پوری دیانت داری کے ساتھ بے کم و کاست اور بغیر کسی ادنیٰ تبدیلی کے پہنچاتے ہیں۔

١٩٤ یعنی براہ راست تمھارے دل پر جس کے بعد کسی آمیزش کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...آیت میں خطاب ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، لیکن کلام کا مقصود مخالفین پر اِس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ یہ کلام پاک منبع سے نکلا ہے، پاک ذریعے سے اترا ہے اور پاک ترین محل میں اِس نے اپنا مستقر بنایا ہے۔“ (تدبر قرآن ٥/٥٥٨)

١٩٥ یہ اُن پیشین گوئیوں کا حوالہ ہے جو قرآن سے متعلق انبیاے سابقین کے صحیفوں میں موجود ہیں۔ آگے اُنھی کے پیش نظر فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کے علما اُن سے واقف ہیں اور اُن میں سے خدا جنھیں توفیق دے گا، وہ اِس کی شہادت بھی دیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر قرآن جو دلائل پیش کرتا ہے، یہ اُن میں سے ایک اہم دلیل ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے آپ لوگوں کے لیے کوئی اجنبی شخصیت نہیں تھے۔ اہل کتاب کے علما آپ کو اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کو اُسی طرح پہچانتے تھے، جس طرح ایک مہجور باپ اپنے موعود و منتظر بیٹے کو پہچانتا ہے۔

عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴿۱۹۷﴾
وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۙ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا
بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ؕ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ﴿۲۰۰﴾ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۙ﴿۲۰۱﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ
لَا يَشْعُرُوْنَ ۙ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ؕ﴿۲۰۳﴾
اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ۙ﴿۲۰۵﴾

کہ اِس کو بنی اسرائیل کے علما جانتے ہیں؟ ۱۹۲-۱۹۷

(یہ اب بھی نہیں مان رہے)، اور اگر ہم اِس کو کسی عجمی پر نازل کر دیتے، پھر وہ انھیں پڑھ کر اِسے سناتا تو یہ پھر بھی اِس پر ایمان نہ لاتے۔ اِن مجرموں کے دلوں میں اِسی طرح ہم نے اِسے گزارا ہے۔[۱۹۶] یہ اِسے نہیں مانیں گے، جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں کہ وہ اچانک اِن پر آجائے اور اِنھیں خبر بھی نہ ہو، پھر اُس وقت کہیں کہ کیا ہمیں کچھ مہلت ملے گی؟ ۱۹۸-۲۰۳

تو کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں؟ ذرا دیکھو تو، اگر ہم (وہ عذاب ابھی نہ اتاریں اور) اِن کو چند سال اور (اِسی طرح) بہرہ مند رکھیں،

---

[۱۹۶] یعنی اِس طرح داخل کیا ہے کہ سنت الٰہی کے مطابق یہ اُس کو قبول کرنے سے اباہی کریں گے، اِس لیے کہ اپنی فطرت کو اِس بری طرح مسخ کر چکے ہیں کہ اِن کا معدہ اب اِس طرح کی کسی غذا کو قبول کرنے کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ انکار کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیتے ہیں۔ اب اِس لیے نہیں مان رہے کہ تم اِنھی کے اندر سے ہو اور اگر باہر کا کوئی آدمی آکر اِسے سناتا تو یہ کہہ کر رد کر دیتے کہ اہل عرب کے لیے کوئی عجمی کیسے پیغمبر بنا کر بھیجا جا سکتا ہے؟

ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿٢٠٦﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿٢٠٧﴾
وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿٢٠٨﴾ ذِكْرٰى
وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٠٩﴾
وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢١٠﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿٢١١﴾
اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿٢١٢﴾

پھر وہ عذاب اِن پر آ جائے جس سے اِنھیں ڈرایا جا رہا ہے تو یہ بہرہ مندی اِن کے کس کام آئے گی؟[۱۹۷] ۲۰۶-۲۰۷

(اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مہلت اتمام حجت کے لیے ہے)۔ ہم نے کسی بستی کو بھی اِس کے بغیر ہلاک نہیں کیا کہ اُس کے لیے پہلے (اُن لوگوں کی) یاددہانی کے لیے خبردار کرنے والے آئے۔ اور ہم ظالم نہیں ہیں کہ اِس کے بغیر ہی اُنھیں ہلاک کر دیں۔ ۲۰۸-۲۰۹

(یہ خدا کا اتارا ہوا کلام ہے، اِس سے یاددہانی حاصل کرو)۔ اِسے شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں۔ نہ یہ اُن کے لائق ہے، نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو سن گن لینے ہی سے دور رکھے گئے ہیں۔[۱۹۸] ۲۱۰-۲۱۲

---

[۱۹۷] مطلب یہ ہے کہ چند برسوں کی اِس مہلت نے اِنھیں غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مہلت مصلحت الٰہی سے ہے۔ اِس سے یہ عذاب ہمیشہ کے لیے ٹل نہیں جائے گا۔ اِن کا رویہ یہی رہا تو اِسے بالآخر آنا ہے اور یہ جب آئے گا تو یہ مہلت اِن کے کچھ بھی کام نہ آئے گی۔ موت اب آئے یا دس سال بعد آئے، وہ جب بھی آئے گی، اُس سے پہلے کی زندگی اپنی تمام قدر و قیمت لازماً کھو دے گی۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ۚ
وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ۙ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ
اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ۚ

(یہ اب عذاب کی زد میں ہیں، اے پیغمبر)، اِس لیے اللہ کے ساتھ تم کسی دوسرے معبود کو نہ پکارنا کہ تم بھی سزاوار عذاب ہو جاؤ۔[۱۹۹] اور اپنے قریبی خاندان والوں کو بھی اِس سے خبردار کر دو۔[۲۰۰] اور جن اہل ایمان نے تمھاری پیروی کی ہے، اُن کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو۔[۲۰۱] ۲۱۳-۲۱۵

---

۱۹۸ یعنی ایسی پاکیزہ باتیں، ایسی اعلیٰ اور برتر تعلیمات اور ایسا علم حقائق، پھر ایسے فصیح و بلیغ اور دل نشیں اسلوب میں نہ کسی شیطان سے صادر ہو سکتا ہے اور نہ شیاطین کسی منبع خیر سے اِس کو اچک کر لا سکتے ہیں، اِس لیے کہ ملاءِ اعلیٰ تک اُن کی رسائی کے تمام راستے نزول قرآن کے ساتھ ہی بند کر دیے گئے ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ خود جنات کی زبان سے اُن کا یہ اعتراف نقل کیا ہے کہ پہلے ہم آسمان کے ٹھکانوں میں سننے کی کوئی جگہ پا لیتے تھے، مگر ہم نے دیکھا کہ اب جو کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے، اپنے لیے گھات میں ایک انگارا پاتا ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ کلام خود بھی اِس بے ہودہ الزام کی تردید کر رہا ہے اور جن کے حوالے سے لگایا جا رہا ہے، وہ بھی تردید کر رہے ہیں۔

۱۹۹ یہ خطاب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اِس سے مقصود اُنھی منکرین کو متنبہ کرنا ہے جو پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود اپنے شرک پر اصرار کر رہے تھے۔

۲۰۰ اِس لیے کہ تمھاری خیر خواہی کے سب سے زیادہ حق دار بھی وہی ہیں اور اہل عرب کی مذہبی اور سیاسی پیشوائی کا منصب بھی اُنھی کو حاصل ہے۔ لہٰذا متنبہ ہو گئے تو پوری قوم کے لیے خدا کے عذاب سے بچنے کی راہ نکل آئے گی۔

۲۰۱ یہ ہدایت اِس لیے فرمائی ہے کہ یہ لوگ زیادہ تر غربا تھے اور قریش کے اکابر ہر وقت

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢١٦﴾ وَتَوَكَّلْ
عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٢١٧﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٢١٨﴾ وَتَقَلُّبَكَ
فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿٢١٩﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٢٢٠﴾

لیکن تمھارے خاندان کے یہ لوگ اگر (اِس کے باوجود) تمھاری بات نہ مانیں تو اِنھیں صاف صاف بتا دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، میں اُس سے بری ہوں، اور (اپنی دعوت کے اِس مرحلے میں)[۲۰۲] اُس عزیز و رحیم پر بھروسا رکھو جو تمھیں اُس وقت دیکھتا ہے، جب تم رات میں تہجد کے لیے اٹھتے ہو اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان تمھارے آنے اور جانے کو دیکھتا ہے۔[۲۰۳] بے شک، وہ سمیع و علیم ہے۔ ۲۱۶-۲۲۰

اِن کی تحقیر کے درپے رہتے تھے۔ چنانچہ اندیشہ تھا کہ کہیں دل شکستہ ہو کر ایمان کے منافی کوئی کام نہ کر بیٹھیں۔ چنانچہ دونے التفات کے مستحق تھے۔

۲۰۲ یعنی جب تمھارے لیے ہجرت اور تمھارے مکذبین کے لیے عذاب کا مرحلہ قریب آ رہا ہے۔ یہ مرحلہ چونکہ پیغمبر کے لیے نہایت کٹھن ہوتا ہے، اِس لیے آگے ہدایت فرمائی ہے کہ اِس میں اُس پروردگار پر بھروسا رکھو جو عزیز ہے، لہٰذا عذاب کا فیصلہ کرے گا تو کوئی اُس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہوگا اور اپنے بندوں کے لیے رحیم و شفیق بھی ہے، لہٰذا اُنھیں بھی لازماً نوازے گا اور کوئی اُس میں رکاوٹ نہ بن سکے گا۔

۲۰۳ یعنی غایت درجہ التفات کے ساتھ دیکھتا ہے۔ یہ اُس آمد و شد کی طرف اشارہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو دعا و مناجات میں مشغول دیکھنے کے لیے اُن کے درمیان رکھتے تھے۔ اہل ذوق اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی شب خیزی، فکرمندی اور ذکر و عبادت میں مشغولیت کی یہ کس قدر دل نواز انداز میں تحسین ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے 'حِيْنَ تَقُوْمُ' کے معنی بھی واضح ہو

هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ عَلٰی مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيۡنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ وَاَكۡثَرُهُمۡ كٰذِبُوۡنَ ﴿۲۲۳﴾

(لوگو، یہ وہ پاکیزہ ہستی ہے جس کے بارے میں تم کہتے ہو کہ اُس پر شیاطین اترتے ہیں)۔ تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں؟ وہ ہر لپاٹیے بدکار پر اترتے ہیں۔ وہ (اُن کی طرف) کان لگاتے ہیں (کہ غیب سے کچھ سن رہے ہیں)[۲۰۴]،

جاتے ہیں کہ یہ فی الواقع آپ کا نماز تہجد ہی کے لیے اٹھنا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خود شب کی دعا و مناجات کا اہتمام فرماتے تھے، اُسی طرح اپنے صحابہ کو بھی اِس کی تاکید فرماتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپ مسجد میں جا کر یہ روح پرور منظر دیکھتے بھی تھے کہ لوگ دعا و عبادت میں مشغول ہیں۔ اوپر آیت ۲۱۵ میں آپ کو مومنین کے باب میں یہ ہدایت جو فرمائی گئی کہ اُن کو اپنی شفقت کے بازوؤں کے نیچے رکھو، یہ بھی اُسی کا ایک پہلو ہے کہ آپ کی طرح آپ کے ساتھی بھی پوری طرح چوکنے اور بیدار رہیں۔ انجیلوں میں سیدنا مسیح کے بارے میں بھی آتا ہے کہ جب آزمایش کا آخری مرحلہ آیا ہے تو وہ ایک پہاڑی پر جا کر دعا میں مشغول ہو گئے اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت فرمائی کہ وہ جاگیں اور دعا کریں کہ فتنے میں نہ پڑیں۔ پھر وہ بار بار اپنے شاگردوں کے پاس یہ دیکھنے کے لیے آئے کہ وہ دعا کر رہے ہیں یا نہیں۔ شاگرد سو جاتے تو وہ اُن کو بار بار جگاتے کہ دعا کرو تا کہ فتنے سے محفوظ رہو۔'' (تدبر قرآن ۵/۵۶۴)

۲۰۴؎ یہ اُن کاہنوں کی تصویر ہے جو اُس زمانے کے عرب میں اکثر دیکھے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں کے متصوفین اور عاملوں کی تصویر بھی اِس سے مختلف نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اِن کی پہلی صفت یہ بتائی ہے کہ یہ 'اَفَّاك' یعنی بالکل لاغی، دروغ باف اور لپاٹیے ہوتے ہیں۔ یہ سادہ لوحوں کو بے وقوف بنانے کے لیے طرح طرح کے جھوٹ گھڑتے ہیں اور پھر اِس دعوے کے ساتھ اُن کو پیش کرتے ہیں کہ یہ باتیں اِن پر غیب سے القا ہوئی ہیں۔

وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾

مگر اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔[۲۰۵] ۲۲۱-۲۲۳

(اور کہتے ہو کہ وہ بھی گویا ایک شاعر ہے،[۲۰۶] جب کہ) شاعروں کے پیچھے تو بہکے ہوئے

اِن کی دوسری صفت 'اَثِیۡم' بیان ہوئی ہے، یعنی اخلاقی اعتبار سے یہ ہر قسم کے گناہوں میں آلودہ ہیں۔ آخر میں اِن کے اُس بھگل کی تصویر پیش کی گئی ہے جو عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ لوگ اختیار کرتے تھے۔ اِن لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ احمق لوگ جب کسی معاملے میں غیب کی باتیں معلوم کرنے کے لیے اِن سے رجوع کرتے تو یہ لوگ کچھ عملیات سفلیہ کے ساتھ مراقبہ کرتے اور پھر ایک مقفّٰی کلام کی صورت میں (جو اکثر بالکل بے معنی یا ذو معانی ہوتا)، اپنا الہام پیش کرتے کہ یہ اِن پر غیب سے فلاں جن نے القا کیا ہے۔ اِن کے اِس مراقبے کو یہاں 'القاے سمع' سے تعبیر فرمایا ہے، اِس لیے کہ وہ مراقبے میں اِس طرح بیٹھتے گویا ہاتف غیب سے کوئی بات سننے کے لیے کان لگائے ہوئے ہیں۔”

(تدبر قرآن ۵/۵۶۵)

۲۰۵؎ یعنی بعض تو فی الواقع اپنے عملیات سفلیہ کے ذریعے سے شیاطین جن کے ساتھ کچھ رابطہ پیدا کر لیتے اور اُن سے الہام پاتے ہیں، لیکن اکثر اپنے اِس پیشۂ کہانت میں بھی سچے نہیں ہوتے، محض عوام فریبی کے لیے اپنے آپ کو کاہن بنا کر پیش کرتے اور غیب دانی کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔

۲۰۶؎ یہ بات وہ اِس معنی میں کہتے تھے کہ جو بلاغت و جزالت اِن کے کلام میں دیکھ رہے ہو، وہ اُسی طرح کی بلاغت و جزالت ہے جو ہمارے شاعروں کے کلام میں بھی ہوتی ہے، خاص طور پر اُن بڑے شاعروں کے کلام میں جن کے ساتھ جنات ہوتے ہیں جو اُنھیں شعر الہام کرتے ہیں۔ اِسے آں سوے افلاک کی کوئی چیز قرار دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ لا اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

لوگ چلا کرتے ہیں[۲۰۷]۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں[۲۰۸] اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں[۲۰۹]؟ اِس سے وہی مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے

۲۰۷؎ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے تقابل میں فرمایا ہے کہ شاعروں کے پیرو تو سیرت و کردار کے لحاظ سے ایسے مہ و آفتاب اور سجدوں میں راتیں بسر کرنے والے نہیں ہوتے۔ تم شاعروں کو بھی جانتے ہو اور اُن کے پیرووں کو بھی۔ اُن میں سے تو ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر اوباش، گم راہ، دین و اخلاق کی بندشوں سے آزاد اور جذبات و خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔ کیا اندھے ہو گئے ہو کہ اِن دونوں گروہوں کا یہ کھلا کھلا فرق و امتیاز بھی دیکھ نہیں پاتے ہو؟

۲۰۸؎ یہ قرآن کے تقابل میں فرمایا ہے کہ اُسے شاعری کہتے ہو؟ کہاں اُس کی ہم رنگی و ہم آہنگی کہ ہر آیت اپنے معین ہدف اور طے شدہ مقصد کے تحت صادر ہوتی ہے، اُس میں کسی جگہ کوئی تضاد و تخالف نہیں ہوتا، اُس کے مضامین باہم مربوط، نہایت جچے تلے، دو ٹوک، سراسر دانش و حکمت اور ہر جگہ اپنے اندر راستی، حق اور خیر و صلاح کی دعوت لیے ہوئے ہوتے ہیں، اور کہاں تمھارے شاعر کہ بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں:

> ”... جو وارِدہ دل پر گزر گیا، اگر اُس کو ادا کرنے کے لیے اُن کو کوئی اچھوتا اسلوب ہاتھ آ گیا تو اُس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیں گے۔ اِس سے بحث نہیں کہ وہ رحمانی ہے یا شیطانی، روحانی ہے یا نفسانی، اُس سے خیر کی تحریک ہو گی یا شر کی۔ اُن کے اشعار پڑھیے تو ایک شعر سے معلوم ہو گا کہ ولی ہیں، دوسرے شعر سے معلوم ہو گا کہ شیطان ہیں۔ ایک ہی سانس میں وہ نیکی اور بدی، دونوں کی باتیں بے تکلف کہتے ہیں اور چونکہ اچھوتے اور موثر اسلوب میں کہتے ہیں، اِس وجہ سے پڑھنے والے دونوں سے متاثر تو ہوتے ہیں، لیکن نفس کو زیادہ مرغوب چونکہ بدی کی باتیں ہیں، اِس وجہ سے اُس کے نقوش تو دلوں پر قائم رہ جاتے ہیں، نیکی کا اثر غائب ہو جاتا ہے

وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

نیک عمل کیے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور اُسی وقت بدلہ لیا، جب اُن پر ظلم کیا گیا[۲۱۰] ـــــ اور یہ ظلم کرنے والے، اِنھیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ اِن کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے۔ ۲۲۴-۲۲۷

اور اِس طرح اگر اُن کے کلام میں کچھ افادیت ہوتی بھی ہے تو وہ اُن کے تضادِ فکر میں غائب ہو جاتی ہے ـــــ جھاڑ جھنکاڑ کے جنگل میں اگر کچھ صالح پودے بھی لگا دیے جائیں تو وہ مثمر نہیں ہوتے۔'' (تدبرِ قرآن ۵/۵۶۷)

۲۰۹ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقابل میں فرمایا ہے کہ کہاں وہ قدسی صفات ہستی جس کا کلام اُس کی شخصیت میں مجسم ہو گیا ہے اور کہاں یہ گفتار کے غازی جو تمھارے شاعر ہیں ـــــ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ اِنھیں شعروں میں دیکھیے تو رستم و سہراب بھی ہوں گے اور قیس و فرہاد بھی، لیکن اِن کی یہ رزم و بزم، سب خیالی ہوتی ہے۔ چنانچہ مکارمِ اخلاق کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہوں گے، مگر اپنے آپ کو اُن کی ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔ زہد و تصوف کے لطائف و حقائق بیان کریں گے، مگر حال وہی ہو گا کہ ـــــ پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔

۲۱۰ یہ اُن شاعروں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔ فرمایا کہ جس کو شاعر سمجھ رہے ہو، یہ اُس کی دعوت پر ایمان کا اثر ہے کہ وہی گفتار کے غازی اب صرف گفتار کے غازی نہیں رہے، بلکہ تقویٰ اور عملِ صالح کی دولت سے بھی بہرہ مند ہو گئے ہیں، عشق و ہوس اور مفاخر و مطاعن کے بجائے اب اُن کی شاعری میں زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر ہوتا ہے اور کسی کے بارے میں کچھ کہتے بھی ہیں تو حق کی مدافعت میں اور اُسی وقت کہتے ہیں، جب اُنھیں یا اُن کے ساتھیوں کو ظلم و عدوان کا ہدف بنایا جاتا ہے۔

یہ استثنا اِس لیے ضروری تھا کہ شاعری بجائے خود کوئی قابلِ مذمت چیز نہیں ہے، بلکہ ایک

عطیۂ خداوندی ہے جسے اگر صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو روح کے اہتزاز اور قلب ونظر کی تطہیر کا باعث بن جاتی ہے۔

کوالالمپور
۲۱ر اکتوبر ۲۰۱۳ء

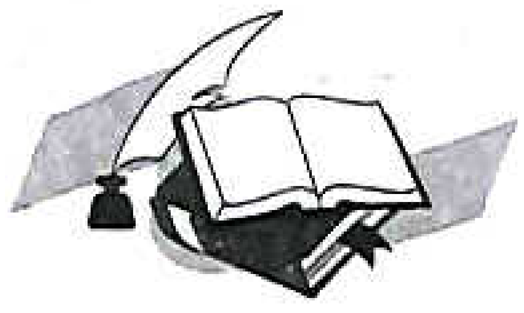

النمل - القصص

٢٧ ـــــ ٢٨

النمل - القصص

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی اور بشارت دینا اور آپ کے منکرین کو متنبہ کرنا ہے کہ آخرت سے بے خوف اور دنیا کے عیش و آرام میں مگن ہو کر وہ جس سرکشی پر اترے ہوئے ہیں، اُسے چھوڑ دیں، اپنے اوپر خدا کی نعمتوں اور عنایتوں کا شکر ادا کریں اور اپنے پیغمبر کو پہچانیں۔

دونوں سورتوں میں اصل بنائے استدلال موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت ہے۔ اِس کے علاوہ جو سرگذشتیں سنائی گئی ہیں، وہ تبعاً اِسی کے بعض پہلوؤں کی مزید وضاحت کرتی ہیں۔

اِن میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوا ہے اور قریش مکہ سے بھی، لیکن روے سخن زیادہ تر اُنھی کی طرف ہے۔

دونوں سورتوں کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب ہجرت و براءت کا مرحلہ قریب آ چکا ہے۔

سورۃ النمل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

طٰسٓ قف تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَکِتَابٍ مُّبِیْنٍ ۙ ① ھُدًی وَّبُشْرٰی
لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ ② الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ
بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ③

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ ’طٰسٓ‘ ہے۔ یہ قرآن اور ایک واضح کتاب کی آیتیں ہیں[1]، ایمان والوں کے لیے ہدایت اور بشارت[2] جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں[3] اور وہی آخرت پر فی الواقع یقین رکھتے ہیں[4]۔ ۱-۳

---

[1] یعنی ایسی کتاب کی جو حقائق کو اِس طرح واضح کر دیتی ہے کہ آپ ہی اپنی حجت بن جاتی ہے۔ اُس کی صحت وصداقت کو جانچنے کے لیے کسی خارجی شہادت یا معجزے اور نشانی کی ضرورت نہیں رہتی۔ آیت میں ’تِلْکَ‘ کا مشارالیہ ’طٰسٓ‘ ہے۔ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

[2] ہدایت کے ساتھ بشارت کا ذکر یہاں خاص طور پر اِس لیے ہوا ہے کہ آگے سورہ کے مضامین اِسی کی شہادت دے رہے ہیں۔

[3] یہ دونوں عبادات ایمان واسلام کا لازمی ظہور ہیں۔ اہل عرب کے لیے یہ کوئی اجنبی چیزیں نہیں تھیں۔ دین ابراہیمی کی ایک روایت کی حیثیت سے وہ نہ صرف یہ کہ اِن سے واقف تھے، بلکہ اُن کے صالحین اِن کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اِن کی کوئی تفصیلات بیان نہیں کی ہیں۔

[4] چنانچہ یہی چیز اُن کے ایمان لانے اور نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کرنے کا باعث بن گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ
فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ④ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي
الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ⑤ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ⑥

اِس کے برخلاف جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، اُن کے اعمال ہم نے اُن کے لیے خوش نما بنا دیے ہیں، چنانچہ بھٹکتے پھر رہے ہیں[۵]۔ یہ لوگ ہیں کہ اِن کے لیے دنیا میں بھی برا عذاب ہے[۶] اور آخرت میں بھی یہی سخت خسارے میں ہوں گے۔ (اِن کی پروا نہ کرو، اے پیغمبر)، اِس میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ قرآن تمھیں ایک حکیم و علیم کی طرف سے دیا جا رہا ہے[۷]۔ ۴-۶

---

[۵] یعنی دنیا کو مطلوب و مقصود بنا کر جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اُسی پر مطمئن ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت ... جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ جو لوگ اِسی دنیا کو مقصود و مطلوب بنا کر اپنی تمام ذہانت و قابلیت اِسی کی طلب میں لگا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال و مشاغل کو اِس طرح اُن پر مسلط کر دیتا ہے کہ پھر نہ وہ اُن کے چھوڑنے ہی پر آمادہ ہوتے اور نہ اُن سے چھوٹ ہی سکتے۔ وہ اُنھی کے اندر بھٹکتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ایک دن فرشتۂ اجل آ کر اُن کو دبوچ لیتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۵۷۷/۵)

[۶] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کے مکذبین پر اِس دنیا میں بھی لازماً عذاب آتا ہے اور یہاں اُنھی کا ذکر ہو رہا ہے۔

[۷] یعنی اُس ذات کی طرف سے دیا جا رہا ہے جس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر بھی رہتا ہے، اِس لیے مطمئن رہو، وہ تمھیں کبھی تنہا نہ چھوڑے گا، بلکہ ہر قدم پر تمھاری رہنمائی فرمائے گا اور تمھیں منزل مقصود پر پہنچائے گا۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ⑦ فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ

(اور اپنے اوپر خدا کی اِس عنایت کو سمجھنے کے لیے) وہ قصہ یاد کرو،[۸] جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے ایک آگ سی دیکھی ہے۔[۹] (تم لوگ ذرا ٹھیرو)، میں وہاں سے ابھی تمھارے پاس کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا کوئی انگارا لے کر آتا ہوں تاکہ تم اُسے تاپ سکو۔[۱۰] سو جب وہ اُس کے پاس پہنچا تو ندا آئی[۱۱] کہ

---

[۸] آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ مماثلت حضرت موسیٰ ہی کی ہے۔ چنانچہ آگے اُنھی کی سرگذشت آپ کی تسلی اور آپ کے مخاطبین کی تنبیہ کے لیے سنائی گئی ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ پیغمبری کیا ہے، یہ کیسے ملتی ہے اور اِس کے ساتھ خدا کی کیا کیا عنایتیں وابستہ ہو سکتی ہیں؟

[۹] یہ اُس وقت کا قصہ ہے، جب موسیٰ علیہ السلام مدین میں آٹھ دس سال گزارنے کے بعد اپنی بیوی کو لے کر واپس مصر جا رہے تھے۔ اپنے اِس سفر میں جب وہ مدین سے چل کر جزیرہ نماے سینا کے اُس مقام پر پہنچے جو اب کوہ سینا اور جبل موسیٰ کہلاتا ہے تو اِسی پہاڑ کے دامن میں یہ واقعہ پیش آیا۔ نزول قرآن کے زمانے میں یہ پہاڑ طور کے نام سے مشہور تھا۔

[۱۰] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سردی کا زمانہ تھا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جب موسیٰ علیہ السلام وادی طور کے پاس پہنچے تو رات ہو چکی تھی اور اُنھیں راستے کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ روشنی دیکھ کر اُنھیں خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے وہاں کچھ لوگ ہوں جن سے رہنمائی مل جائے، ورنہ آگ ہی کا کوئی انگارا لے آؤں جس سے کچھ گرمی حاصل کی جا سکے۔

[۱۱] اصل میں مجہول کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ یہ ابہام اور تفخیم کو ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی اُنھیں آواز تو سنائی دی، لیکن یہ متعین نہیں ہو سکا کہ آواز کس کی ہے اور کہاں سے آئی ہے۔

اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑧
يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑨ وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا

مبارک ہے وہ جو اِس آگ میں جلوہ فرما ہے اور وہ بھی جو اِس کے اردگرد ہیں[12]۔
اور پاک ہے اللہ، جہانوں کا پروردگار[13]۔ ۷-۸
اے موسیٰ، یہ میں ہوں اللہ، زبردست اور حکیم۔ (تم مطمئن ہو جاؤ)[14] اور اپنی

---

[12] یعنی خدا کے فرشتے۔ اِس میں 'مبارک' کے لفظ سے بیان حقیقت کے ساتھ حضرت موسیٰ کی تسلی بھی مقصود ہے کہ وہ اِس طرح کی آواز سن کر گھبرائیں نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بابرکت ذات کی آواز ہے جو اپنے بابرکت کروبیوں کے ساتھ اِس آگ کے پردے میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

[13] آگ کے اندر سے آنے والی آواز چونکہ تحدید و حلول کا تاثر پیدا کر سکتی تھی، لہٰذا تنزیہہ کے لیے فرمایا ہے کہ متنبہ رہو، تمام محدودیتوں اور تمام عیوب و نقائص سے پاک ہوتے ہوئے، یہ اُسی کی تجلی ہے جو تمھیں نظر آئی ہے اور وہ تمام عالم کا پروردگار ہے، اِس لیے جس وقت اور جس طریقے سے چاہے، اپنے بندوں سے مخاطب ہو سکتا ہے۔

[14] آیت میں عزیز و حکیم کی صفات کا حوالہ یہی اطمینان دلانے کے لیے آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... یہاں 'عَزِیْز' کے ساتھ 'حَکِیْم' کی صفت آئی ہے جس سے مقصود اِس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جس ذات نے تم کو اِس وقت خطاب و کلام سے مشرف فرمایا ہے، وہ ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے، کوئی اُس کے کسی ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا اور ساتھ ہی وہ حکیم ہے، اُس کا ہر ارادہ حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اور اسلوب کلام چونکہ حصر در حصر کا ہے، اِس وجہ سے اِس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ میرے مقابل میں کسی اور کے زور و اقتدار یا میری حکمت و مصلحت کے مقابل میں کسی اور کی حکمت و مصلحت کے تصور کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۵/۵۸۱)

رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ قف
اِنِّیْ لَا يَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۖۗ ⑩ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًاۢ
بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑪
وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِیْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ قف فِیْ تِسْعِ

لاٹھی (زمین پر) ڈال دو۔ پھر جب موسیٰ نے اُس کو دیکھا کہ وہ اِس طرح بل کھا رہی ہے، گویا وہ سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ ارشاد ہوا: اے موسیٰ، ڈرو نہیں، میرے حضور پیغمبر ڈرا نہیں کرتے[۱۵]۔ ہاں مگر جو برائی کے مرتکب ہوں، پھر برائی کے بعد وہ اُسے بھلائی سے بدل دیں تو (اُن کے لیے) میں بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہوں[۱۶]۔ ۹-۱۱

اور اپنا ہاتھ ذرا اپنے گریبان میں ڈالو، وہ بغیر کسی بیماری کے[۱۷] سفید ہو کر نکلے گا۔ (یہ

---

[۱۵] یہ تسلی کا نہایت دل نواز اسلوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نبوت کے منصب پر فائز کیے جا رہے ہو اور اِس منصب کے حاملین میری حفاظت میں ہوتے ہیں۔ اُنھیں اِس طرح کی چیزیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتیں، اِس لیے بے خوف اور مطمئن ہو جاؤ۔

[۱۶] یہ استثنا اِس بات کا قرینہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا ذہن اِس موقع پر غالباً قبطی کے قتل کے واقعے کی طرف منتقل ہوا ہے کہ مجھ سے ایک غلطی ہو چکی ہے، یہ کہیں اُسی کا خمیازہ نہ ہو۔ چنانچہ مزید تسلی کے لیے فرمایا ہے کہ توبہ و اصلاح سے تم اُس کی تلافی کر چکے ہو اور میں بڑا غفور و رحیم ہوں، اِس لیے ایسا کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس بات کو یہاں عام صیغے میں فرما کر اِس کے فیض کو ہمہ گیر کر دیا ہے کہ یہ معاملہ کچھ تمھارے ہی لیے خاص نہیں ہے، بلکہ میں اپنے ہر بندے کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہوں۔“
>
> (تدبر قرآن ۵/۵۸۳)

اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ
اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ﴿۱۳﴾ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ
اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ

دونوں مل کر نو نشانیاں ہیں جو ہم تمھیں دے رہے ہیں۔ اِن) نو نشانیوں کے جلو میں[۱۸] تم فرعون اور اُس کی قوم کے پاس جاؤ، وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔ پھر جب ہماری یہ آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں اُن کے سامنے آئیں تو اُنھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ اُنھوں نے ظلم اور گھمنڈ کے باعث اِن کا انکار کیا، دراں حالیکہ اُن کے دل اِن نشانیوں کو تسلیم کر چکے تھے۔ سو دیکھو، اِن مفسدوں کا انجام کیا ہوا![۱۹] ۱۲-۱۴

اِس کے برخلاف ہم نے داؤد اور سلیمان کو بڑا علم[۲۰] عطا فرمایا تھا، (مگر وہ

---

[۱۷] یہ اضافہ صاف واضح کر رہا ہے کہ یہاں بائیبل کی تردید مقصود ہے جس میں ہاتھ کی سفیدی کو برص بتایا گیا ہے۔

[۱۸] قرآن کے دوسرے مقامات میں اِن نشانیوں کی تفصیل ہے۔ یہ گویا ایک پوری میگزین تھی جو فرعون کے پاس جانے کے لیے حضرت موسیٰ کو ابتدا ہی میں دے دی گئی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک منتقم و جبار اور سرکش بادشاہ کی طرف رسول بنا کر بھیجے جا رہے تھے جو آسانی کے ساتھ اُن کی کوئی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

[۱۹] یہ وہ اصل مدعا ہے جس کے لیے یہ سرگذشت سنائی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے مخاطبین کے انکار کا سبب سمجھ لیں اور اُن کے رویے سے دل برداشتہ نہ ہوں۔

[۲۰] اِس سے مراد وہ حکمت و معرفت بھی ہے جو براہ راست اُنھیں عطا ہوئی اور نفس اور

فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِہِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵﴾
وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ
الطَّیْرِ وَاُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۶﴾

ہمارے حضور میں جھکتے ہی چلے گئے) اور اُنھوں نے کہا: شکر ہے اللہ کے لیے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے[۲۱]۔ ۱۵

اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا[۲۲] اور اُس نے بھی کہا: لوگو، ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے[۲۳] اور دوسری ہر طرح کی چیزیں بھی دی گئی ہیں۔ بے شک، یہ خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔ ۱۶

مادہ میں تصرفات کا وہ علم بھی جو اُن کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کو عطا کیا گیا جس کا ذکر آگے ہوا ہے۔ یہی دوسرا علم ہے جس کی بدولت وہ اُس زمانے کی سب سے عظیم اور سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت قائم کر دینے میں کامیاب ہوئے تھے۔

[۲۱] یعنی فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر کی طرح نہ اپنی برتری کے زعم میں مبتلا ہوئے، نہ ظلم اور گھمنڈ اختیار کیا، بلکہ اُس عزت و فضیلت پر سراپا شکر و سپاس ہو کر جیے جو اُنھیں خدا کے باایمان بندوں میں حاصل ہوئی۔

آیت میں خاص طور پر باایمان بندوں میں عزت و فضیلت کا ذکر اِس لیے ہوا ہے کہ اصل عزت و فضیلت ایمان ہی کی عزت و فضیلت ہے۔

[۲۲] داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبر اور بادشاہ تھے۔ اُن کے بیٹے حضرت سلیمان اِسی حیثیت سے اُن کے وارث ہوئے۔ اُن کی سلطنت فلسطین اور شرق اردن سے لے کر شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت سلیمان کا زمانۂ سلطنت ۹۶۵ ق م سے لے کر ۹۲۶ ق م تک ہے۔

[۲۳] بنی اسرائیل کی روایات میں بھی اِس کا ذکر ہوا ہے کہ حضرت سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے جہاں دوسری بہت سی قوتیں دی تھیں، وہاں پرندوں کی بولی کا بھی خاص علم عطا فرمایا تھا اور اپنے اِس علم کی بنا پر وہ اُن کی تربیت کر کے اپنی فوج میں اُن سے نامہ بری، خبر رسانی اور سراغ رسانی وغیرہ

کے کام لیتے تھے۔ اِس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ پرندوں کے اندر بھی کسی نہ کسی درجے میں نطق و ادراک کی صلاحیت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اگر ہم اُن کے نطق کو نہیں سمجھتے تو ہمارا نہ سمجھنا اُس کی نفی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن میں صاف تصریح ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے، لیکن ہم اُس کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اِسی طرح قرآن میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ جتنے بھی چرند پرند ہیں، سب ہماری ہی طرح الگ الگ امتیں ہیں... حضرت سلیمان کو تو پرندوں کی بولی کا خاص علم عطا ہوا تھا، جن کو یہ علم نہیں ملا ہے، وہ بھی یہ جانتے ہیں کہ جتنے بھی حیوانات ہیں، سب اپنی نفرت، محبت، عتاب، التفات، خوشی، غم، فکرمندی، طمانیت، استمالت، ملاعبت اور اپنے دوسرے جذبات کی تعبیر کے لیے الگ الگ بولیاں بھی اختیار کرتے ہیں اور اُن کے اظہار کے لیے اُن کی ادائیں اور حرکتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ جو لوگ کسی مقصد خاص کے لیے اِن جانوروں کی تربیت کرتے ہیں، وہ اِن کی آوازوں اور اشارات کو اُسی طرح سمجھتے ہیں، جس طرح اپنے ہم جنسوں کی بولی اور اُن کے اشارات کو سمجھتے ہیں۔ پھر اِن سے بھی زیادہ اُن لوگوں کا علم ہے جنھوں نے سائنٹیفک طریقے پر اِن حیوانات کا تجربہ و مشاہدہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے علمی تجربہ و مشاہدہ سے جو معلومات فراہم کی ہیں، اُن کو پڑھیے تو انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ بڑے جانور تو درکنار ننھی سی چیونٹی کے اندر بھی قدرت نے جو دانش و بینش، جو زیرکی و ہوشیاری اور جو فہم و فراست ودیعت فرمائی ہے، وہ ایسی ہے کہ اُس سے انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ آج کتوں سے سراغ رسانی اور جاسوسی کے سلسلے میں جو کام لیے جا رہے ہیں، کیا وہ کم حیرت انگیز ہیں! جب انسان اپنے تجربات اور اپنی تجرباتی سائنس کے ذریعے سے جانوروں کے اتنے اسرار دریافت کر سکتا ہے اور اُن سے یہ کچھ کام لے سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اگر حضرت سلیمان کو پرندوں کی بولی کا خاص علم دے دیا تو اِس میں تعجب کی کیا بات ہے! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بولی درحقیقت آوازوں ہی کی ترکیب و تالیف سے وجود میں آتی ہے۔ جو چیزیں ادراک و شعور اور جذبات رکھتی ہیں، وہ اپنے ادراک و شعور اور جذبات کی تعبیر کے لیے مختلف قسم کی آوازیں نکالتی ہیں اور اُنھی کی تالیف و ترکیب سے بولی وجود میں آتی ہے۔ اشارات بھی اِسی میں داخل ہیں، اُن کو غیر ناطق زبان سمجھیے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۵۹۲)

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ
يُوْزَعُوْنَ ⑰ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا
النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا
يَشْعُرُوْنَ ⑱ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ

(چنانچہ ایک دن ایسا ہوا کہ) جنوں اور انسانوں اور پرندوں میں سے سلیمان کے سارے لشکر اُس کے ملاحظے کے لیے جمع کیے گئے[۲۴]، اِس لیے کہ اُن کی درجہ بندی کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ (مارچ کرتے ہوئے) جب وہ چیونٹیوں کی وادی[۲۵] میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو، اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور اُس کے لشکر تمھیں کچل نہ ڈالیں اور اُنھیں اِس کا احساس بھی نہ ہو[۲۶]۔ (سلیمان نے

---

[۲۴] اِس جملے میں ایک مضاف عربیت کے قاعدے سے محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

[۲۵] یعنی جس میں چیونٹیاں بہت تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ چیونٹیوں کی اِسی کثرت کے باعث اُسے وادی النمل کہا جاتا ہو۔ اِس وادی کا یہ قصہ بنی اسرائیل کی روایتوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

[۲۶] بعض چیونٹیاں آواز بھی نکالتی ہیں۔ آیت سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ غالباً اِسی قسم کی چیونٹیاں تھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”چیونٹیوں کے متعلق سائنس نے جو حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں، اُس سے قطع نظر ایک عام آدمی بھی اگر اُن کے کسی بڑے دَل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے دیکھے تو اُن کے عسکری نظام اور فوجی ڈسپلن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ پوری فوج ایک قائد کی قیادت میں مارچ کر رہی ہے۔ دَل کے دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اُن کے رضا کاروں اور اسکاؤٹوں کی لائن ہوتی ہے جو اپنے معین حدود

اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِيۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنۡ اَعۡمَلَ

یہ سنا) تو اُس کی بات سے خوش ہو کر وہ مسکرایا[۲۷] اور بولا: اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیرے فضل کا شکرگزار رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا

کے اندر برابر تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ وہ نگرانی کی ڈیوٹی پر مامور ہیں۔ جوں ہی اُن کو کسی خطرے کا احساس ہوتا ہے، وہ اپنے حدود کے اندر اُس سے دَل کو آگاہ کرتے ہیں اور دَل اپنے آپ کو اس سے بچانے کی تدبیر اختیار کرتا ہے۔ وہ منظر اُن کا خاص طور پر دیدنی ہوتا ہے، جب اُن کا کوئی قبیلہ مستقل طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام کے لیے اپنے تمام غذائی ذخائر اور اپنے تمام اولاد و احفاد کے ساتھ ہجرت کرتا ہے۔ میں نے بعض مرتبہ اُن کی اِس مہاجرت کا غور سے مشاہدہ کیا ہے۔ اگر میں اِن مشاہدات کو قلم بند کروں تو ایک طویل داستان بن جائے۔

چیونٹیوں کے یہ کارنامے تو ہما وشما کو بھی نظر آتے ہیں، لیکن سائنس دانوں نے اُن کے جن عجائب کا انکشاف کیا ہے، اُن کے بعد تو اِس امر میں کسی شبہے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ وہ بھی، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے، ہماری ہی طرح امتیں ہیں۔ اُن کی بعض قسمیں ہماری ہی طرح بعض جانوروں کو پالتی ہیں اور اُن کو اپنے اغراض و ضروریات کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ اپنے لیے کھیت بناتی اور اُن میں بیج بوتی ہیں اور جب فصل تیار ہوتی ہے تو دِرَو کے بعد اُس کو تہ خانوں میں محفوظ کر دیتی ہیں۔ اِن کی باقاعدہ فوج بھی ہوتی ہے جو مخصوص افسروں کی کمان میں دشمن پر حملہ آور ہوتی ہے۔ اِن کے ہاں تربیت اور ٹریننگ کا باقاعدہ نظام ہے۔ غرض وہ ساری خصوصیات اُن کے اندر بھی پائی جاتی ہیں جو انسانوں کے اندر پائی جاتی ہیں، بس صرف شکل و صورت اور درجہ و مرتبہ کا فرق ہے۔" (تدبر قرآن ۵/ ۵۹۴)

[۲۷] اصل الفاظ ہیں: 'فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا'۔ اِن میں 'ضَحِك' خوشی اور ابتہاج و سرور کے مفہوم میں ہے اور عربی زبان میں یہ اِس مفہوم میں آتا ہے۔

صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٩﴾
وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ
الْغَآئِبِيْنَ ﴿٢٠﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ
بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢١﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ

ہے اور ایسے اچھے کام کروں جو تجھے پسند ہوں اور اپنی رحمت سے، (اے پروردگار)، تو مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل کر لے۔[۲۸] ۱۷-۱۹

(اِسی موقع پر) سلیمان نے اپنے لشکر کے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا: کیا بات ہے، میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ موجود ہے[۲۹] یا کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اُس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح ہی کر ڈالوں گا یا (اپنی اِس غیر حاضری کے لیے) وہ میرے سامنے کوئی واضح عذر پیش کرے گا۔[۳۰] پھر زیادہ دیر نہیں گزری کہ ہدہد آ گیا اور اُس نے عرض کیا: مجھے وہ بات معلوم ہوئی ہے جو آپ کے علم میں نہیں ہے۔[۳۱]

---

[۲۸] خدا کی عظیم اور بے مثال نعمتوں پر شکر گزاری کا یہی رویہ ہے جس کو نمایاں کرنے کے لیے حضرت سلیمان کی زندگی کے یہ واقعات قریش مکہ کو سنائے جا رہے ہیں۔

[۲۹] یہ فقرہ عربیت کے اسلوب پر اصل میں بر بنائے قرینہ محذوف ہے۔

[۳۰] ہدہد کی غیر حاضری پر حضرت سلیمان کے عتاب کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ اُن کی فوج کے پرندے بھی نظم و ضبط کے پوری طرح پابند تھے اور کسی خلاف ورزی کی صورت میں اُنھیں فوجی ضوابط کے تحت سزا بھی بھگتنی پڑتی تھی۔

[۳۱] مطلب یہ ہے کہ اگرچہ دیر سے پہنچا ہوں، لیکن یہ دیر کام ہی کے سلسلے میں ہوئی ہے۔ چنانچہ سبا کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں، میں اُس سے آگے کچھ ایسی معلومات حاصل کر کے آیا ہوں جو بالکل تازہ ہیں۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَّقِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ
وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا
يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ
فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٢٤﴾
اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

میں سبا (کے ملک[۳۲]) سے ایک یقینی خبر آپ کے پاس لایا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت اُن پر حکمرانی کر رہی ہے، اُسے ہر طرح کا ساز و سامان میسر ہے اور اُس کا بہت بڑا تخت بھی ہے[۳۳]۔ میں نے اُس کو اور اُس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سوا سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔ شیطان نے اُن کے اعمال اُن کے لیے خوش نما بنا دیے ہیں اور اُنھیں صحیح راہ سے روک دیا ہے، سو راستہ نہیں پا رہے ہیں۔ ۲۰-۲۴

(یقیناً شیطان ہی نے روک دیا ہے[۳۴]) کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو زمین اور آسمانوں

۳۲؎ سبا قدیم زمانے کی ایک دولت مند قوم تھی۔ اُسی کے نام پر یمن کے جنوب مغربی علاقے کو بھی اُس زمانے میں سبا کہا جاتا تھا۔ اُس کا دارالحکومت مارب تھا جس کے کھنڈر آج بھی اِس علاقے میں موجود ہیں۔ قوم سبا کا زمانہ ۱۱۰۰ ق م سے لے کر ۱۱۵ ق م تک ہے۔ اِس کے بعد جنوبی عرب کی ایک دوسری مشہور قوم حمیر نے اِن کی جگہ لے لی۔

۳۳؎ قدیم زمانے میں بھی ملکوں کی حکمرانی زیادہ تر مردوں ہی کے پاس رہی ہے، اِس لیے ہد ہد کا انداز کلام ایسا ہے کہ گویا اُس کے لیے یہ تعجب کی بات ہے۔ تخت کی عظمت کا ذکر بھی اِسی انداز سے ہوا ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہوں کی عظمت و جلالت اُن کے تخت و تاج میں لگے ہوئے زر و جواہر اور سونے چاندی ہی سے ناپی جاتی تھی۔

۳۴؎ یہاں سے آگے تضمین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہد ہد کی بات کے ساتھ اپنی بات کو ملا کر

وَيَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ۩ السجدة ﴿۲۶﴾
قَالَ سَنَنۡظُرُ اَصَدَقۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۲۷﴾ اِذۡهَبۡ بِّكِتٰبِىۡ
هٰذَا فَاَلۡقِهۡ اِلَيۡهِمۡ ثُمَّ تَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَانۡظُرۡ مَاذَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۲۸﴾
قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اِنِّىۡۤ اُلۡقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيۡمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنۡ
سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ﴿۳۰﴾ لا اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَىَّ

کی چھپی ہوئی چیزوں کو نکالتا ہے[۳۵] اور جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔ ۲۵-۲۶

سلیمان نے کہا: ہم ابھی دیکھے لیتے ہیں کہ تم سچے ہو یا جھوٹ بول رہے ہو۔ میرا یہ خط لے کر جاؤ اور اِسے اُن کی طرف ڈال دو، پھر اُن سے الگ ہٹ جانا، پھر دیکھنا کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں[۳۶]؟ ۲۷-۲۸

(ملکہ کو خط ملا تو) اُس نے درباریوں سے کہا: اے اہل دربار، ایک گرامی نامہ

اُسے مطابق حال کر دیا ہے۔ اِس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں، 'مَا تُخۡفُوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ' کے صیغہ ہاے خطاب ہدہد کی زبان سے بالکل ناموزوں ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی فرما سکتا ہے۔

[۳۵] یعنی آسمان میں سورج، چاند، ستارے اور زمین میں درخت، نباتات، دریا، سمندر اور چشمے وغیرہ جو پیدایش سے پہلے نہ معلوم کہاں چھپے ہوئے تھے۔

[۳۶] مطلب یہ ہے کہ خط ڈال کر فوراً واپس نہ آ جانا، بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش بھی کرنا کہ اِس خط کو پا کر وہ لوگ کیا کہتے ہیں؟

وَأْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝٣١ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ

میرے پاس ڈالا گیا ہے۔[۳۷] یہ سلیمان کی طرف سے ہے[۳۸] اور یہ اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے ہے۔[۳۹] اِس میں لکھا ہے کہ تم میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور فرماں بردار ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔[۴۰] ملکہ نے کہا: اے اہل دربار، میرے اِس معاملے

---

[۳۷] اصل میں 'کِتٰبٌ کَرِیْمٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان کی عظمت وجلالت سے وہ لوگ پوری طرح واقف تھے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہے کہ ملکہ اور اُس کے درباریوں کو خط کے ایک پرندے کے ذریعے سے ڈالے جانے پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں نامہ بری کا یہ طریقہ معلوم ومعروف تھا۔

[۳۸] یہ سلیمان علیہ السلام کے خط ہی کا پہلا جملہ ہے۔ قدیم زمانے میں سلاطین وامرا کے خطوط وفرامین اِسی طریقے سے مرسل اور مرسل الیہ کے نام سے شروع ہوتے تھے۔

[۳۹] اِس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کے ہاں بھی خطوں کی ابتدا 'بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ' کے ہم معنی کلمات ہی سے کی جاتی تھی۔ ملکہ نے خط کے اِس سرنامے کا حوالہ غالباً اِس لیے دیا ہے کہ خط جس ہستی کی طرف سے آیا ہے، درباری کوئی راے قائم کرتے ہوئے، اُس کے بارے میں متنبہ رہیں کہ وہ کوئی عام بادشاہ نہیں ہے۔

[۴۰] سورۂ مائدہ (۵) کی تفسیر میں آیت ۲۱ کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے ساتھ ہی فلسطین کا علاقہ بھی جزیرہ نماے عرب کی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی دعوت کے لیے خاص کر لیا تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ وہ اِس علاقے کو اِس کے باشندوں سے خالی کرا لیں، اِسے توحید کا مرکز بنائیں اور اِس میں کسی کافر ومشرک کو زندہ نہ چھوڑیں اور اِس کی سرحدوں سے متصل کسی علاقے میں کافروں اور مشرکوں کی کوئی حکومت بھی قائم نہ رہنے دیں، اِلّا یہ کہ وہ اُن کے باج گزار بن جائیں۔ استثنا کے باب ۲۰ میں یہ حکم پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو یہ الٹی میٹم اِسی حکم کے تحت دیا ہے۔ یہ ایک خدائی فیصلہ تھا

قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾
قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۵ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ
فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾

میں مجھے رائے دو۔ (تمھیں معلوم ہے کہ) میں کسی معاملے کا فیصلہ نہیں کرتی، جب تک تم لوگ میرے حضور میں موجود نہ ہو[۴۱]۔ ۲۹-۳۲

اُنھوں نے جواب دیا: ہم طاقت ور بھی ہیں اور اعلیٰ جنگی صلاحیت رکھنے والے بھی ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ سو دیکھ لیجیے کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں[۴۲]۔ ۳۳

جو ایک خاص علاقے میں اور پیغمبروں کی وساطت سے نافذ کیا گیا جن کی حکومت براہ راست خدا کی حکومت ہوتی ہے۔ اِس کا عام مسلمانوں اور اُن کے کسی ملک یا اُس کی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ جن اہل علم نے اِس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غیر مسلموں کو دنیا میں کسی جگہ اقتدار پر متمکن نہ رہنے دے، اُن کی رائے کسی طرح صحیح نہیں ہے*۔

[۴۱] یہ دل جوئی اور استمالت کا جملہ ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ ملکہ اگر اُن سے اختلاف بھی کرے تو اُسے وہ استبداد پر محمول نہ کریں، بلکہ ملک و قوم کی خیر خواہی کے جذبے سے اُس پر غور کریں۔ اِس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اُس کی حکومت ایک جمہوری حکومت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شخصی حکومتیں بھی، اگر وہ بالکل برخود غلط لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہوں تو اپنے اعیان و اکابر کے مشورے ہی سے فیصلے کرتی ہیں۔

[۴۲] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ درباریوں کا رجحان لڑنے ہی کی طرف تھا جو اُنھوں نے نہایت شایستہ طریقے سے ظاہر کر دیا ہے۔

---

* اِس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ہماری کتاب ''مقامات'' میں مضمون: ''خدا کے فیصلے''۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ
اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۳۴) وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ
فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (۳۵)
فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ
مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ (۳۶) اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ
بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۳۷)

ملکہ نے کہا: بادشاہ لوگ جب کسی بستی (کو فتح کر کے اُس) میں داخل ہوتے ہیں تو اُس کو درہم برہم اور اُس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہ لوگ بھی یہی کریں گے۔ (میری رائے ہے کہ) میں اپنی سفارت اُن کی طرف ہدیے کے ساتھ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ میرے سفیر کیا جواب لاتے ہیں[۴۳]۔ ۳۴-۳۵

پھر جب ملکہ کی سفارت سلیمان کے پاس پہنچی تو (اُن کے ہدیے دیکھ کر) سلیمان نے کہا: کیا تم لوگ مجھے یہ مال پیش کرنا چاہتے ہو! سو جو کچھ اللہ نے مجھے دے رکھا ہے، وہ اُس سے کہیں بہتر ہے جو اُس نے تمھیں دیا ہے۔ نہیں، بلکہ یہ تمھی لوگ ہو کہ اپنے ہدیوں سے خوش ہوتے ہو۔ تم اپنے بھیجنے والوں کے پاس واپس جاؤ، اب ہم اُن پر ضرور ایسے لشکر لے کر آئیں گے کہ وہ اُن کے مقابلے کی تاب نہ لا سکیں گے اور ہم اُنھیں وہاں سے اِس طرح ذلیل کر کے نکال دیں گے کہ وہ خوار ہو

---

[۴۳] یعنی اِس سے معلوم ہو جائے گا کہ 'وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ' کا جو مطالبہ حضرت سلیمان کی طرف سے کیا گیا ہے، اُس سے کچھ کم پر بھی معاملہ ہو سکتا ہے یا بالآخر وہی بات ماننا پڑے گی۔

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ
مُسْلِمِيْنَ ﴿٣٨﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ
مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿٣٩﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ

کر رہ جائیں گے[۴۴]۔ ۳۶-۳۷

(سلیمان کو اندازہ تھا کہ اب وہ آ ہی جائیں گے۔ چنانچہ) اُس نے کہا: اے اہل دربار، تم میں سے کون اُس کا تخت میرے پاس لاتا ہے، اِس سے پہلے کہ وہ لوگ مطیع و فرماں بردار ہو کر میرے پاس حاضر ہو جائیں[۴۵]؟ جنوں میں سے ایک دیو نے عرض کیا: میں اُس کو آپ کے پاس آپ کی اِس مجلس سے آپ کے اٹھنے سے پہلے حاضر کر دوں گا۔ میں اِس پر قدرت رکھتا ہوں اور امانت دار بھی ہوں[۴۶]۔ ایک شخص جس کے پاس قانون خداوندی کا علم تھا[۴۷]، (اِس پر جوش میں آ گیا اور) اُس نے

---

[۴۴] مطلب یہ ہے کہ اِس طرح کے تحائف و ہدایا تم لوگوں کو خوش کر سکتے ہیں، لیکن میں اِن کا متمنی نہیں ہوں۔ میرے الٹی میٹم کے پیچھے ایک اصولی فیصلہ ہے اور میں ہر حال میں اُس کو نافذ کروں گا۔

[۴۵] حضرت سلیمان کو اندازہ تھا کہ سفیروں کو واپس کر دینے کے بعد وہ لوگ سر تسلیم خم کر دیں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے ارادہ فرمایا کہ اُن کے آنے پر وہ اُس غیر معمولی قوت اور علم حق کی سطوت کا مظاہرہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو عطا کر رکھا تھا اور اُن کو اپنے پیچھے خدا کی طاقت کا مشاہدہ کرا دیں۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ وہ محض تسلیم و انقیاد نہیں، اِس کے ساتھ اُن کے ایمان و اسلام کے بھی خواہاں تھے۔

[۴۶] مطلب یہ ہے کہ حضور مطمئن رہیں، میں اُس میں کوئی تصرف نہیں کروں گا۔

[۴۷] یعنی کائنات میں کار فرما خدا کے قانون کا علم۔ یہ غالباً اُسی نوعیت کا کوئی علم تھا جو ہاروت و ماروت کے ذریعے سے دیا گیا۔ اِس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں آیت ۱۰۲ کے تحت کر چکے ہیں۔ دور حاضر کے سائنس دان مادے میں کار فرما قوانین کو دریافت کر کے جس طرح کے کرشمے دکھا رہے

مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ
مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ
اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ
رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾

کہا: میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اُس کو آپ کے پاس لائے دیتا ہوں۔ پھر جب سلیمان نے اُس کو اپنے سامنے رکھا ہوا دیکھا تو پکار اٹھا کہ یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر گزار ہوتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں[۴۸]۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو یہ بھی اُسی کا نقصان ہے، اِس لیے کہ میرا پروردگار بے نیاز ہے اور وہ بڑا اکرم فرمانے والا بھی ہے[۴۹]۔ ۳۸-۴۰

ہیں، زمانۂ قدیم میں اِسی طرح کے کرشمے نفسی علوم کے ماہرین نفس میں کارفرما قوانین کے ذریعے سے دکھاتے رہے ہیں۔ ہندو، بدھ، مسیحی اور مسلمان صوفیا کے تذکروں میں اِس کے واقعات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اِس پر کم سے کم اِس زمانے کے لوگوں کو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے جس کے سائنس دان ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے سے زندہ انسانوں کی آواز، تصویریں اور نقل و حرکت چشم زدن میں اُسی طرح اٹھا لاتے ہیں، جس طرح حضرت سلیمان کے دربار کا یہ شخص ملکۂ بلقیس کا تخت اٹھا لایا تھا۔

[۴۸] یہ وہ اصل مدعا ہے جس کے لیے قرآن نے یہ واقعہ سنایا ہے کہ اِس غیر معمولی قوت اور کمال علم کے باوجود سلیمان علیہ السلام کے اندر فخر و غرور کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا، بلکہ وہ مزید جھکتے چلے گئے۔

[۴۹] چنانچہ وہ رحیم و کریم اُن لوگوں کو بھی محروم نہیں کرتا جو اُس کے خلاف آمادۂ بغاوت رہتے ہیں۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٤١﴾ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿٤٢﴾ وَصَدَّهَا

سلیمان نے حکم دیا کہ اُس کو جانچنے کے لیے اُس کے تخت کی صورت بدل دو، دیکھیں وہ پہچانتی ہے یا اُنھی لوگوں میں سے ہو کے رہ جاتی ہے جو (اِس تبدیلی کے بعد اُسے) پہچان نہ پائیں۔[۵۰] سو جب وہ آ گئی تو پوچھا گیا: کیا تمھارا تخت ایسا ہی ہے؟ اُس نے کہا: گویا کہ وہی ہے۔ آپ کے یہ کمالات ہم اِس سے پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا۔[۵۱] حقیقت یہ ہے کہ (وہ مان چکی

---

[۵۰] یہ تبدیلی کیوں کی گئی؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...یہ ایک قسم کا تفنن تھا جس کے لیے اُنھوں نے اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ تخت کی ہیئت میں فی الجملہ تبدیلی کر دی جائے تا کہ ملکہ صاحبہ کے لیے اُن کا اپنا تخت ایک پہیلی بن جائے اور ہم دیکھیں کہ یہ پہیلی بوجھنے میں وہ کامیاب ہوتی ہیں یا ناکام رہ جاتی ہیں۔“
>
> (تدبر قرآن ۵/۶۰۵)

[۵۱] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کے کمال علم و حکمت سے تنہا ملکہ ہی نہیں، اُس کے وزرا و امرا بھی متاثر تھے اور پہلے سے اُن کی عظمت کے قائل ہو چکے تھے۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام کی طرف سے سر اطاعت جھکانے کا مطالبہ کیا گیا تو ملکہ نے چاہا کہ وہ براہ راست آپ سے ملے اور آپ کے کمالات کو دیکھے تا کہ جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے، اُس سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کر سکے۔ سبا کے دار الحکومت مارب سے یروشلم تک تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کا یہ سفر اِسی مقصد سے کیا گیا تھا۔

مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾
قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ
عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۬ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ

ہوتی، مگر) اُسے اُن چیزوں نے روک رکھا تھا جنھیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی۔ اِس لیے کہ وہ ایک منکر قوم سے تھی۔[۵۲] ۴۱-۴۳

اُسے کہا گیا کہ اب محل میں داخل ہو جائیے۔ پھر جب اُس نے محل (کے فرش) کو دیکھا تو سمجھی کہ گہرا پانی ہے اور اپنی پنڈلیوں سے پائنچے اٹھا لیے۔ سلیمان نے کہا: یہ تو شیشوں سے بنا ہوا محل ہے۔[۵۳] (اِس پر) وہ پکار اٹھی: میرے پروردگار، میں

۵۲؎ دنیا میں قبول حق کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے جسے قرآن نے ملکۂ سبا کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...مطلب یہ ہے کہ روایات اور قومی روابط کی زنجیریں ہر شخص آسانی سے نہیں توڑ سکتا۔ کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر حق واضح ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے ماحول کے بندھنوں میں ایسے بندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اُن سے رہائی حاصل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ صرف صاحب توفیق ہی ہوتے ہیں جو راہ کے اِن بھاری پتھروں کو ہٹانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ مشکل یوں تو ہر ایک کی راہ میں ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کو سیادت و قیادت کا منصب حاصل ہوتا ہے، اُن کے لیے یہ مشکل دوچند، بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کے بالکل ہی غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ مدعی تو وہ ہوتے ہیں لوگوں کے لیڈر ہونے کے، لیکن چلتے ہیں لوگوں کے پیچھے پیچھے۔“ (تدبر قرآن ۵/۶۰۶)

۵۳؎ یہ اُس صورت حال کی تصویر ہے جس سے ملکہ محل کے فرش پر قدم رکھتے ہی دوچار ہوئیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”معلوم ہوتا ہے محل کا فرش شیشے کی دبیز تختیوں سے بنایا گیا تھا اور اُس کے نیچے پانی بہ رہا تھا،

ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ وَ اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَیۡمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۴﴾

اپنی جان پر ظلم کرتی رہی ہوں۔ (سو لوٹتی ہوں) اور سلیمان کے ساتھ ہو کر اب میں نے اپنے آپ کو اللہ رب العٰلمین کے حوالے کر دیا ہے۔[۵۴] ۴۴

> اِس وجہ سے کوئی انجان جب فرش پر قدم رکھتا تو اُس کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا وہ کسی حوض میں اتر رہا ہے۔ ایک دیہاتی جب کسی متمدن شہر کے ایوانوں اور محلوں میں داخل ہوتا ہے تو اُس کو اِس طرح کی حیرانی بہت پیش آتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل کا حال یہ تھا کہ اُس کے اندر دیہاتی تو در کنار، ملکۂ سبا بھی ایک دیہاتی بن گئیں۔” (تدبر قرآن ۵/۶۰۶)

۵۴ مطلب یہ ہے کہ علم و معرفت اور پاکیزگی نفس کے حیرت انگیز کرشموں کے ساتھ اِس شان و شکوہ نے ملکہ کو بالکل سرافگندہ کر دیا اور اُس نے شرک و بت پرستی سے توبہ کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت سلیمان نے اِس کے بعد اُسے معزول نہیں کیا، بلکہ ملازموں سمیت واپس جانے کی اجازت دے دی۔*

سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ سبا کا یہ قصہ یہودی ربیوں کی روایات میں بھی کم و بیش اِنھی تفصیلات کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ملکہ کا تخت اٹھا منگوانے کا واقعہ، البتہ صرف قرآن میں ہے۔ تاہم اصل مدعا وہی ہے کہ اِن تمام تفصیلات سے یہ حقیقت واضح کی جائے کہ فراعنہ کے مقابل میں خدا کا یہ بندہ اِس علم و حکمت، اِس شکوہ خسروی اور ایسی بے نظیر تعمیرات کے باوجود عبدیت کا کیا جمال و کمال اپنے اندر رکھتا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> “... اِس سے معلوم ہوا کہ وہ شیش محل بھی اللہ کی ایک نشانی ہے جس کے ساتھ عبدیت و انابت اور شکر گزاری و وفاداری کا وہ جمال ہو جو حضرت سلیمان کے اندر تھا۔ اُس سے خلق کو رہنمائی ملتی ہے اور وہ آنکھوں کو خیرہ کرنے کے بجائے اُن کو بصیرت بخشتا ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو پھر وہ کبر و غرور کا ایک نشان اور ایک ظلمت خانہ ہے، اگرچہ کوئی اُس کا نام قصر ابیض (White House) ہی کیوں نہ رکھ چھوڑے۔” (تدبر قرآن ۵/۶۰۷)

---

* سلاطین اول ۱۰: ۱۳۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ
فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ
الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾
قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۭ قَالَ طٰۤئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ

البیان

النمل
۲۷

(لیکن یہ توفیق ہر شخص کو نہیں ملتی)[۵۵]۔ ہم نے ثمود[۵۶] کی طرف اُن کے بھائی صالح کو بھی اِسی دعوت کے ساتھ بھیجا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو تو ہوا یہ کہ وہ دو فریق[۵۷] بن کر آپس میں جھگڑنے لگے۔ صالح نے کہا: میری قوم کے لوگو، تم بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟[۵۸] تم اللہ سے معافی کیوں نہیں مانگتے کہ تم پر رحم کیا جائے؟ ۴۵-۴۶

اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم نے تو تم سے اور تمھارے ساتھیوں سے نحوست ہی پائی ہے[۵۹]۔ صالح نے کہا: (اِس سے ہمارا کیا تعلق)؟ تمھاری نحوست سب خدا کے

---

[۵۵] یعنی جو ملکۂ سبا کو ملی اور تمام تعصّبات کو چھوڑ کر وہ خدا کے سامنے سرافگندہ ہو گئی۔

[۵۶] عرب کی قدیم اقوام میں سے عاد کے بعد یہ دوسری قوم ہے جس نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اِن کا مسکن شمالی عرب کا وہ علاقہ ہے جسے الحجر کہا جاتا ہے۔

[۵۷] یعنی ایمان والے اور منکرین جو اِس دعوت کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

[۵۸] مطلب یہ ہے کہ اللہ سے خیر مانگنے کے بجائے عذاب و نقمت کیوں مانگ رہے ہو؟ اِس کے لیے اصل میں 'حَسَنَة' اور 'سَيِّئَة' کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی زبان میں یہ اِس طرح کے مفاہیم کے لیے بھی آتے ہیں۔

[۵۹] یہ اُن آزمایشوں کی طرف اشارہ ہے جو سنت الٰہی کے مطابق رسولوں کی بعثت کے

اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾
وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا
يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ

پاس ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ آزمائے جا رہے ہو[۶۰]۔ ۴۷

اُس کے شہر میں نو خاندان تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کسی اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتے تھے[۶۱]۔ اُنھوں نے آپس میں اللہ کی قسم کھا کر عہد کیا[۶۲] کہ ہم صالح اور اُس کے لوگوں کو رات کے وقت جا ماریں گے، پھر اُس کے وارث سے کہہ دیں گے کہ

زمانے میں خاص طور پر اِس لیے ظاہر ہوتی ہیں کہ اُن کی قوم کے اندر انابت و خشیت پیدا ہو اور وہ اُن کی دعوت کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ لیکن اِن سے فائدہ اٹھانے کے بجائے لوگوں نے بالعموم اِنھیں رسول اور اُس کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیا جو اُن کی طرف سے اُن کے معبودوں کی مخالفت کے باعث پوری قوم پر آ پڑی ہے۔

[۶۰] یعنی جو کچھ ہو رہا ہے، خدا کی تدبیر و تقدیر اور حکمت و مشیت پر مبنی ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس کو کن آزمایشوں میں مبتلا کرنا ہے اور اُس سے کیا نتیجہ نکالنا ہے۔ چنانچہ اِن کے ذریعے سے وہ تمھیں بھی دیکھ رہا ہے کہ تمھارے اندر کچھ جان باقی ہے یا بالکل ہی مردہ ہو چکے ہو۔ یہ ہماری نحوست کے سبب سے نہیں ہے۔

[۶۱] مطلب یہ ہے کہ ایک طرف صالح اور اُن کے چند ساتھی اور دوسری طرف مفسدین کے نو جتھے تھے۔

[۶۲] اصل الفاظ ہیں: ’قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ‘۔ اِن میں ’تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ‘ ہمارے نزدیک بدل کے محل میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا
وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ
اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

اُس کے آدمی کی ہلاکت کے وقت ہم موجود نہیں تھے اور ہم بالکل سچے ہیں[۶۳]۔ اُنھوں نے بھی تدبیر کی اور ہم نے بھی ایک تدبیر کی اور اُن کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ پھر دیکھو کہ اُن کی تدبیر کا انجام کیا ہوا کہ ہم نے اُن کو اور اُن کی پوری قوم کو ہلاک کر مارا۔ سو یہ ہیں اُن کے گھر، ویران پڑے ہوئے[۶۴]، اِس لیے کہ اُنھوں نے اپنی جان پر ظلم کیا تھا۔ اِس میں اُن لوگوں کے لیے یقیناً ایک سبق ہے جو جاننا چاہیں[۶۵]۔ اور اُن سب لوگوں کو ہم نے بچا لیا جو (اُن میں سے) ایمان لے آئے تھے اور خدا سے ڈرتے تھے۔ ۴۸-۵۳

---

[۶۳] یہ تدبیر اِس لیے کی گئی کہ قبائلی زندگی میں اِس طرح کے قتل سے ایک لامتناہی جنگ چھڑ سکتی تھی۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں بھی قریش کے سرداروں نے اِسی طرح کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ آپ کا خاندان کسی ایک قبیلے کو ملزم نہ ٹھیرا سکے اور اُن کے لیے قصاص لینا ناممکن ہو جائے۔

[۶۴] یعنی اپنی داستان عبرت سنانے کے لیے تمھارے سامنے موجود ہیں۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ قریش کے قافلے اُن کے تباہ شدہ آثار پر سے گزرتے رہتے تھے۔

[۶۵] اصل الفاظ ہیں: 'لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ'۔ اِن میں فعل ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (٥٤)
اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تَجْهَلُوْنَ (٥٥) فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ
مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (٥٦) فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا

اور لوط[٦٦] کو بھی اِسی دعوت کے ساتھ بھیجا تھا، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم کھلی آنکھوں دیکھتے یہ بدکاری کرتے ہو؟ (تم پر افسوس)، کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو؟[٦٧] (حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل اوندھے)، بلکہ تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔[٦٨] مگر اُس کی قوم نے جواب دیا تو یہ دیا کہ لوط کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ لوگ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔[٦٩] سو ہم نے اُسے اور اُس کے

---

[٦٦] یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اِن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔

[٦٧] یہ استفہام حیرت، کراہت اور تعجب کے اظہار کے لیے ہے کہ ایک جائز اور فطری چیز کے ہوتے ہوئے یہ تم کس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کر رہے ہو۔

[٦٨] یعنی خواہشات نفس سے مغلوب ہو کر بالکل ہی عقل و ہوش کھو بیٹھے ہو۔

[٦٩] یہ کسی معاشرے کے بگاڑ کی آخری حد ہے جس تک پہنچ جانے کے بعد برائی تہذیب اور فیشن کا تقاضا اور نیکی باعث طعن بن جاتی ہے۔ لوگ یہ جاننے کے باوجود کہ پاکیزگی کیا ہے، اُسے اپنے اندر برداشت نہیں کرتے اور اُس کے علم برداروں کو اپنی بستیوں سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں تاکہ جس طرح اُنھوں نے کپڑے اتار دیے ہیں، باقی سب بھی ننگے ہو جائیں اور کوئی یہ احساس دلانے والا نہ ہو کہ لباس بھی کوئی چیز ہوتی ہے جسے انسان کبھی پہنا کرتے تھے۔

اِمْرَاَتَهٗ ؗ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ
فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٥٨﴾
قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ
آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؕ ﴿٥٩﴾

گھر والوں کو بچا لیا، اُس کی بیوی کے سوا، اُسے ہم نے پیچھے رہ جانے والوں میں شمار کر رکھا تھا۔[۷۰] اور اُس کی قوم پر (پتھروں کی) ایک ہول ناک بارش برسا دی۔ پھر کیا ہی بری تھی وہ بارش اُن لوگوں کے لیے جنھیں آگاہ کر دیا گیا تھا۔[۷۱] ۵۷-۵۸

اِن سے کہو، (اے پیغمبر) کہ شکر اللہ ہی کے لیے ہے (جس نے اپنی یہ شانیں دکھائی ہیں) اور اُس کے اُن بندوں پر سلامتی جن کو اُس نے (اپنی عدالت کے ظہور کے لیے) منتخب فرمایا۔ کیا وہ اللہ بہتر ہے یا اِن کے معبود جنھیں یہ اُس کے شریک ٹھیراتے ہیں؟[۷۲] ۵۹

---

[۷۰] یعنی خاص طور پر تاک رکھا تھا کہ پیغمبر کے گھر میں ہوتے ہوئے جب یہ اِسی بدکار قوم کے ساتھ ہے تو اِس کا انجام بھی اِنھی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ خدا کے بے لاگ انصاف کا اظہار ہے۔ لوط علیہ السلام کی بیوی کے لیے پیغمبر کی بیوی ہونا کچھ بھی نافع نہیں ہوا۔ حضرت نوح کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے باپ کی طرح وہ بھی اُسی انجام کو پہنچ گئی جو اُس کی قوم کے لیے مقرر ہو چکا تھا۔

[۷۱] یعنی جن پر خدا کے ایک رسول کی طرف سے اتمام حجت کر دیا گیا تھا اور اب وہ کوئی عذر پیش نہیں کر سکتے تھے۔

[۷۲] یہ آیت پیچھے کے مضمون پر تبصرہ بھی ہے اور نہایت خوب صورت گریز بھی جس نے آگے کے مضمون کے لیے تمہید استوار کر دی ہے۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ
فَأَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿٦٠﴾

کیا[۳؎] یہ بہتر ہیں یا وہ (پروردگار) جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے تمھارے لیے پانی اتارا، پھر اُس سے ہم نے خوش منظر باغ اگائے، تمھارے لیے ممکن نہیں تھا کہ تم اُن کے درختوں کو اگا سکتے[۴؎]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی (اِن سب کاموں میں شریک) ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہی لوگ ہیں کہ

۳؎ یہاں سے آگے توحید پر جو خطبہ ارشاد ہوا ہے، اُس کے صحیح زور کو سمجھنے کے لیے پے در پے سوالیہ انداز میں بات کہنے کا جو اسلوب اِس خطبے میں اختیار کیا گیا ہے، اُس کو سمجھنا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس قسم کے سوالیہ جملوں میں مقصود استفہام اور سوال و جواب نہیں ہوتا، بلکہ افحام، اتمام حجت اور زجر و تنبیہ ہوتا ہے۔ متکلم پورے زور بیان کے ساتھ سوالیہ انداز میں حقائق کو پیش کرتا جاتا ہے اور مخاطب کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ گویا اُس کی تردید میں کچھ کہنے کے لیے کوئی گنجایش کسی کے لیے سرے سے ہے ہی نہیں۔ اِس زور بیان کے تقاضے سے اِس قسم کے جملوں میں بعض اجزاے کلام حذف کر دیے جاتے ہیں جن کو مخاطب خود سمجھ لیتا ہے یا اُس کو سمجھ لینا چاہیے۔ کلام کے اِس خلا کو متکلم کا زور کلام بھر دیتا ہے۔ خطباے جاہلیت کے کلام میں اِس حذف و ایجاز کی مثالیں بہت ہیں، لیکن قرآن کے آگے اِن کو پیش کرنا آفتاب کے آگے دیا جلانا ہے۔ اردو میں یہ اسالیب چونکہ نہیں ہیں، اِس وجہ سے ترجمے میں ہم نے کلام کے محذوفات کھول دیے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۶۲۳)

۴؎ اِس جملے میں غائب کے بجاے متکلم کا اسلوب ہے۔ اِس سے امتنان و احسان اور عنایت و ربوبیت کا اظہار مقصود ہے۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ ﴿۶۱﴾

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ

راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔[۵] ۶۰

کیا یہ بہتر ہیں یا وہ (پروردگار) جس نے زمین کو ٹھکانا بنایا[۶] اور اُس کے درمیان ندیاں بہا دیں اور اُس (کو اپنے محور پر قائم رکھنے) کے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان پردہ ڈال دیا؟[۷] کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی (اِن سب کاموں میں شریک) ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ اِن کے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۸] ۶۱

کیا یہ بہتر ہیں یا وہ (پروردگار) جو بے قرار کی دادرسی کرتا ہے، جب وہ اُسے پکارتا ہے اور اُس کے دکھ کو دور کر دیتا ہے[۹] اور (تم سے پہلوں کو ہٹاتا اور)

---

[۵] یہاں پھر غائب کا اسلوب ہو گیا ہے۔ یہ نفرت و کراہت اور اظہار حسرت پر دلیل ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، گویا بات اُن سے منہ پھیر کر فرمائی گئی ہے۔

[۶] یعنی نہایت اعلیٰ اہتمام اور نہایت غیر معمولی حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ اُسے زندگی کے موافق بنایا تاکہ وہ انسان کے لیے جاے قرار بن سکے۔

[۷] اِس سے وہ غیر مرئی دیوار مراد ہے جو بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ میٹھے اور کھاری پانی کے درمیان کھڑی کر دیتا ہے۔

[۸] یہاں پھر اظہار حسرت و افسوس کے لیے غائب کا اسلوب اختیار فرمایا ہے۔

[۹] یعنی ایسی قدرت رکھتا ہے کہ کسی کی حاجت روائی کا فیصلہ کر لیتا ہے تو جتنے کائناتی اسباب اُس کے لیے جمع کرنا ضروری ہوں، سب چشم زدن میں جمع کر کے اُس کے دکھ اور تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔

خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ (٦٢)
اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا

تم کو زمین کا وارث بنا دیتا ہے[٨٠]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی (اِن سب کاموں میں شریک) ہے؟ تم لوگ کم ہی یاددہانی حاصل کرتے ہو[٨١]۔ ٦٢

کیا یہ بہتر ہیں یا وہ (پروردگار) جو بحر و بر کی تاریکیوں میں تمھاری رہنمائی کرتا ہے[٨٢] اور جو اپنے باران رحمت سے آگے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے؟

---

٨٠ یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کے تحت ایک قوم نمایاں ہوتی، اپنا کردار ادا کرتی اور پھر دوسری کے لیے جگہ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے دنیا کے اسٹیج سے رخصت ہو جاتی ہے۔ گویا قوموں کے لیے بھی موت و حیات کا وہی قانون ہے جس کا مشاہدہ ہم افراد کی زندگی میں کرتے ہیں۔ یہ، ظاہر ہے کہ خدائی سطح کا کام ہے جسے زمین و آسمان کا خالق ہی انجام دے سکتا ہے۔

٨١ یعنی نہ اپنے اندر خدا کی نشانیوں سے سیکھتے ہو نہ قوموں کی تاریخ میں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...آیت کے دونوں ٹکڑوں ’اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ‘ اور ’يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ‘ میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تم اُن مصائب سے کوئی سبق حاصل کرتے ہو جو تمھاری انفرادی زندگیوں میں پیش آتے ہیں اور نہ اُس ردوبدل سے کوئی عبرت پکڑتے جس سے قوموں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تو جن کی یادداشت اتنی کمزور ہو، اُن کو کون سبق پڑھا سکتا ہے!“ (تدبر قرآن ٥/٦٢٦)

٨٢ یہ اُس رہنمائی کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو زمین کی مختلف علامتوں اور مہ و آفتاب اور نجوم و کواکب کے طلوع و غروب اور اُن کی گردش سے حاصل ہوتی ہے۔

بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ تَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ؕ
اَمَّنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ وَ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ
ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۶۴﴾

کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی (اِن سب کاموں میں شریک) ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بہت ہی برتر ہے اُن چیزوں سے جنھیں یہ اُس کا شریک ٹھیراتے ہیں۔ ۶۳

کیا یہ بہتر ہیں یا وہ (پروردگار) جو خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اُس کا اعادہ کرے گا[۸۳] اور جو زمین و آسمان سے تمھیں روزی دیتا ہے[۸۴]؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی (اِن سب کاموں میں شریک) ہے؟ اِن سے کہو کہ اپنی دلیل لاؤ، اگر تم سچے ہو[۸۵]۔ ۶۴

---

[۸۳] یعنی اُسی طرح اعادہ کرے گا، جس طرح اُس نے ابتدا کی ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت کے ایک بدیہی نتیجے کا بیان ہے کہ جب اِس کائنات کی موجودہ تخلیق سے انکار نہیں ہے تو اِس کے اعادے میں بھی کسی شک کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔

[۸۴] یعنی وہ تمام وسائل مہیا کرتا ہے جن سے پوری انسانیت اپنے لیے رزق کا بندوبست کرتی ہے۔ یہ کوئی معمولی اہتمام نہیں ہے کہ اِسے کسی جھوٹے معبود یا کسی اندھے طبیعی قانون کی طرف منسوب کر کے انسان اپنے آپ کو مطمئن کر سکے۔

[۸۵] یعنی اپنے اِس دعوے میں سچے ہو کہ اُس کی خدائی میں کچھ دوسرے بھی اُس کے ساتھ شریک ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”اِس ساری بحث کا خلاصہ دو لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ جو خدا کو نہیں مانتا، اِن سوالوں کا کوئی اطمینان بخش جواب دے جو اوپر مذکور ہوئے۔ اور اگر مانتا ہے، لیکن اِس کے ساتھ دوسرے خداؤں کو بھی شریک کرتا ہے تو وہ اِن خداؤں کے حق میں دلیل پیش کرے۔ دلیل و ثبوت کی ذمہ داری بہرحال منکروں یا مشرکوں پر ہے۔ خدا کے ماننے والوں پر کسی چیز کو ثابت کرنے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ وہ تو ایک بدیہی حقیقت کو مانتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۵/۶۲۷)

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ

(یہ عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں)۔ اِن سے کہو، (یہ غیب کی باتیں ہیں اور) اللہ کے سوا زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، اِس غیب کو نہیں جانتے اور نہ یہ جانتے ہیں کہ (مرنے کے بعد) کب اٹھائے جائیں گے۔[۸۶] ۶۵

(تمھارا خیال ہے کہ یہ اِس بات کو سمجھتے نہیں ہیں)؟ ہرگز نہیں، بلکہ آخرت کے بارے میں اِن کا علم الجھ گیا ہے،[۸۷] بلکہ یہ اُس کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ یہ اُس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔[۸۸] یہ منکرین کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں

---

[۸۶] یعنی نہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم ہے اور نہ اُس عذاب کا جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قوموں پر آتا ہے۔ میں بھی اُنھی میں سے ہوں، اِس لیے صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ نہیں مانو گے تو خدا کا عذاب آجائے گا۔ اِس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔

[۸۷] یعنی نہ صریح انکار کر سکتے ہیں نہ ماننا چاہتے ہیں، اِس لیے ایک قسم کی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

[۸۸] یہ لوگ جس مرض میں مبتلا تھے، قرآن نے یہ اُس کے تدریجی ارتقا کو بیان کر دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”یہ ایک حقیقت ہے کہ حقائق سے گریز و فرار کی اصلی علت آخرت سے گریز و فرار ہی ہے۔ آخرت کو مان لینے سے چونکہ انسان پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اِس وجہ سے وہ اُس سے بھاگتا ہے۔ اور فرار کے لیے چونکہ کوئی راہ نہیں ہے، اِس وجہ سے وہ چور دروازے

اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ
هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾
قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾
وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

گے اور ہمارے باپ دادا بھی تو کیا ہم قبروں سے نکالے جائیں گے؟ یہ دھمکی ہمیں بھی دی گئی ہے اور اِس سے پہلے ہمارے باپ دادا کو بھی دی گئی تھی۔ کچھ نہیں، یہ محض اگلوں کی کہانیاں ہیں۔ ۶۶-۶۸

اِن سے کہو، (نہیں مانتے ہو تو) ذرا اپنی اِس سرزمین ہی میں چلو پھرو، پھر دیکھ لو کہ (اُن) مجرموں کا انجام کیا ہوا (جو تم سے پہلے اِسی طرح کی باتیں کرتے تھے)[۸۹]۔ ۶۹

اِن پر افسوس نہ کرو، (اے پیغمبر)، اور جو چالیں یہ چل رہے ہیں، تم اُن پر دل تنگ نہ ہو[۹۰]۔

تلاش کرتا ہے۔ یہ چیز اُس کو ایک شدید ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ حقائق سے گریز کرنے کے لیے اُن کے اندر شک کے پہلو ڈھونڈتا ہے۔ یہ غیر فطری جستجو اُس کو شک کا مریض بنا دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے صریح حقائق سے آنکھیں بند کر کے اندھا بننا پڑتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۵/۶۲۹)

[۸۹] یعنی عاد و ثمود وغیرہ جن کی سرگذشتیں قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں اور جن کے تباہ شدہ آثار سرزمین عرب ہی میں موجود تھے۔

[۹۰] یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اِن کی ضد اور ہٹ دھرمی پر غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اِن کی شرارتوں سے آزردہ ہونا چاہیے۔ آپ اپنا فرض ادا کیجیے، یہ خدا کی گرفت میں ہیں، اُس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ عَسٰٓى اَنْ
يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ
فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ
مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾

یہ پوچھتے ہیں کہ اگر تم لوگ سچے ہو تو یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟ اِن سے کہو کہ جس (قیامت) کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہو، بہت ممکن ہے کہ اُس میں سے کچھ تمھارے پیچھے ہی لگا ہوا ہو[91]۔ (اِس وقت جو مہلت تمھیں ملی ہوئی ہے، وہ تمھارے ہی فائدے کے لیے ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا پروردگار لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اُن میں سے اکثر شکر گزار نہیں ہوتے۔ اِن کے سینے جو کچھ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں، تیرا پروردگار یقیناً اُسے جانتا ہے۔ زمین و آسمان میں کوئی ایسی چھپی ہوئی چیز نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں درج نہ ہو[92]۔ ۷۰-۷۵

---

[91] یعنی وہ قیامت صغریٰ جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کے منکرین کا گویا تعاقب کر رہی ہوتی ہے۔

[92] اِن الفاظ میں جو تہدید و وعید ہے، اُسے قرآن کے طلبہ سمجھ سکتے ہیں۔ گویا مدعا یہ ہے کہ تمھارے سب کرتوت اُس نے لکھ رکھے ہیں، اُس سے کوئی چیز بھی چھپی نہ رہے گی۔ جس چیز کے لیے جلدی مچا رہے ہو، وہ اِسی لیے تو آئے گی کہ تمھارا یہ اعمال نامہ تمھارے سامنے کھول دے۔ اِس لیے سوچ لو کہ کس چیز کے لیے جلدی مچا رہے ہو۔

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ رَبَّكَ
يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ
اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾

(یہ اُن کی باتوں سے گم راہ نہ ہوں، اِس لیے کہ) یہ قرآن بنی اسرائیل پر بھی یقیناً وہ بہت سی چیزیں واضح کر رہا ہے جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں[۹۳] اور اِس میں شبہ نہیں کہ ماننے والوں کے لیے تو یہ سراسر ہدایت اور رحمت ہے[۹۴]۔ یقیناً تیرا پروردگار (قیامت کے دن) اپنے حکم ناطق کے ذریعے سے اُن کے درمیان فیصلہ فرمائے گا[۹۵]۔ وہ زبردست ہے، بڑے علم والا ہے۔ سو تم اللہ پر بھروسا رکھو، بے شک تمھی صریح حق پر ہو۔ ۷۶-۷۹

حقیقت یہ ہے کہ تم مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے

---

[۹۳] یہ اُن اختلافات کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق بعض حقائق سے رکھتے تھے۔

[۹۴] اس لیے کہ جونہی وہ اِسے مانیں گے، یہ اختلافات کی بھول بھلیوں سے نکال کر اُنھیں صراط مستقیم پر لے آئے گا اور دنیا اور آخرت، دونوں میں اُنھیں خدا کی رحمت کا مستحق بنا دے گا۔

[۹۵] یعنی خدا کے فیصلے کو یہاں نہیں مانیں گے تو یہی فیصلہ قیامت کے دن سننا پڑے گا اور اُس وقت کسی کے لیے زبان کھولنے کی گنجایش نہ ہوگی۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ
يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾
وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَاۗبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ
اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا

ہو، جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں اور نہ اندھوں کو اُن کی گم راہی سے ہٹا کر راہ دکھا سکتے ہو۔[96] تم صرف اُنھی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لانا چاہیں۔ پھر وہی فرماں بردار بھی ہوں گے۔[97] ۸۰-۸۱

(اِس وقت تو، اے پیغمبر، تم اِنھیں سمجھا رہے ہو، لیکن) جب ہماری بات اِن پر پوری ہو جائے گی[98] تو ہم اِن کے لیے زمین سے کوئی جانور نکال کھڑا کریں گے جو اِنھیں بتائے گا کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے، (سو اب وہ قہر الٰہی بن کر سامنے آ گئی ہیں)۔[99] یہ اُس دن کا خیال کریں جس دن ہم ہر امت میں سے

---

[96] آیت میں 'هٰدِي' کے ساتھ 'عَنْ' آیا ہے۔ یہ اِس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تضمین ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

[97] یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو خدا نے ہدایت و ضلالت کے باب میں قائم کر رکھی ہے کہ ہدایت اُنھی کو ملتی ہے جو ہر طرح کے تعصّبات سے بالاتر ہو کر اُس کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہوں، اندھے اور بہرے ہو کر اُس سے بھاگنے والوں کو یہ نعمت کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

[98] یعنی حجت پوری ہو جائے گی اور فیصلے کا وقت آ جائے گا۔

[99] یعنی اپنے وجود سے یہ حقائق واضح کر دے گا۔ آیت میں اِس کے لیے 'تُكَلِّمُهُمْ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ اُسی مفہوم میں ہے، جس مفہوم میں یہ سورۂ روم (۳۰) کی آیت ۳۵ میں ہے۔ یہ اِس لیے ہو گا کہ جو لوگ خدا کے آخری پیغمبر کی بات بھی سننے کے لیے تیار نہ ہوں، اُن پر پھر

مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝۸۳ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ
بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸۴ وَوَقَعَ الْقَوْلُ
عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝۸۵

ایک فوج کی فوج اُن لوگوں کی اکٹھا کریں گے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے، پھر اُن کی درجہ بندی کی جائے گی۔[۱۰۰] یہاں تک کہ جب وہ اکٹھے ہو کر آجائیں گے تو خدا پوچھے گا کہ کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلا دیا، دراں حالیکہ تمھارا علم اُن کا احاطہ نہ کر سکا تھا یا بتاؤ کہ تم کیا کرتے رہے تھے[۱۰۱]؟ سو اُن پر بات پوری ہو جائے گی،[۱۰۲] اِس لیے کہ اُنھوں نے اپنی جان پر ظلم کیا، پھر وہ کچھ بول نہ سکیں گے۔ ۸۲-۸۵

جانوروں ہی کو گواہی دینی چاہیے۔ تاہم اِس کی نوبت نہیں آئی، اِس لیے کہ قریش کے بیش تر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں بھی لوگوں کے ساتھ اِسی طرح کا معاملہ ہوگا اور اُن پر گواہی کے لیے اِسی نوعیت کا ایک 'دَآبَّةُ الْاَرْضِ' نکال کھڑا کیا جائے گا۔

[۱۰۰] یعنی ہر گروہ کو اُس کے جرائم اور اُن کی مقدار کے لحاظ سے الگ کر دیا جائے گا۔

[۱۰۱] مطلب یہ ہے کہ کائنات کے تمام اسرار تم پر کھل گئے ہوتے اور تم انکار کر دیتے تو کوئی بات بھی تھی، لیکن تم نے تو خزف ریزوں سے اہرام کو ڈھانے کی کوشش کی ہے۔ دور حاضر کے سائنس دانوں کے لیے بھی اِس میں بڑی تنبیہ ہے جو مادے میں کارفرما چند قوانین سے واقف ہو کر اِسی طرح کی جسارت کر رہے ہیں، دراں حالیکہ ابھی نوری سالوں کے فاصلوں تک پھیلی ہوئی ایک عظیم کائنات اور خود اُن کے اندر ایک جہان کبیر اُن کے مطالعے کے لیے پڑا ہوا ہے۔

[۱۰۲] یعنی خدا کا فیصلہ صادر ہو جائے گا کہ اِنھیں اب جہنم میں جھونک دیا جائے۔

النمل
۲۷

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾
وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ
تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ

(یہ نشانیاں مانگتے ہیں) ؟ کیا اِنھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے رات کو تاریک بنایا کہ اُس میں آرام کریں اور دن کو روشن کر دیا کہ اُس میں کام کریں[۱۰۳]؟ حقیقت یہ ہے کہ اِس میں اُن لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو ماننا چاہیں[۱۰۴]۔ ۸۶

(لوگو)، اُس دن کا خیال کرو، جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سب گھبرا اٹھیں گے، سوائے اُن کے جنھیں اللہ چاہے، اور اُس کے آگے سر جھکائے ہوئے سب حاضر ہو جائیں گے۔ تم پہاڑوں کو گمان کرو گے کہ جمے ہوئے ہیں، دراں حالیکہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے۔ یہ خدا کی صنعت کا

---

[۱۰۳] آیت کے پہلے فقرے میں 'مظلمًا' اور دوسرے میں 'لتعملوا' یا اِس کے ہم معنی الفاظ عربیت کے اسلوب کے مطابق حذف کر دیے گئے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شب و روز کی گردش ہی کو دیکھو کہ کیسی حکمت، معنویت اور منصوبہ بندی اِس میں علانیہ نظر آ رہی ہے۔ پھر یہ دونوں موت و حیات کی تمثیل بھی ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو ہر روز کس پابندی کے ساتھ ایک یوم النشور کی یاددہانی کر رہے ہیں۔ کیا اِس کے بعد بھی حشر و نشر اور قیامت کے بارے میں کوئی شبہ باقی رہ جاتا ہے؟

[۱۰۴] آیت کے اسلوب سے واضح ہے کہ یہاں فعل ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔

كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ
مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ
فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾
اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ
كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ۙ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ

کرشمہ ہوگا[۱۰۵] جس نے ہر چیز کو محکم کیا ہے۔ بے شک، وہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔[۱۰۶] اُس دن جو بھلائی لے کر آئیں گے، اُن کے لیے اُس سے بہتر صلہ ہے اور وہ اُس دن ہر گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے۔ اور جو برائی لے کر آئیں گے، وہ اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے ___ تم وہی بدلہ پا رہے ہو جو تم کرتے رہے ہو۔ ۸۷-۹۰

(اِن سے کہو، اے پیغمبر کہ) مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ میں اِس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اِسے حرمت دی ہے[۱۰۷] اور جس کے اختیار ہی میں سب کچھ ہے۔ اور مجھے حکم ملا ہے کہ اُس کے فرماں برداروں میں رہوں اور حکم ملا ہے کہ تمھیں یہ قرآن پڑھ

---

[۱۰۵] اصل الفاظ ہیں: 'صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ'۔ یہ اُسی طرح کی ترکیب ہے، جیسے 'وَعْدَ اللّٰهِ' اور 'صِبْغَةَ اللّٰهِ' وغیرہ۔ کسی چیز کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا مقصود ہو تو عربی زبان میں یہ اسلوب بالعموم اختیار کیا جاتا ہے۔

[۱۰۶] چنانچہ اُس کی جزا و سزا بھی لازماً دے گا۔ آگے اُسی کی تفصیل ہے۔

[۱۰۷] سورہ کے آخر میں یہ بالکل فیصلہ کن انداز میں قریش کو توجہ دلائی ہے کہ میں اُسی مقصد کے احیا و تجدید کے لیے مبعوث ہوا ہوں جس کے لیے خدا نے ہمارے ابوالآبا ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ وہ اِس شہر کو عالمی سطح پر دعوت توحید کا مرکز بنائیں۔ چنانچہ عبادت و اطاعت میں اُسی توحید کو اختیار کیے ہوئے ہوں اور اِس شہر کے مالک نے مجھے اِسی کا حکم دیا ہے۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ
الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ
وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

سورة القصص

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

کر سناؤں[۱۰۸]۔ پھر جو راہ پر آئے تو وہ اپنے لیے ہی راہ پر آئے گا اور جو گم راہی اختیار کرے، وہ بھی اپنے لیے اختیار کرے گا۔ سو کہہ دو کہ میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں[۱۰۹]۔ اور کہہ دو کہ شکر اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ عنقریب اپنی نشانیاں تمھیں دکھائے گا اور تم اُنھیں پہچان لو گے[۱۱۰] اور جو کچھ تم کر رہے ہو، تمھارا رب اُس سے بے خبر نہیں ہے[۱۱۱]۔ ۹۱-۹۳

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

---

[۱۰۸] یعنی جس توحید کو میں نے اختیار کیا ہے، اِس قرآن کے ذریعے سے تم کو بھی اُسی کی دعوت دوں اور اُس کے مقتضیات تم پر واضح کروں۔

[۱۰۹] مطلب یہ ہے کہ میری ذمہ داری صرف انذار ہے اور میں یہ ذمہ داری ادا کر رہا ہوں۔ تم جو مطالبات مجھ سے کر رہے ہو، مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

[۱۱۰] یعنی تمھیں پتا چل جائے گا کہ یہ وہی نشانیاں ہیں جن کے بارے میں میں نے تمھیں خبردار کر دیا تھا۔ چنانچہ معلوم ہے کہ ہجرت کے بعد یہ سب نشانیاں ظاہر ہو گئیں اور لوگوں نے بچشم سر دیکھ لیا کہ خدا کے پیغمبر نے کتنی سچی باتیں بتائی تھیں۔

[۱۱۱] یعنی جب بے خبر نہیں ہے تو متنبہ ہو جاؤ، تمھاری خبر بھی لازماً لے گا۔

طٰسٓمٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ
نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ③
اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ
طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ

یہ سورۂ ’طٰسٓمٓ‘ ہے۔[۱۱۲] یہ نہایت واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ ہم اُن لوگوں کی ہدایت کے لیے جو ایمان لانا چاہیں،[۱۱۳] موسیٰ اور فرعون کی سرگذشت کا کچھ حصہ ٹھیک ٹھیک تمھیں سناتے ہیں۔ ۱-۳

واقعہ یہ ہے کہ سرزمین مصر میں فرعون نے سرکشی اختیار کر لی تھی۔[۱۱۴] اُس کے باشندوں کو اُس نے گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔[۱۱۵] اُن میں سے ایک گروہ کو اُس نے

---

[۱۱۲] اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

[۱۱۳] اصل الفاظ ہیں: ’لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ‘۔ اِن میں فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔ یہ ایک قسم کی تنبیہ ہے۔ قرآن نے ابتدا ہی میں بتا دیا ہے کہ اِس سرگذشت سے ہدایت اُنھی کو ملے گی جو ہدایت پانا چاہیں گے۔ اُن کے لیے اِس میں کوئی ہدایت نہیں ہے جو فیصلہ کر چکے ہیں کہ اندھے اور بہرے بن کر ہی جئیں گے۔

[۱۱۴] اِس سرکشی کی نوعیت کیا تھی؟ آگے قرآن نے اِسی کی وضاحت فرمائی ہے۔

[۱۱۵] یعنی انصاف کی مسند پر بیٹھ کر انصاف کرنے اور سب کو یکساں اور برابر کے حقوق دینے کے بجاے اُس نے رعایا کو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ کسی کو مراعات اور امتیازات دے رکھے تھے اور کسی کو محکوم بنا کر ذلیل کرتا تھا۔

مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ④ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا
فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ⑤ ۙ وَنُمَكِّنَ

سختی سے دبا رکھا تھا،[۱۱۶] اُن کے بیٹوں کو وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ذبح کر چھوڑتا اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔[۱۱۷] فی الواقع وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ اور اِدھر ہم نے ارادہ کر لیا تھا کہ اُن لوگوں پر عنایت کریں جو اُس ملک میں دبا کر رکھے گئے تھے[۱۱۸] اور اُن کو امامت عطا فرمائیں[۱۱۹] اور اُنھیں ملک کا وراث بنائیں اور اُنھیں اُس ملک میں

---

[۱۱۶] یعنی بنی اسرائیل کو جو یوسف علیہ السلام کے زمانے میں یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے اور اب ایک بڑی قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔

[۱۱۷] یہ، ظاہر ہے کہ سرکشی کی انتہا ہے جس کا صدور کسی حکمران سے ہو سکتا ہے۔ فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر نے یہ اسکیم اِس لیے چلائی تھی کہ وہ بنی اسرائیل کی تعداد میں اضافے سے خوف زدہ تھے کہ مبادا وہ ایک بڑی قوت بن کر اُن پر غلبہ پا لیں۔ اِس کی تفصیلات بائیبل اور تالمود، دونوں میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔

[۱۱۸] یہ اُس خدائی فیصلے کا بیان ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد بنی اسرائیل کو عالمی سطح پر اپنے دین کی شہادت کے لیے منتخب کیا۔ یہ اُسی طرح کا انتخاب تھا، جس طرح انسانوں میں سے انبیا علیہم السلام کو انذار و بشارت اور دعوت و شہادت کے لیے منتخب کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ یہاں جو مدعا 'نَمُنَّ' کے لفظ سے ادا ہوا ہے، قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں اُسی کو 'نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ' کے الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔

[۱۱۹] یعنی دین کے امام اور پیشوا بنائیں۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱۲۴ میں قرآن نے ابراہیم علیہ السلام سے متعلق جس فیصلے کا ذکر 'اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا' کے الفاظ میں کیا ہے، یہ اُسی کا نتیجہ ہے۔

لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿٦﴾

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ

اقتدار بخشیں[۱۲۰] اور فرعون اور ہامان[۱۲۱] اور اُن کے لشکروں کو اُن سے وہی کچھ دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے تھے[۱۲۲]۔ ۴-۶

(چنانچہ موسیٰ پیدا[۱۲۳] ہوا تو بچے قتل کیے جا رہے تھے)۔ ہم نے موسیٰ کی ماں کو (اِسی

القصص
۲۸

۱۲۰؎ اِس کے لیے ارض فلسطین کا انتخاب کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اِسے اپنی دعوت کے لیے خاص قرار دے کر بنی اسرائیل کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ اِس کے باشندوں سے اِس سرزمین کو خالی کرا لیا جائے اور گردوپیش کی حکومتوں کو باج گزار بنا کر اِس پورے علاقے میں انبیا علیہم السلام کی زیر قیادت خدا کی حکومت قائم کر دی جائے۔ بائیبل میں اِسی بنا پر اِسے بنی اسرائیل کی میراث کا علاقہ کہا گیا ہے۔ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ یہ ایک خدائی فیصلہ تھا، اِس کا دنیا کے دوسرے علاقوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۲۱؎ اِس کا ذکر جس طریقے سے یہاں ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً فرعون کا وزیر اعظم تھا اور اُس کے دست راست کی حیثیت سے اُس کے تمام مظالم میں پوری طرح شریک تھا۔

۱۲۲؎ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ فرعونی اِس بات سے ڈرتے تھے کہ بنی اسرائیل کی تعداد اور مصر میں اُن کا اثر و رسوخ اِسی طرح بڑھتا رہا تو ایک دن وہ اُن پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ یہ اُسی ڈر کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ یہی ہو گا اور فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر اپنے تمام زور و سلطنت اور تدبیر و تدبر کے باوجود ایک دن بالکل مغلوب ہو کر رہ جائیں گے۔

۱۲۳؎ موسیٰ قبطی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے اُسے پانی سے نکالا۔ بائیبل اور تالمود، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا یہ نام فرعون کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ اُن کے والد کا نام

فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ⑦

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ

بنا پر) وحی کی[۱۲۴] کہ ابھی اِسے دودھ پلاؤ، پھر جب اِس کی نسبت تمھیں (جان کا) خطرہ ہو تو اِسے دریا میں ڈال دینا اور کوئی اندیشہ اور غم نہ کرنا، ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اِس کو ہم واپس تمھارے پاس پہنچا دیں گے[۱۲۵] اور اِسے پیغمبروں میں سے (ایک پیغمبر) بنائیں گے۔ ۷

(اُس نے بالآخر یہی کیا)[۱۲۶]، پھر فرعون کے گھر والوں نے (دریا میں بہتے دیکھ

اِن کتابوں میں عمرام بتایا گیا ہے۔ قرآن اِسی کا تلفظ عمران کرتا ہے۔ وہ حضرت یعقوب کے بیٹے لاوی کی اولاد میں سے تھے۔

۱۲۴؎ الہام و القا یا رؤیا کے ذریعے سے کوئی بات کسی کے دل میں ڈال دی جائے تو قرآن کی زبان میں وحی کا لفظ اُس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پیغمبر نہیں تھیں، اِس لیے یہاں اِس لفظ کو اِسی مفہوم میں لینا چاہیے۔

۱۲۵؎ بائیبل کی کتاب خروج میں ہے کہ فرعون اور اُس کے اعیان نے پہلے دائیوں کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیں، لیکن جب اِس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی تو قبطیوں کو عام حکم دے دیا گیا کہ جہاں دیکھیں کہ بنی اسرائیل کے ہاں کوئی بیٹا پیدا ہوا ہے، اُسے اٹھائیں اور دریا میں پھینک دیں*۔ چنانچہ اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ بچے کو چھپائے رکھو، لیکن جب یہ ممکن نہ رہے تو اپنے ہاتھوں سے اُسے دریا میں ڈال دینا اور کوئی اندیشہ نہ کرنا، ہم اِسی کو تمھارے بچے کے لیے نجات کی راہ بنا دیں گے۔

۱۲۶؎ بائیبل میں ہے:

”...وہ عورت حاملہ ہوئی اور اُس کے بیٹا ہوا اور اُس نے یہ دیکھ کر کہ بچہ خوب صورت

---

* ۱: ۱۵-۲۲۔

وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ ⑧ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ
قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا

کر) اُس کو اٹھا لیا[۱۲۷] کہ (خدا کی بات پوری ہو اور) اِس کے نتیجے میں وہ اُن کا دشمن اور اُن کے لیے باعث غم بنے[۱۲۸]۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون اور ہامان اور اُن کے لشکر بڑے خطا کار تھے (کہ اپنے آپ کو تمام اختیار و اقتدار کا مالک سمجھتے رہے)[۱۲۹]۔ فرعون کی بیوی نے (بچے کو دیکھا تو فرعون سے) کہا: یہ تو میری اور تمھاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، تم لوگ اِسے قتل نہ کرو۔ کیا عجب کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اِسے

> ہے، تین مہینے تک اُسے چھپا کر رکھا۔ اور جب اُسے اور زیادہ چھپا نہ سکی تو اُس نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا لیا اور اُس پر چکنی مٹی اور رال لگا کر لڑکے کو اُس میں رکھا اور اُسے دریا کے کنارے جھاؤ میں چھوڑ آئی۔'' (خروج ۲: ۲-۳)

[۱۲۷] یہ اِس لیے ممکن ہوا کہ دریاے نیل بنی اسرائیل کی بستیوں سے گزرتا ہوا شاہی محلات کی طرف جاتا تھا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام جس ٹوکرے میں تھے، اُسے دریا کی سیر کرتے ہوئے خود بادشاہ اور ملکہ نے یا اُن کے خدام نے دیکھا اور دریا سے نکال لیا۔

[۱۲۸] اصل الفاظ ہیں: 'لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا'۔ اِن میں 'ل' اُن کے مقصد کو نہیں، بلکہ فعل کی غایت اور انجام مقدر کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۱۲۹] مطلب یہ ہے کہ اُنھوں نے سوچا ہی نہیں کہ کائنات کا اصل مالک خدا ہے اور وہ اگر چاہے گا تو اُن کے سب سے بڑے قامع کی پرورش اُنھی کے ہاتھوں کرا کے اُنھیں اُن کے انجام مقدر تک پہنچا دے گا، اور یہی بہت بڑی غلطی تھی۔

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۹
وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ
اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۱۰ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ؗ

بیٹا ہی بنا لیں۔[۱۳۰] (وہ یہ باتیں کر رہے تھے) اور اُنھیں کچھ خبر نہ تھی کہ اُن کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ۸-۹

اُدھر موسیٰ کی ماں کا دل بالکل بے قرار ہو گیا۔ اگر ہم اُس کے دل کو نہ سنبھالتے کہ اُس کو ہمارے وعدے کا یقین رہے[۱۳۱] تو وہ اُس کا راز فاش کر بیٹھتی۔ اور (اِسی بے قراری میں) اُس نے بچے کی بہن سے کہا کہ اُس کے پیچھے پیچھے جا۔[۱۳۲] چنانچہ وہ (اجنبی

---

[۱۳۰] فرعون کے ہاں غالباً کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اور یہ ملکہ نہایت نیک دل خاتون تھیں۔ قرآن نے دوسری جگہ بتایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بڑی موہنی صورت عطا فرمائی تھی۔ جو دیکھتا، اُسے بے اختیار پیار آ جاتا تھا۔ چنانچہ ملکہ بھی اِس موہنی صورت پر قربان ہو گئیں اور اُنھوں نے فرعون سے وہ بات کہی جو یہاں نقل ہوئی ہے۔

[۱۳۱] یعنی خدا کے اشارے سے بچے کو دریا کے حوالے کر کے اُس نے جس ایمان و توکل کی شہادت دی تھی، اُس کی لاج قائم رہے۔ اپنے مومن بندوں اور بندیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یوں ہی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور بندیوں کو امتحان میں تو ڈالتا ہے کہ یہ امتحان اُس کی سنت ہے، اور یہ امتحان درجے اور مرتبے کے اعتبار سے سخت تر بھی ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی اُس کی یہ سنت بھی ہے کہ جو لوگ اُس کے امتحان کی راہ میں بازی کھیل جاتے ہیں، وہ اُن کو سنبھالتا بھی ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۶۶۱)

[۱۳۲] یہ دل کی تسلی کے لیے آخری تدبیر تھی جو وہ کر سکتی تھیں۔

فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۙ﴿۱۱﴾
وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى
اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى
اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

بن کر) اُس کو دور سے دیکھتی رہی اور فرعون کے لوگوں کو اِس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔[۱۳۳] ۱۰-۱۱

اور اِدھر دودھ پلائیوں کے دودھ سے ہم نے موسیٰ کو پہلے ہی روک رکھا تھا۔[۱۳۴] چنانچہ (موسیٰ کی بہن وہاں پہنچی اور یہ دیکھا تو) اُس نے اُن سے کہا: تم لوگ کہو تو میں تمھیں ایک گھرانے کا پتا بتاؤں جو تم لوگوں کی خاطر اِسے پالیں گے اور بڑی خیر خواہی سے اِس کی دیکھ بھال کریں گے؟ اِس طرح موسیٰ کو ہم نے اُس کی ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ آزردہ خاطر نہ ہو اور اِس لیے کہ وہ اچھی طرح جان لے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہتا ہے،[۱۳۵] مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔[۱۳۶] ۱۲-۱۳

---

[۱۳۳] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی محل اسرائیلیوں کی بستی سے زیادہ دور نہیں تھا۔

[۱۳۴] یہ اُس تدبیر کا ذکر ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی ماں کی طرف لوٹانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی۔ چنانچہ بچے کو پانے کے بعد جب اُس کو دودھ پلانے کی فکر ہوئی تو فرعون کی بیوی ایک کے بعد دوسری انا کو دودھ پلانے کے لیے بلاتی رہی، لیکن بچے نے کسی کی چھاتی منہ سے نہیں لگائی۔

[۱۳۵] یہ اُس وعدے کے ایفا کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۷ میں گزرا ہے۔

[۱۳۶] یعنی اپنی بلادت کے سبب سے اِس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...وہ خدا کے وعدوں کو محض ہوائی باتیں خیال کرتے ہیں اور اُن کے اعتماد پر کوئی بازی کھیلنے

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾
وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا

(فرعون کے زیر سایہ پرورش پا کر یہی) موسیٰ جب اپنی جوانی کو پہنچا اور ہر لحاظ سے پختہ ہو گیا[۱۳۷] تو ہم نے اُسے علم و حکمت سے نوازا۔[۱۳۸] اچھے لوگوں کو ہم اِسی طرح صلہ دیتے ہیں۔[۱۳۹] ۱۴

(پھر ایک دن اتفاق سے) وہ ایسے وقت شہر میں داخل ہوا، جب کہ شہر کے لوگ بے خبر ہوتے تھے[۱۴۰] تو اُس نے دیکھا کہ دو آدمی وہاں لڑ رہے ہیں۔ ایک اُس کی اپنی

میں اُن کو خسارہ اور خطرہ نظر آتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے دیکھ لیں، تب مانیں گے، حالاں کہ اِس دنیا میں اصل امتحان تو یہی ہے کہ لوگ اپنے رب کے اُن وعدوں اور وعیدوں کے لیے جئیں اور مریں جن کی حقیقت ابھی سامنے آنی ہے۔" (تدبر قرآن ۵/۶۶۲)

[۱۳۷] یعنی جسمانی لحاظ سے بھی جوانی کو پہنچ گیا اور اُس کی عقل اور اُس کے مزاج میں بھی پختگی آگئی۔

[۱۳۸] آیت میں 'حُکم' اور 'عِلم' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'حُکم' سے مراد چیزوں کے بارے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے کی صلاحیت اور 'عِلم' سے مراد معرفت حقائق ہے۔

[۱۳۹] یعنی اُن لوگوں کو جو خدا کی دی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بالکل صحیح طریقے پر استعمال کرتے ہیں۔

[۱۴۰] یہ غالباً لوگوں کے قیلولے کا وقت ہوگا۔ آگے جو واقعہ بیان ہوا ہے، اُس کے بارے میں خیال ہو سکتا تھا کہ آخر لوگوں نے اُسے دیکھا کیوں نہیں۔ قرآن نے یہ اُس کی وجہ بیان کر دی ہے کہ یہ ایسا وقت تھا، جب لوگ زیادہ تر گھروں میں تھے۔ چنانچہ سڑکیں اور گلیاں سنسان تھیں اور شہر

رَجُلَيۡنِ يَقۡتَتِلٰنِ ۖ هٰذَا مِنۡ شِيۡعَتِهٖ وَهٰذَا مِنۡ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسۡتَغَاثَهُ
الَّذِيۡ مِنۡ شِيۡعَتِهٖ عَلَى الَّذِيۡ مِنۡ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوۡسٰى فَقَضٰى
عَلَيۡهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ
مُّبِيۡنٌ ⑮ قَالَ رَبِّ اِنِّيۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِيۡ فَاغۡفِرۡ لِيۡ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ

قوم میں سے تھا اور دوسرا اُس کے دشمنوں کی قوم میں سے۔ پھر اُس کی قوم کے آدمی نے اُس شخص کے مقابل میں اُس کی مدد چاہی جو اُس کے دشمنوں میں سے تھا۔ اِس پر موسیٰ نے اُس کے گھونسا مارا اور اُس کا کام تمام کر دیا۔[۱۴۱] (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰ نے کہا: یہ تو مجھ سے شیطانی کام ہو گیا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ شیطان ایک کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔ اُس نے دعا کی کہ میرے پروردگار، میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے، سو مجھ کو بخش دے۔[۱۴۲] تو اُس کے پروردگار نے اُسے بخش دیا۔

میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اِس وقت کا انتخاب شاید اِس لیے کیا کہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے بچ بچا کے اپنے مظلوم بھائیوں کے حالات دیکھ سکیں۔

[۱۴۱] یہ حادثہ بالکل بے ارادہ پیش آیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اِس طرح کی صورت حال پیش آجائے گی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اسرائیلی نے جب حضرت موسیٰ کو دیکھا تو اُن سے طالب مدد ہوا۔ حضرت موسیٰ اُس کو مظلوم دیکھ کر، بہ تقاضاے فتوت و حمایت حق، اُس کی مدد کے لیے بڑھے اور چاہا کہ بیچ بچاؤ کرا دیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قبطی اپنی رعونت کے سبب سے اُن سے الجھ پڑا۔ اُنھوں نے اپنی مدافعت میں اُس کو جو گھونسا مارا تو وہ ایسا بے ڈھب پڑا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۶۶۳)

[۱۴۲] یہ اُسی علم و حکمت کا کرشمہ تھا جس کا ذکر اوپر ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی شہ زوری اور بے پناہی پر فخر کرنے کے بجاے اِس غیر ارادی غلطی کو بھی جرم سمجھا۔ چنانچہ فوراً نادم ہوئے اور

هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ⑯ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ⑰

حقیقت یہ ہے کہ وہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ موسیٰ نے کہا: میرے پروردگار، یہ عنایت جو تو نے مجھ پر فرمائی ہے، اِس کے بعد تو اب میں اِس طرح کے مجرموں کا کبھی مددگار نہ بنوں گا۔[۱۴۳] ۱۵-۱۷

اپنے پروردگار سے معافی کی درخواست کی۔

[۱۴۳] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کی بشارت بھی کسی غیبی ذریعے سے دے دی گئی تاکہ وہ مطمئن ہو جائیں اور اپنی حفاظت کا بندوبست کریں۔ اِس لیے کہ اُس وقت کی حکومت اور قانون سے وہ اپنے لیے کسی انصاف کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اِس میں یہ جو فرمایا ہے کہ ''اب میں اِس طرح کے مجرموں کا کبھی مددگار نہ بنوں گا''، تو اِس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اُنھوں نے اپنے اسرائیلی بھائی کو مجرم سمجھتے ہوئے اُس کی مدد کی تھی۔ اُس وقت تو اُنھوں نے اُسے مظلوم ہی سمجھا تھا، لیکن بعد میں واضح ہو گیا کہ جسے وہ مظلوم سمجھے تھے، وہی درحقیقت مجرم تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...آپ نے تو جو کچھ کیا، اُس کو مظلوم سمجھتے ہوئے کیا، اُس کی فریاد پر کیا اور وقت کے حالات کی بنا پر اُن کو گمان یہی ہوا کہ قبطی ظالم اور اسرائیلی مظلوم ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اُن کے معافی مانگنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تم بے قصور ہو، قبطی ظالم آدمی تھا، بلکہ اُن کو ایک غلطی کا مرتکب قرار دیتے ہوئے معافی دی تو اِس سے وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مظلوم کی حمایت کرنی چاہی، لیکن معاملے کی تحقیق نہ کرنے کے سبب سے مجھ سے ظالم کی حمایت صادر ہو گئی۔ اِس وجہ سے آیندہ کے لیے آپ نے یہ عہد فرمایا کہ اب میں بلا تحقیق کسی کی حمایت نہیں کروں گا، بلکہ صرف اُسی کی حمایت کروں گا جس کا مظلوم ہونا معلوم ہو۔ چنانچہ دوسرے ہی دن آپ نے جب اُسی اسرائیلی کو ایک دوسرے قبطی سے لڑتے دیکھا اور وہ حسب سابق پھر حضرت موسیٰ سے طالب مدد ہوا تو آپ نے اُس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔'' (تدبر قرآن ۵/۶۶۴)

فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ
بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾
فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اَتُرِیْدُ

القصص
۲۸

(رات خیریت سے گزر گئی) تو اگلے دن موسیٰ صبح کو ڈرتے ڈرتے، کچھ ٹوہ لیتے ہوئے شہر میں داخل ہوا۔ پھر کیا دیکھتا ہے کہ وہی جس نے کل اُسے مدد کے لیے پکارا تھا، آج پھر اُسے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے اُس سے کہا: اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ تم خود ایک کھلے ہوئے شریر آدمی ہو۔[۱۴۴] پھر (دونوں کو سمجھاتے سمجھاتے) جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ موسیٰ نے ارادہ کیا[۱۴۵] کہ اب اپنے اور اُس کے دشمن[۱۴۶] کو پکڑے (کہ وہ بھی جھگڑنا بند کرے) تو (اُسے شبہ ہوا کہ یہ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں،[۱۴۷] لہٰذا) وہ بول اٹھا کہ موسیٰ، جس طرح کل ایک آدمی کو تم نے قتل کر دیا تھا، کیا آج اُسی

---

[۱۴۴] موسیٰ علیہ السلام پر یہ بات اللہ تعالیٰ کے اشارے ہی سے کھل گئی تھی، تاہم آج اُسے دوبارہ لڑتے دیکھ کر اُنھیں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اصل مجرم یہی شخص ہے جو ہر ایک سے لڑتا رہتا ہے۔

[۱۴۵] اصل الفاظ ہیں: 'فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ'۔ اِس 'اَنْ' سے پہلے موقع کی مناسبت سے کوئی فعل محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

[۱۴۶] یہ اُس دشمنی کی طرف اشارہ ہے جو قبطیوں کے مظالم کی وجہ سے اُن کے اور اسرائیلیوں کے مابین اُس وقت قومی اعتبار سے قائم ہو چکی تھی۔

[۱۴۷] یہ شبہ غالباً اِس لیے ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے آتے ہی اُسے جھڑک دیا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا، اُسے گمان ہوا کہ اُن کا گھونسا آج اُسی پر پڑے گا۔

اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖق اِنْ تُرِیْدُ
اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ⑲
وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی ز قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنَّ الْمَلَاَ
یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ⑳ فَخَرَجَ

طرح مجھے قتل کرنا چاہتے ہو؟ تم یہی چاہتے ہو کہ اِس ملک میں جبار بن کر رہو، تم یہاں مصلح بن کر نہیں رہنا چاہتے[۱۴۸]۔ ۱۸-۱۹

(یہ بات دربار میں پہنچی تو) شہر کے پرلے سرے سے، (جہاں شاہی محلات تھے)، ایک شخص[۱۴۹] دوڑتا ہوا آیا۔ اُس نے بتایا کہ موسیٰ، دربار کے بڑے تمھارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں[۱۵۰]، اِس لیے یہاں سے نکل جاؤ۔ یقین کرو، میں تمھارے

---

[۱۴۸] اِس سے معلوم ہوا کہ یہ آدمی محض شریر ہی نہیں، اِس کے ساتھ نہایت سفلہ بھی تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اِس کی مدد و حمایت کی تو اِس کے نزدیک وہ بہت بڑے مصلح تھے، لیکن جب اُن کی طرف سے خود اِس کو تنبیہ کا اندیشہ ہوا تو نہایت غیر ذمہ دارانہ طور پر اُس نے کل کے قتل کا راز کھول دیا جو اب تک کسی کے علم میں نہیں تھا اور اُنھیں بھی فوراً ایک مطلق العنان اور بے قابو آدمی قرار دے دیا جو دوسروں پر اپنی دھونس جمانا چاہتا ہے۔

[۱۴۹] یہ غالباً وہی شخص ہے جس کا ذکر آگے سورۂ مومن (۴۰) کی آیت ۲۸ میں ہوا ہے کہ اگرچہ شاہی خاندان میں سے تھا، مگر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا۔

[۱۵۰] اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پہلے ہی سے دربار والوں کی نگاہ میں کھٹک رہے تھے۔ لہٰذا اُنھیں جب معلوم ہوا کہ یہ اسرائیلی اب ہمارے لوگوں کو قتل بھی کرنے لگا ہے تو اُن کی آتش غضب پوری طرح بھڑک اٹھی اور وہ اُن کے قتل کے منصوبے بنانے لگے۔

مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ز قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (٢١)
وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ
السَّبِيْلِ (٢٢) وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ

خیر خواہوں میں سے ہوں۔[۱۵۱] چنانچہ موسیٰ وہاں سے ڈرتا اور ٹوہ لیتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔ (اُس وقت) اُس نے دعا کی کہ میرے پروردگار، مجھے اِن ظالم لوگوں سے نجات عطا فرما دے۔ ۲۰-۲۱

(مصر سے نکل کر) جب موسیٰ نے (بالآخر) مدین کا رخ کیا[۱۵۲] تو (اپنے دل میں) کہا: امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھی راہ دکھائے گا۔[۱۵۳] (چنانچہ چلتے چلتے) جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں لوگوں کی ایک بھیڑ لگی ہے اور وہ

---

[۱۵۱] یہ وضاحت اُس نے غالباً اِس لیے ضروری سمجھی کہ بدگمانی کی جو فضا اُس وقت قبطیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان تھی، اُس میں حضرت موسیٰ یہ خیال نہ کریں کہ اِس خبر کے پیچھے بھی فرعونیوں کی کوئی اسکیم ہے۔

[۱۵۲] یعنی گھر سے نکل کر کچھ سوچا اور پھر فیصلہ کر لیا کہ اِس ہجرت کے لیے فرعون کی سلطنت سے باہر مدین ہی موزوں جگہ ہے۔ خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی سواحل پر آباد، یہ اُسی قوم کی بستی ہے جس کی طرف حضرت شعیب مبعوث ہوئے تھے۔ اِس کا محل وقوع خلیج عقبہ کے مغربی ساحل پر مقنا سے چند میل بجانب شمال بتایا جاتا ہے۔

[۱۵۳] یعنی ٹھیک اُس راستے پر ڈال دے گا جو مجھے میری منزل مقصود تک پہنچا دے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے مدین کا رخ تو کر لیا تھا، لیکن ابھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ مدین میں کہاں اور کس کے پاس جانا ہے۔ بس خدا کے بھروسے پر گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ آگے کے واقعات سے واضح ہے کہ یہی بھروسا اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُنھیں ٹھیک اُسی مقام پر لے گیا، جہاں اُنھیں جانا چاہیے تھا۔

يَسْقُوْنَ ۠ۚ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ
قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰي يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ سکتۃ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰي
لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓي اِلَي الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ

اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور یہ بھی دیکھا کہ اُن سے الگ دو عورتیں ہیں جو اپنے گلے کو روکے کھڑی ہیں[۱۵۴]۔ اُس نے پوچھا: تمھارا کیا ماجرا ہے[۱۵۵]؟ اُنھوں نے کہا: ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں، جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ ہٹا لیں۔ اور (اِس کام کے لیے ہمیں ہی آنا پڑتا ہے، اِس لیے کہ) ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں[۱۵۶]۔ یہ سن کر موسیٰ نے اُن دونوں کی خاطر اُن کے گلے کو پانی پلا دیا۔ پھر ہٹ کر سایے کی طرف آیا[۱۵۷] اور دعا کی کہ میرے پروردگار، اِس وقت جو خیر

---

[۱۵۴] اصل میں لفظ 'تَذُوْدٰنِ' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اُن کا گلہ تو گھاٹ پر پہنچ کر پانی پینے کے لیے زور لگا رہا تھا، لیکن وہ زبردستی اُسے پیچھے ہٹا رہی تھیں۔

[۱۵۵] اصل میں 'مَا خَطْبُكُمَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا حق ادا کیجیے تو گویا مدعا یہ ہے کہ تم عورتیں ہو، آخر کیا افتاد پیش آئی ہے کہ خود اپنا گلہ لے کر نکلی ہو اور اب اُسے یہاں روکے کھڑی ہو۔

[۱۵۶] یعنی والد بوڑھے ہیں اور گھر میں کوئی دوسرا مرد بھی نہیں ہے، اِس لیے آتی ہیں۔ لیکن مردوں کی بھیڑ میں گھسنا مشکل ہوتا ہے، لہٰذا انتظار کرتی ہیں کہ چرواہے ہٹیں تو اپنے جانوروں کو آگے لائیں۔

[۱۵۷] یعنی اگرچہ سخت مشکل اور پریشانی سے دوچار تھے، مگر اُس کے اظہار کے لیے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا اور جس سایے سے اٹھ کر کمزوروں کی حمایت کے لیے گئے تھے، اُسی میں آ کر بیٹھ گئے۔

خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۴)
فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍؗ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ
يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَاؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ

بھی تو میرے لیے اتار دے، میں اُس کا حاجت مند ہوں[۱۵۸]۔ ۲۲-۲۴

پھر (زیادہ دیر نہیں گزری کہ) اُن میں سے ایک شرماتی ہوئی اُس کے پاس چل کر آئی اور کہنے لگی: میرے والد[۱۵۹] آپ کو بلا رہے ہیں تا کہ ہماری خاطر آپ نے جو پانی پلایا ہے، اُس کا صلہ آپ کو دیں[۱۶۰]۔ (موسیٰ چل پڑا)، پھر جب اُس کے والد

---

[۱۵۸] یہ ایسی دعا ہے کہ روح میں اہتزاز پیدا کر دیتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس دعا کی بلاغت کی تعبیر سے زبان قلم قاصر ہے۔ صرف اہل ذوق ہی اِس کو سمجھ سکتے ہیں۔ چونکہ یہ دعا بالکل صحیح وقت پر، صحیح جذبے کے ساتھ اور بالکل صحیح الفاظ میں زبان سے نکلی، اِس وجہ سے اِس کا اثر بلا کسی تاخیر کے ظاہر ہوا۔ صاحب زادیوں نے حضرت موسیٰ کے اِس احسان کا ذکر اپنے باپ سے کیا اور اِس طرح حضرت موسیٰ کے لیے اُس خیر کی راہ کھل گئی جس کے لیے اُنھوں نے دعا فرمائی تھی۔'' (تدبر قرآن ۶۶۹/۵)

[۱۵۹] یہ بزرگ مدین کے کاہن تھے۔ بائیبل میں اِن کا نام ایک جگہ رعوایل اور دوسری جگہ یترو بیان کیا ہے۔ تالمودی لٹریچر میں ایک اور نام حوباب بھی نقل ہوا ہے۔ اِن میں سے یترو کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اِن کا نام نہیں، بلکہ لقب تھا۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدیان کی اولاد میں سے تھے۔ چنانچہ قیاس یہی ہے کہ حضرت موسیٰ کی طرح یہ بھی دین ابراہیمی کے پیرو تھے۔

[۱۶۰] بائیبل میں مزید تفصیل ہے کہ اُس روز لڑکیاں معمول کے خلاف وقت سے پہلے فارغ ہو کر گھر پہنچ گئیں تو باپ نے اِس کا سبب معلوم کرنا چاہا۔ اُنھوں نے بتایا کہ آج ایک مسافر نے ہمارے گلے کو خود بھر کر پانی پلا دیا ہے۔ اِس پر باپ نے فرمایا کہ تم نے اُسے چھوڑ کیوں دیا؟ جا کر اُسے بلاؤ کہ ہمارے ہاں روٹی کھائے۔

الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ۗ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٥﴾
قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ
الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿٢٦﴾

کے پاس پہنچا[۱۶۱] اور اپنا سارا قصہ اُسے سنایا تو اُس نے تسلی دی کہ اب اندیشہ نہ کرو، تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو۔[۱۶۲] ۲۵

اُن عورتوں میں سے ایک نے (یہ سب دیکھا تو ایک موقع پر اپنے باپ سے) کہا:[۱۶۳] ابا جان، اِسے ملازم رکھ لیجیے، اِس لیے کہ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں، وہی ہو

آیت میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے چرواہوں کی بھیڑ سے لڑکیوں کے الگ کھڑے ہونے اور موسیٰ علیہ السلام کو بلانے کے لیے شرماتے ہوئے آنے کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ یہ اُن کے شریفانہ اطوار کی تصویر ہے جس کی طرف قرآن توجہ دلانا چاہتا ہے۔

۱۶۱ اِس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اِسے اپنی دعا کی قبولیت اور تائید غیبی سمجھا اور بغیر کسی تردد کے فوراً اُس کے ساتھ ہو لیے۔ یہ سن لینے کے باوجود کہ اُنھیں ایک ذرا سی خدمت کا بدلہ دینے کے لیے بلایا جا رہا ہے، اُنھوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اِس موقع پر خواہ مخواہ خودداری کا مظاہرہ کریں اور اُن کے پروردگار نے جو سامان میزبانی فراہم کر دیا ہے، اُسے رد کر دیں۔

۱۶۲ یہ ٹھیک اُس دعا کی قبولیت کی بشارت تھی جو موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے نکلتے ہوئے کی تھی کہ ’رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ‘ (پروردگار، تو مجھے اِن ظالم لوگوں سے نجات عطا فرما دے)۔

۱۶۳ آیت کے اسلوب سے واضح ہے کہ یہ لڑکی وہ نہیں تھی جو موسیٰ علیہ السلام کو بلانے گئی تھی، بلکہ دوسری تھی۔

قَالَ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡکِحَکَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ ہٰتَیۡنِ عَلٰۤی اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ
ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِکَ ۚ وَمَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ
اَشُقَّ عَلَیۡکَ ؕ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ
ذٰلِکَ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَکَ ؕ اَیَّمَا الۡاَجَلَیۡنِ قَضَیۡتُ فَلَا عُدۡوَانَ عَلَیَّ ؕ

سکتا ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔[۱۶۴] ۲۶

اُس کے باپ نے موسیٰ سے کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی اِن دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمھارے ساتھ کر دوں، بشرطیکہ تم آٹھ سال میری ملازمت کرو۔ پھر اگر دس سال ہی پورے کر دو تو یہ تمھاری مرضی ہے۔ میں تم پر کوئی مشقت نہیں ڈالنا چاہتا۔[۱۶۵] خدا نے چاہا تو آگے تم مجھے ایک بھلا آدمی پاؤ گے۔ موسیٰ نے کہا: (ٹھیک ہے)، یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔ میں اِن دونوں میں سے جو مدت بھی پوری کر دوں، اُس

---

[۱۶۴] قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کے والد غالباً پہلے ہی سے اپنے گھر اور جایداد کی دیکھ بھال کے لیے کسی موزوں آدمی کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ اُس نے سفارش کر دی اور سفارش کے وجوہ بھی بیان کر دیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... جہاں تک جسمانی صحت و قوت کا تعلق ہے، یہ ایک ایسی کھلی ہوئی چیز ہے کہ آدمی بہ یک نظر اِس کا اندازہ کر سکتا ہے، لیکن امانت و دیانت کا تعلق کردار سے ہے جس کا صحیح صحیح اندازہ تجربے سے ہوتا ہے۔ یہ تجربہ عام حالات میں تو بہت دیر میں ہوتا ہے، لیکن بعض حالات میں بالکل باول وہلہ ہو جاتا ہے۔ آدمی کی پیشانی اور اُس کی نگاہیں گواہی دیتی ہیں کہ یہ کس کردار کا آدمی ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۶۷۰)

[۱۶۵] یعنی تمھیں ایسی کسی بات کا پابند نہیں کرنا چاہتا جو تمھیں منظور نہ ہو، اِس لیے تم اچھی طرح غور کر کے فیصلہ کر سکتے ہو۔

وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلٌ ﴿۲۸﴾

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَھْلِہٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَھْلِہِ امْکُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْکُمْ مِّنْھَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَۃٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّکُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

فَلَمَّآ اَتٰھَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَۃِ الْمُبٰرَکَۃِ

کے بعد مجھ پر کوئی جبر نہیں ہے اور جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں، اُس پر اللہ گواہ ہے۔ ۲۷-۲۸

پھر جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور اپنے اہل و عیال کو لے کر (وہاں سے) روانہ ہوا تو طور کی جانب سے اُسے ایک آگ سی دکھائی دی۔[۱۶۶] اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا: مجھے آگ دکھائی دی ہے، تم لوگ ذرا ٹھیرو کہ وہاں سے میں تمھارے پاس (رستے کی) کوئی خبر یا آگ کا کوئی انگارا ہی لے آؤں تاکہ (اِس سردی میں) تم اُسے تاپ سکو۔[۱۶۷] ۲۹

پھر جب موسیٰ وہاں پہنچا تو وادی ایمن کے کنارے سے، اُس مبارک خطے میں[۱۶۸]،

---

[۱۶۶] اصل میں لفظ 'اٰنَسَ' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آگ کا کوئی جلتا ہوا الاؤ نہیں، بلکہ ایک شعلہ سا دیکھا تھا جو اچانک چمکا اور غائب ہو گیا اور اُن کے سوا شاید کسی اور کو نظر بھی نہیں آیا۔

[۱۶۷] اِس سے معلوم ہوا کہ رات کا وقت تھا اور اُنھیں راستے کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

[۱۶۸] یعنی مبارک وادی کے کنارے سے جو طور کے مبارک خطے میں تھی۔ اِنھیں مبارک اِس لیے کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام یہاں اپنے پروردگار کی تجلی اور اُس کے کلام سے نوازے گئے۔ اللہ تعالیٰ زمین کے کسی ٹکڑے یا کسی علاقے کو اپنے نور و ظہور کے لیے منتخب کر لیں تو وہ یقیناً مبارک ہو گا اور اُس کے قدوسیوں کی جلوہ گاہ بن جائے گا۔ 'الوَاد' اور 'البُقْعَۃ' کے لیے آیت میں یہ صفات اِسی حقیقت کی وضاحت کے لیے آئی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو آواز سنی، وہ ایک متعین جہت

مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰۤى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۰) وَاَنْ اَلْقِ
عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰۤى
اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ قف اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (۳۱) اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ
تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ز وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ
الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ

اُس کو درخت سے آواز آئی کہ اے موسیٰ، میں ہوں اللہ، جہانوں کا پروردگار[۱۶۹] اور یہ بھی کہ اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دو۔ پھر جب موسیٰ نے دیکھا کہ لاٹھی بل کھا رہی ہے، گویا کہ سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اُس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا[۱۷۰]۔ فرمایا: موسیٰ، آگے آؤ اور ڈرو نہیں، تم بالکل مامون ہو۔ اپنا ہاتھ ذرا اپنے گریبان میں ڈالو، وہ بغیر کسی مرض کے[۱۷۱] سفید (چمکتا ہوا) نکلے گا اور اِس کے لیے اپنا بازو اپنی طرف سکیڑ لو، جس طرح خوف سے سکیڑتے ہیں[۱۷۲]۔ سو تیرے پروردگار کی طرف سے

سے اور متعین درخت سے آئی تھی، جہاں کسی شیطان کے لیے دراندازی کا کوئی امکان نہ تھا۔

[۱۶۹] سورۂ نمل (۲۷: ۹) میں اِس مقام پر 'اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ گویا اِسی 'رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' کی صفت کو اُس کے مضمرات کے لحاظ سے بیان کر دیا ہے۔

[۱۷۰] یہ اُس فطری ردعمل کا بیان ہے جو رات کی تاریکی میں کسی سنسان جگہ پر اِس طرح کے کسی منظر کو دیکھ کر کسی شخص سے صادر ہو سکتا ہے۔

[۱۷۱] یہ اضافہ صاف واضح کر رہا ہے کہ یہاں بائیبل کی تردید مقصود ہے جس میں ہاتھ کی سفیدی کو برص بتایا گیا ہے۔

[۱۷۲] اصل میں 'مِنَ الرَّهْبِ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی 'ضمك من الرهب'۔ یہ اُسی طرح کا اسلوب ہے، جیسے دوسرے مقامات میں 'مِنَ الذُّلِّ' یا 'مِنَ الرَّحْمَةِ' وغیرہ کے اسالیب ہیں۔

كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾
قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾
وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ز
اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ

فرعون اور اُس کے درباریوں کے پاس جانے کے لیے یہ دو نشانیاں[۱۷۳] ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں[۱۷۴]۔ ۳۰-۳۲

موسیٰ نے عرض کیا کہ میرے پروردگار، میں تو اُن کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں، اِس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ اور میرا بھائی، ہارون، اُس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے، سو اُس کو میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیجیے وہ میری تائید کرے[۱۷۵]، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے۔ فرمایا: ہم تمھارے بھائی کو

---

[۱۷۳] اصل الفاظ ہیں: 'فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ'۔ اِن میں 'اِلٰى' سے پہلے ایک فعل حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ عربی زبان کا عام اسلوب ہے جس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

[۱۷۴] یہ وجہ بتائی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اِن غیر معمولی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے درباریوں کی طرف کیوں بھیجا جا رہا ہے۔

[۱۷۵] یہودی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون علیہ السلام اپنی قوم میں فصاحت بیان کے لیے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ اُن کے ہاں یہ کمی ہے، اِس کی تلافی کے لیے اُن کے بھائی کو اُن کا مددگار بنا دیا جائے۔

وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا
وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى
وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾
وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ
تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

تمھارے لیے قوت بازو بنائیں گے اور تم دونوں کو ایسا دبدبہ عطا کریں گے کہ وہ تم تک پہنچ نہ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے ساتھ جاؤ[۱۷۶]، تم دونوں اور جو تمھاری پیروی کریں گے، وہی غالب رہیں گے۔ ۳۳-۳۵

پھر جب موسیٰ ہماری اِن واضح نشانیوں کے ساتھ اُن کے پاس آیا تو اُنھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو محض گھڑا ہوا جادو ہے اور اِس طرح کی بات ہم نے اپنے اگلے باپ دادوں میں تو کبھی سنی ہی نہیں[۱۷۷]۔ ۳۶

موسیٰ نے جواب دیا: میرا پروردگار خوب جانتا ہے اُس کو بھی جو اُس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور اُس کو بھی جس کے لیے اگلے گھر کا اچھا انجام ہے۔

---

[۱۷۶] اصل میں 'بِاٰیٰتِنَا' کا لفظ آیا ہے۔ ہمارے نزدیک راجح یہی ہے کہ اِس سے پہلے ایک فعل محذوف مانا جائے۔

[۱۷۷] یعنی حضرت موسیٰ کی یہ بات کہ میں رب العٰلمین کا رسول ہوں اور مجھے اِس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں اُس کے پیغامات تمھیں پہنچا دوں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ
فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى
اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾
وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ

(اُس کے منکرین اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور)[۱۷۸] حق یہ ہے کہ اِس طرح کے ظالم کبھی فلاح نہ پائیں گے۔[۱۷۹] ۳۷

فرعون نے کہا: دربار کے لوگو، میں تو اپنے سوا تمھارے لیے کسی اور معبود سے واقف نہیں ہوں۔[۱۸۰] اچھا تو اے ہامان، تم میرے لیے مٹی کی اینٹوں کا پزاوہ لگواؤ اور ایک اونچا محل میرے لیے بنواؤ تاکہ موسیٰ کے خدا کو میں (آسمان میں) جھانک کر دیکھوں، اور میں تو اِسے ایک جھوٹا آدمی سمجھتا ہوں۔ ۳۸

فرعون اور اُس کے لشکروں نے زمین میں ناحق گھمنڈ کیا اور خیال کیا کہ وہ

---

[۱۷۸] یہ مقابل کا جملہ ہے جو اصل میں بربنائے قرینہ محذوف ہے۔

[۱۷۹] نہایت بلیغ اور شستہ اسلوب میں یہ اُس نتیجے کا اعلان ہے جو حق و باطل کی اُس کشمکش کا نکلنے والا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد مصر میں برپا ہو گئی تھی۔

[۱۸۰] یعنی زمین و آسمان کا کوئی خالق ہے تو ہوا کرے، تمھارا معبود تو میں ہی ہوں۔ فرعون نے یہ بات اِس لیے کہی کہ مصر میں اُسے سورج دیوتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ تاہم یہ کوئی سنجیدہ بات نہیں تھی، بلکہ محض استہزا کا جملہ تھا جو موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر کے لیے کہا گیا۔ اِسی طرح آگے کا جملہ بھی محل بنوانے کا کوئی سنجیدہ حکم نہیں ہے۔ فراعنہ و متمردین عہد رفتہ کے ہوں یا دور حاضر کے، ہمیشہ اِسی طرح حقائق کا مذاق اڑاتے رہے ہیں۔

اِلَيۡنَا لَا يُرۡجَعُوۡنَ ㊴ فَاَخَذۡنٰهُ وَجُنُوۡدَهٗ فَنَبَذۡنٰهُمۡ فِى الۡيَمِّ‌ ۚ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ ㊵ وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً يَّدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ‌ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ لَا يُنۡصَرُوۡنَ ㊶ وَاَتۡبَعۡنٰهُمۡ فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا لَعۡنَةً‌ ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ هُمۡ مِّنَ الۡمَقۡبُوۡحِيۡنَ ㊷ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَهۡلَكۡنَا الۡقُرُوۡنَ الۡاُوۡلٰى

ہماری طرف نہیں لوٹائے جائیں گے۔[۱۸۱] آخر اُسے اور اُس کے لشکروں کو ہم نے پکڑا، پھر اُنھیں سمندر میں پھینک دیا تو دیکھ لو کہ اِن ظالموں کا انجام کیسا ہوا۔[۱۸۲] ہم نے اُنھیں (ڈھیل دی اور) ایسے پیشوا بنا دیا کہ جہنم کی طرف بلاتے رہے۔[۱۸۳] قیامت کے دن اب اُن کی کوئی مدد نہ ہوگی۔ ہم نے اِس دنیا میں اُن کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے دن وہی خوار ہونے والوں میں ہوں گے۔ ۳۹-۴۲

اگلی بہت سی امتوں کو ہلاک کر دینے کے بعد ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی،[۱۸۴] لوگوں

---

[۱۸۱] یعنی اِس وجہ سے گھمنڈ کیا کہ وہ خدا کے سامنے کسی جواب دہی کا گمان نہیں رکھتے تھے۔

[۱۸۲] یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور آپ کے مخاطبین کے لیے تذکیر و تنبیہ بھی کہ اِس وقت جو دعوت برپا ہے، اُس کا نتیجہ بھی یہی نکلنے والا ہے۔

[۱۸۳] آیت میں لفظ 'اَئِمَّة' کے ساتھ 'جَعَلۡنَا' کا فعل ہے۔ یہ 'أمهلنا' کے مفہوم پر متضمن ہے اور 'یَدۡعُوۡنَ' سے پہلے فعل ناقص عربیت کے اسلوب پر حذف کر دیا گیا ہے۔ ہم نے ترجمے میں یہ چیزیں ملحوظ رکھی ہیں۔

[۱۸۴] یہ اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں کی طرف رسول بھیجے، لیکن اُن میں سے کوئی قوم بھی اُس دعوت کی علم بردار بن کر کھڑی نہیں ہوئی جو رسولوں کی

بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾
وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ
مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۙ﴿۴۴﴾ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ

کے لیے بصیرتوں کا سامان اور ہدایت و رحمت بنا کر[۱۸۵] تا کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ ۴۳
ہم نے جب موسیٰ کو اپنے اِس فیصلے سے آگاہ کیا[۱۸۶] (اے پیغمبر)، تو نہ تم طور کے
مغربی جانب موجود تھے اور نہ اِس واقعے کو دیکھنے والوں میں شامل تھے[۱۸۷]۔ لیکن
ہم نے بہت سی نسلیں اٹھائیں، پھر اُن پر ایک زمانہ گزر گیا (اور وہ ہماری یاد دہانی

طرف سے اُن کے سامنے پیش کی گئی۔ چنانچہ اتمام حجت کے بعد سب ہلاک کر دی گئیں۔ اِس کے بعد نبوت کا دوسرا دور شروع ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو یہ توفیق دی کہ وہ اپنے پیغمبر پر ایمان لائیں اور فلسطین کی سرزمین میں دعوت حق کا ایک مرکز قائم کر کے عالمی سطح پر اتمام حجت کا اہتمام کریں۔ اُن کا یہی منصب تھا جس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اُنھیں تورات کی صورت میں ایک باقاعدہ کتاب دی گئی۔

[۱۸۵] یعنی دنیا کی زندگی میں ہدایت اور آخرت میں خدا کی رحمت و عنایت۔ یہ دونوں لفظ واحد ہیں، لیکن اِن سے پہلے لفظ 'بَصَآئِر' آیت میں جمع استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ خدا کی یہ کتاب ایسی آیات اور ایسے دلائل پر مشتمل تھی جن سے لوگوں کی آنکھیں کھل سکتی تھیں۔

[۱۸۶] آیت میں تضمین ہے۔ چنانچہ 'قَضَيْنَا' میں 'عَهِدْنَا' کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے، جیسے 'عَهِدْنَآ إِلٰى إِبْرَاهِيْمَ'۔

[۱۸۷] اِس سے حضرت موسیٰ کی قوم کے لوگ مراد ہیں جو اُن کے ساتھ طور کے دامن میں موجود تھے۔

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا
مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ
رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

کو بھلا بیٹھے تو خدا کی عنایت سے اب تمھی یاد دلا رہے ہو)۔ تم مدین والوں کے درمیان بھی موجود نہ تھے، اُن کو ہماری آیتیں سناتے ہوئے، لیکن ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ تمھیں رسول بنائیں۔ (سو اُن کے واقعات بھی سنا رہے ہو)۔ اور تم طور کے پہلو میں بھی موجود نہ تھے، جب ہم نے موسیٰ کو پکارا تھا، لیکن اپنے پروردگار کی رحمت سے تم اُس سے بھی آگاہ کیے گئے، اِس لیے کہ اُن لوگوں کو خبردار کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں[۱۸۸]۔ ۴۴-۴۶

---

[۱۸۸] اِن آیتوں میں بعض فقرے دلالت قرینہ کی بنا پر حذف کر دیے گئے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس کے باوجود کہ تم نے یہ واقعات اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے، لیکن اِن کا آنکھوں دیکھا حال اِن لوگوں کو سنا رہے ہو اور اِس طرح سنا رہے ہو کہ لوگ جو کچھ جانتے ہیں، اُس کی تصحیح بھی ہو رہی ہے تو یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ تمھاری زبان پر اُس ہستی کا کلام جاری ہوا ہے جس کی نگاہوں سے ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی چیز بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ اگر سمجھنا چاہیں تو تنہا یہی بات اِن کو یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ تم خدا کے رسول ہو اور تم پر یہ کلام تمھارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جن لوگوں کے سامنے یہ بات کہی گئی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شب و روز سے واقف تھے اور خوب جانتے تھے کہ اِن معلومات کے لیے آپ کے پاس وحی الٰہی کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے من جانب اللہ ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے پر جو دلائل دیے ہیں، اُن میں سے یہ ایک

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا قف وقفة

ہم تمھیں نہ بھیجتے، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ جو کچھ اِنھوں نے آگے بھیجا ہے، اُس کے سبب سے کوئی آفت اِن پر آئے تو یہ کہنے لگیں کہ ہمارے پروردگار، تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور ایمان والوں میں سے ہوتے؟[۱۸۹] پھر جب ہماری طرف سے[۱۹۰] حق اِن کے پاس آ گیا تو اُنھوں نے کہہ دیا کہ جو کچھ موسیٰ کو ملا تھا، وہی اِس پیغمبر کو کیوں نہیں دیا گیا؟[۱۹۱] اِس سے پہلے کیا یہ اُس کا انکار نہیں کر چکے جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟[۱۹۲] اُنھوں نے کہا کہ (تورات اور قرآن)، دونوں جادو ہیں،

بڑی دلیل ہے جو کئی دوسرے مقامات پر بھی پیش کی گئی ہے۔

[۱۸۹] آیت کے مخاطب قریش ہیں۔ چنانچہ مدعا یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو کسی رسول کی بعثت کے بغیر ہی اِن کا مواخذہ کر سکتے تھے، اِس لیے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی ذریت، اُن کی روایات کے امین اور زمین پر خدا کے اولین معبد کے متولی ہیں۔ لیکن ازراہ امتنان ہم نے فیصلہ کیا کہ اِن کی گرفت سے پہلے اِن پر ایک رسول کے ذریعے سے اتمام حجت کیا جائے۔ ہم نے آپ کو اِسی مقصد سے بھیجا ہے۔ لہٰذا یہ متنبہ ہو جائیں، اِن پر اب خدا کی حجت پوری ہو چکی ہے۔

[۱۹۰] یعنی زمین و آسمان کے پروردگار کی طرف سے جس کے فیصلے نافذ ہو کر رہتے ہیں۔

[۱۹۱] یعنی عصا، ید بیضا اور اِسی نوعیت کے دوسرے معجزات جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے۔

[۱۹۲] یعنی اُن کے معجزات اور اُن پر نازل ہونے والی تورات کا۔ آگے اِسی کی وضاحت فرمائی ہے۔

وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ (۴۸)
قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰی مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۴۹) فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ
اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ ؕ

ایک دوسرے کے موافق، اور کہا کہ ہم اِن میں سے کسی کو بھی نہیں مانتے[۱۹۳]۔ ۴۷-۴۸

اِن سے کہو، پھر خدا کے ہاں سے کوئی اور کتاب لے آؤ جو اِن دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو، میں اُس کی پیروی اختیار کرلوں گا، اگر تم سچے ہو[۱۹۴]۔ اب اگر وہ تمھاری یہ بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ وہ صرف اپنی خواہشوں کے پیرو ہیں۔ اور اُن سے بڑھ کر کون گم راہ ہوگا جو خدا کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کے پیرو

---

[۱۹۳] قرآن نے جگہ جگہ تورات اور اُس کی پیشین گوئیوں کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ قریش نے یہ بات اُسی کے جواب میں کہی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ موسیٰ کا حوالہ دیتے ہو تو کیا موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی کتاب کو مانتے ہو؟ تم تو اِس سے پہلے تورات اور قرآن، دونوں کے بارے میں کہہ چکے ہو کہ یہ محض زبان و بیان اور فکر و خیال کی ساحری ہے جو لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ اِس سے زیادہ اِن کتابوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا اِنھیں اگر ایک دوسرے کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے تو ہم دونوں کو نہیں مانتے۔

[۱۹۴] ہدایت کے ہر سچے طالب کا موقف یہی ہونا چاہیے، جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو کھڑا ہونے کے لیے کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں کسی تعصب کی بنا پر تورات اور قرآن کی پیروی نہیں کر رہا۔ مجھے تو ہدایت حاصل کرنی ہے، وہ جہاں سے بھی ملے۔ تم اگر اِن دونوں سے بھی زیادہ کوئی ہدایت بخش کتاب خدا کی طرف سے پیش کر سکتے ہو تو ضرور کرو، میں بلا تامل اُس کی پیروی قبول کرلوں گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۰﴾
وَلَقَدۡ وَصَّلۡنَا لَہُمُ الۡقَوۡلَ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۵۱﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ
الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِہٖ ہُمۡ بِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا
بِہٖۤ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلِہٖ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ

بنے ہوئے ہیں[۱۹۵]۔ اِس طرح کے ظالم لوگوں کو اللہ ہرگز راہ نہ دکھائے گا[۱۹۶]۔ ۴۹-۵۰

ہم نے اپنی بات اِن لوگوں کے لیے برابر جاری رکھی ہے، اِس لیے کہ یہ یاددہانی حاصل کریں[۱۹۷]۔ (پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ) جن کو ہم نے اِس سے پہلے کتاب دی تھی، وہ اِس قرآن کو مانتے ہیں اور جب یہ اُنھیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اِس پر ایمان لائے ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ ہمارے پروردگار کی طرف سے حق آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تو اِس کے اترنے سے پہلے ہی اِس کو مانے ہوئے

---

[۱۹۵] اِس لیے کہ اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہلاکت کے گڑھے میں جا گریں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...نفس کی خواہشیں صرف اپنے مطالبے پورا کرنا چاہتی ہیں۔ اُن کے اندر حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت نہیں ہے اور بسا اوقات وہ اتنی زورآور ہو جاتی ہیں کہ بڑی آسانی سے انسان کی عقل کو بھی مغلوب کر لیتی ہیں۔ اِس وجہ سے انسان کے لیے فلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ اِن خواہشوں کی پیروی اللہ کی ہدایت کی روشنی میں کرے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۶۸۸)

[۱۹۶] اِس لیے کہ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہی سنت الٰہی ہے۔

[۱۹۷] یعنی قرآن میں برابر جاری رکھی ہے، جس کی سورتیں پے در پے اِسی مقصد سے نازل ہو رہی تھیں اور ایک ہی بات اتنے گوناگوں پہلوؤں اور متنوع دلائل کے ساتھ سمجھائی جا رہی تھی کہ کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے اُس سے انحراف کی گنجایش باقی نہیں رہ سکتی تھی۔

القصص
۲۸

اَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَيَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ﴿۵۴﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغۡوَ اَعۡرَضُوۡا عَنۡهُ وَقَالُوۡا لَنَآ

تھے۔[۱۹۸] یہی لوگ ہیں کہ اِن کی ثابت قدمی کے صلے میں اِنھیں اِن کا دہرا اجر دیا جائے گا۔[۱۹۹] یہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں[۲۰۰] اور ہم نے جو رزق اِنھیں دے رکھا

---

[۱۹۸] یہ قرآن کے حق میں صالحین اہل کتاب کی گواہی پیش کی ہے کہ اپنی قوم کے مفسدین کے علی الرغم وہ قرآن کی تصدیق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو اِس کے نزول سے پہلے ہی اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر منتظر تھے کہ یہ کتاب نازل ہو اور ہم اپنے آپ کو اِس کے حوالے کر دیں۔

[۱۹۹] یعنی ایک اجر اپنی قوم کے عام بگاڑ کے باوجود موسیٰ و مسیح علیہما السلام کی لائی ہوئی ہدایت پر ثابت قدمی کا اور دوسرا اجر اُس ہدایت کی تصدیق اور اُس کو قبول کرنے کا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ اِن کے لیے 'بِمَا صَبَرُوۡا' کی جو صفت آیت میں آئی ہے، اُس کا بھی ایک خاص محل ہے جو پیش نظر رہنا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... اِن لوگوں کو اپنے سابق دین پر قائم رہنے کے لیے بھی بڑے زہرہ گداز مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور جب اِنھوں نے اسلام قبول کیا تو اِن کو اپنی قوم اور قریش، دونوں کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن اِن تمام مخالفتوں کا اِنھوں نے پوری پامردی سے مقابلہ کیا۔ نصاریٰ میں سے شمعون کے پیرووں نے اپنی قوم کے مبتدعین و محرفین کے ہاتھوں جو مصائب جھیلے، اُن کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں .... موجود ہے ... یہی اہل حق تھے جن کو قرآن کی دعوت قبول کرنے کی توفیق حاصل ہوئی اور قرآن نے متعدد سورتوں میں اِن کی حق دوستی و ثابت قدمی کی تعریف فرمائی ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۶۹۰)

[۲۰۰] یعنی مخالفین جب اِنھیں اپنے اعتراضات و مطاعن اور سب و شتم کا نشانہ بناتے ہیں تو اُن کے مقابلے میں صبر و عزیمت اور عفو و درگذر سے کام لیتے ہیں۔

اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ ۫ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ ۫ لَا نَبۡتَغِى الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۵۵﴾
اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ

ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں[۲۰۱] اور جب بے ہودہ بات[۲۰۲] سنتے ہیں تو اُس سے اعراض کر لیتے ہیں اور ایسے لوگوں کو کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، تم کو سلام ہو[۲۰۳]، ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے[۲۰۴]۔ ۵۱-۵۵

(یہ اِس کے باوجود نہیں مانیں گے، اِس لیے زیادہ پریشان نہ ہو، اے پیغمبر)۔ تم جن کو چاہو، ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے، (اپنے قانون

---

[۲۰۱] یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اِنھیں زر پرستی اور حرص و طمع کی بیماری نہیں لگی ہوئی کہ قبول حق میں رکاوٹ بن جائے۔ یہ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ چنانچہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ اِنھیں یہ توفیق حاصل ہوئی کہ آگے بڑھ کر خدا کے پیغمبر کی تصدیق کریں اور اُس پر ایمان لائیں۔

[۲۰۲] بے ہودہ بات سے مراد یہاں وہی اعتراضات و مطاعن ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ آگے کا جملہ اِس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

[۲۰۳] یہ سلام مفارقت کے مفہوم میں ہے۔ اگر کوئی شخص جہالت پر اتر آئے تو اُس سے پیچھا چھڑانے کا یہ ایک شایستہ طریقہ ہے۔

[۲۰۴] یہ اُن کا قول نہیں ہے، بلکہ اُن کے طرز عمل کی تعبیر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...وہ دل میں یہ خیال کر کے کہ جاہلوں سے الجھنے سے کچھ فائدہ نہیں، اُن کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اِس طریقۂ تعبیر کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ بسا اوقات آدمی کا طرز عمل ہی اُس کے قول کا قائم مقام بن جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۶۹۱)

وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۵۶﴾
وَقَالُوۡۤا اِنۡ نَّـتَّبِعِ الۡهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفۡ مِنۡ اَرۡضِنَا ؕ اَوَلَمۡ

کے مطابق) ہدایت دیتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے اُن کو جو ہدایت پانے والے ہیں۔[۲۰۵] ۵۶

یہ (ظالم) کہتے ہیں کہ ہم اگر تمھارے ساتھ ہو کر اِس ہدایت کے پیرو بن جائیں تو ہم اپنی اِس سر زمین سے اچک لیے جائیں گے۔[۲۰۶] (اِس سے پہلے) کیا ہم نے

---

[۲۰۵] یعنی ہدایت پانے کے اہل ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر کر رکھی ہے۔

[۲۰۶] قریش یہ بات اِس لیے کہتے تھے کہ سر زمین عرب میں جو اقتدار اُنھیں حاصل تھا، اُس کے بارے میں اُن کا گمان تھا کہ یہ اُنھیں تمام قبائل عرب کے اصنام بیت اللہ میں جمع کر دینے سے حاصل ہوا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ دیوی دیوتا اپنی برکات بھی رکھتے ہیں اور مذہب و سیاست میں امامت اور پیشوائی کے جس منصب پر وہ اِس وقت فائز ہیں اور جس طرح کی معاشی خوش حالی میں زندگی بسر کر رہے ہیں، وہ بھی اِنھی کی بدولت اُنھیں ملی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید کی دعوت تھی۔ چنانچہ اُنھیں اندیشہ ہوا کہ وہ اگر اِس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو بت پرست قبائل کے ساتھ اُن کے تمام معاہدانہ تعلقات ختم ہو جائیں گے، اُن کی تجارت بند اور جمعیت پارہ پارہ ہو جائے گی اور تمام عرب اُن کے خلاف بھڑک اٹھے گا، بلکہ بعید نہیں کہ اِس کے نتیجے میں قبائل عرب اُنھیں اِس سر زمین ہی سے نکلنے پر مجبور کر دیں اور بیت اللہ کی تولیت خود سنبھال لیں جو اب اِن قبائل کے لیے بھی عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بن چکا تھا۔ اُن کے کفر و انکار کو اِس پس منظر میں دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا ایک بڑا سبب اُن کا یہ اندیشہ بھی تھا۔

نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾
وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ

اِن کو اِس امن والے حرم میں تمکن عطا نہیں فرمایا جس کی طرف ہر چیز کی پیداوار یں خاص ہماری عنایت سے کھنچتی چلی آ رہی ہیں[۲۰۷]؟ لیکن اِن میں سے اکثر اِس بات کو نہیں جانتے[۲۰۸]۔ ۵۷

(قریش کے لوگو)، کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر چھوڑی ہیں جو اپنی معیشت پر ناشکری

۲۰۷؎ یہ اُن کے عذر کا جواب ہے کہ جسے اپنی تدبیر و سیاست کی کرشمہ سازی سمجھ رہے ہو، وہ اِسی حرم کا اعجاز ہے جس کی بدولت تم اِس سرزمین میں متمکن ہو۔ ڈھائی ہزار برس پہلے تمھارے باپ ابراہیم نے تمھیں اِس بے آب و گیاہ وادی میں لا کر آباد کیا تھا۔ اُس وقت سے اب تک جو امن و امان تمھیں یہاں میسر رہا ہے اور جس امامت و سیادت کے حامل بنے رہے ہو، وہ اِسی حرم کی وجہ سے ہے۔ پتھر اور گارے کے اِسی ایک حجرے کو خدا کے حکم سے حرم قرار دے کر ابراہیم نے تمھارے لیے رزق و امن کی دعا کی تھی جس کی برکت سے آج دیکھتے ہو کہ تمھارا یہ شہر عرب کا مرکز بنا ہوا ہے، عرب کا بچہ بچہ اِسے احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور ہر سال ہزارہا انسان حج و عمرہ کے لیے اِس میں چلے آتے ہیں۔ چنانچہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا بھر کے میوے، پھل اور قسم قسم کی پیداواریں یہاں کھنچی چلی آ رہی ہیں۔

۲۰۸؎ یہ اُن کے حال پر اظہار افسوس ہے کہ اُن کی اکثریت اپنی تاریخ سے کس قدر بے خبر ہو چکی ہے اور جس ہستی نے یہ سب کچھ اُنھیں دیا ہے، آج اُسی کو بھول کر وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ اپنی زندگی اور خوش حالی کے لیے وہ شرک اور بت پرستی جیسی غلاظت ہی میں رہنے بسنے کے لیے مجبور ہیں۔

لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

کر کے اترا گئی تھیں[۲۰۹]۔ سو یہ اُنھی کے مسکن ہیں جن میں اُن کے بعد کوئی کم ہی بسا ہے[۲۱۰] اور اُن کے وارث پھر ہم ہی ہوئے ہیں[۲۱۱]۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا پروردگار اِن بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں تھا، جب تک اِن کے مرکز میں کسی رسول کو نہ بھیج لے جو ہماری آیتیں اِنھیں پڑھ کر سنا دے[۲۱۲]۔ اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم بستیوں کو اُسی وقت ہلاک کرتے ہیں، جب اُن کے لوگ اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بن جاتے ہیں[۲۱۳]۔ ۵۸-۵۹

---

۲۰۹ اصل الفاظ ہیں: 'بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا'۔ اِن میں 'بَطِرَتْ' 'کفرت' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ چنانچہ 'مَعِيْشَتَهَا' اِسی بنا پر منصوب ہو گیا ہے۔

۲۱۰ یعنی کوئی بسنے والا نہیں بسا، الّا یہ کہ گڈریوں، چرواہوں اور خانہ بدوشوں نے کبھی اپنے ڈیرے اِن میں ڈال لیے ہوں تو ڈال لیے ہوں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ کی اجڑی ہوئی بستیوں کی طرف ہے، جہاں سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے رہتے تھے۔

۲۱۱ اِس لیے کہ زمین و آسمان اور اُن کے درمیان کی سب چیزوں کے حقیقی مالک ہم ہی ہیں۔

۲۱۲ مطلب یہ ہے کہ خبردار ہو جاؤ، سنت الٰہی کا یہ مرحلہ تمھارے لیے بھی پورا ہو گیا ہے اور خدا کا رسول اِسی مقصد سے شب و روز تمھیں انذار کر رہا ہے۔

۲۱۳ ظلم ڈھانے سے مراد یہاں رسول کی تکذیب ہے، جب کہ اُس کی حقانیت واضح ہو چکی ہو۔ اِس میں بھی وہی تنبیہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے کہ یہی ظلم تم بھی اپنے اوپر ڈھا رہے ہو، اِس لیے ضد، ہٹ دھرمی اور عناد پر جمے رہو گے تو اُسی انجام کو پہنچو گے جس کو اِن سب بستیوں کے لوگ تم سے پہلے پہنچ چکے ہیں۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا
عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝٦٠ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا
حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝٦١
وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝٦٢
قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ
كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ؗ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ۝٦٣

القصص
۲۸

تمھیں جو چیز بھی دی گئی ہے، وہ دنیا کی زندگی کا سامان اور اُس کی زینت ہی ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے، وہ اِس سے بہتر بھی ہے اور پایدار بھی۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو؟ بھلا وہ شخص کہ جس سے ہم نے اچھا وعدہ[۲۱۴] کیا ہے اور وہ اُسے لازماً پا کر رہے گا، اُس شخص کے برابر ہو جائے گا جسے ہم نے دنیا کی زندگی کا سامان دیا ہے، پھر قیامت کے دن وہ پکڑ بلایا جانے والا ہے؟ ۶۰-۶۱

یہ اُس دن کا دھیان کریں، جب خدا اِنھیں پکارے گا، پھر پوچھے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کا تم دعویٰ کرتے تھے؟ (اُن کے زعما) جن پر بات پوری ہو چکی ہوگی[۲۱۵] (اِس اندیشے سے کہ تمام ذمہ داری کہیں اُن پر نہ ڈال دی جائے)، فوراً بول اُٹھیں گے کہ ہمارے پروردگار، یہ لوگ جنھیں ہم نے بہکایا، اِنھیں ہم نے

---

[۲۱۴] یعنی آخرت کی ابدی بادشاہی کا وعدہ۔

[۲۱۵] یعنی خدا کا فیصلۂ عذاب جن کے لیے صادر ہو چکا ہوگا۔

وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ
وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿٦٤﴾
وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٦٥﴾ فَعَمِيَتْ

اُسی طرح بہکایا ہے، جس طرح ہم خود بہکے تھے۔[۲۱۶] تیرے حضور ہم اِن سے براءت کرتے ہیں۔ یہ ہم کو نہیں پوجتے تھے۔ ۶۲-۶۳

(اُس وقت) کہا جائے گا: اچھا، اب اپنے شریکوں کو بلاؤ۔ سو (گھبرا کر) اُنھیں بلائیں گے، مگر وہ اِنھیں جواب نہ دیں گے[۲۱۷] اور یہ اپنا عذاب دیکھ لیں گے۔ اے کاش، یہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے! ۶۴

اور اُس دن کا دھیان کریں، جب خدا اِنھیں پکارے گا، پھر پوچھے گا کہ تم نے

---

[۲۱۶] مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اپنی خواہشات کی پیروی کی اور گم راہ ہوئے، یہ بھی اُسی طرح اپنی خواہشات کے اسیر ہو کر ہماری باتیں اپنی پسند سے مانتے رہے ہیں۔ اِس لیے بہکے ہیں تو آپ ہی اِس کے ذمہ دار ہیں۔

[۲۱۷] اِس لیے کہ وہ محض خیالی ہستیاں تھیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا کہ آج قیامت میں جواب دینے کے لیے موجود ہوتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... یہاں ذکر مشرکین عرب کا ہے جن کے تمام اصنام والٰہ محض خیالی اور خود تراشیدہ تھے۔ جن قوموں نے کسی واقعی ہستی کی پرستش کی ہے، مثلاً نصاریٰ جنھوں نے حضرت مسیح کی پرستش کی، اُن کا ذکر قرآن میں الگ ہوا ہے کہ قیامت کے دن حضرت مسیح اپنے پرستاروں سے اعلان براءت کر دیں گے کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کچھ احمق لوگوں نے میری پرستش کی ہے۔ میں نے تو سب کو اللہ واحد کی بندگی کی دعوت دی تھی۔“ (تدبر قرآن ۵/۶۹۹)

عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٦٦﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿٦٧﴾
وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ
صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ

رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟ تو اُس دن اِن کی سٹی بھول جائے گی، پھر آپس میں بھی کچھ نہ پوچھ سکیں گے۔ ہاں، جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کیے، اُسے توقع رکھنی چاہیے کہ اُس دن وہ فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔[۲۱۸] ۶۵-۶۷

تیرا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، منتخب کر لیتا ہے۔ اِس میں اُن کا کوئی اختیار نہیں ہے۔[۲۱۹] (سو) اللہ پاک اور برتر ہے اُس سے جو یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔ تیرا پروردگار جانتا ہے جو کچھ یہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ (پھر وہ کسی کو اپنا شریک کیوں بنائے گا)؟[۲۲۰] وہی اللہ ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت میں

---

[۲۱۸] توقع رکھنی چاہیے، اِس لیے کہ نجات اور فلاح جس کو بھی حاصل ہوگی، خدا کی عنایت ہی سے حاصل ہوگی۔

[۲۱۹] یعنی جنھیں منتخب کیا جاتا ہے، اُن کا کوئی اختیار نہیں ہے کہ اُن کے صفات و افعال کو اُن کی کوئی ذاتی چیز قرار دے کر اُنھیں خدا کی خدائی میں شریک بنا لیا جائے۔ یہ اشارہ خاص طور پر فرشتوں کی طرف ہے جن کے بت مشرکین عرب پوجتے تھے۔

[۲۲۰] یہ احاطۂ علم الٰہی سے شرک کا ابطال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا ہر چیز کے

فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ ز وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٧٠﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ
اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ
اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِضِیَآءٍ ط اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ

وہی شکر کا سزاوار ہے۔ اُسی کے اختیار میں فیصلہ ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۶۸-۷۰

اِن سے کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ روز قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھیں روشنی لا دے گا؟[۲۲۱] پھر کیا سنتے نہیں ہو؟[۲۲۲] کہو

سر و علانیہ سے خود باخبر ہے تو اُس کو شریک بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...وہ اپنی مملکت میں دوسروں کو شریک تو جب بنائے، جب وہ لوگوں کے حالات و معاملات سے باخبر رہنے کے لیے کسی کا محتاج ہو اور اُس کے ہاں کسی کے باب میں کسی کی سفارش کی ضرورت تو جب پیش آئے، جب کوئی اُس کے علم میں اضافہ کرنے کے پوزیشن میں ہو کہ فلاں کے باب میں نعوذ باللہ خدا کو خبر نہیں ہے، اُسے ہے۔ جب اِس طرح کی کوئی بات فرض کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے تو فرشتوں کو اِس مفروضے پر پوجنے کے کیا معنی کہ وہ خدا کے ہاں کسی کے لیے تقرب و سفارش کا وسیلہ ہیں!“ (تدبر قرآن ۵/۷۰۱)

[۲۲۱] روشنی زندگی کی سرگرمیوں کے لیے ہے۔ یہ بات چونکہ بالکل واضح تھی، اِس لیے یہاں اِسے ظاہر نہیں کیا۔ آگے کی آیت میں اِس کی وضاحت ہو گئی ہے۔

[۲۲۲] آگے دن کے ذکر میں فرمایا ہے کہ ”پھر کیا دیکھتے نہیں ہو“۔ یہ اسلوب تصویر حال کے لیے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...گویا پہلی بات شب کے اندھیرے میں فرمائی جا رہی ہے کہ اگر رات کے اندھیرے میں تمھیں سجھائی نہیں دے رہا ہے تو کیا سنائی بھی نہیں دے رہا ہے تو آخر اِس بات کو سنتے کیوں نہیں! اِسی طرح دوسری بات گویا دن کی روشنی میں فرمائی جا رہی ہے کہ اِس وقت تو پورے دن

القصص
۲۸

اللّٰہُ عَلَیْکُمُ النَّہَارَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ
اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِلَیْلٍ تَسْکُنُوْنَ فِیْہِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِہٖ
جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّہَارَ لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ
وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

وَیَوْمَ یُنَادِیْہِمْ فَیَقُوْلُ اَیْنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾
وَنَزَعْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیْدًا فَقُلْنَا ہَاتُوْا بُرْہَانَکُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ

کہ بتاؤ، اگر اللہ روز قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن ہی کیے رہے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھیں رات لا دے گا جس میں تم سکون پاتے ہو؟ پھر کیا دیکھتے نہیں ہو؟ یہ اُسی کی رحمت ہے کہ اُس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، اِس لیے کہ رات میں سکون حاصل کرو اور اِس لیے کہ دن میں اپنے رب کا فضل تلاش کرو، اور اِس لیے کہ تم اُس کے شکر گزار رہو۔ ۷۱-۷۳

یہ اُس دن کا دھیان کریں، جب خدا اِنھیں پکارے گا، پھر پوچھے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کا تم دعویٰ کرتے تھے؟ اور ہر امت میں سے ہم ایک گواہ نکال لائیں

کی روشنی موجود ہے تو کیا اِس روشنی میں بھی تمھیں یہ بدیہی حقیقت نظر نہیں آ رہی ہے!

اِس میں یہ بلاغت بھی ہے کہ معقولات کو محسوسات کی حیثیت دے دی گئی ہے جس میں اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بدیہیات ہیں جن کو سمجھنے کے لیے زیادہ تامل و فکر کی ضرورت نہیں ہے، یہ کافی ہے کہ آدمی کے کان اور اُس کی آنکھیں کھلی ہوں۔ لیکن تمھارا حال تو یہ ہے کہ نہ شب کے سکون میں تمھیں کچھ سنائی دیتا نہ دن کے اجالے میں کچھ دکھائی دیتا۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۷۰۲)

لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝٧٥
اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ

گے،[۲۲۳] پھر لوگوں سے کہیں گے کہ اپنی دلیل لاؤ۔ تب اُن پر واضح ہو جائے گا کہ حق خدا کی طرف ہے اور جو کچھ جھوٹ وہ باندھتے رہے تھے، وہ سب اُن سے کھوئے جائیں گے۔ ۷۴-۷۵

(یہ اپنے ساز و سامان پر نہ اترائیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ) قارون موسیٰ کی قوم ہی میں سے تھا،[۲۲۴] پھر وہ اُن کے خلاف سرکش ہو گیا۔[۲۲۵] ہم نے اُس کو اتنے خزانے دے

---

[۲۲۳] یعنی انبیا و رسل جنھوں نے اپنی امتوں پر دین کی گواہی دی تھی۔

[۲۲۴] بائیبل میں اِس کا نام قورح آیا ہے۔ یہ بنی لاوی میں سے اور موسیٰ علیہ السلام کے سگے چچا کا لڑکا تھا۔ یہاں روے سخن قریش کے رؤسا، خاص طور پر، ابولہب کی طرف ہے۔ یہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا اور دولت مندی کے لحاظ سے گویا قریش کا قارون ہی تھا۔ بخل، تکبر، قساوت قلبی، پیغمبر سے عناد اور حلال و حرام میں امتیاز سے بے پروائی میں یہ دونوں بالکل مماثل تھے۔ قرآن نے یہ واقعہ اِسی بنا پر سنایا ہے۔ اِس کو پڑھتے ہوئے اِس کا یہ پہلو سامنے رہنا چاہیے۔ اِس کی اصلی حکمت اِسی سے واضح ہو گی۔

[۲۲۵] اِس کا سبب یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم نے موسیٰ علیہ السلام کی امامت و سیادت تسلیم کر لی اور اُن کے ساتھ ہجرت کر کے مصر سے نکل آئی۔ اِس سے اِس کو بڑا حسد ہوا اور اِس نے یہ نعرہ بلند کر دیا کہ اِس جماعت کا تو ہر آدمی مقدس ہے اور خدا کی معیت بھی پوری جماعت کو حاصل ہے، پھر موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کے لیے یہ امتیاز کیوں کہ وہ قوم کی امامت و پیشوائی کریں؟ چنانچہ اپنے خاندان اور عام بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں کو ساتھ ملا کر یہ اُن کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اِس کی یہی بغاوت ہے جس کا ذکر قرآن نے 'فَبَغٰى عَلَيْهِمْ' کے الفاظ میں کیا ہے۔ بائیبل میں ہے:

> ''اور قورح بن اضہار بن قہات بن لاوی نے بنی روبن میں سے الیاب کے بیٹوں داتن اور ابیرام اور پلت کے بیٹے اون کے ساتھ مل کر اور آدمیوں کو ساتھ لیا۔ اور وہ اور بنی اسرائیل میں سے ڈھائی سو اور اشخاص جو جماعت کے سردار اور چیدہ اور مشہور آدمی تھے، موسیٰ کے

الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ
قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ

رکھے تھے کہ اُن کی کنجیاں کئی طاقت ور مردوں کی جماعت بھی مشکل ہی سے اٹھاتی تھی[۲۲۶]۔ جب اُس کی قوم کے لوگوں[۲۲۷] نے اُسے نصیحت کی کہ اتراؤ مت، اِس لیے کہ

مقابل میں اٹھے۔ اور وہ موسیٰ اور ہارون کے خلاف اکٹھے ہو کر اُن سے کہنے لگے: تمھارے تو بڑے دعوے ہو چلے، کیونکہ جماعت کا ایک ایک آدمی مقدس ہے اور خداوند اُن کے بیچ رہتا ہے، سو تم اپنے آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا کیوں کر ٹھیراتے ہو۔'' (گنتی ۱۶: ۱-۳)

[۲۲۶] یہ اُس کی سرکشی اور استکبار کا سبب بیان فرمایا ہے۔ اِسے مبالغے کا کوئی اسلوب نہ سمجھیے، یہ بیان واقعہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اُس زمانے میں خزانوں کی حفاظت کے لیے اُس طرح کی تجوریاں، آہنی الماریاں اور سیف نہیں ہوتے تھے، جس طرح کے ہمارے زمانے میں ہوتے ہیں اور نہ اُس طرح کے صیقل کردہ قفل اور کنجیوں ہی کا رواج تھا جن کا اب ہے۔ اُس زمانے کے بڑے سرمایہ دار بالعموم زمین دوز خزانے بناتے اور اُن کو محفوظ کرنے کے لیے اُن کے پھاٹکوں اور دروازوں میں بڑے بڑے آہنی کنڈے لگا کر اُن میں بھاری بھاری آہنی اڑنگے، جو خاص اِسی غرض کے لیے تیار کیے جاتے، پھنساتے۔ اِن اڑنگوں کو پھنسانا اور اِن کو کھولنا، دونوں ایک مشکل کام ہوتا اور اِن کے تمام لوازم مل ملا کر ایک بھاری بوجھ بن جاتے۔ جب بھی اِن کو ہٹانے یا اٹھانے کی ضرورت پیش آتی تو ایک طاقت ور جماعت کی ضرورت ہوتی۔ یہی طریقہ اُس زمانے میں شہر پناہوں اور قلعوں کے آہنی دروازوں کو بند کرنے کے لیے بھی اختیار کیا جاتا۔ اِس طریقہ کی بعض یادگاریں اب بھی ہماری دیہاتی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ آیت میں اِسی طرح کی کنجیوں کی طرف اشارہ ہے۔ عرب میں جس طرح کسی کے پاس بھاری بھاری دیگوں کا پایا جانا اُس کی فیاضی کی دلیل تھا، اُسی طرح اِس قسم کی کنجیوں کا پایا جانا اُس کی سرمایہ داری کی نشانی تھا۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۷۰۸)

[۲۲۷] قرینہ دلیل ہے کہ اِس سے قوم کے اصحاب علم مراد ہیں۔ تاہم پوری قوم چونکہ اُن

اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ
اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۷۷

القصص
۲۸

اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا[۲۲۸] اور جو کچھ خدا نے تمھیں دے رکھا ہے، اُس میں آخرت کے گھر کے طلب گار بنو اور اِس دنیا سے اپنا حصہ وہاں لے جانا نہ بھولو اور جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے، اُسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو[۲۲۹] اور زمین میں فساد کے خواہاں نہ ہو، اِس لیے کہ اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا[۲۳۰]۔ ۷۶-۷۷

کی پشت پر تھی اور صرف تھوڑے سے مفاد پرست ہی الگ تھے جو قارون کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، اِس لیے لفظ 'قَوْم' استعمال فرمایا ہے۔ آگے آیت ۸۰ میں اِس کی وضاحت ہوگئی ہے۔

۲۲۸؎ یہ قوم کے دانش مند لوگوں نے نہایت شایستہ الفاظ میں اُس کو تنبیہ کی ہے کہ خدا کی نعمتیں پا کر جو لوگ اُن کے غرور میں خدا ہی کے خلاف اکڑنے کی جسارت کریں، وہ بالآخر خدا کی پکڑ میں آجاتے ہیں۔

۲۲۹؎ یہی وہ حکمت و معرفت ہے جس کے بارے میں دوسری جگہ فرمایا ہے کہ جس کو یہ عطا ہوئی، اُسے خیر کثیر کا خزانہ عطا کر دیا گیا۔ مدعا یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز سراسر خدا کی بخشش ہے، اِسے اپنے اب و جد کی میراث اور اپنی قابلیت و استحقاق کا کرشمہ خیال نہ کرو۔ تمھاری ابدی زندگی میں جو کچھ اِس میں سے تمھارے کام آئے گا، وہ اِس کا وہی حصہ ہے جو خدا کی راہ میں خرچ کر کے تم یہاں سے وہاں لے جاؤ گے۔ یہ خدا کا احسان ہے کہ اُس نے تمھیں اِس قدر مال و دولت سے نوازا ہے۔ وہ اپنی صفات کا عکس اپنے بندوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے اور اُنھی لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اُس کے بندوں کے معاملے میں اِسی طرح محسن ہو کر زندگی بسر کریں۔

۲۳۰؎ یہ اُسی علو و استکبار اور سرکشی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ
اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ
جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (۷۸)
فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (۷۹)

اُس نے جواب دیا: یہ سب تو مجھے میرے ذاتی علم کی بنا پر ملا ہے[۲۳۱]۔۔۔۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اللہ اُس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت میں اُس سے بڑھ کر اور جمعیت میں اُس سے کہیں زیادہ تھیں۔ اِس طرح کے مجرموں سے تو اُن کے گناہوں کے بارے میں سوال بھی نہیں کیا جاتا[۲۳۲]۔ ۷۸

سو (ایک دن) وہ اپنی شان و شوکت کے ساتھ اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے نکلا[۲۳۳] تو دنیا کی زندگی کے طلب گار (اُسے دیکھ کر) کہنے لگے کہ جو کچھ قارون کو ملا ہے، اے کاش، ہمیں بھی ملا ہوتا! اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بڑی قسمت والا ہے۔ اور

---

[۲۳۱] یعنی اُس قابلیت، مہارت فن اور حسن تدبیر سے ملا ہے جو مال کمانے کے لیے میرے اندر موجود ہے۔ اِس کا خدا سے کیا تعلق کہ اِس میں اُس کا کوئی حق قائم ہو جائے؟

[۲۳۲] یعنی اِس کے مستحق بھی نہیں ہوتے کہ اُن کی بات ہی سن لی جائے۔ اُن کے گناہ اُن کی پیشانی پر لکھے ہوتے ہیں اور خدا کی بارگاہ میں اُن کے ہاتھ پاؤں، بلکہ ایک ایک بن مو اُن کے جرائم کی گواہی دے رہا ہوتا ہے۔

[۲۳۳] شان و شوکت کے اِس مظاہرے کی ضرورت غالباً اِس لیے پیش آئی کہ موسیٰ علیہ السلام کی امامت و سیادت کے خلاف جو تحریک اُس نے اٹھا دی تھی، اُس کے لیے لوگوں کو متاثر کیا جائے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ج وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ قف فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ق وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ

جن کو علم کی دولت[۲۳۴] عطا ہوئی تھی، وہ بول اٹھے کہ شامت کے مارو، جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، اُن کے لیے خدا کا اجر اِس سے کہیں بہتر ہے ___ (یہی وہ حکمت ہے جس کی ہر شخص کو تمنا کرنی چاہیے) اور یہ اُنھی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہوں[۲۳۵]۔ ۷۹-۸۰

پھر ہوا یہ کہ ہم نے قارون اور اُس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا تو نہ کوئی جماعت اُس کے لیے اُٹھی کہ خدا کے مقابل میں اُس کی مدد کرتی اور نہ وہ آپ ہی اپنے آپ کو بچا سکا[۲۳۶]۔ اب وہی جو کل اُس کی جگہ ہونے کی تمنا کر رہے تھے، پکار

---

[۲۳۴] یعنی خدا کی معرفت اور آخرت کے علم کی دولت۔ اِس لیے کہ یہی حقیقی علم ہے اور انسان کو اصلی روشنی اِسی سے حاصل ہوتی ہے۔

[۲۳۵] یعنی جن کے اندر دنیا کی رغبات و مطامع کے مقابل میں ایمان و عمل پر جمے رہنے کی ہمت ہو۔ اِس کے لیے اصل میں 'لَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ضمیر کا مرجع وہ حکمت و موعظت ہے جس کی تلقین کی گئی ہے۔ عربی زبان میں ضمیریں اِس طرح بھی آتی ہیں۔ اِس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

[۲۳۶] بائیبل میں اِس کی تفصیل ہے کہ جب قارون کی بغاوت فتنہ بننے لگی تو موسیٰ علیہ السلام نے اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو خیمۂ اجتماع کے سامنے مباہلے کی دعوت دی تا کہ خدا کی جماعت کے لیے خدا ہی کا فیصلہ صادر ہو جائے۔ چنانچہ لکھا ہے:

لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ
بِنَا ۗ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾
تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا

اٹھے: ارے، یہ تو وہی بات ہو گئی (جو ہمیں بتائی جا رہی تھی) کہ اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے، روزی کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر عنایت نہ فرمائی ہوتی تو ہمیں بھی اسی طرح دھنسا دیتا۔ ارے غضب، یہ تو وہی بات ہو گئی کہ منکرین فلاح نہیں پائیں گے۔ ۸۱-۸۲

یہ آخرت کا گھر (جس کا ذکر ہوا)[۲۳۷]، اِسے ہم اُنھی کے لیے خاص رکھیں گے جو

”...اور داتن اور ابیرام اپنی بیویوں اور بیٹوں اور بال بچوں سمیت نکل کر اپنے خیموں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے۔ تب موسیٰ نے کہا: اِس سے تم جان لو گے کہ خداوند نے مجھے بھیجا ہے کہ یہ سب کام کروں، کیونکہ میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔ اگر یہ آدمی (اشارہ قارون اور اُس کے جتھے کی طرف ہے) ویسی ہی موت مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا اِن پر ویسے ہی حادثے گزریں جو سب پر گزرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں۔ پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور اِن کو اِن کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ اِن لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ اُس نے یہ باتیں ختم ہی کی تھیں کہ زمین اُن کے پاؤں تلے پھٹ گئی اور زمین نے اپنا منہ کھول دیا اور اُن کو اور اُن کے گھر بار کو اور قورح کے ہاں کے سب آدمیوں کو اور اُن کے سارے مال و اسباب کو نگل گئی۔ سو وہ اور اُن کا سارا گھر بار جیتے جی پاتال میں سما گئے اور زمین اُن کے اوپر برابر ہو گئی اور وہ جماعت میں سے نابود ہو گئے۔ اور سب اسرائیلی جو اُن کے آس پاس تھے، اُن کا چلانا سن کر یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ کہیں زمین ہم کو بھی نگل نہ لے۔“ (گنتی ۱۶: ۲۷-۳۴)

[۲۳۷] یعنی آیت ۷۷ میں۔

فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ
فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ
عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾
اِنَّ الَّذِىْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّىْٓ
اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾

نہ زمین میں اپنی بڑائی چاہتے ہیں، نہ فساد کے خواہاں ہیں۔ (وہی خدا سے ڈرنے والے ہیں)، اور انجام کار کی کامیابی تو خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے[۲۳۸]۔ (اُس دن) جو بھلائی لے کر آئے گا، اُس کے لیے اُس سے بہتر بھلائی ہے اور جو برائی لے کر آئے گا تو جنھوں نے برائیاں کی ہیں، اُن کو وہی بدلے میں ملے گا جو وہ (دنیا میں) کرتے رہے[۲۳۹]۔ ۸۳-۸۴

(اِس لیے) یقین رکھو، (اے پیغمبر کہ) جس نے تم پر یہ قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے، وہ تمھیں اچھے انجام تک پہنچا کے رہے گا[۲۴۰]۔ (اب) اِن سے کہہ دو کہ میرا پروردگار خوب جانتا ہے اُس کو بھی جو خدا کی ہدایت لے کر آیا ہے اور اُس کو بھی جو کھلی گم راہی میں پڑا ہوا ہے۔ ۸۵

---

[۲۳۸] یہ اُس موعظت کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔

[۲۳۹] یہ اُس قانون کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں جزا و سزا کے لیے مقرر کر رکھا ہے کہ بروں کے لیے وہاں عدل اور اچھوں کے لیے فضل کا معاملہ ہوگا۔

[۲۴۰] یعنی دشمنوں کے علی الرغم، کیونکہ تم خدا کے رسول ہو اور رسولوں کے باب میں یہی سنت الٰہی ہے۔ لفظ 'مَعاد' آیت میں 'معاد حسن' کے مفہوم میں ہے، اِس لیے کہ نکرہ ہے اور تنکیر یہاں تفخیم شان پر دلیل ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ

تم اِس کے متوقع نہیں تھے کہ تمھاری طرف یہ کتاب اتاری جائے۔ یہ تو محض تمھارے پروردگار کی عنایت ہوئی (کہ اُس نے تمھیں اِس ذمہ داری کے لیے منتخب فرمایا ہے)۔ اِس لیے (بے کم و کاست سناؤ اور) ہرگز اِن منکروں کے مددگار نہ بنو۔[۲۴۱] اور ایسا کبھی نہ ہو کہ یہ خدا کی آیتوں سے، جب کہ وہ تمھاری طرف نازل

---

[۲۴۱] یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے درحقیقت جھٹلانے والوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ ہمارے پیغمبر سے ہرگز یہ توقع نہ رکھو کہ تمھاری مخالفتوں کے باعث وہ اپنے موقف میں کوئی نرمی پیدا کر لے گا۔ نہیں، وہ اِس پیغام میں کسی تبدیلی یا مداہنت کا مجاز نہیں ہے اور تمھارے آگے نہیں، بلکہ ہمارے آگے جواب دہ ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے بعض مضمرات کی مزید وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”اِس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ نبوت و رسالت ایک موہبت ربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے، اِس کار خاص کے لیے منتخب فرماتا ہے اور وہی جس کو منتخب فرماتا ہے، اُس کی تربیت فرماتا ہے۔ نبی کو یہ منصب بغیر کسی طلب و تمنا اور کسی انتظار و توقع کے ملتا ہے اور خدا ہی اِس منصب کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اُس کی مدد فرماتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ انسانی فطرت کی مضمر صلاحیتوں ہی کا ایک بُروز ہے، اُن کا خیال بالکل غلط ہے۔...
>
> دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی پر اگر کسی منصب و عہدہ کی ذمہ داریاں اُس کی طلب و تمنا کے بغیر عائد ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اُس میں اُس کی مدد فرماتا ہے۔ اور اگر وہ کسی عہدے کا طالب بن کر اُس کو حاصل کرتا ہے تو خدا اُس کو اُس کے عہدے کے حوالے کر دیتا ہے۔ اِس بات کی وضاحت احادیث میں بھی نہایت موثر انداز میں ہوئی ہے۔
>
> تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کے معاملے میں ہمیں ہرگز کسی نرمی و مداہنت کو گوارا

اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾ ج
وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ م لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قف كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا
وَجْهَهٗ ط لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

ہو چکی ہیں، تمھیں روک دیں۔ تم اپنے پروردگار کی طرف بلاتے رہو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو اور نہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارو۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ اُسی کے اختیار میں ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۸۶-۸۸

نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم مجرموں کے ساتھی اور اُن کے مددگار بن جائیں گے۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۷۱۷)

سڈنی

۲۶/ جنوری ۲۰۱۴ء